شعاع
جنوری 2021
www.pklibrary.com
pklibrary.com

بہنوں کا اپنا ماہنامہ

خط و کتابت کا پتہ

ماہنامہ شعاع

37 - اردو بازار کراچی

بانی و مدیر اعلیٰ —— محمود ریاض

مدیرہ —— رضیہ جمیل

مدیر منتظم —— آذر ریاض

مدیرہ اعزازی —— امت الصبور

فلم ٹیلی وژن —— شاہین رشید

اشتہارات —— خالدہ جیلانی

قانونی مشیر —— نورالدین سرکی اینڈ کمپنی

ایڈوکیٹس اینڈ لیگل کونسلرز

واٹس ایپ

03172266944

Happy New Year

Special wishes to you for a Happy New Year

MEMBER
APNS
CPNE
رکن آل پاکستان نیوز پیپرز سوسائٹی
رکن کونسل آف پاکستان نیوز پیپرز ایڈیٹرز

مستقل سلسلے

جنوری 2021
جلد 35 شمارہ 05
قیمت 70 روپے

خط و کتابت کا پتہ: ماہنامہ شعاع، 37 - اردو بازار، کراچی۔

رضیہ جمیل نے ابن حسن پرنٹنگ پریس سے چھپوا کر شائع کیا -

Phone: 32721777, 32726617, 021-32022494 Fax: 0092-21-32766872
Email: shuaa@khawateendigest.com website: www.khawateendigest.com

رضیہ جمیل

شعاع جنوری سنہ 2021ء کا شمارہ لیے حاضر ہیں۔

ایک اور سال کا سفر اختتام کو پہنچ رہا ہے۔

وقت تیزی سے گزرتا جا رہا ہے۔ وقت کی سب سے اچھی بات ہی یہ ہے کہ اچھا ہو یا برا گزر جاتا ہے۔ وقت ہی کیا زندگی ہی اتنی بے ثبات اور ناپائیدار ہے کہ اس میں کوئی بھی رنگ زیادہ دیر نہیں ٹھہرتا۔ نہ خوشی نہ غم، نہ بچپن نہ جوانی۔ ہر چیز اپنا جلوہ دکھا کر غائب ہو جاتی ہے اور انسان سوچتا رہ جاتا ہے کہ جو دیکھا تھا، وہ خواب تھا کہ فسانہ تھا۔ لیکن وقت کے کچھ لمحے ایسے ہوتے ہیں جو قوموں کی تقدیر بدل دیتے ہیں۔ ان لمحوں میں کیے گئے غلط فیصلوں کا خمیازہ صدیوں بھگتنا پڑتا ہے۔ ایسے کتنے ہی لمحات تاریخ کا حصہ ہیں لیکن بدقسمتی یہ ہے کہ تاریخ سے کوئی سبق سیکھنے کو تیار ہی نہیں ہوتا۔

انسان غلطیاں کرتا ہے، یہ اس کی سرشت میں شامل ہے لیکن وہ کبھی اپنی غلطیوں کو تسلیم نہیں کرتا۔ یہ تباہ کن ہے۔ ہم اپنی غلطیوں سے سیکھ کر مستقبل کو بہتر بنا سکتے ہیں، اور یہ اسی وقت ممکن ہے جب ہم اپنی غلطیوں اور کوتاہیوں کو تسلیم کریں۔ مستقبل پر نظر ضرور رکھنا چاہیے لیکن ماضی کو نہیں بھولنا چاہیے۔

سال گزشتہ خوف اور پریشانیوں کے سائے تلے گزرا۔ نہ صرف ملکی سطح پر بلکہ عالمی سطح پر بھی دنیا ایک بھیانک تجربے سے گزری۔ وہ مناظر سامنے آئے، ان تجربات سے گزرے جو کبھی تصور نہ کیے تھے۔ کورونا کی عالمی وبا نے سب کو گھروں میں قید کر کے رکھ دیا۔ نظام زندگی معطل ہو کر رہ گیا۔ ہم جیسے ترقی پذیر ملکوں کے لیے جہاں پہلے ہی مہنگائی انتہائی حدوں کو چھو رہی تھی۔ دوہرا عذاب تھا۔ ایک طرف بڑھتی مہنگائی، دوسری طرف روزگار پہ تالہ بندی۔ دعا ہے اللہ تعالیٰ پھر ایسے منظر نہ دکھائے۔ آمین۔

نئے سال کا استقبال کرتے ہوئے دل میں جہاں بہت سے خدشات ہیں، وہاں اللہ تعالیٰ کی رحمت سے امید بھی ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو اپنے حفظ و امان میں رکھے۔ نیا سال ہمیں اس گرداب سے نکالے جس میں ہم مبتلا ہیں۔ نیا سال ہمارے لیے، ہمارے ملک کے لیے خوش گوار تبدیلی کا پیغام لے کر آئے۔ آمین۔

اس شمارے میں،

- حسنہ حسین کا مکمل ناول ۔ عسر یسرا،
- توشین فیاض کا مکمل ناول ۔ شب آرزو،
- عائشہ نصیر احمد کا مکمل ناول۔
- حمیرا شفیع کا ناولٹ ۔ احساس،
- رخسانہ نگار عدنان اور تنزیلہ ریاض کے ناول،
- سلویٰ علی بٹ، افشین نعیم، نورین زہرا، فرح انیس، قرۃ العین خرم ہاشمی اور مریم شہزاد کے افسانے،
- مقبول مصنفہ ۔ امتل عزیز سے بندھن کے حوالے سے باتیں،
- معروف شخصیات سے گفتگو کا سلسلہ ۔ دستک،
- جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے،
- نئے سال کے موقع پر قارئین سے سروے،
- پیارے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی پیاری باتیں ۔ احادیث نبوی کا سلسلہ،
- خط آپ کے اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں۔

مہک میں سارے حروف دھو کر
قلم کو عنبر میں ڈبو کر
ثنائے ربِّ جلیل لکھوں
رحیم لکھوں، کریم لکھوں
اُسی کو اُس کی دلیل لکھوں
کہاں نہیں تھا، کہاں نہیں ہے
مجھے بتاؤ وہ جہاں نہیں ہے
ازل سے ہے، تا ابد رہے گا
وہ آپ اپنی سند رہے گا
وہی تو ہے لاشریک ویکتا
وہ سب کا خالق وہ سب کا آقا
وہ سب کے اندر وہ سب کے باہر
وہ سب سے اعلیٰ، وہ سب سے برتر
رحیم و رحمان صفات اس کی
بڑی مکرّم ہے ذات اس کی

لاریب، ماہ زیب

کُل عالم، جس کی کُٹیا جس کی پرچھائیں سویرا
وہ ہے رسولؐ میرا
جس کی کملی کے سائے میں آنکھ سحر نے کھولی
جس کے لہجے میں ہم تک پہنچی قدرت کی بولی
جس کے چاروں سمت خدا نے اپنا نور بکھیرا
وہ ہے رسولؐ میرا
جس کی سچائی نے بادل کے شہ زور پچھاڑے
جس نے تیز ہواؤں کے سینے پر خیمے گاڑے
جس کے دریا کی لہروں نے کہساروں کو گھیرا
وہ ہے رسولؐ میرا
آپ چٹائی پر سویا بانٹی خیرات میں شاہی
چھو کر جس کے پاؤں کو قائد کہلائی گمراہی
جس کی چوکھٹ پر انسان کی عظمت کرے بسیرا
وہ ہے رسولؐ میرا
لاکھوں سلام اس پر بھیجوں لاکھوں درود بھیجوں
روح کو اکثر اس کے روضے پر بے وجود بھیجوں
جس کی رحمت کا احسان مظفرؔ پر بہتیرا
وہ ہے رسولؐ میرا

مظفر وارثی

ادارہ

پیارے نبی کی پیاری باتیں

گناہ گار کو بددعا دینا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس ایک شرابی آدمی لایا گیا۔ آپ نے فرمایا:

"اسے مارو۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ ہم میں سے کوئی اسے اپنے ہاتھ سے، کوئی اپنے جوتے سے اور کوئی اپنے کپڑے سے مار رہا تھا۔ جب وہ (مار کھا کر) جانے لگا تو لوگوں میں سے کسی نے کہا۔

"اللہ تجھے رسوا کرے۔"

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اس طرح مت کہو، اس کے خلاف شیطان کی مدد مت کرو۔" (بخاری)

فوائد و مسائل:

1۔ گناہ گار کو بددعا دینے سے شیطان کی مدد ہوتی ہے کیونکہ شیطان کا مقصد بھی مسلمان کو عنداللہ ذلیل و خوار کرنا ہی ہے، تو جب ایک مسلمان دوسرے مسلمان پر لعنت کرتا یا اسے ذلت و رسوائی کی بددعا دیتا ہے تو گویا وہ شیطان کے مشن ہی کی تکمیل کرتا ہے۔ اس لیے گناہ گار کو بددعا نہیں دینی چاہیے۔ اس کے لیے ہدایت کی دعا کی جائے۔

2۔ اس میں شرابی کو صرف زدوکوب کرنے کا ذکر ہے۔ یہ حد کے مقرر ہونے سے پہلے کا واقعہ ہے۔ بعد میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے شراب پینے والے پر چالیس کوڑوں کی حد نافذ فرمائی۔ اس لیے راجح مسلک یہی ہے کہ شراب نوشی کی سزا بطور تعزیر نہیں، بطور حد ہے اور وہ ہے چالیس کوڑے۔ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے بھی اسی حد کو نافذ کیا۔

البتہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے دور میں جب شراب نوشی کا رواج کچھ زیادہ ہو گیا تو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے مشورے سے چالیس کے بجائے اسی کوڑے اس کی سزا کر دی۔

3۔ علمائے محققین نے کہا ہے کہ حد تو چالیس کوڑے ہی ہے، البتہ بطور تعزیر چالیس کوڑوں یا اس سے کم و بیش کا حق امام وقت اور قاضی کو حاصل ہے۔

4۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا یہ اضافہ بھی بطور تعزیر ہی ہے ورنہ حد میں کسی کو بھی کمی بیشی کرنے کا حق حاصل نہیں ہے۔

محکوم پر تہمت لگانا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔

"جو شخص اپنے مملوک (غلام، باندی) پر بدکاری کی تہمت لگائے تو قیامت والے دن اس (مالک) پر حد قائم کی جائے گی، مگر یہ کہ وہ (مملوک) ایسا ہی ہو جیسے اس نے کہا (پھر مالک پر حد لاگو نہیں ہوگی۔")" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ مالک پر قیامت والے دن حد قذف (زنا کی تہمت لگانے کی سزا) اس لیے قائم کی جائے گی کہ دنیا میں مالک اپنے مملوکین پر ہر طرح کا ظلم کر لیتے ہیں اور ان کی دادرسی نہیں ہوتی۔ اس لیے اللہ تعالیٰ قیامت والے دن جب بے لاگ انصاف فرمائے گا تو اس مظلوم طبقے کے ساتھ بھی انصاف کا اہتمام ہوگا

اور جو مالک دنیا میں سزا سے بچ رہے ہوں گے۔ انہیں قیامت والے دن سزا سے دوچار ہونا پڑے گا۔

2۔اس میں ان لوگوں کے لیے ترہیب ہے جو اپنے مالکانہ اختیارات کے گھمنڈ میں اپنے غلاموں اور نوکروں چاکروں پر ظلم کرتے ہیں۔

مردے کو برا کہنا

حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"فوت شدہ لوگوں کو برا بھلا مت کہو، اس لیے کہ انہوں نے (اچھے یا برے) جو عمل آگے بھیجے، وہ اس کو پہنچ گئے۔ (بخاری)

فائدہ: مطلب یہ ہے کہ دنیا میں انہوں نے اچھے یا برے جو عمل بھی کیے، اس کے مطابق وہ جزا یا سزا کے مستحق ہوں گے۔ ہمیں اب انہیں برا کہنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہی ہے۔ اس لیے کسی بھی فوت شدہ پر سب وشتم نہ کی جائے۔ بالخصوص کسی کا نام لے کر سوائے مصلحت شرعی کے۔

تکلیف پہنچانے سے ممانعت کا بیان

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور وہ لوگ جو بغیر کسی قصور کے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیف پہنچاتے ہیں، انہوں نے یقیناً بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" (الاحزاب۔58)

کامل مسلمان

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"(کامل) مسلمان وہ ہے جس کی زبان اور ہاتھ سے دوسرے مسلمان محفوظ رہیں۔ اور مہاجر وہ ہے جو ان چیزوں کو چھوڑ دے۔ جن سے اللہ نے منع فرمایا۔" (بخاری ومسلم)

فوائد ومسائل:

1۔کہنے کو تو ہر وہ شخص مسلمان ہے جس نے کلمہ شہادت پڑھ کر توحید ورسالت محمدیہ کا اقرار کرلیا۔ لیکن کامل مسلمان وہ ہے جس کا کردار اتنا بلند ہو کہ اس کی زبان یا ہاتھ سے کسی دوسرے مسلمان کو تکلیف نہ پہنچے۔

2۔مہاجر تو اصل میں وہ ہے جو اللہ کے لیے اپنے وطن اور خویش واقارب کو چھوڑ کر کسی ایسی جگہ چلا جائے جہاں وہ آسانی سے اللہ کے دین پر عمل کرسکے۔ لیکن وہ شخص بھی مہاجر ہے جو اللہ کے حکم کے مطابق نافرمانی والے کاموں کو ترک کردیتا ہے۔ اس لیے کہ ہجرت کے معنی ترک کرنے کے ہیں، وطن کو ترک کردے یا معاصی کو ترک کردے۔

ایمان

حضرت عبداللہ بن عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ ہی سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"جو شخص اس بات کو پسند کرتا ہے کہ وہ جہنم سے دور اور جنت میں داخل کردیا جائے تو چاہیے کہ اس کو موت اس حال میں آئے کہ وہ اللہ اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اور لوگوں کے ساتھ وہ برتاؤ کرے جو وہ اپنے لیے پسند کرتا ہے۔" (مسلم)

فوائد ومسائل:

1۔اس میں ایمان پر استقامت اور عمل صالح پر مداومت کی تاکید ہے کیونکہ موت کا کچھ پتا نہیں کس وقت آجائے۔ اس لیے انسان کو کسی وقت بھی ایمان کے تقاضوں اور عمل صالح سے غافل نہیں رہنا چاہیے۔

2۔مسلمان کو چاہیے کہ وہ ہر ایک کے ساتھ اچھا برتاؤ کرے، جیسے اس کی خواہش ہوتی ہے کہ لوگ اس کے ساتھ اچھا معاملہ کریں۔

بغض رکھنا، قطع تعلق کرلینا اور ایک دوسرے سے منہ پھیر لینا

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "مومن تو بھائی بھائی ہیں۔" (الحجرات۔10)

نیز اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "(مومن) مومنوں پر نرم ہیں اور کافروں پر سخت۔" (المائدہ 54)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: (محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اللہ کے رسول ہیں اور ان کے ساتھی کافروں پر سخت ہیں، آپس میں مہربان۔" (الفتح 29)

حضرت انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، نہ باہم حسد کرو نہ ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ، نہ آپس میں تعلق منقطع کرو اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ، کسی مسلمان کے لیے یہ جائز نہیں ہے کہ وہ اپنے (کسی مسلمان) بھائی سے تین دن سے زیادہ بول چال چھوڑے رکھے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل: ایک دوسرے سے بغض نہ رکھو، کا مطلب ہے کہ ایسا کام یا بات نہ کرو جس سے دلوں میں کدورت اور بغض پیدا ہو۔ حسد نہ کرو، یعنی کسی مسلمان کو کوئی نعمت اور شرف و فضل حاصل ہو تو اس کے زوال کی آرزو مت کرو، ایک دوسرے کو پیٹھ مت دکھاؤ، یعنی ایک دوسرے سے آمنا سامنا ہو تو سلام کرنے کے بجائے ایک دوسرے سے اعتراض کرتے ہوئے کنی کترا کر مت نکلو۔ یہ تمام چیزیں ممنوع ہیں کیونکہ ان سے افتراق اور انتشار پیدا ہوتا ہے۔ اسی لیے تین دن سے زیادہ ترک تعلق اور بول چال بند رکھنا جائز نہیں ہے۔

صلح

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"پیر اور جمعرات کے روز جنت کے دروازے کھولے جاتے ہیں۔ چنانچہ ہر اس بندے کے گناہ معاف کر دیے جاتے ہیں جس نے اللہ کے ساتھ کسی کو شریک نہ ٹھہرایا ہو، سوائے اس آدمی کے کہ اس کے اور اس کے (کسی مسلمان) بھائی کے درمیان دشمنی ہو۔

کہا جاتا ہے، ان دونوں کو مہلت دی جائے یہاں تک کہ یہ صلح کر لیں، ان دونوں کو صلح کرنے تک مہلت دی جائے۔" (مسلم)

اور مسلم کی ایک اور روایت میں ہے: "ہر جمعرات اور سوموار کو اعمال پیش کیے جاتے ہیں۔"

فائدہ: اس میں بھی باہم دشمنی اور بغض و عناد کو جنت سے محرومی کا سبب بتلایا گیا ہے۔

حسد کرنا

حسد کسی صاحب نعمت سے زوال نعمت کی آرزو کرنے کا نام ہے، وہ نعمت دینی ہو یا دنیاوی۔

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:

"کیا وہ لوگوں سے حسد کرتے ہیں، اس نعمت پر جو اللہ نے ان کو اپنے فضل سے دی۔" (النساء 54)

حسد سے بچو

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"حسد سے بچو! اس لیے کہ حسد نیکیوں کو اس طرح کھا جاتا ہے جیسے آگ لکڑی کو کھا جاتی ہے۔"

یا فرمایا: "خشک گھاس کو (کھا جاتی ہے۔")

(ابوداؤد)

ٹوہ لگانے کی ممانعت کسی کے ناپسند کرنے کے باوجود اس کی بات سننے کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "ٹوہ مت لگاؤ۔" (مسلمانوں کے عیبوں اور کمزوریوں کو تلاش مت کرو۔) (الحجرات۔12)

اور اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "اور وہ لوگ جو بغیر قصور کے مومن مردوں اور مومن عورتوں کو تکلیف پہنچاتے

ہیں، انہوں نے یقیناً بہتان اور صریح گناہ کا بوجھ اٹھایا۔" (الاحزاب 58)

بدگمانی

حضرت ابو ہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"تم بدگمانی سے بچو کیونکہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔ اور عیبوں کی ٹوہ مت لگاؤ اور نہ جاسوسی کرو اور نہ دوسرے کا حق غصب کرنے کی حرص اور اس کے لیے کوشش کرو، نہ ایک دوسرے سے حسد کرو، نہ باہم بغض رکھو، نہ ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ۔ اور اے اللہ کے بندو! تم بھائی بھائی ہو جاؤ، جیسے اس نے تمہیں حکم دیا ہے۔ مسلمان مسلمان کا بھائی ہے، نہ اس پر ظلم کرے، نہ اسے بے یار و مددگار چھوڑے، نہ اس کو حقیر سمجھے۔ تقویٰ یہاں ہے۔ تقویٰ یہاں ہے۔"

اور اپنے سینے کی طرف اشارہ فرماتے......

"آدمی کے برے ہونے کے لیے یہی کافی ہے کہ وہ اپنے مسلمان بھائی کو حقیر سمجھے۔ ہر مسلمان کا دوسرے مسلمان پر خون، عزت اور مال حرام ہے۔

بے شک اللہ تعالیٰ تمہارے جسموں کو دیکھتا ہے نہ تمہاری صورتوں کو، وہ تو تمہارے دلوں اور تمہارے عملوں کو دیکھتا ہے۔"

بھائی بھائی بن جاؤ

ایک اور روایت میں ہے۔ "ایک دوسرے سے حسد نہ کرو، باہم بغض نہ رکھو، جاسوسی نہ کرو، عیبوں کی ٹوہ مت لگاؤ، محض دھوکا دینے کے لیے بولی بڑھا کر مت لگاؤ، اور اے اللہ کے بندو! بھائی بھائی بن جاؤ۔"

اور ایک روایت میں ہے: "ایک دوسرے سے قطع تعلقی نہ کرو،، نہ ایک دوسرے کو پیٹھ دکھاؤ اور باہم بغض نہ رکھو، نہ باہم حسد کرو اور اے اللہ کے بندو! تم بھائی بھائی بن جاؤ۔"

بول چال بند کرنا

ایک اور روایت میں ہے: "ایک دوسرے سے بول چال بند مت کرو اور تم میں سے کوئی شخص دوسرے کے سودے پر سودا نہ کرے۔"

یہ ساری روایت مسلم نے بیان کی ہیں اور ان میں سے اکثر امام بخاری نے بھی روایت کی ہیں۔

فوائد و مسائل:

1۔ بدگمانی سے مراد کسی مسلمان کی بابت ایسا گمان ہے جس کا کوئی ظاہری سبب نہ ہو، اسی طرح وہ خیال ہے جو بغیر کسی دلیل کے دل میں پیدا ہو۔

2۔ کسی سودے کی بولی میں اس لیے اضافہ کرنا تاکہ دوسرے لوگ دھوکا کھا جائیں، اس کا مقصد خریدنا نہ ہو۔ اس کی ممانعت ہے۔

3۔ اس حد میں جو ہدایات دی گئی ہیں، ان کا مقصد مسلمان کی عزت کا تحفظ ہے، بلاوجہ بدگمانی، عیبوں اور کمزوریوں کی تلاش مسلمان کی عزت کے منافی ہے، اس لیے ان سے روک دیا گیا۔

دوسرا مقصد اخوت اسلامیہ کی پاسداری ہے، اسی لیے ظلم کرنے سے، دست گیری کے وقت بے یار و مددگار چھوڑ دینے سے، حقیر سمجھنے سے اور تکبر کرنے سے روک دیا گیا ہے اور مسلمان کی جان، مال اور عزت کو دوسرے مسلمانوں پر حرام کر دیا گیا ہے۔ بولی میں اضافے اور سودے پر سودا کرنے کی ممانعت بھی اسی لیے ہے کہ ان سے بھی بغض و نفرت پیدا ہوتی ہے۔

ٹوہ لگانا

حضرت معاویہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو فرماتے ہوئے سنا۔ "اگر تو مسلمانوں کے عیبوں کی تلاش میں رہے گا تو تو ان کے اندر بگاڑ پیدا کرے گا یا قریب ہے کہ تو ان کے اندر فساد پیدا کر دے۔" (یہ حدیث صحیح ہے، اسے امام ابوداؤد نے صحیح سند سے روایت

کیا ہے۔)

فائدہ: جب ایک شخص دوسروں کے عیوب کی تلاش میں اور ان کی کمزوریوں کے تعاقب میں لگا رہے گا تو پھر دوسرے لوگ بھی اس کی بابت یہی انداز اختیار کریں گے۔ اس سے معاشرے میں جو فساد پیدا ہوگا وہ ظاہر ہے، اس لیے شریعت نے اس سے منع کر دیا ہے۔

بدظنی

حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ ان کے پاس ایک آدمی لایا گیا اور اس کے بارے میں کہا گیا کہ یہ فلاں آدمی ہے، اس کی داڑھی سے شراب کے قطرے گر رہے ہیں۔ انہوں نے فرمایا" ہمیں تو ٹوہ لگا کر عیب تلاش کرنے سے منع کیا گیا ہے، البتہ اگر کوئی کمزوری ہمارے سامنے آئے گی تو ہم اس پر اس کی گرفت کریں گے۔ (یہ حسن صحیح ہے۔ اسے ابوداؤد نے ایسی سند سے روایت کیا ہے جو بخاری و مسلم کی شرط پر ہے)

فوائد و مسائل:

1۔ اس میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم کے اس عمل کا ایک نمونہ ہے جس کی ہدایت اسلام نے دی ہے۔ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم یقیناً اسلام کے اوامر و نواہی کے پابند تھے۔

2۔ محض شبے پر حد یا تعزیر عائد نہیں ہوگی، اس کے لیے واقعی ثبوت ضروری ہے۔

بلاضرورت مسلمانوں سے بدگمانی کرنے کی ممانعت

اللہ تعالیٰ نے فرمایا:" اے ایمان والو! زیادہ بدگمانی کرنے سے بچو، اس لیے کہ بعض بدگمانی گناہ ہے۔"

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ تعالیٰ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:" تم بدگمانی سے بچو، اس لیے کہ بدگمانی سب سے بڑا جھوٹ ہے۔" (بخاری و مسلم)

فوائد و مسائل:

1۔ اہل خیر و صلاح کے بارے میں بدگمانی سے بچنے کی تاکید ہے، اس لیے کہ یہ جھوٹ کی بدترین قسم ہے۔ علاوہ ازیں شرعی احکام اور سزائیں یقین پر نافذ ہوتی ہیں، محض ظن و تخمین پر نہیں۔

2۔ عام حالات میں ہر مسلمان کی بابت اچھا خیال رکھنا ضروری ہے۔ الا یہ کہ کوئی واضح ثبوت اس کے برعکس موجود ہو۔

ابتدا کرنے والا

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے، رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا:

"آپس میں گالی دینے والے دو شخص، جو کچھ ایک دوسرے کو کہیں گے، اس کا گناہ ابتدا کرنے والے کو ہوگا، یہاں تک کہ مظلوم زیادتی کا ارتکاب کرے۔" (مسلم)

اہل بیت کی تکریم

حضرت ابن عمر رضی اللہ عنہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کا قول نقل کرتے ہیں، جو انہی پر موقوف ہے۔

"کہ تم حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کا، ان کے اہل بیت کے بارے میں خیال رکھو۔ (بخاری)

فوائد و مسائل:

(1) اس میں اہل بیت نبوی کی محبت اور ان کی عزت و توقیر کو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے احترام و وقار کے ساتھ منسلک کر دیا گیا ہے، یعنی جو اہل بیت کی عزت کرے گا، وہ گویا نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کی قدر و منزلت کرنے والا شمار ہوگا، اس کے برعکس جو دل، عظمت اہل بیت سے خالی ہے، وہ دل احترام نبوت سے بھی خالی ہے۔

جب تجھ سے ناتا جوڑا ہے

ط۔غ

آپ لوگوں کا شکریہ کہ آپ لوگوں نے موقع دیا کہ ہم اپنے دل کی بات کہہ سکیں جو کسی سے نہیں کہہ سکتے۔ آپ نام کو پوشیدہ رکھتے ہیں یہ بہت اچھی بات ہے۔

سب سے پہلے اتنا کہوں گی منفی سوچ نہ سمجھیے گا۔ یہ ایک سبق ہے تمام والدین کے لیے کیونکہ ایک لڑکی جب اپنے والدین، بہن بھائی، اپنا گھر جہاں اس نے اپنے بیس بائیس سال گزارے ہوتے ہیں۔ انہیں چھوڑ کے جاتی ہے تو یہ سوچ کے جاتی ہے کہ اپنوں میں ہی جا رہی ہے لیکن اگر الٹ ملے تو اس کی ذہنی کیفیت ایسی ہو جاتی ہے جیسے زندگی کی آخری بازی ہار گئی ہو۔

1۔ شادی کب ہوئی؟

شادی اکتوبر 2009 میں انجام پائی الحمدللہ بزرگوں اور بڑے بھائی کی محبت اور دعاؤں کے سائے میں ہوئی۔

2۔ شادی سے پہلے کے مشاغل اور دلچسپیاں؟

شادی سے پہلے دوستوں سے ملنا بچوں کو ٹیوشن دینا یہ دلچسپیاں تھیں۔ ریڈیو سننا اس کے بارے میں پڑھنا اور عملی طور پر کرنا (جو کہ خواب رہ گیا) آگے کی تعلیم مکمل کرنا اور شاعری پڑھنا یہ میرے شوق جنون تھے۔

3۔ اس شادی میں آپ کی مرضی شامل تھی یا بزرگوں کے فیصلے کے آگے سر جھکایا؟

سچ تو یہ ہے کہ میں شادی ہی نہیں کرنا چاہتی تھی اپنے شوق جنون کو عملی روپ دینا چاہتی تھی لیکن اچھا رشتہ تھا تو بڑوں کے فیصلے پر اعتماد کے ساتھ سر جھکا دیا۔

4۔ ذہن میں جیون ساتھی کے لیے کوئی تصور تھا اور وہ کیا خوبیاں تھیں جو آپ جیون ساتھی میں دیکھنا چاہتی تھیں؟

ہک......ہا......

خواب خواب ہی ہوتے ہیں

خواہش خواہش ہی رہ جاتی ہے

جیون ساتھی کا کوئی خاص تصور نہیں تھا بس خواہش تھی کہ مجھ کو سمجھنے والا اور مجھے دوست کی طرح رکھنے والا ہو۔

5۔ منگنی کتنا عرصہ رہی۔ شادی سے پہلے فون پر بات ہوئی یا ملاقات وغیرہ؟

منگنی بہت مختصر عرصے کے لیے کی گئی تھی تین ماہ کے لیے پھر جہاں تک سوال ہے بات کرنے یا ملاقات کی تو میں نے اپنے شوہر کو اپنی شادی والے دن ہی دیکھا تھا۔ شادی سے پہلے نہ مجھے شوق تھا کہ بات یا ملاقات کروں نہ ہی میرے سسرال والوں کو پسند تھا۔

6۔ شادی سے پہلے سسرال والوں کے بارے میں آپ کے کیا خیالات تھے؟

خیالات...... وہ تو جناب بہت اچھے تھے۔ مل جل کر رہنے والے، ہنسنے بولنے والے، یہ بھی سنا ان لوگوں کو سیریں کرنے کا (پکنک) کا بہت شوق ہے۔ خیر جناب خیالات تو خیالات ہوتے ہیں۔ اصل بات تب ہے وہ سچ ثابت ہوں۔

7۔ شادی کے لیے آپ کو تعلیم وغیرہ ادھوری چھوڑنی پڑی یا کوئی قربانی دینا پڑی؟

شادی کے لیے تعلیم کو روک دیا ایم اے کرنا چاہتی تھی فارم فل کرنے کے بجائے ماں جی نے کہا بیٹا اب نکاح نامہ فل کر دو" ریڈیو پہ پروگرام کرنا چاہتی تھی اپنی آواز کو پس پردہ استعمال کرنا چاہتی تھی۔ کبھی کبھی کچھ لکھ لیا کرتی تھی۔ لیکن اب تو میری نظمیں اور غزلیں بچے ہی ہیں ہا...... ہا...... ہا۔

8۔ شادی بخیر و خوبی انجام پائی یا رسموں کے دوران لین دین کے معاملے میں کوئی بدمزگی ہوئی؟

ہماری شادی بھلے شادی ہال میں ہوئی لیکن بہت سادگی سے ہوئی کوئی فضول رسم (بقول میرے جیٹھ کے) نہیں ہوئی۔ ہاں حق مہر میں تھوڑی سی بحث ہوئی تھی ہماری طرف سے کہ اکیاون سو (جدی پشتی مہر) والے زمانے لکھے۔ اب کم از کم اک ماہ کی تنخواہ تو ہو اور چونکہ سادگی ۔سے شادی ہوئی تھی اس لیے سادگی سادگی میں میرے سسرال والے استقبال کے لیے تو کیا میرے لیے بھی پھول لانا بھول گئے۔

8۔ شادی کے بعد شوہر نے آپ کو دیکھ کے کیا کہا؟

ہائے کیا یاد دلا دیا...... سلام کیا اور بولے سلائی آتی ہے آپ کو، گھر داری سنبھال لیتی ہیں آپ...... انٹرویو لینے کے بعد صرف اپنی امی کے بارے میں بریفنگ دی پھر کہا آیئے نوافل پڑھ لیتے ہیں۔

9۔ شادی کے بعد آپ کی زندگی میں کیا تبدیلی آئی؟

لڑکی اک لچک دار شاخ کی طرح ہوتی ہے ڈھل جانے والی۔ اسی طرح مجھ میں بہت سی تبدیلیاں آئیں اور ایسی تبدیلیاں جس کا مجھے خود یقین نہ تھا۔ سویرے اٹھنے کی عادت ہوگئی۔ سونے کا بہت شوق ہوا کرتا تھا اب کم ہوگیا کچن کے کام سے اک میل دور بھاگتی تھی۔ مزے کی بات ساس امی نے مستقل ٹھکانہ وہ ہی بنایا۔ قوت برداشت زیادہ مضبوط ہوگئی اور میری اپنی ماں جی سے وقت کی پابندی پر بحث بہت ہوتی تھی سو اس کی اہمیت شادی کے بعد سمجھ میں آئی۔

10۔ شادی کے کتنے عرصے بعد کام کاج سنبھالا؟

ان فارملی گھر کے کام تو شادی کے اک ہفتے بعد ہی سنبھال لیے تھے۔ باقاعدہ پندرہ دن بعد سنبھالا۔ میرے سسر کو میرے ہاتھ کی چائے اور کڑھی چاول بہت پسند ہیں۔

11۔ کیا میکے اور سسرال کے کھانے پکانے کے انداز اور ذائقے مختلف محسوس ہوئے؟

بہت نہیں بلکہ بے انتہا فرق ہے۔ کھانے پکانے کے طریقے میں، ذائقے میں زمین آسمان کا فرق ہے۔ شاید اسی لیے آج تک میرے ہاتھ کا کوئی بھی کھانا کسی کو ذائقے میں پسند نہیں آتا نہ ہی طریقہ۔

12۔ میکے اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق محسوس ہوا؟

جس طرح الفاظ ”میکے“ اور ”سسرال“ بولنے میں فرق ہے اسی طرح میرے میکے اور سسرال کے ماحول میں دن اور رات کا فرق ہے کیونکہ زندگی رسم ورواج سے نہیں گھر سے ملنے والی عزت اور اپنائیت سے گزرتی ہے ہمارے رسم ورواج تو اک ہیں پر زندگی کے نظریات ایک نہیں: اگر میں دن کہوں تو وہ رات کہیں اگر میں بھی رات کہوں تو اسے دن کہیں۔

13۔ سسرال میں کن باتوں پر تعریف ہوئی اور کب تنقید کا سامنا کرنا پڑا؟

یہ واحد سوال ہے جس نے سچ میں سوچ میں

ڈال دیا۔ جہاں صحت کے آگے کام کو ترجیح دی جائے۔ جہاں اپنے اصولوں کے لیے دنیا کو بدلنے کا ارادہ ہو وہاں بالکل دوسرے ماحول سے آنے والی پہ تنقید کی کتاب لکھی جا سکتی ہے جواب تک جاری رہے۔

14۔ سسرال میں گھریلو اور خاندانی معاملات میں آپ کی رائے کو کتنی اہمیت دی جاتی ہے؟

ہماری رائے اہم یا غیر اہم جب ہوگی جب رائے لی جائے گی یا معاملات پتا ہوں گے۔ میرے سسرال میں سب آپس میں ایسے جڑے ہیں کہ اگر کوئی اور آ جائے اس کو اپنے خاندان میں شامل تو کرتے ہیں آپ کو لگتا بھی ہے سب آپ سے خوش ہیں ملنسار ہیں آپ بھی انہیں سمجھ گئے لیکن اچانک سے آپ کو معلوم ہوتا ہے آپ تو وہیں ہیں جہاں آپ کی جگہ ہے الگ سب سے الگ۔

15۔ سسرال والوں سے توقعات کس حد تک پوری ہوئیں؟

جب میری شادی ہوئی تو میں نے بہت کچھ سن رکھا تھا اور اچھے گمان کے ساتھ اپنے سسرال میں قدم رکھا لیکن پوری حد تک تو نہیں لیکن ایک بات میرے دل کو بھائی ہے اور فخر بھی ہے کہ میرے سسرال میں ہر تہوار سب مل کر مناتے ہیں ایک ہی جگہ جو کہ میرا خواب تھا کیونکہ میں ایک ہی بیٹی ہوں اور میری سسرال ماشاءاللہ بڑی فیملی ہے۔

16۔ پہلے بچے کی پیدائش بہت بڑا امتحان ہوتی ہے؟ خصوصاً پہلا بچہ اک طرف خود میں آتی تبدیلی دوسری طرف شوہر اور سسرال والے آپ کو کتنی دشواری کا سامنا کرنا پڑا؟

ہم م...... اک عورت کی زندگی میں ماں بننے کا پورا عرصہ اور زندگی کے دوسرے نازک لمحات ایسے ہوتے ہیں جس میں گزرا ہوا ایک ایک پل اور ایک ایک شخص کا رویہ یاد رہ جاتا ہے۔ ہاں بس اتنا معلوم ہو گیا انسانوں کی اہمیت ہے یا ان سے لیے جانے والے کاموں کی۔

17۔ آپ جوائنٹ فیملی سسٹم سے اتفاق کرتی ہیں یا علیحدہ رہنا پسند ہے؟

مجھے جوائنٹ فیملی سسٹم بہت پسند ہے سارے کام مل بانٹ کے ہو جاتے ہیں تھوڑا اپنی انا کو مارنا پڑتا ہے دکھ سکھ آپس میں مل بانٹ لیتے ہیں لیکن اگر اس کے بعد بھی اپنی عزت نفس مجروح ہونے لگے یا رشتوں میں دراڑیں آتی محسوس ہوں وہیں نگاہ بدلنے سے بہتر کوچہ بدلنا ہے۔

18۔ آپ نے سسرال کے ماحول کو بہتر بنانے کی کوشش کی۔ کس حد تک اس کوشش میں کامیاب ہوئیں؟

کوشش تو بہت کی کچھ تبدیلیاں کرنے کی بہت پیار سے اور بہت مان سے لیکن میری ساس کو گھر میں کوئی تبدیلی پسند نہیں ہے یہاں تک کہ میری بھی کوئی چیز میرے کمرے کے علاوہ اپنے گھر کے کسی کونے میں برداشت نہ ہوئی اسی لیے میں نے دل برداشتہ ہو کے مان لی اور اپنا کونہ کر لیا۔

آخر میں بس اتنا کہنا چاہوں گی کہ سسرال میں اپنا مقام بنانا ایسا ہے جیسے "ناک کو چنے چبانا" اور یہ بھی کہ اپنی بیٹی کی شادی کسی ایسے شخص سے ہرگز نہ کریں جو اپنے ہر فیصلے کے لیے اپنی ماں کا منہ دیکھتا ہو کیونکہ اس شخص میں فیصلہ لینے کی قوت نہیں ہوتی اپنی بیٹی کو بیاہتے وقت یہ نہیں بھولیں کہ وہ زندگی کا آخری جوا کھیلنے جا رہی ہے۔ اللہ اور ماں باپ کے بعد اس کا واحد وہ ہی سہارا ہوگا۔

"صحرا میں ابر مسلسل یا ابر گریزاں"

سرورق کی شخصیت

ماڈل .... ھانیہ

میک اپ --- روز بیوٹی پارلر

فوٹو گرافی ===== موسیٰ رضا

بندھن

امتل عزیز شہزاد — ہمراہ — سید شہزاد احمد

شاہین رشید

"امتل عزیز خواتین، کرن، شعاع کی رائٹر ناول "شہر آشوب اور افسانوں کے مجموعہ "من دیپک۔"

"راگ محبت" کی مصنفہ

آج "بندھن" میں ہمارے ساتھ موجود ہیں...... شکریہ امتل عزیز کہ آپ نے مصروفیات سے ٹائم نکالا...... اور انٹرویو دیا۔

"کیسے مزاج ہیں؟"

"اللہ کا شکر ہے۔"

"سب سے پہلے تو اپنا پورا نام شادی سے پہلے والا اور اب کا بتایئے اور اپنا اور اپنے میاں صاحب کا فیملی بیک گراؤنڈ بھی بتایئے؟"

"شادی سے پہلے میں "امتل عزیز خان" ہوا کرتی تھی نکاح کے بعد خان ہٹا کر بڑے معصومانہ شوق سے "شہزاد" لگالیا...... میں 20 دسمبر 1985ء کو کراچی میں پیدا ہوئی بہن بھائیوں کی تعداد "چھ" ہے مجھ سے بڑے ایک بھائی ہیں باقی دو بھائی اور بہنیں مجھ سے چھوٹے ہیں...... میرے والد Opticain تھے۔ 2007 میں ان کا انتقال ہوا۔ والدہ حیات ہیں الحمداللہ۔ وہ گھریلو خاتون ہیں۔ انٹر میں تھی تو میری شادی ہوگئی مگر میں نے بعد میں بھی اپنی تعلیم کا سلسلہ جاری رکھا اور "بین الاقوامی تعلقات" میں ماسٹرز کیا۔"

"شوہر کا نام سید شہزاد احمد ہے اور انہیں گھر میں عدنان کہتے ہیں چار بڑے بھائیوں اور پانچ بڑی بہنوں کے یہ سب سے چھوٹے بھائی ہیں یعنی ان کا نمبر دسواں ہے۔ ان کی تاریخ پیدائش یکم اکتوبر 1979 ہے، کراچی میں پیدا ہوئے ان کے والدین

کا تعلق بہار سے تھا۔ والد کا ڈھاکہ میں لوہے کی مشینری کا کارخانہ تھا اور والدہ ہاؤس وائف تھیں اللہ غریق رحمت کرے دونوں حیات نہیں ہیں۔ شہزاد نے اے سی سی پی کیا ہے۔ پانچ سال ''عمان'' میں جاب کی اور اب اپنا کاروبار ہے ہارڈ ویر کا۔''

''آپ بتا رہی تھیں کہ نکاح ''2005''ء میں ہوا جبکہ رخصتی 6 جون 2008 میں ہوئی تو اتنی دیر ہونے کی وجہ؟''

ہمارا نکاح 24 جنوری 2005 میں ہوا جبکہ رخصتی 6 جون 2008 میں ہوئی۔ اور اس کی وجہ یہ تھی کہ شہزاد کا ایک خاندانی گھر تھا جس پر ان کے تیسرے نمبر کے بھائی نے اپنی ذاتی ملکیت سمجھتے ہوئے قبضہ کر رکھا تھا اور اس گھر میں بہنوں اور بھائیوں کا داخلہ بند کیا ہوا تھا۔ اور شہزاد کی ضد تھی کہ بارات اسی گھر سے نکلے گی اور وہیں اپنی بیگم کو لے کر آؤں گا۔ بس ان ہی جھگڑوں میں اتنا وقت گزر گیا پھر 2011 میں عدالت کا فیصلہ آیا کہ گھر وراثت کا ہے اس لیے خالی کر دیں۔''

''نکاح کے بعد گھومنے پھرنے کی اور ایک دوسرے کے گھر جانے کی اجازت تھی؟ اور یہ کہ عدالت کا فیصلہ آسانی سے قبول کر لیا بھائی نے؟''

''باہر گھومنے پھرنے کی اجازت تو نہیں تھی ہاں مگر خاص موقعوں پر گھر میں آنا جانا ہو جاتا تھا...... اور نکاح کے بعد بڑے اہتمام سے فون مع مہنگی ترین سم کارڈ بطور تحفہ دیا گیا چنانچہ بات چیت ہوتی رہتی تھی...... ہاں میری رومانوی قسم کی خواہشات کی ایک طویل فہرست تھی جیسے کہ پورے چاند کو سمندر پر جا کر دیکھنا، خود کو زبردستی کوئی غزل ڈیڈی کیٹ کروانا۔ سالگرہ کے پورے ماہ گلاب کی کلیاں وصول کرنا وغیرہ وغیرہ...... اور جیسا کہ میں نے بتایا کہ عدالت نے فیصلہ دیا کہ گھر وراثت کا ہے تو پھر بھی بہت سی شرائط منوا کر جیٹھ جی نے گھر چھوڑا۔ بہت ہی لمبی اور خوفناک جنگ تھی، آج کوئی دھماکا تو کل کوئی دھماکا......''

''خاندان میں یہ سب کچھ ہوتا رہتا ہے مگر یہ بتائیں کہ شہزاد صاحب سے پہلی ملاقات کب اور کہاں ہوئی۔ اور آپ کی پسند کو کتنا عمل دخل تھا؟''

''دراصل حساب سے مجھے شدید نفرت ہے۔ مگر نویں میں پڑھنا مجبوری تھی۔ سو میں نے ٹیوشن پڑھنے وہیں جانا چاہا جہاں میرے چھوٹے بہن بھائی جایا کرتے تھے۔ مگر چونکہ میں دادی کے ساتھ رہا کرتی تھی اور وہاں سے والدین کا گھر دور بھی تھا اور دادی کو یہ خوف بھی تھا کہ کہیں میں اپنے گھر جانے کی ضد نہ کروں سو چچا نے اپنے ایک دوست کو میرا استاد مقرر کیا مگر میں نے بھی احتجاجاً اچھا پڑھ کر نہ دکھایا وہ بے چارے بھی کچھ دن میرے ساتھ سر کھپا کر چچا سے اپنے امتحانات کا بہانا کر کے اپنی جگہ شہزاد کا تعارف کروا نے گھر لے آئے......

اور ان کا کسی بھٹکی ہوئی روح سے مشابہ ضرورت سے زیادہ سنجیدہ چہرہ دیکھ کر میں نے سوچا کہ بھئی...... مارے گئے ۔یہ تو پڑھا کر دم لیں گے...... تو بس یہ تھی ہماری پہلی ملاقات...... اور ہاں شہزاد سے شادی پسند کی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ میں نے سوچا کہ اس سے پہلے گھر والے کسی کنویں میں دھکا دیں ،احتل عزیز! تم خود ہی دریا میں چھلانگ لگادو کہ دریا اپنے سنگ بہا کر تمہیں کسی کنارے پہنچادے ...."

"گھر والے راضی ہوگئے؟"

"گھر والوں کی رضامندی میں روایتی مشکلات تو پیش آئیں مگر کوئی خاص مخالفت نہ ہوئی اور شہزاد کے والدین تو حیات ہی نہیں تھے بڑی بہنوں کو انہوں نے اپنی پسند کے بارے میں بتادیا تھا،لہٰذا انہوں نے ہی خوشی خوشی سارے معاملات طے کر دیے تھے۔اور یوں پہلے نکاح ہوا اور پھر تین سال بعد رخصتی۔"

"اپنے گھر کے ماحول اور سسرال کے ماحول میں کیا فرق پایا؟"

"میرے خاندان کا ماحول کافی کھلاڈلا تھا...... جبکہ سسرال میں رکھ رکھاؤ تمیز و تہذیب کو بہت اہمیت حاصل ہے...... اعلا تعلیم کا بھی رجحان بہت زیادہ ہے...... مسلکی ذائقے کا بھی بہت فرق ہے...... کھانوں کے ذائقے کوئی خاص مختلف نہ تھے کہ اب

تو سب کو سب کچھ اچھی طرح پکانا آتا ہے...... ہاں البتہ کچھ پکوان جیسے کہ دال چاول...... سبزیاں وغیرہ...... ان کے ہاں سے زیادہ مجھے اپنے (میکے) ہاں کے ذائقے دار لگتے ہیں۔"

"نکاح کے بعد زیادہ ملنا جلنا نہیں تھا تو مزاج کا بھی پتا نہیں چلا ہوگا تو نکاح کے دوران اور شادی کے بعد کیا تبدیلی دیکھی آپ نے؟"

"شہزاد جیسے تھے ویسے ہی رہے...... ہاں ان کے مشہور زمانہ غصے کو تحمل سے برداشت کرنا خاصا دشوار کام تھا...... دوبدو لڑنا میرے نزدیک حماقت تھی اور ہے اور وہ بھی معمولی بات پر...... ویسے میں لڑ بھی نہیں سکتی سو اس کا حل میں نے یہ نکالا کہ جو جواب میں شہزاد کو دے نہیں سکتی تھی، وہ میں ڈائری میں لکھ لیا کرتی تھی۔ اور بعد میں انہیں دکھاتی تھی کہ دیکھیں اگر میں یہ سب کچھ کہہ دیتی اس وقت تو پھر کیا ہوتا......؟"

"شادی دھوم دھام سے ہوئی؟ اور رسمیں ساری ہوئیں؟ اور شہر بدر ہوئیں؟"

"شادی دھوم دھام سے نہیں ہوئی کہ چھ ماہ قبل ہی میرے والد کا انتقال ہوگیا تھا۔البتہ رسمیں ساری ہوئی تھیں اور شہر بدر نہیں ہوئی بس ایک علاقے سے دوسرے علاقے میں گئی۔"

"جوائنٹ فیملی میں آئیں؟"

"نہیں، جوائنٹ فیملی نہیں ملی جیسا کہ سسرال ہوتا ہے پراپر...... ہوا یہ کہ خاندانی گھر کا جھگڑا جب عدالت میں تھا تو رخصت ہوکر میں شہزاد کی سب سے بڑی بہن کے گھر آئی تھی اور وہاں ہم تین ماہ رہے...... پھر شہزاد اپنی جاب کے سلسلے میں "عمان" چلے گئے۔ تو میں اپنے گھر آگئی جاتی رہتی تھی...... روایتی سسرال تو ملا ہی نہیں...... سو تجربہ بھی اچھا ہی ہے کہ سب اپنے کام سے کام رکھتے ہیں اور میں بھی...... سچ تو یہ ہے کہ چھوٹے ہونے کی بنا پر سب ہی شفقت سے پیش آتے ہیں۔"

"منہ دکھائی میں کیا ملا تھا؟ ہنی مون کے لیے کہاں گئے تھے اور کیا ہنی مون ضروری ہے؟"

"انہوں نے منہ دکھائی میں سونے کا بریسلٹ دیا تھا اور ہنی مون منانے ہم "کشمیر" گئے تھے...... اور ہنی مون تو اس خوش گوار وقت کا نام ہے جو جوڑے ساتھ گزارتے ہیں۔تو چاہے کہیں بھی چلے جائیں شروع کا وقت میرے خیال سے ساتھ گزار لینا چاہیے خصوصاً اریج میرج والوں کو ...... ورنہ پھر حسرت ہی رہ جاتی ہے...... مصروفیت بڑھ جاتی ہے

اور وقت کہیں کھو جاتا ہے۔"
"شادی کی شاپنگ گھر والوں کے ساتھ کی یا سسرال والوں کے ساتھ؟"
"شادی کی شاپنگ تو امی اور بہنوں کے ساتھ مل کر ہی کی۔ نکاح کا جوڑا شہزاد کی بڑی بہن اور خالہ نے خریدا تھا۔ سرخ و سنہری شرارہ جبکہ رخصتی کا لہنگا مرون پسنری کا میں نے خود بنوایا تھا اور ولیمہ کی ساڑھی تھی جو کہ "جوگیا اور سیاہ رنگ" کی تھی۔ باقی ساری "بری" شہزاد کی مجھلی بہن نے تیار کی تھی۔ جہیز کا کسی بھی قسم کا کوئی مطالبہ نہیں تھا اور نہ ہی لین دین کا کوئی قصہ تھا......"
"آپ کی تحریریں سسرال میں شوق سے پڑھی جاتی تھیں؟" اور ڈرامے کی طرف آنے کا کوئی ارادہ نہیں ہے۔"

"شہزاد کے بڑے بہنوئی شاعر ہیں تو ان کے گھر میں سب کتاب دوست ہیں...... ان کی بیٹی اور نواسیاں شوق سے پڑھتی ہیں میری تحریریں...... میری ایک جیٹھانی صاحبہ ناولوں اور ڈائجسٹوں کی رسیا ہیں وہ بھی بڑے اشتیاق سے پڑھتی ہیں میری کہانیاں چھوٹی نند بھی کبھی کبھار پڑھ لیتی ہیں...... باقی کسی کو قصے کہانیاں پڑھنے کا شوق نہیں ہے اور جہاں تک ڈرامے کی طرف آنے کی بات ہے تو یقیناً ابھی اس کا وقت نہیں آیا۔"
"سسرالی رشتوں کو نبھانا آسان کام ہے یا مشکل...... آپ کو کوئی مشکل پیش آئی؟"

"یہ بات درست ہے کہ مجھے روایتی سسرال نہیں ملا...... مگر پھر بھی میں سمجھتی ہوں کہ سسرالی رشتوں کو نبھانا پل صراط پر چلنے کے مترادف ہے۔ شروع کا وقت سمجھ داری سے گزار لینا چاہیے۔ مشکل کے بعد آسانی ملتی ہے...... لیکن کہیں زمین اگر بنجر ہے تو وہاں پھول کھلنے کا انتظار کرنے کے بجائے اپنا راستہ الگ کر لینا بہتر ہے۔"
"رشتوں میں توڑ پھوڑ کس کی وجہ سے ہوتی ہے۔ مرد، عورت یا کوئی اور......؟"
"قصور وار کوئی بھی ہو سکتا ہے، دونوں صورتوں میں نقصان عورت کا ہی ہوتا ہے۔ اور وجوہات تو بہت سی ہو سکتی ہیں...... دراصل ہر کردار کی کہانی الگ ہوتی ہے تو رشتوں میں خرابی کی وجہ کوئی بھی ہو سکتی ہے۔ کوئی ایک وجہ نہیں ہوتی...... مرد عورت سے زیادہ دانائی کا دعوے دار ہے مگر میرا مشاہدہ ہے کہ اس کی دانائی پر غالب عورت کی حکمت...... معاملہ فہمی...... صبر برداشت اور...... تدبر ہے...... چنانچہ گھر کو بسائے رکھنے کا بار قدرتی طور پر اس کے کندھوں پر زیادہ پڑ جاتا ہے۔"
"کچھ شہزاد صاحب کے مزاج اور کھانے پینے کے معاملے میں بتائیں؟"
"محتاط طبع ہیں...... عام لوگوں کے لیے "دیے

لیے" مزاج کے ہیں...... مگر جس سے دل مل جائے تو پھر اس کے سامنے بذلہ سنج بھی ہیں...... خوش مزاج بھی...... کھانے پینے کے معاملے میں ہم دونوں ایک سے ہیں یعنی شوقین...... گھومنے پھرنے کے بھی بے حد شوقین ہیں۔ آدھی دنیا دیکھ چکے ہیں آدھی دیکھنے کو بے قرار ہیں۔"

"آپ ساتھ جاتی ہیں دنیا گھومنے؟"

"میں نے پاکستان اور گلف دیکھا ہے۔ دراصل شہزاد نے تبلیغ کے حوالے سے سفر کیے ہیں زیادہ تر ممالک کے۔"

"آپ کے بچے کتنے ہیں؟ تربیت میں کس کا حصہ زیادہ ہے اور شہزاد گھر میں کتنا ٹائم دیتے ہیں؟"

"ماشاء اللہ میری دو بیٹیاں ہیں۔ "زینب" اور "زویا" شہزاد کام کے بعد سارا وقت ہمیں ہی دیتے ہیں۔ یا پھر اپنے ایک دو اچھے دوستوں کو...... اور بچوں کی تربیت میں ہم دونوں کا ہی حصہ ہے۔"

"لڑنے اور منانے میں پہل کون کرتا ہے؟"

"لڑنے میں پہل شہزاد ہی کرتے ہیں۔ تو ظاہر ہے کہ منانے میں پہل بھی ان ہی کو کرنی چاہیے۔ سو خود ہی منا لیتے ہیں...... جو بے قصور ہو اس کے طرفدار بن جاتے ہیں اور...... میں ہی ان کو بے قصور دکھائی دیتی ہوں...... جس کی مجھے بہت خوشی ہوتی ہے۔"

"گھر کے کاموں میں آپ کا ہاتھ بٹاتے ہیں؟"

"گھر کے کام اور شہزاد...... توبہ توبہ...... اپنے گھر کے سب سے چھوٹے...... لاڈلے...... اور سب سے زیادہ "کاہل" ...... کبھی گھر کا کوئی کام کیا ہی نہیں کہ ماشاء اللہ سے دیگر لوگ جو موجود تھے...... ہاں...... جب "زینب" کا سلسلہ تھا۔ تب کبھی کبھار برتن دھو دیا کرتے تھے۔ اور ان کا یہ کارنامہ خاندانی تاریخ میں سنہری حروف میں درج ہو چکا ہے۔"

"شادی سے پہلے لڑکیاں خواب دیکھتی ہیں کہ میرا گھر ہوگا اور میرا راج ہوگا...... یہ خواب پورے ہوئے۔"

"میرے یہ راج واج کرنے والے خواب نہیں تھے...... ہاں مگر یہ ضرور تھا کہ سکون سے خود بھی جیو اور دوسروں کو بھی جینے دو...... شکر ہے کہ ماحول تو ایسا ہی ملا۔"

"بچے کی پہلی امید پر آپ کے اور گھر والوں کے کیا تاثرات تھے زیادہ خوشی کسے ہوئی تھی؟"

"میری نگاہ میں دنیا کا مشکل ترین اور حساس کام بچوں کی پرورش ہے۔ سولاشعوری طور پر اس سے فرار اختیار کیے ہوئے تھی...... جب سات سال بعد پہلی بار ایسا سلسلہ بنا تو میں بہت پریشان ہو گئی تھی۔ پھر وہ خوشی ساتویں ماہ اللہ کے پاس لوٹ گئی...... بڑا ہی مشکل وقت تھا وہ ہر لحاظ سے...... مگر پھر جلد ہی اللہ نے زینب دے دی...... مجھ سے زیادہ شہزاد خوش تھے بلکہ سب ہی خوش تھے۔ اتنے کہ مجھے حیرانی تھی۔ وہ تو بعد میں علم ہوا کہ کچھ لوگوں کو یقین تھا کہ مجھ میں کوئی گڑبڑ ہے۔"

"شہزاد صاحب کو آپ کس روپ میں زیادہ اچھی لگتی ہیں۔ سجی بنی یا سادگی میں؟"

"بہت زیادہ نہ سجی بنی اور نہ ہی بہت سادہ بس نارمل بین بین۔"

"اور جناب دلہن کا گھونگھٹ تو نہیں ہوتا مگر پھر بھی کمرے میں آکر پہلا جملہ کیا بولا۔"

"آتے ہی سلام کیا اور جلدی سے بولے کہ بڑی ہی واہیات نظم ہے۔ "کنگن" مجھے یاد ہی نہیں ہوئی تم...... کہو تو کوئی شعر سنا دوں...... اور چونکہ اشعار سننے کا میرا کوئی موڈ نہیں تھا تو میں نے ہاتھ جوڑ دیے ان کے سامنے۔"

"اور اس کے ساتھ ہی ہم نے امثل عزیز صاحبہ سے اجازت چاہی۔

خواتین اور دوشیزاؤں کیلئے اپنی طرز کا پہلا ماہنامہ

خواتین ڈائجسٹ

جنوری 2021
کے شمارے کی ایک جھلک

- ''میں تم سے نہ پوچھوں'' نعیمہ ناز کا مکمل ناول،
- ''ایک خواب تھا کوئی'' نازیہ رزاق کا مکمل ناول،
- ''رقص شرر'' فوزیہ ثمرین کا مکمل ناول،
- ''رومیو جیولیٹ'' میمونہ صدف کا ناولٹ،
- نصرت یوسف، حمیرا شفیع، عمارہ جہان، ریحانہ چودھری، شازیہ الطاف ہاشمی اور عنبرین ابدال کے افسانے،
- نمرہ احمد، عفت سحر طاہر اور راحت جبیں کے ناول،
- سال نو کے حوالے سے قارئین سے سروے،
- ''روئید عالم'' سے باتیں،
- خاتون اینکر ''آصفہ زہرا'' سے ملاقات،
- ''کرن کرن روشنی'' احادیث نبوی ﷺ کا سلسلہ،
- ہمارے نام، نفسیاتی ازدواجی الجھنیں، خبریں وبریں اور دیگر مستقل سلسلے شامل ہیں،

خواتین ڈائجسٹ کا جنوری 2021 کا شمارہ آج ہی خرید لیں

دستک دستک دستک

شاہین رشید

لیلیٰ زبیری

"کیسے مزاج ہیں؟"
"اللہ کا شکر ہے۔"
"آج آپ سے بہت ہی عرصے کے بعد بات ہو رہی ہے۔ آپ آج بھی اسی طرح حسین ہیں جس طرح جوانی میں تھیں۔"
"بہت شکریہ تعریف کا۔"
"اور سنائیں، گھر میں سب خیریت ہے، کیا مصروفیات ہیں؟"
"جی...... جی الحمد للہ...... سب خیریت ہے، بچے، میاں صاحب، سب ٹھیک ٹھاک ہیں...... اور کورونا کی وجہ سے کوئی اور ایکٹیوٹی تو ہے نہیں...... بس شوبز ایکٹیوٹیز ہی ہیں...... اس لیے کہ ریکارڈنگز تو ضروری ہوتی ہیں...... باقی ٹائم گھر پر ہی گزرتا ہے اور گھر میں رہ کر نئی نئی چیزیں کوکنگ کے لیے ٹرائی کرتی رہتی ہوں۔ یا پھر ٹی وی کے پروگرامز دیکھ لیتی ہوں...... ویسے تو خیر فرصت ذرا کم ہی ملتی ہے...... اس لیے کہ ابھی بھی دو ڈراموں کی ریکارڈنگز چل رہی ہیں۔ تو اسی میں کافی مصروف ہوں۔"
"آپ کی ماشاء اللہ دو بیٹیاں ہیں، ان کے بارے میں بتایئے؟"
"جی میری دو بیٹیاں ہیں بڑی کا نام "کرن" ہے اور چھوٹی کا نام "تانیہ" ہے...... الحمد للہ دونوں شادی شدہ ہیں۔ کرن کے دو اور تانیہ کے تین بچے ہیں...... کرن دبئی میں رہتی ہے اور تانیہ اسلام آباد میں...... دونوں کام بھی کرتی ہیں...... تانیہ ایک اسکول سسٹم کے ساتھ ایچ آر آفس میں ہے......اور ساتھ ساتھ اپنے شوہر کے ساتھ ان کے بزنس میں بھی ہاتھ بٹاتی ہے......
اور کرن دبئی میں ہے لیکن چونکہ ان کا آفس دبئی میں نہیں ہے تو وہ آن لائن کام کرتی ہے ایک سیلیولر کمپنی جس کا ہیڈ آفس امریکا میں ہے اس کے لیے کام کرتی ہے گھر بیٹھ کر۔
"کرن اور تانیہ شوبز میں نہیں...... وجہ؟ عموماً تو نسل در نسل سلسلہ چلتا ہے؟"
"میں نے کبھی انہیں روکا نہیں۔ منع نہیں کیا...... یہ ان کی اپنی چوائس ہے...... بچپن میں انہوں نے کام کیا تھا...... مگر بڑے ہونے کے بعد وہ اس

فیلڈ میں نہیں آئیں۔ شاید انہیں لگتا ہے کہ اس فیلڈ میں بہت زیادہ ٹائم دینا پڑتا ہے۔ تو بس اس لیے وہ اپنی تعلیم میں مگن رہیں پھر جابز میں۔ پھر شادی ہوگئی تو بچے۔ گھر داری اور میاں کے ساتھ بزنس اور جابز میں مصروف ہوگئیں۔ اسی لیے اس جانب توجہ نہیں دے سکیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ انہیں کچھ زیادہ دلچسپی بھی نہیں تھی اس فیلڈ سے۔''

''آپ کا پہلا سیریل ''چھاؤں'' تھا...... اس کے بعد آپ نے چند ڈرامے کیے اور پھر میرے خیال میں کچھ گیپ بھی دیا...... ایسا ہی ہے نا؟''

''جی ...... بالکل! پہلا سیریل چھاؤں ہی تھا...... اور ایسا کوئی بہت لمبا گیپ میں نے دیا نہیں...... چونکہ شوہر آرمی میں تھے اور پوسٹنگ ہوتی رہتی تھیں تو ادھر ادھر جانے کا سلسلہ بنا رہتا تھا اور جہاں پر پی ٹی وی اسٹیشن نہیں ہوتے تھے وہاں کام نہیں کرپائی۔ تو اس وجہ سے گیپ آجاتا تھا...... ورنہ تو میں کام کررہی تھی...... 1985 میں اس فیلڈ میں آئی تھی اور شوہر کی ٹرانسفر کی وجہ سے گیپ آیا...... اور اب تو میں مسلسل کام کررہی ہوں۔''

''آپ نے اپنی فنی زندگی کا آغاز بہ حیثیت ہیروئن کے کیا...... اور ...... اب ماں کے رول کرتی ہیں...... تو کیسا لگتا ہے؟''

''آپ بالکل صحیح کہہ رہی ہیں کہ میں نے بہ حیثیت ہیروئن کے اپنی فنی زندگی کا آغاز کیا تھا...... اور اب میں سپورٹنگ کردار کرتی ہوں...... اور اللہ کا شکر ہے کہ مجھے کوئی مسئلہ نہیں ہوا...... میں سمجھتی ہوں کہ اگر گریس فل طریقے سے اپنی عمر کو قبول کرلیں تو بہت سارے نفسیاتی مسائل سے بچ سکتے ہیں اور پھر میں اصل میں بھی تو ماں ہوں...... میری جوان بیٹیاں ہیں۔ میرے داماد ہیں...... تو اس لیے مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوتا...... اور پھر ہمیں تو اپنی پرفارمنس دکھانی ہے...... اور لوگ ہمیں اس روپ میں بھی پسند کررہے ہیں اور جب تک پسند کرتے رہیں گے...... ہم کام کرتے رہیں گے...... اور مجھے خوشی ہے کہ لوگ مجھے پسند کرتے ہیں۔ میری پرفارمنس کی تعریف کرتے ہیں...... اور مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ میں بڑے لڑکوں کی ماں بن جاؤں...... یا یہ کہ جن کے ساتھ میں نے بیوی کا کردار کیا ہے اور اب میں ان کی ماں کا رول کررہی ہوں۔ تو مجھے کوئی ایشو نہیں ہے بس میرا ایمان ہے کہ انسان جو بھی کام کرے اپنی پوری توجہ اور اپنا سو فیصد دے کر کرے۔ اور وہ میں کرتی ہوں۔''

''آپ نے بتایا کہ 1985 سے آپ نے فنی زندگی کا آغاز کیا...... تو اب بتائیں کہ ''تب میں اور اب'' میں کیا فرق ہے؟''

''بہت فرق ہے...... پہلے پروفیشنلزم بہت زیادہ تھا جس کی اب مجھے کمی نظر آتی ہے...... اب کمرشلزم زیادہ ہوگیا ہے...... ہماری کہانیاں بھی پہلے جیسی اسٹرانگ نہیں رہیں...... البتہ ٹیکنیکلی اب ہم بہت ایڈوانس ہوگئے ہیں۔ جبکہ کانٹینٹ ہمارا کمزور ہوگیا ہے...... کاش کانٹینٹ پہلے جیسا ہوتا اور

ٹیکنالوجی، آج کی ہوتی تو پتا نہیں ہم کہاں سے کہاں پہنچ جاتے...... ایسا نہیں ہے کہ کام اچھا نہیں ہو رہا۔ کام اچھا بھی ہو رہا ہے۔ اور بہت زیادہ ڈرامے بن رہے ہیں تو اتنی تعداد میں جب ڈرامے بنیں گے تو اچھے اور برے دونوں ہی بنیں گے۔ اور بروں کے ساتھ اچھے بھی نکل جاتے ہیں اور پتا بھی نہیں چلتا...... تھوڑا سا کانٹینٹ اچھا ہو جائے تو کام اور بھی اچھا ہو جائے گا۔"

"آپ نے خود بھی محسوس کیا ہوگا کہ ڈراموں کی دنیا میں خواتین رائٹرز زیادہ آگئی ہیں...... مرد حضرات کی تعداد بہت کم ہے...... یہ ایک اچھا چینج ہے یا آپ کے خیال میں مرد حضرات زیادہ اچھا لکھتے ہیں؟"

"میرے خیال سے ہم پرفیکٹ تجزیہ نہیں کر سکتے کہ خواتین اچھی رائٹرز ہوتی ہیں یا مرد...... دونوں میں اچھے برے رائٹرز ہوتے ہیں...... بہت سی خواتین بہت اچھا بھی لکھتی ہیں...... بہت سے مرد برا بھی لکھتے ہیں...... اس لیے تجزیہ مشکل ہے...... ہاں مگر اس بات میں کوئی شک نہیں کہ خواتین رائٹرز معاشرتی پہلوؤں اور مسائل کو لے کر چلتی ہیں...... اور ویسے بھی ڈرامے کو زیادہ تر خواتین ہی دیکھتی ہیں...... اس لیے خواتین ہی خواتین کی نفسیات کو سمجھتی ہیں اور انہیں وہی چیزیں دکھانا چاہتی ہیں...... اور میں یہ سمجھتی ہوں کہ اچھا رائٹر وہی ہوتا ہے جس کی وسیع سوچ ہوتی ہے...... جو گھریلو ماحول اور مسائل کو بھی سمجھتا ہے اور باہر کے ماحول اور مسائل کو بھی اور میرا خیال ہے کہ وہ ہی زیادہ کامیاب بھی ہوتا ہے...... جس کی نظریں ہر چیز پر ہوتی ہیں۔"

"لیلیٰ صاحبہ! یہ بتائیں کہ ہمارے ڈرامے معاشرے کی اصلاح کر رہے ہیں یا ان کا غلط اور نگیٹو امپیکٹ پڑ رہا ہے؟"

"بالکل ایسا ہی ہے کہ جو ڈرامے بن رہے ہیں ان کا غلط امپیکٹ پڑ رہا ہے۔ ہم بہت غلط چیزیں دکھا رہے ہیں اپنے ڈراموں میں...... اور میں اس کے بہت خلاف ہوں اور اس کے لیے کئی بار آواز بھی اٹھا چکی ہوں...... اب تقریباً ہر ڈرامے میں دکھایا جاتا ہے کہ ایک لڑکا ہے جس کے پیچھے دو لڑکیاں لگی ہوئی ہیں...... یا یہ کہ دو بہنیں ہیں اور وہ ایک ہی بندے کو پسند کرتی ہیں...... یا یہ کہ کسی کی شادی ہوتی ہے تو اس کی دوست اس کے میاں کو اپنے جال میں پھنسا لیتی ہے......

عورتوں کے ساتھ زیادتی...... ان کو گھر سے نکالنا...... تھپڑ مارنا...... یہ چیزیں بہت غلط ہیں اور اس کے غلط اثرات پڑ رہے ہیں معاشرے پر۔ اگر فرض کریں کہ ایسا ہمارے معاشرے میں ہو بھی رہا ہے تو بہت کم ہو رہا ہوتا ہے...... اتنا کھلے عام نہیں ہو رہا ہوتا...... اس لیے میرا یہ خیال ہے کہ اتنی نگیٹو چیزوں کو نہیں دکھانا چاہیے...... مگر کیا کریں کہ کچھ ایسا ٹرینڈ بن گیا ہے کہ اگر ایک موضوع پر ڈرامہ مقبول ہو جائے تو اسی موضوع پر ڈھیروں ڈرامے بننا شروع ہو جاتے ہیں......

میں جب کہتی ہوں کہ آپ مت ایسے ڈرامہ بنایا کریں تو جواب آتا ہے کہ اسی پر تو ہمارا "ٹی آر پی" بڑھتا ہے۔ تو اب تو "ٹی آر پی" ہی سب کچھ ہو گیا ہے...... مگر مجھے افسوس ہوتا ہے کہ ہمارا کانٹینٹ کہیں کھو گیا ہے...... ہم جو بھی سوشل ایشوز وغیرہ دکھاتے تھے...... ہماری سوسائٹی کے جو مسائل تھے انہیں دکھاتے تھے۔ مگر اب لگتا ہے کہ زندگی کا ایک ہی مقصد رہ گیا ہے کہ آپ کسی سے افیئر چلائیں اور شادی کر لیں...... اور سازشیں کریں...... بس لگتا ہے کہ یہی زندگی کا مقصد رہ گیا ہے۔"

"آپ نے اپنے آپ کو صرف ڈراموں تک کیوں محدود رکھا ہوا ہے...... پروڈکشن یا ڈائریکشن کی طرف رجحان نہیں ہے کیا؟"

"نہیں ایسا نہیں ہے کہ میں نے اپنے آپ کو محدود رکھا ہوا ہے میں نے فلمیں بھی کی ہیں۔ اور ان میں "شیر دل" پرواز ہے جنون میں بھی کیا تھا...... اس کے علاوہ دو فلمیں اور بھی کی ہیں...... جن میں ایک تو

مکمل ہوگئی ہے مگر ابھی ریلیز نہیں ہوئی جبکہ دوسری زیر تکمیل ہے...... سب سے پہلے "تیری میری لو اسٹوری" کی تھی...... تو ڈراموں کے ساتھ ساتھ فلمیں بھی کیں...... اور میں نے پروڈکشنز بھی بہت کی ہیں...... لیکن اب آج کل نہیں کررہی کہ ٹائم ہی نہیں ملتا...... ماشاء اللہ کام اتنا زیادہ ہوگیا ہے کہ دیگر چیزوں کو ٹائم نہیں دے پاتی...... اور ویسے بھی چھوٹے پروڈیوسر کے لیے ڈرامے بنانا مشکل بھی ہوگیا ہے اور بیچنا بھی مشکل ہوگیا ہے...... اس وجہ سے پروڈکشن سے تو فی الحال ہاتھ اٹھالیا ہے۔"

"چلیں جی چلتے چلتے اب یہ بھی بتادیں کہ کوکنگ کے علاوہ گھر میں آپ کی کیا مصروفیات ہوتی ہیں؟"

"گھر میں رہنے کا وقت تو ذرا کم ہی ملتا ہے۔ مگر کوشش کرتی ہوں کہ گھر کے لیے ٹائم ضرور نکالوں...... مجھے اپنے گھر کو سجانا بہت اچھا لگتا ہے...... میں نے کوکنگ کلاسز بھی جوائن کی ہوئی ہیں اور جب ٹائم ملتا ہے ایک کلاس اٹینڈ کرلیتی ہوں...... اور نئی نئی چیزوں کو ٹرائی کرنا مجھے اچھا لگتا ہے...... ٹریولنگ کا بہت شوق ہے اور ٹریولنگ کرتی بھی ہوں...... آج کل کورونا کی وجہ سے نہیں کرپارہی۔ اور اس کو بہت زیادہ مس کررہی ہوں...... گھومنا پھرنا اور شاپنگ کرنا بہت پسند ہے...... سوشلائز کرنا پسند ہے اپنی دوستوں کے ساتھ...... گھر میں فیملی کے ساتھ ٹائم گزارنا بہت اچھا لگتا ہے۔ اور اکثر بے بی سٹنگ کرتی ہوں اپنے گرینڈ چلڈرن کی...... میں ایک عام انسان ہوں اور میری مصروفیات بھی عام انسانوں جیسی ہوں۔ بس شوبز کی وجہ سے تھوڑی خاص ہوگئی ہیں۔"

ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں ہمیشہ خوش رکھے۔

سرما کی گہری خاموشی میں ڈوبی طویل راتیں بہت سی یادوں کے دروا کر دیتی ہیں۔ کچھ خوش کن یادیں اور کچھ دل میں درد جگاتی۔ اداس کرتی یادیں...... بہت کچھ یاد آتا ہے۔ کچھ اپنی کوتاہیاں کچھ دوسروں کی کج ادائیاں...... وہ دیرینہ رفاقتیں جو جدائیوں میں بدل گئیں۔ وہ فرصتیں جواب خواب ہو گئیں۔ غم دوراں سے آزاد، بے فکری کے زمانے جواب کبھی لوٹ کر نہ آئیں گے۔

اس بار نئے سال کے موقع پر دونوں سوال اسی حوالے سے ہیں۔ آیئے دیکھتے ہیں ہماری قارئین نے کیا جواب دیے ہیں۔ سوالات یہ ہیں۔

1۔ دسمبر اداسی اور جدائی کا استعادہ ہے۔ اس کی خاموش طویل راتوں میں بہت سی یادیں دل پر دستک دیتی ہیں۔ بہت سے بچھڑے دوست اور ان کے ساتھ بزم آرائیاں یاد آجاتی ہیں۔ کچھ خوش گوار یادیں۔ جو ماضی میں لے جاتی ہیں۔ آپ کو کیا کیا یاد آتا ہے۔ تفصیل سے لکھیے۔

2۔ دوستوں عزیز و اقارب یا میاں صاحب کی طرف سے ملنے والا خوب صورت پیغام جو سال نو کے موقع پر آپ کو ملا ہو؟

کچھ اشعار یا کسی کہانی کا اقتباس لکھیں جو آپ کو بہت اچھا لگا ہو۔

گزشتہ موسم اور نیا سورج

ادارہ

فرخندہ خالد...... اٹک

(1) دسمبر جب بھی آتا ہے، جدائی ساتھ لاتا ہے۔ صاحب ذوق جمال لوگوں کی اکثریت کو دسمبر کی آمد اداسی کی چادر اوڑھا دیتی ہے۔ لیکن میری نظر میں دسمبر جہاں حال سے بچھڑنے کی خبر دیتا ہے، وہیں آنے والے نئے سال کی نوید بھی ساتھ لاتا ہے۔

دسمبر کی اداس خاموشیاں اپنے اندر بہت سی بامعنی فرصت بھی سمیٹے ہوتی ہیں۔ جہاں سرمئی شامیں دل کو بے نام و بے وجہ اداسی میں جکڑتی ہیں، وہیں گلابی دوپہروں میں آنگن میں بکھری دھوپ کو ساتھی بنائے مالٹوں اور مسالے دار مولیوں سے انصاف بھی کیا جاتا ہے۔

میری ہمیشہ سے عادت رہی ہے کہ عشاء کی نماز کے بعد جلد ہی سو جاتی ہوں۔ لہٰذا دسمبر کی طویل راتیں ہمارے ہاں اضافی طوالت لیے ہوتی ہیں۔

یوں تو بیتے سالوں کی بہت سی یادیں ہیں لیکن نانی اماں کے گھر گزاری گئی گرمیاں، سردیاں کبھی نہ بھولیں گی۔ جاڑوں میں سرشام مٹی کی انگیٹھی میں کوئلے دہکا کر نانی اماں والے کمرے میں رکھ دیے جاتے۔ اسی کمرے میں مونگ پھلیاں اور ابلے ہوئے دیسی انڈے کھائے جاتے اور ساتھ نانا ابا کے ساتھ بیت بازی کی محفل بھی جمتی۔ چھوٹے بچوں سے پہاڑوں کا امتحان لیا جاتا اور فارسی کے مشکل الفاظ کی املا کا امتحان ہوتا۔ بڑے بہن بھائیوں سے شعر کا دوسرا مصرعہ سنا جاتا۔ رات گئے محفل کے اختتام پر خالہ نارنجی رنگ کی ویزلین۔ سے اپنے اور ہمارے گال چپڑ کر بھاری بھرکم روئی کے لحاف اوڑھا دیتیں۔ باتھ روم رہائشی کمروں سے ہٹ کر بنا ہوتا تھا لہٰذا رات کے وقت اگر باتھ روم جانے کی ضرورت پیش آجاتی تو خالہ کو بھی ساتھ لے کر جاتے۔

صبح ناشتے کے بعد اس وقت تک بستر میں دبکے رہتے جب تک صحن میں دھوپ نہ اترتی۔ بکری کے میمنے،

گائے کے بچھڑے گلیوں میں پھرتے۔ کتے اور بلی کے بچے، نانا ابا کا ریڈیو، غرض کوئی چیز ہماری تخریب کاریوں سے بچی نہ رہتی۔

دوپہر کے کھانے میں براؤن شوگر والی چوری، مکئی کی روٹی، دیسی گھی، تازہ مکھن اور لسی۔ سرسوں، تارامیرا اور چھولے کے ساگ جیسے ذائقے بھلائے نہیں بھولتے۔ نانی اماں اور چھوٹی خالہ کے ہاتھ کے بنے گندم، باجرے اور تیل کے مرونڈے۔ باجرے کے آٹے کی میٹھی روٹیاں، گھر کی بٹی ہوئی سویاں جن پر گرم گرم دیسی گھی اور شکر ڈال کر کھایا جاتا۔ سب گزرے دور کی سوغاتیں ہیں۔ درحقیقت ان ساری اشیا کے لوازمات تو آج بھی بازار میں بآسانی دستیاب ہیں لیکن بنانے والے ہاتھ، وہ شفیق ہستیاں آج تہہ خاک ہیں۔ بس یادیں ہیں، جو باقی رہ جاتی ہے۔

(2) دوستیاں گانٹھنے کے معاملے میں، ہم سب بہن بھائی کافی سے زیادہ نالائق ہیں اور جو گنے چنے دوست اور کولیگ وغیرہ ہیں، وہ بھی بس سادہ سا ہیپی نیو ایر بھیج دیتے۔ میاں صاحب کی تو خیر بات ہی نہ کریں۔ سو اس سوال کا جواب میرے پاس نہیں ہے، معذرت۔

(3) پسندیدہ اشعار تو بہت سے ہیں۔ اقتباس خصوصی طور پر کبھی نوٹ نہیں کیے۔ چند اشعار پیش خدمت ہیں۔

اک تم کہ تمہارے لیے میں بھی، میری جاں بھی
اک میں کہ مجھے تم بھی میسر نہیں آتے

جس شان سے لوٹے ہیں گنوا کے دل وجاں ہم
اس طور سے تو ہارے ہوئے لشکر نہیں آتے

☆☆☆

دل بھی کوئی آسیب کی نگری ہے کہ محسن
جو اس سے نکل جاتے ہیں، مڑ کر نہیں آتے

مریم انصاری...... بہاول پور

(1) وقت کے بہتے دھارے میں انسان کی حیثیت تنکے کی سی ہے۔ اس سیارے کی واحد مخلوق جو پل پل مختلف کیفیتوں کا شکار ہو سکتی ہے۔ محفل میں ہوتے ہوئے بھی بعض اوقات انسان تنہا ہوتا ہے۔ کبھی شکست خوردہ، کبھی بشاش، کبھی پرامید اور کبھی رنجیدہ۔ ہر بندہ اپنی زندگی کا بوجھ اٹھائے ننگے پاؤں رواں دواں ہے۔ وقت کی شعبدہ بازیاں بھی جاری وساری ہیں۔

دل کی دنیا عجیب ہے، تغیر کو ثبات ہے اس حقیقت کو ماننے اور جاننے کے باوجود دل ڈوبتا، ابھرتا رہتا ہے۔

رفاقتیں دم توڑ دیں تو روشنیاں بھی غمگین لگتی ہیں۔ موٹروں اور بسوں کے چلنے کی آواز میں اداسی گھل جاتی ہے۔ وقت گھٹتا محسوس ہوتا ہے اور محبت کرنے والوں کا ساتھ نصیب ہو تو لمحے تیزی سے ہاتھ سے پھسلتے چلے جاتے ہیں۔ وقت کبھی کسی کا دوست نہیں رہا۔ ہر گزرتا پل زندگی کی تجوری خالی کرنے پر تلا ہوا ہے۔

ملکہ کوہسار کی آغوش میں گزارے دسمبر کے دن۔

مال روڈ، برف، کافی، سوپ ان سب چیزوں کو تو دوام ہے مگر وہ نرم گرم محبتیں، چاہتیں......

(2) ایک دور تھا ہم سب دوست "ہیپی نیو ایر کارڈز" ایک دوسرے کو بھیجتے تھے۔ اب وہ زمانے ہوا ہو گئے۔ کارڈز کا خمار پورا سال مدہوش کیے رکھتا تھا۔ خط اور کارڈز ہمارا قیمتی اثاثہ ہوتے تھے۔ نئی ٹیکنالوجی دلوں پر وہ تاثر چھوڑنے میں ناکام ہے یا ہمارے دل اس کو فی الحال قبول نہیں کر پا رہے۔

(3) "جن سے متعلق ہم یہ گمان کر لیتے ہیں کہ ہم ان کے بغیر نہیں رہ پائیں گے، تو وقت اپنے طور پر ثابت کر دیتا ہے کہ ان کے بغیر بھی رہا جا سکتا ہے۔ وقت بہترین استاد ہے۔ محرومیوں کے ساتھ جینا سکھا دیتا ہے۔" (عسریسرا......حسنہ حسین)

سلمٰی مسرت......راولپنڈی

(1) یہ بات بالکل درست ہے کہ دسمبر کی شامیں، راتیں بہت اداس ہوتی ہیں۔ ان طویل راتوں میں بہت کچھ یاد آتا ہے۔

خوش گوار یادوں کی شرط ہے، سب سے پہلے ان کا ذکر ہو جائے میں فوراً کراچی کے واحد جزیرے منوڑہ جانا پسند کروں گی جہاں اسکول کے آخری دو سال اور کالج کے چار سال گزارے۔ ساحل سمندر کے کنارے وہ سرخ اینٹوں والا گھر۔ بارہ سال کا عرصہ زندگی کا، نوجوانی کا گولڈن دور جس کی کیاریوں میں امی جان نے سرخ اور پنک گلاب موتیے اور سورج مکھی کے ڈھیروں پودے اگائے ہوئے تھے۔ وہ میری چار دوستوں کا گروپ، اس لان میں ہم بڑی خوب صورت پارٹیاں کرتے تھے۔

نیلے سمندر میں دسمبر کی شام میں امی کے ساتھ اکثر ساحل پر جاتی تھی کیونکہ ان دنوں میں سمندر کی لہریں بہت پیچھے اور سکون سے سفر کرتی ہیں۔ ساحل پر سیپیاں چننا سورج کو غروب ہوتے دیکھنا، اس وقت میں نے اپنے رب سے دوستی کر لی تھی۔ وہ رب کی عظمت، وہ عبرت کی نظر، وہ آخرت پر یقین یہ سب کچھ وہیں سے ملا۔ مطالعہ کا شوق یہ اپنے رسالوں سے دوستی اور قرآن کی تفسیر سیکھنے اور پڑھانے کا موقع ملا۔ بس پھر اللہ کی ہر بنائی ہوئی چیز سے اور اس کی مخلوق سے پیار ہوا۔ فرائض یاد رہے، حقوق بھلا دیے، یہ یادیں سرمایہ ہیں۔

(2) میں ہر سال کا چاہے وہ اسلامی ہو، چاہے عیسوی۔ ہمیشہ دعاؤں سے استقبال کرتی ہوں۔ مجھے بھی کسی نے وش نہیں کیا البتہ میرے والد ہر اچھے موقع پر چاہے وہ نیا سال ہو، میری سالگرہ ہو، ہمیں گفٹ بھی دیتے تھے اور چائے پر بھی بلاتے تھے۔ ہر سال کی خوب صورت ڈائری ابو مجھے دیتے تھے۔ ایک بے حد خوب صورت ڈائری میرے بہنوئی نے مجھے دی تھی جو میں نے بے حد قیمتی الفاظ سے مکمل کی ہے، یہ بھی میرا سرمایہ ہے۔

(3) آپ کے صفحات محدود ہیں، زیادہ تفصیل سے نہیں لکھتی۔ بہر حال مجھے ہر موقع پر ان الفاظ نے بہت سہارا دیا ہے، میں ان کو صرف پڑھتی نہیں ہوں، اپنے عمل مین لاتی ہوں۔

☆ موازنہ، مقابلہ انسان سے اس کا سکون چھین لیتا ہے، بے نیازی اور عاجزی پر سکون رکھتی ہے

☆ زندگی کی خوب صورتی رشتوں سے ہے اور رشتے تب ہی قائم رہتے ہیں جب ہم ایک ہلکی مسکراہٹ اور ہلکی سی معذرت کے ساتھ سب کچھ نظر انداز کرتے رہتے ہیں۔

عندلیب زہرا......

شعاع اور خواتین ڈائجسٹ کا تعلق مجھ سے لکھاری سے زیادہ قاری کا ہے۔ بلکہ دوست کہنا مناسب ہوگا۔ یہ رسالے اپنی اشاعت کے شروع دن سے میری فیملی کا حصہ ہیں، اس لیے آپ اسے شناسا، ہم دم کہہ سکتے ہیں۔ مجھے شعاع کے سروے میں حصہ لینا بہت پسند ہے۔ جیسے کوئی مہربان ہم سے دل کی بات پوچھنا چاہتا ہو۔ اپنی سنا کر ہماری سننا چاہتا ہو۔

(1) معلوم نہیں کیوں...... مجھے دسمبر اداسی اور تنہائی کا استعارہ لگتا ہے۔ شاید یہ ان فیری ٹیلز کا اثر ہے

جن میں بوڑھا دسمبر پورے ماہ وسال کا گوشوارہ طلب کرتا تھا۔ میں اس مہینے کو یادوں سے منسوب کرتی ہوں۔

خشک پتے...... ٹنڈ منڈ درخت...... جلتی بجھتی لکڑیاں...... کہر اور دھند مجھے نوسٹیلجیا میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ بہت کچھ یاد آتا ہے۔ گزرے دن...... پیارے رشتے، گھر، لمحے سب کچھ...... مجھے سردیوں کی چھٹیاں پسند تھیں۔ ہیٹر کے پاس بیٹھ کر مونگ پھلیاں اور چلغوزے کھانا (اب تو چلغوزے عنقا ہو گئے)۔ میٹھے مالٹے، این ٹی ایم آخری ہفتے میں زبردست موویز کا اہتمام کرتا۔ پرابلم چائلڈ۔ ہوم الون ان ہی دنوں کی یادگار ہیں۔

سب کزنز ہمارے گھر چھٹیاں گزارنے آتے۔ نہ رزق میں کمی ہوتی نہ محبتوں میں۔ نئے سال کے کارڈز کا اہتمام کرنا۔ میری بہن کی سالگرہ یکم جنوری کو آتی ہے، سو سب کو یاد ہوتی اور سب آتے۔ اگر وقت پیچھے جائے تو میں اس دور میں واپس چلی جاؤں گی جہاں پیارے رشتے اور مہربان وقت تھا۔ اب تو بہت کچھ بدل گیا ہے، کچھ رشتے راہ عدم سدھار گئے اور کچھ کو خود غرضی نے نگل لیا۔

(2) اپنی فیملی میں مجھے ہی سب کو وش کرنے اور کارڈز دینے کا شوق ہے۔ جب میرے ابو حیات تھے تو میں ان کے ساتھ مل کر سب کے لیے گفٹس کا اہتمام کرتی اور اب امی دعائیں دیتی ہیں۔ نیک نصیب کی، عافیت کی۔ ہم سب کو۔

(3) مجھے تو بہت سے اشعار پسند ہیں۔ بہت سے اقتباس لکھنے کا دل ہے۔ آپ نے ایک کی شرط لگا دی۔ خیر میری پسند دیکھیے۔

☆ خوش مزاجی بھی مشہور تھی، اب سادگی بھی کمال ہے
ہم شریر بھی انتہا کے تھے، اب سنجیدگی بھی کمال ہے

زینب نور...... جہانیاں

(1) پہلا سوال پڑھا اور پڑھ کے ماضی کی کتاب کے اوراق خود بخود پلٹنے لگے۔ یوں تو ماضی کا ہر پل قیمتی، ہر لمحہ رنگ حیات......

ذہن کے آنگن پر یادیں ساون کی بارش کی طرح چھم چھم برس رہی ہیں۔ نجانے دسمبر میں قدرت نے ایسی کیا تاثیر رکھی ہے کہ اچھے بھلے (میرے جیسے) بندوں کو بھی اداس کر جاتا ہے۔

یوں تو قریبی گاؤں کے گورنمنٹ مڈل اسکول (چھٹی سے آٹھویں تک) اور اسی گاؤں کی اکیڈمی (نویں سے دسویں تک) کا ہر دن سنہرا اور سہانا گزرا ہے۔ کئی واقعات ذہن میں آ رہے ہیں۔ کچھ وہ دور ایسا تھا کہ ذرا ذرا سی بات پر منہ سے "ہاہا ہی ہی ہوہوہو" چھوٹ چھوٹ جاتی۔ جب دوستیں اپنی اصلیت پر اتر آتیں تو لایعنی اور بے تکی باتوں پر بلند و بانگ قہقہے ابل پڑتے اور نہیں تو کسی

کی شکل دیکھ کے ہی ہنسی آجاتی۔ خیر...... ذہن کی وادی سے قطار در قطار گزرتے ان میٹھے، پیارے اور بے تکے سے واقعات میں سے ایک کا ہاتھ پکڑ ہی لیا۔ اب ورق کی زینت بنانے کا ارادہ ہے۔

یہ 2016ء کی بات ہے۔ ہم قریبی گاؤں کی اکیڈمی میں دسویں کلاس میں تھے اور اب ہماری پرانی سیٹ سنبھالنے نئی نویں کلاس داخل ہو رہی تھی۔ ہماری اکیڈمی کا گرلز پورشن صرف ایک کمرے پر مشتمل تھا۔ نویں جماعت (تقریباً سات لڑکیاں) دسویں جماعت (تقریباً نو لڑکیاں) اور گیارہویں بارہویں کی پانچ چھ آپیاں...... سب ایک ہی جگہ ہوتی تھیں اور بڑے سلوک سے۔ ہوا کچھ یوں کہ ہم سب ٹیسٹ کر رہے تھے کہ اچانک کمرے کی بالکل خاموش فضا میں (یہ فضا ہمارے ہوتے ہوئے کم ہی خاموش ہونے کا فخر حاصل کرتی تھی)۔ نئی جماعت کی ایک گوری چٹی لمبی تڑنگی لڑکی کی چیخیں بلند ہو گئیں۔ ہم سب ہی اپنی اپنی جگہ اچھل کر رہ گئے۔ لڑکی تھی کہ چلائے جا رہی تھی۔

"اب ہوا کیا ہے؟"

"باجی...... میرے پونچے (پائنچے) چے چھپکلی وڑ گئی۔" اتنا سننا تھا کہ سب لڑکیاں خود بھی چلاتی ہوئی ڈیسکوں پر چڑھ کے کھڑی ہو گئیں۔

ایک باجی نے ہمت دکھا کے اٹھانا چاہا (لڑکی کو) تو وہ اور بھی چیخنے لگی۔

"باجی...... پنجے چبھ رہے ہیں۔" وہ آنسوؤں سے تر چہرے کے ساتھ بولی۔

سر بھی بوائز پورشن سے بھاگے آئے اور ہمارے کمرے کا دروازہ کھولتے ہی ٹھٹک گئے۔ منظر کچھ یوں تھا کہ سب لڑکیاں ہوائیاں اڑے چہروں کے ساتھ ڈیسکوں پر چڑھی کھڑی تھیں۔ چھپکلی والی لڑکی گھٹنے سے ذرا اوپر مضبوطی سے ہاتھ جمائے، ساکت بیٹھی چلانے میں مشغول تھی۔

"کیا ہوا بچے؟" سر سراپا سوال تھے۔ مگر ہم بتاتے کیا؟

سر کے دوبار پوچھنے پر بھی ہم بتا نہ سکے کہ اس کی شلوار میں چھپکلی چلی گئی ہے۔ سر نے لڑکی کا جم کر بیٹھے رہنا دیکھ کر نہ جانے کیا اخذ کیا کہ خجل سے واپس مڑ گئے۔ اب سوال یہ تھا کہ چھپکلی نکالی کیسے جائے اور یہ ہمت کون کرے؟

ہم بے چاری لڑکیاں تو چھپکلی کے نام اور تصویر سے بھی ڈر جاتی ہیں۔ اور وہ لڑکی اٹھنے کو تیار نہ تھی۔ ذرا سی حرکت پر ہی پنجے چبھتے محسوس ہوتے۔ آخری گیارہویں والی ایک باجی نے ہمت دکھائی اور اس کے پیچھے بنچ کے اوپر کھڑے ہو کر پورا زور لگا کے کھڑا کر دیا۔ لڑکیوں کی سانسیں تھمیں اور چیخ کی آواز کے ساتھ جو چیز نیچے گری وہ چھپکلی نہیں مارکر تھا۔ جو اس نے شاید گھٹنے کے اوپر نہیں۔ کھلی ڈلی شلوار کی ایک تہہ اس کے اوپر آ کر قمیص کا دامن آ گیا اور اسے لگا چھپکلی ہے۔ مارکر کی چبائی ہوئی کیپ اسے پنجے لگ رہے تھے۔ بس پھر کیا تھا؟ ہم تھے اور ہمارے بلند قہقہے...... لیکن سر نے ہم سے کبھی بھی یہ نہیں پوچھا کہ اس دن اس بچی کو کیا ہوا تھا؟

(2) سال نو کے موقع پر سب سے اہم بات تو یہ ہے کہ یکم جنوری کو اس بندی ناچیز کی سالگرہ ہوتی ہے۔ سب فرینڈز اور آدھی سسٹرز خوب صورت لفظوں کے ساتھ وش کرتی ہیں۔ دو سال پہلے...... سال نو اور سالگرہ کے موقع پر میری دوست سائرہ نے کہا تھا۔

زینب...... جب تم چھٹی کلاس میں پہلی دفعہ مجھ سے ملی تھیں تو میرے گمان میں بھی نہیں تھا کہ تم مجھے اتنی عزیز ہو جاؤ گی۔ تم میرے لیے اللہ کا عطا کردہ خاص تحفہ ہو جس کے لیے مجھ پر اپنے رب کا شکر واجب ہے، کہنے کو تو یہ کسی بھی دوست کے عام الفاظ ہیں مگر میرے لیے ان لفظوں کی قدر و قیمت لگانا ناممکن ہے۔

(3) شاعری مجھے خاص پسند نہیں۔ بس کبھی کبھی کوئی کوئی شعر ہی دل کو لگتا ہے مگر اقتباس؟ کسی کہانی کا اقتباس جو مجھے پسند آ جائے، وہ مجھے یاد نہیں رہتا۔ بہت سے اقتباسات پسند آئے جن میں نمیرا احمد کے ناولز کے اقتباسات کی فہرست لمبی ہے۔

نوال افضل گھمن......کراچی

(1) عجب موسم تھے چاہت کے جو کبھی یاد آ جائیں تو پلکوں پر بے شمار ستارے جھلملاتے ہیں۔ کسی کی یاد میں اگر راتوں کو نیند روٹھ جائے تو ہم یہ سوچتے ہیں ابھی وہ بھی ہمارے واسطے سویا نہیں ہوگا، وہ بھی رویا نہیں ہوگا۔ ہم بھی ابھی نہیں روتے، ہم بھی ابھی نہیں سوتے۔ ہم جاگتے ہیں یاد کرتے ہیں، اکیلے بیٹھ کر دل کی ویرانی کو آباد کرتے ہیں۔ اکیلے چاند کی زرد روشنی میں آسماں پر بکھرے تاروں کو ترتیب دے کر اس کا نام بتاتے ہیں۔ اگر کبھی بچھڑا ملا تو گزری راتوں کی بے کلی کا ذکر کر کے ہر قصہ سنائیں گے۔ کیسے کیسے دل دھڑکا، اسے بتلائیں گے۔ ستاروں میں نام لکھنے سے ستارے مل نہیں جاتے جو وقت کے سیلابی ریلے میں گم ہو جائیں، انہیں کنارے مل نہیں جاتے۔

یاد کیوں زندہ رہتی ہے۔ اس کی قبر کیوں نہیں ہوتی جس پر کوئی کتبہ نہ ہو۔ یاد ہمیشہ یاد کیوں رہتی ہے؟

کوئی سامری جادوگر ایسا منتر کیوں نہیں پھونک دیتا کہ یاد کے آسیب سے چھٹکارا مل جائے۔ رات کی سیاہی میں یاد کیوں اور گہری چمکتی ہے۔ کیوں اس کی چمک ماند نہیں ہوتی۔ کاش یاد بھی گرہن زدہ ہو۔ کاش یاد کی بھی کوئی تدفین کرے۔ وقت کیوں چپ کی چادر نہیں اوڑھتا۔ یاد کے ڈھول کی تھاپ پر رقص ختم کیوں نہیں ہو جاتا۔

ہمیں تو حکم مجاوری ہے
مزار دل میں ہے کون مدفن
یہ کس عروسہ کا مقبرہ ہے
نہ کوئی کتبہ، نہ کوئی تختی

نہ سنگ مرمر کی سل پر لکھا ہوا
محبت کا کوئی شعر
فقط سرہانے سے پائنتی تک
امر بیل اک لپٹ گئی ہے
جو اک زمانے سے کہہ رہی ہے
یہاں ٹھکانا تھا عاشقی کا
یہ پیر خانہ تھا عاشقی کا
کسے خبر کہ یہاں ہے مدفن
فقیر کوئی، اسیر کوئی
یا پھر وارث کی ہے، ہیر کوئی

دسمبر میں اپنے بچھڑے سنگی، ساتھی اور ہاسٹل لائف کی ٹھٹھرتی راتیں اور ہمارا پاگل پن۔ مال روڈ کی چمن کی آئس کریم اور کہر میں لپٹی صبح میں (گوگا نقیبا) ماڈل ٹاؤن۔ جی بلاک کے گرم نان اور مرغ چنے۔ پھر پنجاب یونیورسٹی کی چائے...... این سی اے ہوسٹل میں دوستوں کی مونگ پھلیاں اور پھر بٹ سوئٹس کے سموسے اور میٹھی چٹنی، اماں کے ہاتھ کا ساگ اور دیسی گھی میں نہایا ہوا

پراٹھا۔ سب کچھ میسر ہے مگر وہ زمانہ کہاں۔

(2) دوستوں اور عزیز و اقارب میں ملنے والا پیغام بیسٹ فرینڈ عارفہ معین کا لکھا اور بھیجا ہوا کارڈ پچھلے سال یہ کہہ رہا تھا......

کچھ لوگ مثل تعویذ ہوتے ہیں
گلے لگتے ہیں تو شفاء ملتی ہے

(3) آل ٹائم فیورٹ اشعار سب قارئین اور بشریٰ، نادیہ، مقصورہ آپا کے نام

چراغ جلتے رہیں یا ہوا ٹھہر جائے
تیری نگاہ پہ ہر سلسلہ ٹھہر جائے
ٹھہر گیا ہے سرِ شام بہتا دریا بھی
کہیں یہ تو اب دلِ مبتلا ٹھہر جائے

تسنیم کوثر......کراچی

(1) بھیگا بھیگا سا یہ دسمبر ہے
بھیگی بھیگی سی یہ تنہائی ہے

سردیوں کی طویل سرد راتوں میں جہاں خاموشی کا پہرہ ہوتا ہے، وہاں گھڑی کی ٹک ٹک سے لے کر دل کی دھڑکن تک یادوں کا ایک شور بپا ہوتا ہے۔ ماضی کی یادیں کچھ خوش کن بھی ہوتی ہیں اور کچھ ناخوش گوار بھی۔ جو دل کو دکھا دیتی ہیں اپنا اسکول و کالج کا زمانہ بہت یاد آتا ہے۔ شادی اور شادی کے بعد کے حالات ایک فلم کی مانند آنکھوں کے سامنے سے گزرتے ہیں۔ بی اے میں سیکنڈ آنے پر ہماری ساسو ماں نے ایک ہزار روپے انعام دیا تھا۔ وہ خوشی کا احساس آج تک موجود ہے، اس وقت ایک ہزار روپے کی ویلیو تھی اور خاص کر اپنے شریک حیات کے ساتھ خوب صورت اور خوش گوار گزری ہوئی زندگی دل و دماغ پر نقش ہو کر رہ گئی ہے اور یہ یادیں دل کو خوش بھی کرتی ہیں اور اداس بھی کیونکہ میرے شوہر بھی دنیا چھوڑ کر جا چکے ہیں اور پیارے اماں، ابا بھی اب نہیں رہے۔

(2) آپ کا سوال کہ دوستوں عزیز و اقارب وغیرہ کی جانب سے سالِ نو پر کوئی خوب صورت پیغام۔ تو بھئی کیسا پیغام اور کیسی مبارک باد۔ آج کل کے دور میں بلکہ نفسا نفسی اور جو حالات ہو رہے ہیں، تقریباً ہر کوئی کسی نہ کسی الجھن میں گرفتار ہے۔ پریشان ہے تو بھئی کون کسے یاد رکھتا ہے۔ ہاں مگر اتنا تو خیر ہوتا ہے کہ ایک دوسرے کو نیا سال مبارک ہو تو کہہ ہی دیتے ہیں، باقی اللہ اللہ خیر صلا۔

صفیہ مہر......کوٹلی مراد

(1) یادیں انسان کا قیمتی سرمایہ ہوتی ہیں۔ کچھ یادیں ہمارے ذہن کے کینوس پر ابھرتی ہیں۔ سب سے جو بڑا ہمارا بھائی ہے۔ ہمارے بچپن میں ان کی شادی ہوگئی۔ دوسرا والا بھائی جو ہے، وہ فقط سال بڑا تھا۔ وہ پڑھا لکھا تھا (حوالدار ہے اب فوج میں) اس کی ہم بہنوں سے بہت دوستی رہی۔ خوب باتیں کرتے۔ کبھی ادب پر کبھی ٹاک شو پر تو کبھی کسی فلم پر۔ ساتھ ساتھ چائے چلتی، ابا کے خشک میوے چرا لیے جاتے۔ نوکری ہوئی پہلے، پھر 2016ء میں شادی۔ تو پھر پوسٹنگ اسلام آباد میں ہوگئی۔

اس کے بعد دوسری بہن کی بھی شادی ہوگئی۔ یہ بہن ٹیچر ہیں گورنمنٹ اسکول میں۔ پھر میری بھی۔ گھر گرہستی، پھر گورنمنٹ کی طف جاب، ہفتہ ہفتہ ملنا نہیں ہوتا۔ فون رابطے کا ذریعہ تو ہیں لیکن گزرا وقت جو ماضی بن گیا ہے، وہ بڑا یاد آتا ہے۔ وہ بزم جو لگتی تو رات گزرنے کا پتا نہ چلتا۔ دسمبر کی ٹھنڈ میں ہم بہن بھائی چولہے کے نزدیک بیٹھ کر باتیں کرتے کرتے رات ختم کر دیتے۔ اب وہ وقت کہاں اب بھی بھائی چھٹیوں پر آتا ہے تو محفل سی سج جاتی ہے۔

اسکول میں گزرا وقت اور کلاس میٹ مجھے بڑی یاد آتی ہیں۔ پتا نہیں کہ ان کے دل میں کہیں میرا گزر بھی ہوگا یا نہیں۔ نوشین اسماعیل، نجمہ محی الدین، فوزیہ صدیق۔ پتا نہیں تم لوگ دنیا کے کس کونے میں ہو۔

(2) میری کزن پھپھو کی بیٹی اکثر کہتی ہے کہ مجھے تم بہت پیاری ہو۔ تم جیسی میری کوئی دوست نہیں۔ عزیز اقارب دل میں متاثر ہوں گے لیکن منہ پر کبھی نہیں کہا۔

بقیہ صفحہ نمبر 249

تنزیلہ ریاض

نور القلوب ایک ایسا ادارہ جہاں صندل بی لوگوں کے لیے دعا کرتی تھیں، لوگ اپنے مسائل لے کر ان کے پاس آتے تھے۔ وہ انتہائی خوب صورت خاتون تھیں۔

بٹ گرام میں بنی ہری حویلی میں وہ اپنے باپ اور گلے جو اس کی سوتیلی ماں تھی سے ملنے چھٹیوں میں آتا ہے۔ گلے اس کی خالہ تھی جو اس کی ماں کے مرنے کے بعد انتہائی کم عمری میں اس کے باپ سے بیاہی گئی تھی۔

خوشل اپنے باپ کی نسبت گلے سے زیادہ قریب تھا۔

داؤد بروکن فیملی کا بچہ تھا جو انتہائی موٹا تھا اس کے وزن کی وجہ سے سب اسے تنقید کا نشانہ بناتے تھے۔ وہ پڑھائی میں بھی اچھا تھا۔ نانی کے مرنے کے بعد اس کی ماں نے اپنا ٹرانسفر دبئی کروالیا تھا وہ بینک میں ملازمت کرتی تھیں۔

گلے کی اداسی دیکھ کر اسے لگا اس کا باپ شادی کر رہا ہے۔ وہ ان سے سخت ناراض تھا۔

اس کا دوست اسے بتاتا ہے کہ لاریب نے خودکشی کرلی ہے۔ وہ حیران ہو جاتا ہے۔

آدھی رات کو ہری حویلی میں کھٹ پٹ سن کر وہ باہر نکلتا ہے تو اپنے باپ کے ساتھ لاریب کو دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔

خوشل لاریب کو اپنے گھر میں دیکھ کر حیران رہ جاتا ہے۔ وہ ارباب کو فون کرتا ہے لیکن وہ ریسیو نہیں کرتا۔

رفیق کے صاحب اس سے کہتے ہیں کہ لاریب کی تمام تصاویر ان کے گھر سے ہٹادی جائیں ان کے گھر میں لاریب کا چیپٹر بند ہو جاتا ہے۔

تیسری قسط

وہ رات ہری حویلی والوں کے لیے سردیوں کی عام راتوں سے بالکل مختلف تھی۔ پہلے بھی آٹھ ساڑھے آٹھ بجے تک وہاں سناٹا چھا جایا کرتا تھا لیکن اپنے اپنے کمروں میں روشنی بکھیرے سب اپنے معمول کی سرگرمیاں رات گئے تک نبٹانے میں مگن رہتے تھے۔ خان بابا کو مطالعہ کی عادت تھی۔ خوش الحان ٹی وی کا رسیا تھا جبکہ گلے اون سلائیاں یا کروشیا لیے بیٹھی رہتی تھی لیکن اس روز سب اپنی اپنی سوچ کا بوجھ لیے جاگ رہے تھے مگر سب کے کمروں کی روشنیاں گل تھیں سوائے لاریب کے کمرے کے۔

ایک وہی تھی جو اطمینان سے خوش الحان کا دیا ہوا سگریٹ سلگائے اپنے کمرے کی بتی جلائے بیٹھی تھی۔

تیسرا کش لگاتے ہی مہلک دھواں ایک چبھتی ہوئی خوشبو کی صورت اس کے اطرف پھیل گیا تھا۔ لیکن اسے ذرا مزا نہ آیا کیونکہ کش میں صرف خوشبو تھی کوئی سحر نہ تھا۔ کوئی جکڑ دینے والی صلاحیت نہیں تھی جبکہ وہ مسحور کر دینے والے دھویں کی عادی تھی۔ اس نے اگلا کش سانس کو مزید زور سے کھینچ کر لگایا تھا لیکن صورت حال وہی رہی۔

اسے لگا یہ اس کا وہم ہے اور اس کے اعصاب کچھ زیادہ تھک چکے ہیں اس لیے شاید وہ اس مہربان احساس سے دوچار نہیں ہو پا رہی جو اس سگریٹ کو ہونٹوں سے لگاتے ہی محسوس کرنے کی عادی تھی۔ اس نے بے چین ہو کر اگلے پانچ سات کش بعجلت لگائے اور پھر اسے یقین ہو گیا تھا کہ اس کے ساتھ دھوکا ہوا ہے۔ وہ سگریٹ کا تحفہ دیکھ کر کچھ اور سمجھی تھی۔

”خبیث آدمی۔ منہ دکھائی ہی دینی تھی تو بھری ہوئی تو دیتا۔“ اس نے ناگواری اور غصے کو برداشت کرتے ہوئے چڑ کر خود کلامی کی تھی۔

دل تو یہ چاہ رہا تھا کہ ابھی اس کے پاس جائے اور اسے دو چار سنا کر آئے لیکن اس کے بدن میں طاقت کی اس قدر کمی ہو چلی تھی کہ دو قدم چلتے ہی سر چکرانے لگتا تھا اور وہ گرنے والی ہو جاتی تھی اس لیے یہ سوچ ذہن میں پیدا ہوتے ہی اپنی موت آپ مر گئی تھی۔

اسے یہ بھی اندازہ تھا کہ خوش الحان اس وقت جس صدمے کی کیفیت سے گزر رہا ہے اس وقت اس کے منہ لگنا خطرناک بھی ہو سکتا تھا۔ وہ چپ چاپ کش پہ کش لگاتی چلی گئی۔ درد کرتی کنپٹیاں آرام محسوس کرنے لگی تھیں۔ وہ وہیں صوفے پر لیٹ گئی تھی۔

☆☆☆

بند آنکھوں کے عقب میں اس کا ماضی کسی پرانے بوسیدہ تصویروں والے البم کی طرح کھلا تھا اور پہلی تصویر واضح ہوئی تھی۔ وہ دیکھ سکتی تھی اور وہ دیکھ رہی تھی۔

پہلی تصویر میں وہ تھی اور اس کے ڈیڈی تھے۔

”لاریب! یہ کس نے توڑا؟“ وہ اس سے پوچھ رہے تھے۔

ان کے چہرے پر وہی ازلی بیزاری تھی جو اس نے ہمیشہ دیکھی تھی۔ وہ سمجھ نہیں پاتی تھی کہ وہ ایسے ہی تھے یا اس سے بات کرتے ہوئے ایسے کرخت ہو جایا کرتے تھے حالانکہ ان باپ بیٹی کے درمیان زیادہ بات چیت نہیں ہوتی تھی مگر جب بھی ہوتی تھی اس کا ایجنڈا دادی کی لگائی گئی شکایات کے حوالے سے مرتب ہوتا تھا۔

اس روز بھی گرینی دادو کا چشمہ تیسری بار اچانک سے خود بخود ٹوٹ گیا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ یہ لاریب نے کیا ہے اور لاریب کو تو پتا ہی تھا کہ یہ کام اس کا ہے لیکن ڈیڈی کے سامنے اس نے یہ بات ماننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس نے جان بوجھ کر تو کیا نہیں تھا۔ وہ تو بس اس کے ساتھ کھیلتی تھی اور وہ ٹوٹ جاتا تھا۔

”مجھے نہیں پتا۔ گرینی کی چیزوں کے متعلق آپ گرینی دادو سے پوچھیں۔“ وہ اپنے مخصوص ہٹ دھرم انداز میں بولی تھی۔

"گرینی دادو کہہ رہی ہیں کہ یہ آپ نے توڑا ہے۔۔اور پہلی بار نہیں توڑا۔بلکہ یہ تیسری بار ہوا ہے۔"
وہ اسی انداز میں پوچھ رہے تھے۔چہرے پر ذرا بھی نرمی نہیں تھی۔ایسی نرمی جو کارٹونز میں یا موویز میں ڈیڈیز کے چہروں پر نظر آتی تھی۔لاریب نے یہ نرمی کبھی ان کے چہرے پر نہیں دیکھی تھی۔
"گرینی دادو کو عادت ہے۔چلتے ہوئے اگر کسی چیز کے ساتھ ہٹ ہونے سے ان کا ناخن بھی ٹوٹ جائے تو اس کا الزام وہ لاریب کے سر ڈال دیتی ہیں۔"
اس نے ناک سے مکھی اڑانے والے انداز میں کہا تھا۔اس کی اس موضوع پر گرینی دادو سے پہلے بھی اچھی خاصی بحث ہو چکی تھی۔
"ہاں۔میرا دماغ چل گیا ہے نا۔پاگل ہو چکی ہوں میں۔تب ہی تو ہر چیز کا ذمہ دار تمہیں ٹھہراتی ہوں۔"
گرینی دادو سامنے صوفے پر ہی بیٹھی تھیں لیکن ان کی تصویر اس کی یادداشت میں ہمیشہ دھندلی رہی تھی۔ان دونوں کے رشتے کی طرح۔
"میں نے یہ تو نہیں کہا۔آپ ڈیڈی کے سامنے خوامخواہ میری شکایت مت کریں۔اس کا کوئی فائدہ نہیں ہونے والا۔"
اس نے یہ ڈائیلاگ کسی فلم میں سنا تھا۔جس انداز میں سنا تھا،اسی انداز میں کہہ ڈالا۔گرینی دادو کا پارہ آسمان کو چھونے لگا تھا۔
"ہاں ہاں۔اب یہی سننا باقی رہ گیا تھا۔غضب خدا کا یہ ذرا سی بچی کیسی چالاک ہو چکی ہے۔میری یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ اس عمر میں یہ اتنی شاطر ہے تو بڑی ہو کر اس کا کیا بنے گا۔کہاں سے سیکھتی ہو تم یہ سب۔سچ سچ بتاؤ، تمہاری ماں فون پر پٹیاں پڑھاتی ہے نا تمہیں۔ورنہ ایسی تربیت تو نہیں کی تھی میں نے تمہاری۔" وہ چلا کر بولی تھیں۔اس کے ڈیڈی نے اب کی بار اپنی ممی کا چہرہ دیکھا تھا۔
"اس کی ماں کا ذکر کہاں سے آگیا ممی! بخش دیں اسے۔۔اب نہیں رہی وہ ہمارے درمیان۔بھول جائیں اسے۔"
ڈیڈی کو ان کا ذکر ہمیشہ ہی برا لگتا تھا اور وہ اسی طرح برا مان جایا کرتے تھے۔
"کیسے بھول جاؤں۔کبھی نہیں بھولوں گی اسے۔مرتے دم تک بددعائیں دوں گی اسے۔کیڑے پڑیں گے اسے کیڑے تم دیکھنا۔ہماری خوشیوں کو آگ لگا کر خود محترمہ مراقبہ میں چلی گئی ہیں۔دوسروں کی زندگیوں کو جہنم بنا کر خود جنت کی تلاش میں نکل کھڑی ہوئی ہیں۔ایسے مل جائے گی جنت۔کبھی نہیں۔میری بددعائیں ہمیشہ اس کا پیچھا کریں گی۔"
گرینی دادی چبا چبا کر بول رہی تھیں۔ڈیڈی نے ایک دم میز پر پڑی ایش ٹرے کو ہاتھ مار کر نیچے گرا دیا تھا۔
"ممی! چپ کر جائیں۔خدارا چپ کر جائیں۔جائیں آپ یہاں سے۔چلی جائیں۔اور اس کو بھی ساتھ لے جائیں۔مجھے آپ دونوں کی ضرورت نہیں ہے۔مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے۔جائیں یہاں سے۔چلی جائیں۔"
ڈیڈی پاگلوں کی طرح چلانے لگے تھے اور اپنے سر پر زور زور سے ہاتھ مارنے لگے تھے۔ایسا لگتا تھا انہیں اپنا ہوش بھی نہیں ہے۔دادی یکدم پریشان ہو کر اٹھی تھیں۔
"حبیب اللہ۔اِدھر آؤ۔جلدی آؤ۔لاریب کو باہر لے جاؤ۔"
ڈیدی مسلسل چلا رہے تھے۔وہ واقعی ٹھیک نہیں لگتے تھے۔غصے سے لال پیلے ہو کر مٹھیاں بھینچتے ہوئے،میز

پر ہاتھ مارتے ہوئے انہیں اپنا ہوش بھی نہ رہا تھا۔ ایسا باپ جس سے انسان ٹھیک سے بات بھی نہ کر سکے ایسے باپ کی ضرورت کہاں تھی۔

یہ تھی اس کے ماضی کے البم کی پہلی تصویر۔ جس میں ڈیڈی کا چہرہ سب سے نمایاں تھا۔

☆☆☆

دوسری تصویر میں کئی لوگ تھے اور وہ ایک ہال کمرے میں موجود تھے۔ وہ ہال عام گھروں جیسا نہیں تھا۔ وہ کسی اور طرز کی عمارت تھی اور وہاں بہت سے لوگ تھے جن میں سے ننانوے فیصد کو وہ جانتی تک نہیں تھی۔ جن کو جانتی تھی ان کے بھی فقط چہروں سے واقف تھی۔

''آپ بنا خوفزدہ ہوئے اطمینان سے سوچ کر بتایئے لاریب۔ آپ کو کس کے ساتھ رہنا ہے۔ یہ آپ کی زندگی کا سوال ہے۔ آپ سوچ کر فیصلہ کیجیے اور کورٹ کو اپنی مرضی سے بتایئے کہ آپ نے کس کو منتخب کیا ہے۔ باپ۔ یا۔ ماں؟''

اس کے وکیل انکل جو گھر اور اپنے آفس میں کئی دن اس کی برین واشنگ کرتے رہے تھے اور اسے ہر اس سوال کا جواب یاد کرواتے رہے تھے جو کورٹ میں پوچھا جا سکتا تھا انہوں نے سب کے سامنے پوچھا تھا۔

اس کے والدین اسی ہال کمرے میں موجود تھے۔ ان کی نظریں اس کے چہرے پر جمی تھیں۔ ان دونوں کی آنکھوں میں اسے اپنے لیے محبت نظر نہیں آتی تھی بلکہ ان دونوں کی آنکھوں میں ایک دوسرے کو نیچا دکھا دینے کا عزم تھا۔ وہ دونوں ہی لاریب کو اپنی محبت میں اپنے ساتھ نہیں رکھنا چاہتے تھے بلکہ وہ دونوں ایک دوسرے کی نفرت میں لاریب کو اپنانے کو تیار تھے۔

''ماں یا باپ؟'' وکیل انکل نے دہرایا تھا۔

اس نے اب ہال کی دائیں جانب دیکھا۔ وہاں وہ شخص بیٹھا تھا جس کی آنکھوں میں اسے اپنے لیے محبت نظر آتی تھی۔

''میں کورٹ کے حکم کے مطابق آپ سے آپ کی مرضی پوچھنا چاہتا ہوں مس لاریب! ماں یا باپ؟''

سوال کو تیسری بار دہرایا گیا تھا۔

اس نے گہری سانس بھری اور اپنی آنکھوں کا زاویہ بدلے بنا بولی۔

''خان بابا۔''

یہ تھی اس کے ماضی کے البم کی دوسری تصویر جس پر خان بابا کا حیران ہوتا ہوا چہرہ سب سے زیادہ نمایاں تھا۔

☆☆☆

لاریب کے ماضی کی تیسری نمایاں تصویر بھی ایک ہال کی تھی۔ یہ ہال ان کے اسلام آباد والے گھر میں تھا جو اس کے باپ نے تب خریدا تھا جب خان بابا مستقل بگرام رہائش پذیر ہو گئے تھے۔

وہ ایک بڑا سا ہال تھا۔ اس ہال میں بڑی بڑی کھڑکیاں تھیں اور کئی دروازے۔ کچن ڈرائنگ روم اور ماسٹر بیڈ روم کے دروازے اسی ہال میں کھلتے تھے اور اس ہال کا ایک دروازہ باہر لان میں بھی کھلتا تھا۔ وہ لان میں کھیل رہی تھی جب خان بابا کی مخصوص جیپ کا مخصوص ہارن سنائی دیا تھا۔ وہ خوشی سے کھل اٹھی۔ حالانکہ اس روز وہ بہت اداس رہی تھی مگر خان بابا کی آمد نے اسے مسرور کر دیا تھا۔

وہ انہیں پسند کرتی تھی اور ان سے مل کر اسے ہمیشہ اچھا لگتا تھا۔ وہ جانتی تھی کہ ان کا اس سے کوئی رشتہ نہیں ہے۔ وہ ان کے ساتھ کسی رشتے کے بجائے تعلق کی ڈور سے بندھی تھی اور اس تعلق کا نام محبت تھا۔ اسے خان

کی تربیت آپ نے کی ہے وہ نہیں نبھا سکے گا؟"
وہ اسی انداز میں اس کی جانب دیکھتے ہوئے پوچھ رہے تھے۔ گل لالہ کے چہرے پر تاسف بڑھا تھا۔
"خان! آپ کب تک اس رشتے کو زبردستی کا رشتہ کہتے رہیں گے۔ اتنے سال گزر گئے۔ گل لالہ نے کبھی کسی چیز کی شکایت نہیں کی۔ وہ جو گل ہوا کرتی تھی۔ پگھل پگھل کر آپ کے آنگن میں گھل مل گئی۔ لیکن پھر بھی آپ کو یقین نہ آسکا کہ یہ زبردستی کا رشتہ نہیں ہے۔ اس میں رشتے میں سو فیصد میری رضا شامل تھی۔ میں نے دل و جان سے آپ کو اور خوشحال خان کو قبول کیا تھا۔" وہ جب بولی تو لہجہ بے حد تھکا ہوا محسوس ہوتا تھا۔ خان کی گرفت اس کے ہاتھ پر نرم پڑی۔ صوفے کی پشت سے کمر ٹکائے انہوں نے ایک نظر اس کی جانب دیکھا۔ ان کی آنکھیں ہمیشہ سے گہری سرخ رہا کرتی تھیں۔
"یہی بات ایک دن خوش الحان بھی آپ سے کہے گا۔ اس رشتے میں میری سو فیصد رضا شامل تھی۔" انہوں نے من و عن اس کا جملہ دہرایا پھر مزید بولے۔
"اور اس وقت میں آپ سے دوبارہ پوچھوں گا کہ کیا زبردستی کے رشتے نبھانے واقعی مشکل ہوتے ہیں؟"
گل لالہ کچھ بول ہی نہ سکی پھر اس نے گہری سانس بھری تھی۔
"میں اپنی بات کب کر رہی تھی خان۔ مجھے تو آپ سے کب محبت ہوگئی پتا ہی نہ چل سکا۔ میں تو آپ کی بات کر رہی تھی۔ آپ نے جس طرح نبھایا ہے یہ مجھ سے چھپا ہوا تو نہیں ہے۔ کاش آپ نے اپنے بیٹے کے لیے یہ راہ نہ چنی ہوتی۔"
ان سے اپنا ہاتھ آہستگی سے چھڑوا کر وہ اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ اس موضوع پر ان سے بات کرنے کا فائدہ ہی نہیں تھا۔ لفظ "محبت" پر ان کا وجود برف بن کر پگھلنے لگا تھا۔

☆☆☆

"یہ کیا ہے؟" مہر نے ایک سنہری ملفوف گول سی چیز کو اس کی آنکھوں کے سامنے لہراتے ہوئے سوال کیا تھا۔
وہ اس کی سی ڈیز والے ریک میں سے سی ڈی منتخب کر رہی تھی۔ ممی کے کہنے پر اس نے فرمان کے گینگ کو بھی بلا رکھا تھا کیونکہ ان سب کے والدین آپس میں دوست تھے اور ممی نہیں چاہتی تھیں کہ چند نئے دوستوں کو بلانے اور پرانے دوستوں کو نہ بلانے پر کوئی ناراضی جنم لے۔ اسی لیے فرمان سمیت فروا خلود اور باقی لوگ بھی مدعو کیے گئے تھے۔
یہ مہر کا آئیڈیا تھا کہ سب دوست کھانا کھا کر اب بیٹھے بور ہو رہے ہیں تو کیوں نہ ایک اچھی سی مووی دیکھی جائے۔ داؤد سمیت سب کو ہی یہ تجویز اچھی لگی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ سب کی پسند مختلف تھی اور کافی دیر تک وہ لوگ اس بات پر بحث کرتے رہے کہ کون سی مووی دیکھی جائے۔ فرمان کو سائنس فکشن دیکھنی تھی۔ زوبیب کو کرائم تھرلر میں دلچسپی تھی جبکہ باقی لوگ رومینٹک اور میوزیکل کامیڈی کا راگ الاپ رہے تھے۔
مہر نے چیسٹ ڈرازر کے پورے دراز کو ہی گھسیٹ کر باہر نکال لیا تھا اور اب وہ سب کو سی ڈیز دکھاتے ہوئے سوال پر سوال کر رہی تھی کہ شاید کسی ایک مووی پر سب متفق ہو جائیں اور تب ہی اسے وہ سنہرے کاغذ جیسے پلاسٹک میں لپٹی وہ سی ڈی مل گئی تھی۔
"یہ کون سی مووی ہے داؤد؟" اس نے پوچھا تھا۔
اس نے ایک نظر اس کے ہاتھ میں پکڑی اس چیز کی طرف دیکھا پھر کندھے اچکا کر لاعلمی کا اظہار کیا۔
"پلے کر کے چیک کر لو۔" اس نے لاپروائی سے کہا اور فلور کشن پر بیٹھ گیا تھا۔

لگائے۔

اس کا کوئی دوست نہیں تھا کیونکہ وہ ان کے ساتھ جھگڑتی تھی۔ ان کے کھلونے توڑ دیتی تھی۔ اس کے کزنز تھے ہی بہت کم اور جو تھے ان سے بھی اس کے تعلقات کشیدہ ہی رہتے تھے۔

ایسی صورت حال میں ایک خان بابا تھے جن سے اس کی دوستی تھی اور اس دوستی میں خوش الحان کسی غیر حلقہ شخص کی طرح آن وارد ہوا تھا۔ اس کے ماضی کے البم کی تیسری تصویر میں خوش الحان کا چہرہ سب سے زیادہ نمایاں تھا۔

☆☆☆

"آپ کو مبارک ہو۔ رات کو نکاح ہو گیا تھا۔" انہوں نے فون پر کسی کو بتایا تھا۔

گُلے اسی لمحے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ ان کے چہرے پر بے پناہ اطمینان بکھرا تھا جیسے کوئی بہت مشکل مرحلہ سر کر لیا ہو۔ گلے نے بوجھل قدموں سے چلتے ہوئے قہوے والی ٹرے ان کے قریب پڑی تپائی پر رکھ دی اور واپسی کے لیے مڑی۔ انہوں نے بائیں ہاتھ سے اس کا ہاتھ تھاما۔

"کچھ دیر میرے پاس بیٹھو گلِ لالہ!"

اس نے ایک نظر ان کے ہاتھ میں دبے اپنے ہاتھ کی جانب دیکھا۔ ایسا عام حالات میں ہوا ہوتا تو وہ واری صدقے جاتے ہوئے فوراً بیٹھ جاتی لیکن آج وہ خان سے ناراض تھی بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب تھا کہ وہ خان سے بددل ہو چکی تھی لیکن خوش الحان کی طرح وہ بھی خان کو انکار نہیں کر سکتی تھی۔ اس لیے چُپ چاپ ان کے ساتھ صوفے پر بیٹھ گئی۔

"آپ کو میرے ہوتے ہوئے کسی بھی بات کے لیے پریشان ہونے کی ضرورت نہیں ہے۔ اللہ کرم کرے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" وہ فون پر کہہ رہے تھے۔ ہاتھ ابھی تک گلے کے ہاتھ کو مضبوطی سے تھامے ہوئے تھا۔ اپنا جملہ مکمل کر کے وہ دوسری جانب سے آنے والی آواز کو غور سے سننے لگے۔

"ایسا ہی ہوتا ہے۔ آپ کیوں ہلکان کرتے ہیں خود کو۔ میں کہہ رہا ہوں نا۔ اللہ کرم کرے گا۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔" انہوں نے پھر تسلی دی تھی۔ گلے نے سر جھٹکتے ہوئے تاسف سے ان کی اس تسلی کو ہضم کیا۔

"اپنے شیر جیسے بیٹے کو قربان کر دینے کے بعد سب کیسے ٹھیک ہو گا خان؟"

انہوں نے فون کو کان سے ہی لگائے گلے کی پشتو میں کی گئی بڑبڑاہٹ کو سنا تھا۔ ان کے چہرے پر مسکراہٹ چمکی جو گلے کو ذرا اچھی نہ لگی۔

انہوں نے اطمینان سے بات مکمل کر کے فون بند کیا تو وہ کہے بغیر رہ نہ سکی۔

"آپ نے یہ سب کیوں کیا خان۔ آپ اچھی طرح سے جانتے تھے کہ خوشل کو یہ سب اچھا نہیں لگے گا؟"

وہ مزید مسکرائے اور گلے کے ہاتھ کو اپنی جانب کھینچا یعنی اسے قریب ہو جانے کا عندیہ دیا۔ گلے نے دل میں ناراضی ہونے کے باوجود سرِ تسلیم خم کیا اور ذرا سا قریب ہو گئی۔

"جب آپ کی اور میری شادی ہوئی تھی تو آپ کو اچھا لگا تھا گلِ لالہ؟" انہوں نے اطمینان سے ٹانگ پر ٹانگ رکھی اور صوفے کی پشت سے کمر ٹکا لی۔ آنکھیں اس کے چہرے پر ٹکی تھیں۔ گلے نے ناراضی سے ان کا چہرہ دیکھا۔ ان کی گھما پھرا کر کی جانے والی باتیں اسے اچھی نہ لگتی تھیں کیونکہ وہ لاجواب ہو جایا کرتی تھی۔ اب بھی اس سے کوئی جواب نہ بن پڑا تھا۔

"زبردستی کے رشتے نبھانے مشکل ہوتے ہیں خان۔" وہ ٹوٹے ہوئے لہجے میں پشتو میں بولی تھی۔

"آپ نے بھی تو نبھایا ہے نا اور اب تک نبھا رہی ہیں ایک زبردستی کا رشتہ۔ آپ کا کیا خیال ہے جس بچے

بابا سے محبت تھی۔ اور خان بابا بھی اس سے محبت کرتے ہیں اس بات کا اسے یقین تھا۔
''خان بابا۔'' اس نے جیسے آنکھیں سکیڑ کر تصدیق کے لیے خود ہی سے سوال کیا تھا پھر اپنے ہاتھ میں پکڑے پینٹ برش اور پلیٹ کو تپائی پر رکھ کر وہ بھاگتی ہوئی اندر ہال کی جانب گئی تھی۔ وہاں کوئی نہیں تھا لیکن اس سے پہلے کہ وہ باہر جا کر دیکھتی خان بابا اندر داخل ہوئے تھے۔
''خان بابا۔'' وہ دوڑ کر ان کے قریب ہوئی۔ انہوں نے محبت سے اسے گلے لگا لیا تھا۔
''مجھے لگا تھا، آپ نہیں آئیں گے۔'' وہ بے پناہ خوش تھی۔ اس کی ایک فون کال پر اس سے ملنے چلے آنا صرف خان بابا کا کام تھا۔ اتنا مان، اتنا بھروسا اسے اپنے باپ پر بھی نہیں تھا جتنا ان پر تھا اور تب ہی ایک لڑکا ان کے عقب سے نکل کر ان کے برابر آ کھڑا ہوا تھا۔ اس نے سوالیہ انداز میں ان کے چہرے کی جانب دیکھا۔ وہ اس لڑکے سے پہلے کبھی نہیں ملی تھی۔
''یہ خوش الحان ہے۔'' خان بابا نے اس کی طرف اشارہ کر کے اسے اسی محبت بھرے انداز میں بتایا تھا۔
وہ دو قدم پیچھے ہوئی اور تیکھی نگاہوں سے اس کا جائزہ لیا۔ خان بابا اتنی محبت سے تو ہمیشہ اس کے متعلق بات کیا کرتے تھے۔ اس کے دل میں ایک بے چین کر دینے والی لہر اٹھی تھی۔ اسے بچپن سے ہی تقسیم شدہ رشتے ملے تھے اسی لیے اسے تعلقات میں تقسیم پسند نہیں تھی۔ جو اس کا تھا۔ وہ بس اسی کا ہونا چاہیئے تھا۔
''یہ میرا بیٹا ہے۔'' خان بابا اب اپنا بازو اس لڑکے کے کندھے پر رکھ چکے تھے۔ ان کے انداز میں استحقاق تھا اور اس لڑکے کے انداز میں اشتیاق۔ وہ دوستانہ سے انداز میں اس کی جانب دیکھ رہا تھا مگر اس نے ذرا بھی اہمیت نہ دی۔
وہ ان ہی بچوں جیسا ایک بچہ تھا جیسے بچے اس کی کلاس میں تھے یا اس کے اسکول میں پڑھتے تھے لیکن نجانے کیوں اسے اس بچے کی شخصیت بے حد ناگواری سی محسوس ہوئی۔
وہ دیکھنے میں اس سے کچھ اونچا لگتا تھا لیکن رنگ روپ میں اس جیسا ہی تھا۔ گندمی سا کِھلتا رنگ، گلابی ہونٹ اور سُرخ پھولے پھولے گال۔ مگر اس کی آنکھیں نیلی تھیں اور نیلی آنکھوں میں کچھ ایسا تھا، اپنے باپ کی محبت کا مان جس کے لیے لاریب ترستی رہی تھی جو لاریب کے پاس نہیں تھا۔ اور لاریب کے پاس جو نہیں تھا، اسے وہی چاہیے تھا۔
ہلکے نیلے رنگ کی جینز پر سیاہ پوری بازوؤں والی ٹی شرٹ پہنے کندھے پر گٹار والا بیگ لٹکائے دونوں ہاتھ جینز کی جیب میں اُڑسے وہ کتنے اعتماد سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ اس کے انداز میں بے پروائی تھی جیسے اسے اس بات سے کوئی غرض نہ ہو کہ دنیا میں کیا ہو رہا ہے۔ اس کی بلا سے جو مرضی ہوتا رہے۔
اس کے کندھے پر تو وہ محبت بھرا احساس ٹکا تھا جو اس کی پروا کرتا تھا، اس کی قدر کرتا تھا اور اسے ہر قسم کے مصائب سے بچا سکتا تھا۔ باپ کی محبت فقط ایک احساس نہیں ہے۔ یہ ایک طاقت ہے جو انسان کو اس قدر مضبوط بنا دیتی ہے۔ اتنا مضبوط جتنا کہ وہ لڑکا اس لمحے نظر آ رہا تھا۔
اسے یہ طاقت آج تک نصیب نہ ہوئی تھی اور اس کا دل چاہتا تھا کسی اور کے نصیب میں بھی نہ رہنے دے۔ اس کی لڑائی کبھی بھی خوش الحان سے نہیں تھی۔ اس کی لڑائی اپنی ذات سے تھی۔ بعض اوقات تو اسے پتا بھی نہیں چلتا تھا کہ وہ اپنی حرکتوں سے دوسرے لوگوں کی زندگی میں کس قدر مشکلات پیدا کر دیتی تھی۔
اسے نہیں پتا وہ بچپن میں ایسی تھی یا نہیں لیکن اسے اتنا ضرور پتا تھا کہ ہوش سنبھالتے ہی اس کی شخصیت میں ایک عجیب سی شدت پسندی آ چکی تھی۔ اسے خوش باش نظر آتے چہرے زہر لگتے تھے۔ اس کا دل چاہتا تھا کہ ہر وہ شخص جو مطمئن نظر آتا ہے اسے اس قدر غیر مطمئن کر دے کہ وہ رونے لگے اور خود پھر وہ اونچے اونچے قہقہے

مہر نے صرف یہ دیکھنے کو کہ یہ کون سی مووی ہے اسے سی ڈی پلیئر میں لگا دیا تھا۔ چند لمحے بعد ہی اسکرین پر دھیمے سے میوزک کے ساتھ چلتے پھرتے لوگ اور حسین چہرے دکھائی دینے لگے۔

"یہ تو کسی کی شادی کی مووی ہے؟" فروا نے سب سے پہلے نشان دہی کی تھی۔ داؤد جو تساہل سے پاؤں پھیلانے کا سوچ رہا تھا یک دم الرٹ ہو کر اسکرین کی جانب متوجہ ہوا۔ وہ واقعی اس کی ممی کی شادی کی مووی تھی اور دلچسپ بات یہ تھی کہ اس نے پہلے کبھی ممی کی شادی کی مووی نہیں دیکھی تھی۔ اس نے پہلی بار اپنے والدین کو ایک ساتھ اس مووی میں دیکھا تھا۔ ممی بے حد خوبصورت لگ رہی تھیں تو اسے اپنے ڈیڈ کی وجاہت کا اندازہ بھی ہوا کیونکہ اس نے ان کی کوئی واضح تصویر کبھی نہیں دیکھی تھی لیکن اسے یہ بھی احساس تھا کہ ممی کو یہ بات پتا چل گئی تو وہ ناراض ہوں گی اسی لیے اس نے مہر کو پکارا تھا۔

"مہر! پلیز، اسٹاپ کرواسے۔"

"نہیں داؤد! ایسی نادر و نایاب چیزیں تو کبھی کبھی دیکھنے کا موقع ملتا ہے۔ پلیز ہمیں دیکھنے دو۔" وہ ٹس سے مس نہ ہوئی اور باقی لوگ بھی متوجہ ہو گئے تھے۔

"یار داؤد! یہ تمہارے ڈیڈ ہیں؟" فرمان کے لہجے میں ہمیشہ کی طرح طنز تھا۔ داؤد کا خیال تھا کہ اگلا جملہ وہ یہی بولے گا کہ اس کے ڈیڈی تو اس سے بالکل مختلف ہیں لیکن اس نے یہ نہیں کہا تھا۔ اس نے ایک الگ ہی پنڈورا باکس کھول دیا تھا۔

"اگر یہی تمہارے ڈیڈ ہیں تو آئی مسٹ سے کہ آنٹی دنیا کی بدقسمت ترین عورت ہیں۔ بھلا اتنے ہینڈسم آدمی کو کوئی کیسے ڈائیوورس کر سکتا ہے۔" وہ اپنے مخصوص لہجے میں کہہ رہا تھا۔ اس کے لہجے میں ترحم تھا۔

"ٹیک اٹ ایزی فرمان۔ ڈائیورس از ناٹ این ایب نارمل تھنگ۔ اور خوب صورت لوگ بھی ایک دوسرے کو چھوڑ سکتے ہیں۔ اتنا سینٹی بھی مت ہو۔" زوہیب نے کہا تھا۔ اس دوران باقی سب لوگ بھی پہلے سے زیادہ دھیان سے ٹی وی کی جانب متوجہ ہو گئے تھے۔

"انکل بہت ہینڈسم ہیں داؤد! آنٹی تو ان کے مقابلے میں بہت ہی عام سی ہیں۔ وہ ان کو چھوڑ کر ریگریٹ (پچھتاتی) کرتی ہوں گی۔" کسی اور نے کہا۔

"آنٹی نے ان کو کیوں چھوڑا تھا؟" کسی اور نے پوچھا۔

"انکل کو کوئی پریٹی لیڈی مل گئی ہوں گی۔ اپنے جیسی۔ پرفیکٹ میچ ٹائپ۔" دوسری جانب سے جواب بھی دے دیا گیا تھا۔

داؤد کو بہت سبکی محسوس ہوئی تھی کیونکہ اس کے پاس کسی سوال کا جواب تھا نہ اس نے ایسی باتیں پہلے کبھی سنی تھیں۔ اس کی ممی اپنی مشکلات کا ذکر تو ہمیشہ کرتی رہتی تھیں لیکن اس کے ڈیڈ کا ذکر کم ہی اچھے الفاظ میں کرتی تھیں۔ ڈیڈ کا ذکر گھر میں ممنوع ہی رہا تھا اسی لیے اسے اپنے دوستوں کے با آوازِ بلند کیے گئے تبصرے اچھے نہیں لگ رہے تھے۔

"اسے اسٹاپ کرو مہر۔" اس نے اُکتا کر دوسری بار کہا تھا۔ مہر نے نفی میں سر ہلایا۔

"نہیں۔ بہت مزا آ رہا ہے داؤد۔ پلیز ہمیں دیکھنے دو۔" اب کی بار فروا بھی اس کی ہمنوا ہو گئی تھی۔

"ممی کو پتا چل گیا تو وہ ناراض ہوں گی مہر۔ انہیں یہ بات اچھی نہیں لگے گی۔" اس نے التجائیہ انداز میں کہا تھا۔

"یار۔ کم آن، تم کب تک چُنّے کاکے بنے رہو گے۔ انہیں بتانے کی کیا ضرورت ہے کہ ہمیں یہ اینٹیک پیس کہیں دراز میں پڑا مل گیا تھا۔" فروا نے چڑ کر کہا تھا۔ مہر نے ایک نظر داؤد کی جانب دیکھا پھر جیسے وہ بات کی تہہ

تک پہنچ گئی تھی۔

"نہیں۔ ہم اسے بند کر دیتے ہیں۔ داؤد ٹھیک کہہ رہا ہے۔ یہ ایک پرسنل سی چیز ہے۔ ہو سکتا ہے، آنٹی کو واقعی یہ بات اچھی نہ لگے۔" اس نے موووی کو بند کرنے کے لیے ریموٹ کا بٹن پریس کیا تھا۔

"کیوں ل ل...... بند کیوں کیا؟" فرمان نے ناگواری کا اظہار سب سے پہلے کیا تھا۔

"داؤد از ناٹ کمفرٹیبل۔ اور مجھے بھی لگتا ہے کہ آنٹی کو بُرا لگے گا اس لیے۔ ہم کچھ اور دیکھتے ہیں نا۔" مہر ایک بار سب کی پسند کی موووی تلاش کرنے لگی تھی۔

"یہ اچھی مصیبت ہے۔ ہم کچھ بھی کہیں تو داؤد ان کمفرٹیبل۔ لیکن تم کچھ بھی کہو یا کرو تو ہی گیٹس ویری کمفرٹیبل۔" مہر سی ڈیز کے ڈبے میں منہ گھسائے بیٹھی تھی۔ اس جملے پر اس نے طنزیہ انداز میں اس کی جانب دیکھا۔

"یہ کس نے کہا؟" اس نے فرمان کو کھا جانے والی نگاہوں سے گھورا تھا۔

"میں نے کہا۔ اور غلط نہیں کہا۔ تم جب سے ہمارے گروپ میں آئی ہو، میں تب سے ہی نوٹس کر رہا ہوں۔ تم بہت رعب جماتی ہو۔ اور ہر بات میں حکم چلاتی ہو۔ پتا نہیں تمہاری اور داؤد کی دوستی کیسے ہو گئی۔ اتنی عجیب سی ہو تم۔ اب یہی دیکھ لو، ایک شادی کی موووی کو تم نے تماشا بنا کر رکھ دیا ہے۔ بار بار ایک ہی بات کی تکرار کیے چلی جا رہی ہو کہ آنٹی کو بُرا لگے گا۔ کیوں وہ کیا اکیلی اس دنیا میں ڈائیورسی خاتون ہیں۔ یا ڈائیورس کوئی ایسی ہی انہونی چیز ہے؟"

"میں نے ڈائیورس کی بات کب کی؟" مہر حیران ہوئی تھی پھر اس نے گھور کر فرمان کو دیکھا۔

"تمہارا دماغ کام کرتا ہی نہیں ہے۔ اسی لیے میں تم سے زیادہ بات کرنا پسند نہیں کرتی۔ میں نے داؤد سے کہا بھی تھا کہ تمہیں نہ بلائے۔ تمہاری باتوں کو ہضم کرنا عام اسٹیمنا والے شخص کے لیے تو بہت ہی مشکل ہے۔ اس لیے بہتر ہے کہ مجھے مخاطب مت کرو۔" وہ سپاٹ سرد لہجے میں بولی تھی۔

"اب ایسی بات بھی نہیں ہے۔ تم خود ہی فرمان سے جھگڑے کے بہانے تلاش کرتی رہتی ہو۔"

فرمان کی حمایت میں خلود آگے آئی تو زوہیب مہر کی مدد کے لیے اس کے ساتھ ہو گیا۔ اچھی بھلی تقریب خانہ جنگی میں بدلنے لگی تھی کہ شور سن کر مسز گوپی بھی کچن سے واپس ہال میں آ گئیں۔ ان کے ٹوکنے پر لڑائی تو ختم ہو گئی تھی مگر رنجش باقی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

یہ پارٹی سے دو روز بعد کی بات تھی۔ بچوں کی بات بڑوں تک دو سے ضرب کھا کر پہنچی تھی اور داؤد کی ممی تک پہنچتے پہنچتے ایک ننھی سی بات نے اتنی ضربیں کھالی تھیں کہ رائی کے پہاڑ والا محاورہ درست لگنے لگا تھا۔

"سی ڈی کس نے لگائی تھی؟" ممی نے اس سے پوچھا تھا۔ وہ اپنی کسی دوست سے ایک لمبی فون کال کے بعد فارغ ہوئی تھی۔ ان کا لہجہ سخت اور آنکھیں سُرخ ہو رہی تھیں۔ چہرے کے نقش کھنچے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔

"مہر نے۔" اس نے بتا دیا تھا۔ یہ تو حقیقت ہی تھی۔

"تم نے روکا نہیں؟" وہ دوسرا سوال پوچھ رہی تھیں۔

"میں نے کہا تھا لیکن وہ مانی نہیں۔" داؤد کو اندازہ تھا کہ جھگڑے کی بات ان تک پہنچ چکی ہے۔ اس لیے ان سے کچھ چھپانا بے کار تھا اور اس سے کچھ چھپایا جاتا بھی نہیں تھا۔

"تم نے خود کیوں بند نہیں کیا اسے؟" انہوں نے اب کی بار اپنی کنپٹیاں رگڑتے ہوئے سوال کیا تھا۔

"میں کرنے ہی والا تھا۔ لیکن وہ سب کہنے لگے کہ رہنے دو۔ وہ سب......" انہوں نے اس کی بات کاٹ دی۔

"وہ سب......؟" وہ چلائیں۔ "وہ سب......؟ یا صرف وہ دو چھٹانک کی مہر افروز؟" وہ غرائی تھیں۔ ان تک جو بات پہنچائی گئی تھی اس کا سیاق و سباق مختلف ہو چکا تھا۔ داؤد چھوٹا سا بچہ نہیں تھا لیکن بہر حال وہ بچہ ہی تھا،

اور اپنی ممی سے ڈرتا بھی تھا۔

"سب ہی کو پسند آرہی تھی وہ مووی۔ سب ہی آپ کی تعریف کر رہے تھے۔" داؤد جھجک کر بولا تھا۔

"وہ تعریف نہیں کر رہی تھی۔ وہ تمہاری ماں پر پھبتیاں کس رہی تھی۔ وہ جتا رہی تھی کہ تمہاری ماں کی حیثیت پھوٹی کوڑی کی بھی نہیں ہے کیونکہ ایک ہینڈسم آدمی نے اسے ڈائیورس دے کر اس کی اوقات دو کوڑی کی بھی نہیں رہنے دی۔" وہ سابقہ انداز میں بولی تھیں۔

"نہیں ممی۔ مہر نے ایسا کچھ نہیں کہا تھا۔ بات یہ نہیں تھی۔ وہ تو یہ کہنا چاہتی تھی کہ......" داؤد نے وضاحت کرنی چاہی مگر ممی نے ناراضی کے عالم میں پھر اس کی بات کاٹ دی تھی۔

"داؤد! تم ابھی بھی اس لڑکی کی حمایت کر رہے ہو۔ شرم کرو کچھ۔ اتنی انسلٹ ہوئی ہے میری سارے سرکل میں اور یہ سب اس لڑکی کی وجہ سے ہوا ہے جسے تم نے سر چڑھا رکھا ہے۔ شہلا ٹھیک کہتی ہے کہ قصور تو اپنی اولاد کا ہوتا ہے اور ہم غصہ دوسروں پر نکال دیتے ہیں۔ تمہارا دماغ خراب کر دیا ہے اس لڑکی نے۔ وہ جو چاہتی ہے، تم سے منوا لیتی ہے۔ تم انسان کے بچے ہو یا چابی والا کھلونا۔" وہ ہر لفظ ادا کرتے ہوئے جیسے دانتوں تلے مہر کو چبا رہی تھیں۔

"ممی پلیز آپ میری بات سُن تو لیں۔ ایسے نہیں ہوا تھا جیسے سب کچھ آپ کو بتایا گیا ہے۔ آپ مجھے ایکسپلین کرنے کا موقع تو دیں۔" اس نے کھسیا کر کہا تھا۔

"کوئی ضرورت نہیں ہے۔ اس سارے مسئلے کی وجہ سے جو اذیت مجھے ہونی تھی ہو چکی۔ تمہاری کسی وضاحت سے وہ کم نہیں ہوگی۔ لیکن اب میری ایک بات کان کھول کر سُن لو داؤد۔ مجھے یہ لڑکی اپنی زندگی میں نہیں چاہیے۔ آج کے بعد تم اس لڑکی سے کوئی تعلق نہیں رکھو گے۔ وہ لڑکی اس عمر میں اتنی شاطر ہے۔ وہ بڑی ہو کر تو تم جیسے کاٹھ کے الو کو باڑہ مارکیٹ میں بیچ آئے گی اور میرے ہاتھ کیا آئے گا پھر۔ ساری جوانی تم جیسے احمق بچے پر اس لیے ضائع نہیں کی میں نے کہ آخر میں ایسی کوئی چڑیل تمہیں لے اُڑے۔ آئی سمجھ؟"

داؤد چُپ کا چُپ بیٹھا رہ گیا تھا۔ ممی اتنا ناراض تھیں کہ وہ چاہتے ہوئے بھی کچھ نہ کہہ پایا تھا۔

☆☆☆

"تم کیا چاہتے ہو؟" مہر نے اس سے پوچھا تھا۔ داؤد نے نا سمجھی کے عالم میں کندھے اُچکائے تھے۔ وہ دونوں اپنے اپنے بیگز کندھے پر لٹکائے فٹ پاتھ پر چل رہے تھے۔ یہ ان کا روزانہ کا معمول تھا۔ اسکول بس ان کو ایک ہی اسٹاپ پر اتارتی تھی جہاں سے وہ اکٹھے اپنے اپنے گھر کی طرف جاتے تھے۔ دبئی کا موسم ان دنوں کسی قدر بہتر تھا تو پیدل چلتے ہوئے ان کو مشکل نہیں ہو رہی تھی۔

دو روز تو وہ مہر سے قطع تعلقی کی کوشش کرتا رہا جبکہ وہ اسے بہانے بہانے سے مخاطب کرنے کی کوشش کرتی رہی لیکن وہ ہوں ہاں میں جواب دے کر ٹالنے کی کوشش کرتا رہا۔ تیسرے دن مہر نے براہِ راست اس سے پوچھ لیا تھا۔

"تم مجھ سے ناراض ہو؟ جس کے جواب میں داؤد نے ساری بات بتا دی تھی۔

وہ سب سنتی رہی اور آخر میں اس نے بس یہ سوال کیا تھا جس کا جواب داؤد کے پاس تھا ہی نہیں۔ قریب سے گزرتی گاڑی نے بہت زور سے ہارن بجایا تھا۔ وہ اس جانب دیکھنے لگا جبکہ وہ چند لمحے اس کا چہرہ دیکھتی رہی پھر اس نے دوبارہ پوچھا تھا۔

"تم مجھ سے دوستی ختم کرنا چاہتے ہو داؤد؟" داؤد نے گردن موڑ کر اسے دیکھا۔ وہ یقیناً یہ نہیں چاہتا تھا لیکن اس سے سر اٹھا کر یہ کہا نہیں گیا تھا۔

"میں نے یہ کب کہا مہر۔ وہ تو ممی کہہ رہی ہیں۔" اس کا لہجہ شکست خوردہ تھا۔ وہ چلتے چلتے رُک گئی۔ اس کے چہرے کے تاثرات خوش گوار نہیں تھے۔

''اس کے باوجود تمہیں بھی کچھ تو کہنا چاہیے داؤد۔ ہمیشہ تو ہم دوسروں کی رائے کے مطابق زندگی نہیں گزارتے چلے جاتے۔ ہماری زندگی کے کچھ فیصلے تو ہماری مرضی کے مطابق بھی ہوتے ہیں نا۔ تم مجھے بتاؤ، کیا تم بھی یہ دوستی ختم کرنا چاہتے ہو۔ کیا تمہیں بھی یہی لگتا ہے کہ جو کچھ اس روز ہوا۔ میں اس کی قصوروار ہوں؟'' وہ اب ناراضی سے پوچھ رہی تھی۔

''نہیں مہر! یہ بات نہیں ہے۔'' وہ بعجلت بولا لیکن اس کا موقف ابھی بھی غیر واضح تھا۔ مہر مزید چند لمحے اس کی جانب دیکھتی رہی کہ شاید وہ جملہ مکمل کرے جو کہ داؤد نے نہیں کیا تھا۔ مہر نے گہری سانس بھری تھی۔

''داؤد! کبھی کبھی زندگی میں ایک سمت میں ہونا اچھا ہوتا ہے۔ سڑک کے درمیان میں چلنے والے حادثے کا شکار ہو جایا کرتے ہیں۔ اگر تم اس عمر میں بھی اپنے لیے صحیح اور غلط کا سلیکشن نہیں کر سکتے تو کبھی نہیں کر سکو گے۔ گڈ بائے۔'' اس نے کندھے پر رکھا بیگ ٹھیک کیا تھا اور اس سے دو قدم آگے چلنے لگی تھی۔ داؤد اسے جاتا دیکھتا رہا۔

☆☆☆

''یہ ٹھیک نہیں ہے زہرہ!'' صندل بی کی آواز میں سادگی تھی اور لہجہ بے حد ملائم مگر وہ ایسے اچھلی جیسے کسی سانپ نے ڈس لیا ہو۔ ہاتھ سے قہوے کی پیالی گرتے گرتے بچی۔

نوشابہ اکثر کہا کرتی تھی کہ صندل بی سے کوئی بات چھپانا مشکل ہی نہیں ناممکن بھی ہے لیکن کیا یہ بھی ممکن تھا کہ جس بات کا اعتراف خود سے بھی کرتے دل ڈرتا ہو وہ صندل بی تک پہنچ جائے۔

اس نے ذرا کی ذرا نظریں اٹھا کر ان کی جانب دیکھا۔ چینی کی نازک پلیٹ میں دار چینی والے کیک کا سلائس ان کی توجہ کا مرکز تھا۔ دار چینی، گڑ اور بادام کی گریوں سے بنا یہ کیک زہرہ کی پہچان تھا اور صندل بی کو بہت پسند تھا۔ سردیوں میں ہری حویلی والے بوری بھر کر اخروٹ اور بادام بھیجا کرتے تھے تو وہ بہت محنت سے ان کی گریاں نکال کر رکھ لیتی تھی پھر جب جب صندل بی دار چینی والے کیک کی فرمائش کرتیں تو وہ ان ہی گریوں کا پاؤڈر بنا کر انہیں آٹے کی جگہ استعمال کرتے ہوئے ایسا خستہ کیک تیار کرتی تھی کہ سب تعریف کرتے تھے۔

''آج میٹھا کچھ کم لگ رہا ہے۔ گڑ ختم ہو گیا ہے کیا۔؟'' وہ کانٹے کے ساتھ ایک اور لقمہ منہ میں رکھتے ہوئے پوچھ رہی تھیں۔ زہرہ نے ایک لمحہ رک کر پہلے اپنے اعصاب کو راضی کیا پھر بولی۔

''نہ...... نہیں ختم نہیں ہوا۔ لیکن میں نے آج گڑ نہیں ڈالا۔ اماں شہد لائی تھیں اس بار۔ وہ ڈالا ہے۔ نوشابہ بتا رہی تھی گھر کا شہد زیادہ اچھا ہوتا ہے۔ گڑ سے بھی زیادہ اچھا۔''

وہ عجلت بھرے انداز میں وضاحت دے رہی تھی۔ صندل بی نے اس کا جملہ مکمل ہونے تک ایک اور لقمہ لے لیا تھا۔ اس کی بات پر وہ مسکرائیں۔ زہرہ کو مزید تسلی ہوئی لیکن وہ کچھ نہیں بولیں جبکہ وہ کچھ دیر ان کے بولنے کا انتظار کرتی رہی۔

''آپ کو اچھا نہیں لگا؟'' اس نے خود ہی پوچھ ڈالا۔ وہ مزید مسکرائیں اور اپنی خالی پلیٹ تپائی پر رکھ دی۔

''میں نے یہ کب کہا؟'' یہ تو زہرہ جانتی تھی کہ وہ آسانی سے اپنی رائے نہیں دیا کرتیں۔ وہ بھی چپ ہو گئی لیکن پھر زیادہ دیر چپ بھی نہیں رہا گیا۔

''آپ نے کہا تھا کہ یہ ٹھیک نہیں ہے۔؟'' صندل بی نے ناک سکیڑی۔

''میں نے اس کیک کے متعلق یہ نہیں کہا تھا۔ میں نے یہ بات تمہارے رویے کے متعلق کہی تھی۔ ٹھیک مجھے تمہارا رویہ نہیں لگ رہا۔ کچھ الجھی الجھی سی ہو۔ جیسے کچھ کھو گیا ہو۔''

اب وہ اس کی آنکھوں میں جھانک رہی تھیں اور یہ چیز زہرہ کے لیے قیامت سے بڑھ کر تھی۔

''نہیں تو...... میں تو بس......'' اس سے بات بن ہی نہ پائی۔ وہ گڑبڑا گئی تھی۔ صندل بی چند لمحے اس کا چہرہ

دیکھتی رہیں۔

"اچھی بات ہے۔ اگر یہی سچ ہے تو...... اب لاؤ۔ قہوے کا کپ دے دو مجھے۔" انہوں نے بات خود شروع کی تھی اور خود ہی ختم کر دی۔ اس نے سکھ کا سانس لیا۔ انہوں نے قہوہ ختم کرنے تک اسے مزید مخاطب نہیں کیا تھا لیکن جب وہ کپ اٹھانے لگی تو انہوں نے پھر ایک سوال کیا تھا۔

"تم تہجد پڑھتی ہو زہرہ۔؟" روانی سے برتن سمیٹتے اس کے ہاتھ لمحہ بھر کے لیے سست ہوئے تھے۔ اس نے ان کی جانب دیکھا۔ ایک جھوٹ وہ بول چکی تھی، دوسرا نہیں بول سکتی تھی اس لیے پوری سچائی سے نفی میں گردن ہلائی۔ ان کی نصیحت کے باجود وہ کبھی باقاعدگی سے تہجد پڑھنے کی عادت نہیں اپنا سکی تھی۔

"پڑھا کرو زہرہ! اگر نور القلوب درکار ہو تو تہجد ضرور پڑھنی چاہیے۔ اور نور القلوب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی من چاہی خواہش۔ کوئی پسندیدہ چیز۔ یا پھر کوئی جیتا جاگتا انسان۔"

انہوں نے کہا تھا اور تسبیح تھام لی تھی۔ زہرہ کے ہاتھ جو ست ہوئے تھے اب کی بار تھم سے گئے تھے۔ اس نے چلتے ہوئے اپنے قدموں کو بے حد بھاری محسوس کیا۔

"نور القلوب کچھ بھی ہو سکتا ہے۔ کوئی جیتا جاگتا انسان بھی۔" الفاظ جیسے دل پر گڑ گئے تھے۔

☆☆☆

"یہ والی قمیص بھول گئے تم؟"

گلے نے اس بار بہت پُر امید نگاہوں سے اس کی جانب دیکھ کر سوال کیا تھا کہ شاید وہ کچھ جواب دے گا اور گفتگو کی کوئی سبیل بنے گی مگر وہ ٹس سے مس نہ ہوا۔ خوشحال خان میں اس کی جان تھی اور اس کا سرد رویہ دیکھ کر یہ جان نکلی جا رہی تھی۔ اس نے تیسری بار اس کے سوال کو نظر انداز کر کے اپنا کام جاری رکھا تھا۔

وہ اپنے بیگ کو اٹھا کر گاڑی کی پچھلی سیٹ پر رکھ رہا تھا۔ گلے کی جانب سرسری سی نگاہ بھی ڈالے بغیر وہ دوبارہ اپنے کمرے کی جانب چل دیا تھا۔

وہ چند لمحوں بعد اسلام آباد کے لیے نکل رہا تھا۔ خان بابا نے وراثت کو جیپ کے ساتھ بھجوا دیا تھا اور وہ ساری صورت حال سے اس قدر بیزار تھا کہ اس نے رحمت کو آواز دینا بھی مناسب نہ سمجھا تھا بلکہ خود ہی اپنا سامان جیپ میں رکھنا شروع کر دیا تھا جبکہ عام حالات میں وہ نواب بن کر کھڑا رہتا تھا اور اس کا سارا سامان جیبہ ماسی اور رحمت ہی رکھا کرتے تھے۔

وہ جب بھی چھٹیوں کے بعد اسلام آباد کے لیے نکلتا تھا تو ساری حویلی میں ہلچل مچا دیتا تھا۔ "میرا فلاں کام رہ گیا۔ میری فلاں چیز نہیں مل رہی۔" کا راگ مستقل ہی چلتا رہتا تھا لیکن آج وہ اس قدر چپ تھا کہ گلے کو ہول آنے لگے تھے۔ وہ بھاگ کر اس کے کمرے تک گئی تھی۔

"تم مجھ سے ناراض ہو خوشحال خان۔" وہ اس کے بالکل قریب آ کھڑی ہوئی تھی۔

وہ ایک دم مڑا جیسے اسے یہ سوال بالکل اچھا نہ لگا ہو۔ چہرے کے تاثرات انتہائی سرد ہو رہے تھے پھر اپنے بیڈ کی جانب مڑا اور نیچے بیٹھ کر جاگرز کے تسمے باندھنے لگا پھر جب باندھ لیے تو بھی وہیں بیٹھا رہا۔

"کیوں گلے۔ تم سے کیوں ناراض ہونے لگا۔ تم ہو کون میری؟" وہ اس قدر ٹوٹے ہوئے انداز میں بولا تھا کہ گلے کا نازک دل اچھل اچھل کر ادھم مچانے لگا۔ وہ تڑپ کر آگے بڑھی اور اس کے پاس بیٹھ گئی۔ وہ کس قدر بیگانہ لگ رہا تھا۔ ہر چیز سے لاتعلق، ہر چیز سے خفا۔ سپاٹ چہرہ لیے بس اپنے آپ میں گم۔ ایک دم سے اس کی جانب مڑا۔

"بتاؤ نا گلے۔ میں کیوں ہونے لگا ناراض۔ تم میری ہو کون۔ میری مری ہوئی ماں کی بہن۔ میرے باپ کی

دوسری بیوی۔"

"خوشحل خاناں۔" گلے سسکی۔

"یہ مت کرو میرے ساتھ۔ یہ مت کرو۔" وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ خوش الحان اسی حالت میں بیٹھا رہا۔

☆☆☆

ہم تمہیں مُفت مل گئے تھے نا
کسی روتے ہوئے مفلس کی ہتھیلی پر رکھے کسی بدرنگ نوٹ پُرانے کی طرح
سو تم نے خرچا ہے ہمیں مسجد سے چُرائے ہوئے نذرانے کی طرح

"کیا واقعی اولاد بھی اس طرح سے خرچ کی جاسکتی ہے خان بابا۔ کیا واقعی میں آپ کے لیے ایک بدرنگ سکہ ہوں۔"

اس نے بوجھل دل کے ساتھ سوچا تھا۔ ایک طرف اپنی زندگی ہار دینے کا دُکھ تھا، دوسری جانب گلے کا دل توڑ دینے کا قلق بھی تھا مگر سب سے بھاری خان بابا کی بے پروائی اور زیادتی کا احساس تھا۔ وہ ہمیشہ لاریب کی وجہ سے اس کی ذات کی نفی کرتے آئے تھے لیکن وہ چاہ کر بھی ان سے نفرت نہیں کر پاتا تھا۔ وقتی طور پر اُلجھتا تھا، جھنجھلاتا تھا اور پھر خود ہی ٹھیک ہو جاتا تھا لیکن سوال یہ تھا کہ یہ لاریب تھی کون؟ خان بابا اپنے بیٹے پر اسے ترجیح دیتے کیوں تھے؟

جیپ سڑک پر دوڑ رہی تھی اور اس کا ذہن ماضی کی جانب رواں دواں تھا۔

"لاریب کون تھی اور ان کی زندگی میں کیوں تھی۔"

یہ وہ سوال تھے جو اس کے ذہن میں ہمیشہ ہی تب پیدا ہوتے تھے جب اس کی وجہ سے اس کے ساتھ زیادتی ہوتی تھی اور یہ زیادتی ہوتی ہی رہتی تھی۔ خان بابا نے اس کی زندگی میں کبھی کسی چیز کی کمی نہیں رہنے دی تھی لیکن مسئلہ یہ تھا کہ اگر اسے ایک چیز ملی تھی تو لاریب کو وہی چیز "دو" ہو کر ملتی رہی تھی۔ وہ خان بابا کی اکلوتی اولاد ہو کر بھی کبھی اکلوتا نہیں رہا تھا۔ لاریب اس کی زندگی میں شامل نہ ہو کر بھی ہمیشہ شامل رہی تھی حالانکہ وہ اس کی بہن تھی نہ کزن۔ اس کا ان سے کوئی خون کا رشتہ بھی نہیں تھا۔

"لاریب کون ہے خان بابا؟" جب پہلی بار وہ اسے لاریب سے ملوانے اسلام آباد لے گئے تھے تو واپسی پر بگرام جاتے ہوئے راستے میں اس نے ان سے سوال کیا تھا۔ انہوں نے اسٹیئرنگ پر مضبوطی سے ہاتھ جماتے ہوئے ایک نظر اس پر ڈالی مگر بولے کچھ نہیں۔

"کیا وہ آپ کی بیٹی ہے خان بابا؟" خوش الحان کو بچپن میں اسی طرح بنا سوچے سمجھے متعدد سوال پوچھنے کی بیماری تھی۔

"نہیں۔ لیکن وہ میری بیٹیوں کے جیسی ہی ہے" انہوں نے مسکراتے ہوئے جواب دیا تھا۔

"یعنی میری بہن جیسی؟" اگرچہ اسے یہ بات پسند نہیں آئی تھی کیونکہ لاریب سے مل کر اسے اچھا نہیں لگا تھا اسی لیے اس کے متعلق بات کرتے ہوئے اس کے چہرے کے تاثرات بھی خوشگوار نہیں تھے۔ انہوں نے عادت کے مطابق نفی میں گردن ہلائی لیکن عادت کے مطابق بولے کچھ بھی نہیں۔ خوش الحان بھی چپ ہو گیا تھا لیکن اسی روز رات کو انہوں نے اسے اپنے کمرے میں بلوایا اور اپنے ساتھ بستر پر بٹھا کر مٹھی بھر اخروٹ کی گریاں دیتے ہوئے کہا۔

"ہر عورت ہماری ماں، بہن بیٹی جیسی نہیں ہو سکتی لیکن اس بات سے اس کی تکریم میں کوئی فرق نہیں پڑتا۔

لاریب تمہاری بہن ہے نہ تمہاری بہن جیسی ہے۔لیکن وہ تمہارے لیے باعثِ تکریم ہے، باعثِ عزت ہے۔اور مجھ سے وعدہ کرو کہ تم ہمیشہ اس بات کا خیال رکھو گے۔مجھ سے وعدہ کرو خوش الحان کہ تم ہمیشہ لاریب کا خیال رکھو گے۔" اتنی التجا خوش الحان نے کبھی ان کے لہجے میں نہیں دیکھی تھی۔وہ تو بے چین ہو گیا تھا۔خان بابا کو خوش کرنے کے لیے تو وہ کچھ بھی کر سکتا تھا۔اس نے بنا سوچے سمجھے بس اثبات میں سر ہلا دیا تھا۔

"میری بات مانو گے نا خوش الحان۔لاریب کا خیال رکھو گے نا خوش الحان؟ مجھ سے وعدہ کرو۔" وہ سابقہ انداز میں پوچھ رہے تھے۔خوش الحان نے ایک بار پھر سر ہلایا۔

"جی خان بابا۔میں وعدہ کرتا ہوں۔" اس نے وعدہ کر لیا تھا اور یہ وعدہ وہ اب تک نبھا رہا تھا۔

☆☆☆

"آنٹی گھر آ گئی ہیں۔"

یہ اسی روز شام کی بات تھی۔ڈور بیل بجنے پر اس نے انٹر کام پر سست سے انداز میں پوچھا تھا۔دوسری جانب مہر کی آواز سن کر اسے خفیف سا جھٹکا لگا۔

چند گھنٹے پہلے ہی تو وہ اسے گڈ بائے کہہ کر چلی گئی تھی جس کی وجہ سے داؤد کا دل بہت بوجھل تھا اور اب وہ ان کے فلیٹ کے دروازے پر کھڑی تھی تو اسے بہت اچھا لگا لیکن ممی کی ناراضی کی تلوار ابھی بھی گردن پر لٹک رہی تھی۔اس نے ممی کے بیڈ روم کی جانب دیکھا۔وہ اپنے کمرے میں موجود تو تھیں لیکن وہ مہر کو گھر میں دیکھ کر ناراض ہو سکتی تھیں۔

"مجھے آنٹی سے ملنا ہے۔ان سے پوچھ کر بتا دو کہ کیا وہ مل سکتی ہیں؟"

اس نے انٹر کام پر ہی کہا تھا۔داؤد کو دروازہ کھولنے میں اس قدر متامل دیکھ کر اس نے شاید خود ہی فرض کر لیا تھا کہ آنٹی شاید اس سے نہ ملنا چاہیں۔

"ہاں ہاں شیور۔ایک منٹ۔" اس نے فوراً کہا تھا پھر وہ تیزی سے چلتا ممی کے کمرے تک گیا۔دروازہ کھلا ہی تھا۔

"ممی! آپ سے ملنے آیا ہے کوئی۔کیا میں اندر بلوا لوں؟" اس نے جان بوجھ کر مہر کا نام نہیں لیا تھا۔

"مجھ سے؟ اس وقت......کون؟" وہ حیران تھیں۔فون کیے بنا ان کی کوئی سہیلی یا شناسا ملنے کے لیے نہیں آتا تھا۔انہوں نے بستر سے اتر کر اپنی قمیص کی شکنیں ہاتھوں کی مدد سے درست کیں۔

"کوئی میل ہے یا فی میل؟" بالوں میں فٹافٹ برش کرتے ہوئے وہ پوچھ رہی تھیں۔داؤد کا دل چاہا انہیں بتا دے کہ مہر افروز ہے۔مگر پھر وہ چپ رہا اور لاعلمی ظاہر کرنے کندھے اچکا دیے۔ممی نے خود ہی جا کر دروازہ کھول دیا تھا۔

مہر کو دیکھ کر وہ یقیناً اچھا محسوس نہیں کر رہی تھیں لیکن انہوں نے اس کے سلام کا جواب دیتے ہوئے اسے اندر آنے دیا تھا۔مہر کے ہاتھ میں سرخ گلابوں کا بڑا سا بوکے تھا۔ایک اسٹوڈنٹ کے لیے یہ بوکے خریدنا ایک مہنگی ڈیل تھی۔داؤد کی ممی خود بھی وہ پھول دیکھ کر حیران ہوئی تھیں۔

"آنٹی! مجھے پتا ہے آپ مجھ سے ناراض ہیں۔لیکن غلطیاں بچوں سے ہی ہوتی ہیں۔آپ پلیز مجھے معاف کر دیں۔اور ناراضی ختم کر دیں۔"

وہ داؤد کو قطعاً نظر انداز کرتے ہوئے ان سے مخاطب تھی۔ممی کو اس جملے کی توقع نہیں تھی۔وہ ذرا سا مسکرائیں۔اس نے پھول ان کی جانب بڑھا دیے تھے۔انہوں نے بھی پکڑ لیے۔انہیں ایک بچی کا معذرت کرنے کا یہ انداز اچھا لگا تھا۔

"نہیں۔ مہر ڈیر۔ ایسا تو کچھ نہیں ہے۔" وہ دونوں مسکراتے ہوئے اندر کی جانب چل دی تھیں۔ داؤد پیچھے ہی کھڑا رہ گیا تھا۔

☆☆☆

ممی اور مہر افروز کے تعلقات میں اس دن کے بعد ایک خوش گوار ٹرن آیا تھا اور اسی دن کے بعد داؤد کو اندازہ ہوا کہ مہر اس کے لیے بہت اہمیت کی حامل ہو چکی ہے۔ اس کے چلے جانے کے خیال سے جو بے چینی اور اضطراب اس نے اپنی ذات میں محسوس کیا تھا وہ پہلے کبھی محسوس نہ ہوا تھا اور جب وہ واپس آ گئی تو جو اطمینان اور سرخوشی میسر ہوئی تھی، ایسی مسحور کن خوشی پہلے کبھی نہ ملی تھی۔

آہستہ آہستہ وہ دونوں ایک دوسرے کے مزید قریب آتے چلے گئے تھے اور اب کی بار اس میں ممی کی رضا بھی شامل تھی۔ وہ دیکھ رہی تھیں کہ مہر افروز کی شخصیت کے سب مثبت پوائنٹ آہستہ آہستہ ان کے بیٹے کی شخصیت میں بھی پیدا ہونے لگے تھے۔ وہ پہلے سے زیادہ سمجھ دار، زیادہ زور آور اور زیادہ پُرکشش ہوتا جاتا تھا۔ یہ مہر ہی تھی جس کے سمجھانے پر اس نے جم جوائن کیا تھا۔ اسی کی نصیحت پر وہ مختلف شارٹ کورسز کرنے پر رضا مند ہوا تھا اور یہ اسی کا مشورہ تھا کہ وہ مزید پڑھائی کے لیے یورپ کے مختلف آپشنز پر غور کرنے لگا تھا۔

☆☆☆

"ارباب! تم نے خوشل کو دیکھا؟" وہ ڈائننگ ہال میں بیٹھا کھانا کھا رہا تھا جب طاہر نے آ کر پوچھا۔ وہ سب لوگ ایک ایک دو دو دن کے وقفے سے ہاسٹل واپس آئے تھے۔ ایک ارباب تھا جو یہاں ہی موجود تھا کیونکہ وہ گھر گیا ہی نہیں تھا۔ اب جو بھی آ رہا تھا اس سے ہی باقی دوستوں کی بابت سوال کر رہا تھا۔ اس نے رغبت سے اپنے سامنے رکھی بریانی کی پلیٹ سے چمچہ بھر کر منہ میں رکھا اور بولا۔

"نہیں کیوں؟ خیریت۔ کیا ہوا؟" وہ سنجیدگی سے پوچھ رہا تھا جو کہ عام طور پر اس کی عادت نہیں تھی۔ طاہر اس کے ساتھ ہی بیٹھ گیا اور انتظار کرنے لگا کہ جیسے ہی وہ چمچہ پلیٹ میں رکھے تو وہ بھی بہتی گنگا میں ہاتھ دھو لے۔ ارباب کو بھی اس بات کا پتا تھا اس لیے اس نے چمچہ کو مزید سختی سے پکڑ لیا۔ طاہر جی بھر کر بدمزا ہوا۔ ارباب چکن کا تیا پانچہ کرتے ہوئے اسے ہی سوالیہ انداز میں دیکھ رہا تھا۔

"وہ مجھ سے ڈیوس کا نمبر مانگ رہا تھا۔ میں نے نہیں دیا تو وہ ناراض ہو گیا۔ مجھے شک ہے وہ پھر اس طرف گیا ہے۔"

"ڈیوس؟" اس نے استفہامیہ انداز میں دہرایا تھا۔ اسے یاد نہیں آیا تھا کہ وہ کس کی بات کر رہا ہے۔

"میں جانتا ہوں اسے۔ ہمارے بیچ کا ہے؟" ارباب نے پوچھا تھا۔ طاہر جھنجلایا لیکن پھر بھی لہجے پر قابو رکھا۔

"نہیں۔ جونیئر ہے۔ وہی جس کی آنکھ کے نیچے ٹیٹو بنا ہے۔ وہ جو۔" تذبذب کے عالم میں وہ کہتا کہتا رک گیا کہ وہ جو لاریب کا دوست ہے کیونکہ خوشل کے سامنے وہ یہ ذکر کرتے نہیں تھے لیکن ارباب فوراً پہچان گیا تھا۔

"آں ں۔ یاد آیا۔ وہی جس نے خوشل کو مکا مارا تھا۔ اسے کیسے بھول سکتا ہے ارباب۔ وہ تو یاد رکھنے کی چیز تھا۔ لیکن خان کو اس کا نمبر کیوں چاہیے۔" ارباب زیادہ دیر سنجیدہ رہ نہیں سکتا تھا۔ اس سے پہلے کہ طاہر کچھ کہتا خوش الحان کی سرد مہری سے بھرپور آواز عقب سے سنائی دی تھی۔

"کس مائی کے لعل میں جرات ہے کہ خوش الحان کو مکا مارے۔ مکا میں نے اسے مارا تھا۔ یہ بات کیسے بھول گئے ارباب جانی۔"

"اوہ ہاں یاد آیا۔ لیکن یار یہ تو بتا دو کہ تم نے مکا مارا کیوں تھا؟" ارباب کی سنجیدگی بس پانی کا بلبلہ ہوا کرتی تھی۔

طاہر نے اس کا دھیان خوش الحان کی جانب دیکھا تو چمچہ اس کے ہاتھ سے اچک لیا پھر بریانی والی پلیٹ اٹھا کر اطمینان سے ساتھ والی میز پر جا بیٹھا۔

"تم دونوں مجھے یہ بتاؤ ڈیوس کا نمبر لا سکتے ہو یا نہیں؟" لہجے میں سرد مہری اور اکتاہٹ کا عنصر واقعی زیادہ تھا۔

"آف کورس نہیں۔ تم جب تک بتاؤ گے کہ نہیں کہ تمہیں اس کے نمبر کا کرنا کیا ہے۔ تب تک میں تمہارا رابطہ اس سے نہیں کروا سکتا۔ تمہارا کیا بھروسا اسے ایک مکے کی وجہ سے قتل ہی کر دو۔ پٹھان تو ویسے ہی ایسی حرکتوں کے لیے مشہور ہیں۔" خوش الحان زچ ہو گیا تھا۔

"ٹھیک ہے مت بتاؤ۔ میں خود ہی ڈھونڈ لوں گا اسے۔" وہ اٹھ کر باہر جانے لگا تھا۔ ارباب نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اس کو اٹھنے کی کوشش ناکام بنادی تھی۔

"یار ایک تو تم لڑکیوں کی طرح ذرا ذرا سی بات پر ناراض ہو جاتے ہو۔ میں نے صرف یہ پوچھا ہے کہ تمہیں اس لڑکے کا نمبر کیوں چاہیے۔ تم جانتے ہو نا۔ وہ ڈرگز ڈیلنگ کے لیے بدنام ہے۔ کوکین بیچتا ہے وہ؟"

ارباب نہایت سنجیدگی سے اس کی جانب دیکھ رہا تھا۔ خوش الحان نے خالی خالی نظروں سے اس کی جانب دیکھا۔

"ہاں۔ اور میں اسی لیے اس کا نمبر مانگ رہا ہوں۔ کیونکہ مجھے کوکین چاہیے۔" اس کا لہجہ دوٹوک تھا۔ ارباب حیران رہ گیا تھا۔

☆☆☆

"کیا میں اندر آ سکتا ہوں؟"

انہوں نے دستک دینے کے ساتھ ساتھ زبان سے بھی اجازت طلب کی تھی۔ لاریب رضائی میں دھنسی ہوئی تھی۔ آواز سن کر اس نے رضائی سے منہ نکالا تھا۔

"آجائیں خان بابا۔" یہ کہتے ہوئے سیدھی ہو کر بیٹھ بھی گئی تھی۔ وہ آہستہ سے دروازہ کھول کر اندر چلے آئے۔

"کیسی ہے ہماری بیٹی اب؟ طبیعت کچھ بہتر ہوئی؟" اس کے بستر کے سامنے کھڑے ہو کر انہوں نے نرم سے لہجے میں پوچھا تھا۔

"میں ٹھیک ہوں خان بابا۔" وہ دھیمی آواز میں بولی تھی۔ انہوں نے اس کی آواز سے ہی اندازہ لگا لیا تھا کہ وہ ابھی بھی مکمل طور پر ٹھیک نہیں ہے۔

"اچھی بات ہے۔ لیکن اب بستر کو چھوڑ دیں۔ دوپہر کے کھانے کا وقت ہو چلا ہے۔ گل لالہ نے چکن سوپ بنایا ہے۔ آئیں، ہم مل کر انجوائے کرتے ہیں۔" وہ اسی طرح کھڑے کھڑے بات کر رہے تھے۔ لاریب چند لمحے اسی طرح سر جھکائے بیٹھی رہی۔

"میں آپ کا انتظار کر رہا ہوں۔ آجائیں۔" اتنا کہہ کر وہ مڑے تھے تب ہی ان کی نگاہ میز پر پڑے سگریٹ کے ٹکڑے پر پڑی تھی۔ وہ ششدر رہ گئے تھے۔ ہری حویلی میں کوئی بھی سگریٹ نہیں پیتا تھا۔ لاریب نے ان کا چونکنا واضح طور پر محسوس کیا تھا۔ ایک لمحے میں اس کی توجہ میز پر پڑی اس چیز کی جانب مبذول ہو چکی تھی جس نے خان بابا کو ٹھٹک کر رک جانے پر مجبور کیا تھا۔ اس کے چہرے پر عجیب سی مسکراہٹ چمکی اور غائب ہو گئی۔

"یہ میں نے رکھا ہے خان بابا۔ آئی ایم سوری میں اسے اٹھانا بھول گئی۔ یہ مجھے خوش الحان نے دیا تھا۔"

آخری جملے کے ایک ایک لفظ پر زور دیتے ہوئے اس نے کہا تھا۔ وہ عقب سے ان کا چہرہ نہیں دیکھ پائی تھی لیکن اسے بخوبی اندازہ تھا کہ ان کے چہرے کا رنگ بہت تیزی سے بدلا تھا۔

☆☆

باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ

سلویٰ سیف اللہ بٹ

فیصلہ

سلائی مشین کی گھرر گھرر خاموش گھر میں ارتعاش پیدا کر کے تھم جاتی۔ قریب ہی ان کے کپڑوں کا چھوٹا سا ڈھیر پڑا تھا۔ اس نے کل اور پرسوں کی تاریخ کو لوٹائے جانے والے کپڑے نکال کے الگ سے رکھ لیے تھے۔ جتنی تیزی سے مشین کا پہیہ گھوم رہا تھا۔ اتنی ہی تیزی سے اس کے دماغ میں الجھی سوچیں۔

"بھابھی جی، اب کسی کے کپڑے نہیں پکڑنے، امی جی بری خریدنے گئی ہیں۔ پھر ہمارے کپڑے بھی تو تین چار روز تک آجائیں گے، شادی میں صرف سترہ روز باقی ہیں۔"

اس کی نند مدیحہ اس کی چھوٹی بیٹی کو اٹھائے اندر سے نکلی تھی۔ نادیہ کے منہ پر سیریلیک لگا ہوا تھا۔ وہ بھابھی سے بات کرتے، صحن میں بنے کمرے کی طرف بڑھ گئی۔

"ارادہ تو میرا بھی یہی ہے۔ اس ڈھیر کو ختم

کرنے میں بھی دو تین روز لگ جائیں گے۔ تم مہربانی کر کے، شلواریں سلائی کر کے، قمیصوں کی ترپائی کر دینا، فریحہ سے کہوں گی کل اتوار ہے سارے کپڑے وہ استری کر دے۔ تاکہ یہ سارا کام جلد از جلد نمٹ جائے۔"

"اس نے بڑی مہارت اور صفائی سے قمیص کا گلا بنایا تھا۔ مشین سے قمیص نکال کر استری پھیرنے لگی۔

"جی اچھا، آپ کل تھوڑا سا وقت نکال کر فاخرہ بھابھی کا ناپ بھی لے آئیں۔" مدیحہ بھتیجی کا منہ تولیے سے پونچھ کر، نائلہ کے قریب فرش پر آ بیٹھی۔

"بہتر تھا کہ وہ امی جی کو اپنا جوڑا دے دیتی۔"

مصروفیت نے اسے جھنجلا کر رکھ دیا تھا۔ سلائی کے ساتھ گھر کے سو بکھیڑے، بچوں کو دیکھنا اور پھر اکثر خواتین ڈیزائننگ کے لیے، لیسیں، بٹن، پیکو وغیرہ کا سارا کام اضافی پیسے دے کر اس کے ذمے لگا جاتی تھیں۔

مستقل گاہک الگ سر درد بنے رہتے۔ وہ بارہا اپنی مجبوری بتاتی مگر وہ زبردستی اپنا شاپر دھر جاتے۔ وہ گھن چکر بنی ہوئی تھی۔

"مگر فاخرہ بھابھی کی خواہش ہے وہ اپنا ماپ اور ڈیزائن خود آپ کو سمجھائیں گی۔"

تب ہی مسرت اور واجد بھرے ہوئے شاپرز کے ساتھ گھر میں داخل ہوئے۔ مدیحہ بچوں سا اشتیاق لیے دیوانہ وار ان کی طرف دوڑی۔ نائلہ بھی اپنی اکڑی کمر کو سیدھا کرتی۔ ان کے لیے پانی کا جگ لانے اٹھ گئی۔

☆☆☆

بہتر ہوتا اگر مدیحہ کی شادی بھی واجد کے ساتھ نپٹ جاتی، اس طرح ہمارا بہت سا خرچا بچ جاتا جو بعد میں فریحہ کا جہیز بنانے کے کام آتا۔" میٹرک پاس واجد بڑے دونوں بچوں کو ہوم ورک کروا رہا تھا۔ اس نے سر اٹھا کر بیوی کی بات غور سے سنی۔

مدیحہ اپنے خالہ زاد سے منسوب تھی جو دبئی میں مقیم تھا اور سال بعد آنے کا ارادہ رکھتا تھا جبکہ واجد کا رشتہ غیروں میں طے تھا جو مزید انتظار نہیں کر سکتے تھے۔

"میں نے جو کمیٹی مدیحہ کے فرنیچر کے لیے ڈالی ہے وہ بھی دس ماہ بعد نکلے گی، ہماری نیت صاف ہے ان شاء اللہ ہم بہنوں کے فرض سے باعزت سرخرو ہوں گے۔"

زندگی کی ضروریات کے لیے یونہی جوڑ توڑ کیا جاتا تھا۔ ماجد فیکٹری میں فورمین تھا۔ تیس ہزار تنخواہ تھی۔ واجد گورنمنٹ ادارے میں کلرک تھا۔ گزر بسر اچھی ہو رہی تھی۔ والد کا چند سال قبل انتقال ہوا تو وہ چھوٹے بھائی اور دو بہنوں کا باپ بن گیا۔ وہ بہت صابر و شاکر اور ٹھنڈے مزاج کا تھا۔

"بھیا......" تب ہی منہ بسورتی فریحہ اندر آئی۔ پیچھے مسرت بھی تھیں۔ ان کے چہروں سے لگ رہا تھا کہ فریحہ رو کے اور مسرت زچ ہو کے آئی ہیں۔

"یہ فریحہ یونہی، بلاوجہ ضد کیے جا رہی ہے۔" مسرت نے بیٹی کو خشمگیں نظروں سے گھورتے چپ رہنے کا اشارہ کیا اور اسے بازو سے پکڑ کر باہر لے جانا چاہا۔

"چھوڑ دیں ماں جی، بتاؤ فریحہ کیا مسئلہ ہے؟" ماجد نے چھوٹی اور لاڈلی بہن کا ہاتھ ماں سے چھڑوالیا۔

"بھیا نہم جماعت ہمیں الوداع پارٹی دے رہی ہے۔ میں بھی شریک ہونا چاہتی ہوں۔ امی منع کیے جا رہی ہیں۔"

اس کی آنکھیں پھر سے بھر گئیں۔

"امی جی اس کا اسکول میں آخری سال ہے۔ جانے دیں ناں اسے۔" ماجد نے حمایت کرتے اسے اٹھ کے پہلو سے لگالیا۔

"بیٹا شادی کے اخراجات، گھر کی مرمت، آدھی تنخواہیں تو کمیٹیوں میں کھپ جاتی ہیں۔ میری تو جمع تفریق ہی ختم نہیں ہوتی اور یہ مزید پانچ سو کی فرمائش کر رہی ہے۔"

وہ بیٹی کی خوشی ضائع نہیں کرنا چاہتی تھیں مگر خود بھی مجبور تھیں۔
"پچھلے برس میرے پاس نیا جوڑا نہیں تھا اور اب......"
وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کے رونے لگی۔ اس کے لیے یہ اسکول کی آخری خوشی بہت معنی رکھتی تھی۔
"رومت میری گڑیا......" ماجد کے دل پر گھونسا سا پڑا۔ میں کل تمہیں پیسے دے دوں گا، تم ضرور جانا۔" وہ پندرہ سالہ فریحہ کی خوشی کے لئے ادھار مانگ لیتا۔
"فریحہ میری مشین کے ڈبے میں سلائی کی سات سو اجرت پڑی ہے تم اس میں سے پانچ سو لے لو۔" تب — خاموشی سنتی نائلہ نے سارا مسئلہ ہی حل کردیا۔
"ہرگز نہیں! نائلہ بیٹی تم نے بچوں کے کپڑے بھی خریدنے ہیں اور پھر بارات کے لیے تمہارے پاس بھی نیا سوٹ نہیں۔" مسرت شرمندگی سے کہتے نظریں چرا رہی تھیں۔ کیونکہ نائلہ اپنے اور بچوں کے کپڑے اور اسکول کی فیس کے علاوہ دیگر اخراجات بھی سلائی کی اجرت سے ہی پورے کرتی تھی۔ اس نے کبھی بھی شوہر کو بے جا تنگ نہیں کیا تھا نہ ساس کو کچھ جتایا۔ وہ اکثر مدیحہ، فریحہ کو جوتے، جیولری، شیمپو اور لوشن لے دیتی تھی جس کی وہ دونوں بے حد مشکور رہتیں۔
"امی جی فریحہ بھی میری بیٹیوں جیسی ہے۔ اس کے آنسو اور خوشی پانچ سو سے زیادہ قیمتی ہیں۔"
"شکریہ پیاری بھابھی جان!"
اس کی آنکھوں میں ہزاروں جگنو چمکے، وہ مدیحہ کو بتانے باہر دوڑی۔ ماجد اور مسرت اس کے بے حد ممنون تھے۔

☆☆☆

واجد کی شادی بخیر و خوبی نمٹ گئی، فاخرہ ان کے گھر کا حصہ بن گئی۔ وہ ہنس مکھ سے لڑکی جلد گھل مل گئی۔ نائلہ نے بیس دن بعد دیورانی کا ہاتھ زردے میں ڈلوایا۔
اس روز فاخرہ، شوہر کے آنے سے قبل سرخ اور سیاہ امتزاج کا کڑھائی والا جوڑا زیب تن کیے ہلکے میک اپ کے ساتھ بہت خوب صورت لگ رہی تھی۔ چائے سے فارغ ہونے کے گھنٹہ بھر بعد وہ اپنے کمرے سے نکلے تھے۔
نائلہ ہانڈی بھون رہی تھی۔ مسرت سلاد کاٹ رہی تھیں۔ فاخرہ اور واجد کچن کے دروازے تک آئے۔
"امی جی میں جا رہی ہوں، کھانا کھا کے لوٹیں گے۔" چادر درست کرتے، عام سا لہجہ، اجازت مانگنا یاذکر کرنا ضروری نہیں سمجھا گیا تھا۔
اس کے پیچھے بائیک کی چابی پکڑے واجد، موبائل چیک کر رہا تھا یا نظریں چرا رہا تھا۔ نائلہ اور مسرت نے حیرت سے چونک کر دیکھا۔
"نکلو بھی فاخرہ! اچھا امی جی خدا حافظ۔"
واجد کی پکار نے مسرت کو بولنے نہ دیا۔ نائلہ کے حواس اور زبان گنگ رہ گئی۔ وہ نو برس سے ہر کام مسرت کے صلاح و مشورے سے کرنے کی عادی تھی۔ یہ پہلی دفعہ ہوا تھا پھر روز کچھ نہ کچھ ہونے لگا۔
اگلی صبح اس سے زیادہ دھماکہ خیز تھی۔ واجد نے بڑے بھائی کو تنخواہ دی تو اس میں سے پانچ ہزار کم تھے۔
"واجد! اس میں پانچ ہزار کم ہیں۔" اس نے پیسے گن کر استفسار کیا۔
"جی وہ......" اس نے گلا کھنکارا۔
"کل ہم بازار گئے تھے۔ فاخرہ کو دو سوٹ پسند آ گئے وہ تین ہزار کے تھے۔ اور...... دو ہزار اس نے اپنا جیب خرچ رکھ لیا ہے۔" نظریں اٹھاتے، گراتے اور ہونٹوں پر زبان پھیرتے ساری ردو بدل بتادی۔
مسرت کے سر پر تو چھت ہی آ گری ان کا دل کل شام سے وسوسوں میں گھرا تھا۔ بیٹے نے سب بالا ہی طے کر دیا گھر سے وہ میکے کا کہہ کر گئی تھی واجد

نے تنخواہ کا ذکر تک نہ کیا ورنہ وہ سیدھی لا کر ماں کو پکڑاتا، ماں بڑے بیٹے کو۔ بیوی کو جیب خرچ بھی لگا دیا۔

''مگر..... مگر واجد راشن، بل، دودھ، کمیٹیاں اور قرض الگ سے۔''

''بھائی جان فاخرہ، بھابھی جان کی طرح سلائی تو نہیں کرتی اور اپنی ضروریات کے لیے کسی کے آگے ہاتھ پھیلانا اسے شرمندگی لگتا ہے۔'' اس نے بیوی کے داہرئے الفاظ کہہ دیے۔

کل شام کی تھوڑی سی ندامت اب خود اعتماد میں بدلتی جارہی تھی۔ نائلہ کے دل میں چھری سی کندگی، اس کی طبیعت فاخرہ کی حرکت اور ساس کی خاموشی پہ بوجھل سی تھی۔ وہ تو سلائی کے پیسے اپنی ضروریات کے علاوہ گھر میں بھی خرچ کرلیا کرتی تھی۔ اس نے شادی کے دو ماہ بعد ہی سلائی شروع کردی تھی۔ ماجد اسے کبھی کبھار شال، سوئیٹر یا بچوں کی کوئی چیز دلوادیتا مگر مکمل ذمہ داری اس پر تھی۔

☆☆☆

نائلہ کے دل و دماغ میں ایک عجیب سی جنگ چھڑی رہنے لگی۔ فاخرہ کی حرکتیں، واجد کی طرف داری، ساس اور شوہر کی خاموشی۔ وہ ساس کو پیسے دے کر اکثر سموسے، نان، برگر اور سبزی والے سے پھل وغیرہ لے کر اپنے کمرے میں گھس جاتی۔ جبکہ وہ مل بیٹھ کے کھانے کی عادی تھیں۔ نائلہ کھنچی کھنچی سی رہنے لگی۔ وہ منفی خیالات کو جتنا جھٹکتی وہ اتنا ہی زور آور ہوتے۔ اب تو اس کا بھی دل چاہنے لگا تھا کہ وہ اپنے بچوں کے لیے دودھ، جوس اور فروٹ وغیرہ لے کر انہیں کمرے میں بٹھا کر کھلالیا کرے۔ مسرت کی خاموشی اسے مزید متنفر کردیتی۔

اس کا یہ بھی خیال تھا کہ وہ اس کے ساتھ ناانصافی کررہی ہیں اور کبھی اس کا ذہن ماجد کی طرف بھٹک جاتا کہ اس نے کبھی مجھے جیب خرچ نہیں دیا۔ وہ ایک غیر ذمہ دار شوہر ہے۔

ماجد کاپی اور کیلکولیٹر لیے بیٹھا حساب کتاب لگا رہا تھا۔ نائلہ روٹیاں پکا کر گیلے ہاتھ دوپٹے سے پونچھتی اندر آئی تھی۔ بیڈ کی دراز چابی سے کھول کے ایک پوٹلی نکالی اور احتیاط سے اپنی گود میں الٹ لی۔ سو، پچاس اور چند پانچ سو کے نوٹ تھے وہ انہیں گننے لگی۔

ماجد نے دوبارہ اس پر سرسری سے نگاہ ڈالی۔

''پورے اڑتالیس سو ہیں۔ کل بھی کچھ کپڑے دینے ہیں۔'' اس کی گردن فخر سے اکڑی تھی، چہرے پر الوہی سی چمک تھی۔

''یہ کس لیے ہیں؟'' ماجد نے کاپی بند کرتے یونہی پوچھ لیا۔

''کیا مطلب کس لیے......'' اس کے تن بدن میں آگ سی لگ گئی۔ ''اپنے کسی مشکل وقت، اپنی اولاد اور ذاتی ضروریات کے لیے جمع کیے ہیں خواہشات پر تو پابندی ہے۔ مگر اب میں اپنی اولاد کی خوشیوں پہ ہرگز سمجھوتہ نہیں کرنے والی۔''

نائلہ ایک ایک لفظ چبا کر بولی۔ ماجد ٹک ٹک حیرت سے اس کے خطرناک تیور دیکھ رہا تھا۔ وہ کافی دنوں سے نائلہ کا کھنچاؤ اور بلاوجہ کا چڑنا محسوس کررہا تھا۔

''تب ہی مسرت آگئی۔'' نائلہ نے پھرتی سے پیسوں کی پوٹلی ٹانگ کے نیچے کرلی۔

''جی امی......''

ماجد اس کی حرکت پر پریشان ہوگیا۔

''نائلہ بیٹی تمہارے پاس کچھ رقم ہوگی۔ آٹا منگوانا تھا۔''

مسرت کبھی کبھار اس سے ادھار لے لیا کرتی تھیں۔

''نہیں امی جی، مجھے ابھی سلائی کے پیسے نہیں ملے۔'' اس نے شوہر سے نظریں چراتے بڑی روانی سے جھوٹ گھڑا۔

''اچھا......'' مسرت نے پریشانی سے اچھا کو خاصا لمبا کیا۔ ان کے پاس صرف ایک ہزار روپیہ تھا تنخواہ آنے میں تین دن باقی تھے۔ آٹا منگوالیتی تو سبزی کا خرچا کدھر سے نکلتا۔

''امی جی آپ پریشان نہ ہوں، میں صبح ادھار آٹا لادوں گا۔ آپ جا کے کھانا لگوائیں۔''

اس نے ماں کو دلاسہ دے کر بھیج دیا۔ نائلہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کرتی دراز میں اپنی جمع پونجی لاک کرنے لگی۔ ماجد اضطراب میں گھر گیا تھا۔

☆☆☆

اگلے چند دن مزید پیسے جمع کر کے وہ فریحہ کے ساتھ خریداری کے لیے نکل گئی۔ جو جی چاہا، اچھا لگا جھٹ سے خرید لیا۔ حالانکہ وہ ایک سمجھدار اور کفایت شعار خاتون تھی۔ کئی ضروریات کو وہ خواہش سمجھ کر دبا لینے والی مگر آج اسے سب بہت اچھا اور روشن لگ رہا تھا۔ شام ڈھلے وہ واپس لوٹی۔ بچے بھاگ کر ماں سے لپٹ گئے، ماجد نے گڈو کو دبوچا جو ماں سے شاپر لے کر گرہ کھول رہا تھا۔ مدیحہ فٹ سے ان کے لیے پانی لے آئی۔

''میں آپ کے لیے چائے بناتی ہوں۔'' اس کا چہرہ بھی کھلا تھا کیونکہ بھابھی ہمیشہ اس کے لیے ضرور کچھ نہ کچھ لاتی تھیں۔

''ماما جلدی سے کھولیں ناں سب۔'' رانیہ منہ بسورنے لگی۔

''اچھا بیٹھ کے سب دیکھو ناں...... یہ تمہاری ریڈی میڈ فراک اور دو کاٹن کے سوٹ، گڈو اور نادیہ کے ریڈی میڈ کپڑے اور......''

''اور ہمارے کھلونے......'' گڈو اچھل کر باپ کی گود سے اترا۔

''یہ لو جی ہوائی جہاز، رانیہ کی بڑی سی گڑیا اور نادیہ کے لئے رنگین بلاکس......'' نائلہ چمکتے چہرے سے سب کھول کھول کر کے دکھا رہی تھی۔

''یہ میرا میرون ریشمی اور یہ لیلن کا سوٹ......'' اس نے اپنے کپڑے ساس کی گود میں دھرے۔

''یہ ماجد کا گرم سوٹ اور موزے۔'' شاپر ختم ہو گئے اور چیزیں بھی۔

''ماشاء اللہ بہو سب بہترین اور اچھا ہے۔'' مسرت نے خوش دلی سے تعریف کی۔ وہ انسانوں اور چیزوں میں عیب ڈھونڈنے کی عادی نہیں تھیں۔

فریحہ خاموش تھی۔ اس کا دل نجانے کیوں برا ہو رہا تھا۔ مدیحہ چولہے پر چائے رکھے، کچن کے باہر کھڑی، بھابھی کے شاپروں میں اپنی کسی چیز کی برآمدگی کی منتظر تھی۔ ماجد نے تاسف سے دونوں بہنوں اور ان کے مرجھائے چہروں کو باری باری دیکھا۔

''فریحہ کو کچھ نہیں لے کر دیا۔'' ''اپنا سوٹ پرے رکھتے۔ اس نے نقطہ اعتراض اٹھایا۔

نائلہ کے بدلتے تیور اس کا وہم نہیں تھے۔ ایسا پہلی بار ہوا تھا کہ اس کی ماں، بہن، کے لئے کچھ نہ خریدا گیا۔

''فریحہ کو فروٹ چاٹ کھلا دی تھی۔'' نائلہ نے کافی رکھائی سے جواب دیا۔ اس کی ساری خوشی ملیا میٹ ہو گئی۔ وہ غصہ ضبط کرتی چیزیں سمیٹنے لگی۔

''تم میرے کپڑے نہ لاتیں۔''

''رہنے دیں بھائی......'' فریحہ نے کمزور سے لہجہ میں بھائی کو ٹوکا۔

''ہاں ماجد...... پھر کیا ہوا؟ ...... ہمیشہ تو وہ ......''

''میں نے جو بھی خریدا ہے اپنی کمائی سے خریدا ہے۔''

یوں سب کے بیچ اس نے شوہر کو جتا دیا۔ مسرت کا ٹوکنا بیچ میں رہ گیا۔ وہ تن فن کرتی اپنے کمرے میں چلی گئی، سب کو ہکا بکا چھوڑ کر۔

☆☆☆

رات کو بچوں کو سلا کر، اس نے نیا شوشہ چھوڑ دیا۔

''ماجد آپ کو کل تنخواہ ملے تو مجھے تین ہزار دے دیجیے گا۔'' وہ سنجیدہ تھی۔

''وہ کس لیے......'' وہ شام سے چپ سادھے تھے۔

''بچوں کی اسکول اور ٹیوشن کی فیسیں......'' یہ خرچا بھی اس کی سلائی سے جاتا تھا۔

"آج تم نے میری ماں، بہن کے سامنے بے عزت کیا۔ کل پیسے نہ ملے تو بازار میں سناؤ گی۔" وہ بھی کافی دنوں سے بھرے بیٹھے تھے۔

"میں نے جان بوجھ کر ایسا نہیں کیا، غلطی ہو گئی، مجھے تلخ نہیں ہونا چاہیے تھا۔" نائلہ نے شرمندگی سے سر جھکاتے ہوئے فوراً اعتراف کر لیا۔

"اور غلطیاں تم کافی دنوں سے کر رہی ہو اور یہ سب تم مکمل سوچ و بچار کے بعد کرتی ہو۔" اس نے صاف الفاظ میں سب کہہ دیا۔

"اپنی اولاد کے لیے کچھ کرنا غلط ہے؟" اس کی آواز دھیمی پڑ گئی۔

"میں نے شادی سے پہلے تمہارے والد صاحب کو پہلی رات بتا دیا تھا کہ دو یتیم بہنوں کا بھائی ہوں۔ مجھے عزت کے ساتھ انہیں رخصت کرنا ہے۔ اتنے برس بعد، تمہارے اندر کا یہ بدلاؤ، اعتراضات، یہ سب کیا ہے نائلہ۔ میں محبت سے بہت پہلے تمہیں عزت دیتا ہوں اور تم میرے ساتھ کیا کر رہی ہو۔" وہ کافی دلبرداشتہ تھا۔

"سارا دن میں سلائی کرتی ہوں کہ......"

"یہ سچ ہے کہ تم سلائی کرتی ہو، مگر مکمل سچ نہیں ہے۔" ماجد نے اسے دوبدو ٹوک دیا۔

"تم اپنے بچوں کو اسکول کے لیے تیار کرتی ہو، امی ناشتہ بناتی ہیں۔ فریحہ، نادیہ کو بہلاتی ہے گھر کا کوئی بھی کام خاص طور پر تمہارے ذمہ نہیں ہیں۔ دن بھر امی اور فریحہ لگی رہتی ہیں۔ مدیحہ شام کو دونوں بچوں کو ٹیوشن پڑھاتی ہے اور اتوار کے روز گھر بھر کے کپڑے دھوتی ہے۔ فریحہ شلواریں سلائی کر کے، تر پائی بھی کر دیتی ہے۔ امی تمہارے بٹنوں کے لیے بار بار بازار جاتی ہیں۔ اس سب کے بدلے انہوں نے کبھی تم سے ایک روپے کا مطالبہ نہیں کیا۔ تم اپنی خوشی سے جو دو وہ راضی رہتی ہیں۔ گھر میں امن وسکون ہے مگر......"

"مگر فاخرہ بھی تو سب کچھ کرتی ہے واجد کی کمائی سے دودھ، فروٹ، جوس اور کپڑے وغیرہ سب، کوئی اسے کچھ نہیں کہتا۔"

اس نے روتے ہوئے شوہر کو ٹوک دیا۔ یہی اس کے اندر کا ابال تھا جو اسے چین نہیں لینے دیتا تھا۔

ماجد کو بھی یہی شبہ تھا۔ اس کے شک پر نائلہ نے مہر لگا دی تھی۔ اب ساری بحث فضول تھی۔ وہ ایک حسد کا شکار عورت تھی اور شاید کسی حد تک صحیح بھی۔

ماجد مزید اپنے گھر میں خرابی اور رشتوں میں کدورتیں نہیں ڈال سکتا تھا۔ اس نے مزید کچھ نہ کہا، رات بھر اٹھتے، بیٹھتے اور سوچتے گزری، فیصلہ کرنا بہت مشکل تھا مگر کرنا تھا۔ کیونکہ ایک مچھلی سارا تالاب گندا کر رہی تھی۔ فجر کی نماز پڑھتے ہی نائلہ نے اپنے ہر رویے اور غلطی کی شوہر سے معافی مانگ لی کیونکہ یہ سب کرنے کے بعد بھی اس کا اندر بے سکون تھا۔ کیونکہ وہ اپنی فطرت کے مخالف جا رہی تھی۔

ماجد دوپہر کو چھٹی لے کر بھائی کے دفتر پہنچ گیا۔ اس نے سارا مسئلہ اور ہر طرح کی اونچ نیچ بڑی نرمی اور محبت سے اسے سمجھائی۔ جواباً واجد نے بھی فاخرہ کی ہر بات آج کل میں کیے جانے والا علیحدگی کا مطالبہ بھی بتایا۔

شام کو ماجد نے ماں کو اکیلے میں سب بتا دیا۔ شوہر کے جانے کے بعد مسرت کا سب سے بڑا آسرا ماجد ہی تھا۔ واجد چھوٹا تھا مگر وہ اس کا گھر بھی خراب نہیں کرنا چاہتی تھیں۔"

اگلے روز گھر کے بیچ میں دیوار اٹھا دی گئی۔ ایسا کر کے ماجد نے اپنے گھر اور رشتوں کو کسی بہت بڑے نقصان سے بچا لیا تھا خود کو اور اپنی بیوی کو بھی گناہ گار ہونے سے۔ نائلہ کے دماغ کا وقتی غبار چھٹ گیا۔ وہ اب بھی ان کے ساتھ بہنوں کی طرح رہتی ہے۔ گھر میں امن وسکون ہے۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ ماجد کا فیصلہ کتنا درست تھا۔

"میں تجھے کبھی معاف نہیں کروں گا۔" عادل نے گلاب جامن اور رس گلا اکٹھے منہ میں ٹھونستے ہوئے ایک مرتبہ پھر سے شہادت کی انگلی محب اللہ کے سامنے لہرائی۔

"میں بھی معاف نہیں کروں گا......؟" احسن نے مٹھائی کے ڈبے پر تابڑ توڑ حملے کرتے ہوئے عادل کی ہاں میں ہاں ملائی۔

"میں معاف کردوں گا اگر تو اتوار کو بہترین سی چکن کڑاہی بمعہ رائتہ کھلا دے۔" حیدر نے انگلی سے شیرہ چاٹتے ہوئے فراخ دلی کا مظاہرہ کیا۔

مجرموں کے سے انداز میں سر جھکائے بیٹھے محب اللہ نے کچھ بے چارگی سے انس کی جانب دیکھا گویا کہنا چاہ رہا ہو۔ "تو بھی بول دے کچھ نہ کچھ......"

"نہیں، نہیں محب اللہ بھائی......! میں نے آپ کو معاف کردیا ہے میری طرف سے ٹینشن لینے کی ضرورت نہیں ہے۔" انس کو اس کی بے چارگی پر کچھ زیادہ ہی ترس آ گیا تھا۔

"اوئے...... غدار انسان......!" احسن نے روئے سخن انس کی جانب کیا۔

"خبردار، جو کسی نے اس کو معاف کرنے کے

افشین نعیم

بارے میں سوچا بھی ہو تو، اس کا جرم قابل معافی ہے ہی نہیں......" غضب خدا کا ......نہ منگنی، نہ نکاح...... سیدھے سیدھے شادی کر کے آ گیا اور یہ ایک کلو مٹھائی پر ٹرخا کے سمجھ رہا ہے کہ ایسے ہی چھوٹ جائے گا۔"

عادل نے ایک اور گلاب جامن پر ہاتھ صاف کیا۔

"ایک نہیں دو کلو......" محب اللہ تڑپ کر بولا۔

اور ساتھ ہی تیزی سے خالی ہوتے ڈبے پر ایک چور سی نظر ڈالی، جس میں سے ایک پیس بھی تا حال اس کو نصیب نہیں ہو سکا تھا۔

"محب اللہ بھائی! آپ بھی لیں نا......" انس گویا اس کے دل کا حال سمجھ گیا تھا۔

"نہیں ...... میرا تو طعنوں سے ہی پیٹ بھر گیا ہے۔"

محب اللہ، ندیدوں کی طرح مٹھائی پر ٹوٹے

ہوئے دوستوں کو دیکھ کر بولا۔
''اس سے زیادہ سخت سزا کا حق دار ہے تو......''
احسن بولا۔
''حق دار نہیں مستحق......'' حیدر نے تصیح ضروری سمجھی۔
''وہی......تو......'' احسن نے سر ہلایا۔
''یارو......میں تم لوگوں کو کیسے سمجھاؤں کہ سب کچھ اس قدر جلدی میں ہوا کہ قریبی رشتے داروں تک کو مطلع کرنے کی مہلت نہ مل سکی۔''
''ادھر اماں جی نے اوپرے دل سے ابا جی کو اپنی رضا مندی دی۔ ادھر ابا جی پھپھو کے گھر پہنچ گئے رشتہ ڈالنے اور پھپھو کے اقرار کرتے ہی انہیں نوید سنائی کہ ہم شام کو نکاح کرنے آرہے ہیں۔ جب تک ہم سب اپنے پھولے ہاتھ پیروں کو سنبھالتے تب تک شام ہوچکی تھی، مولوی صاحب سمیت کل سات لوگ تھے ہم۔''
''نکاح ہوا......پھپھو نے کھانا بنالیا تھا۔ تاہم سب نے کھانا کھایا، کھانے کے بعد ابا جی نے اعلان کیا کہ کل رات کا کھانا ہماری طرف ہے۔ اس کو ولیمے کی دعوت سمجھ کر آنا۔''
''اس سے قبل ہم ابا جی کی بات کا مطلب سمجھتے۔ ابا جی نے اماں جی سے کہا۔ نیک بخت، بچی کو چادر اوڑھا کر ساتھ لے آؤ۔''
پھپھو بے چاری ہائے وائے ہی کرتی رہ گئیں اور دلہن رخصت ہو کر ہمارے گھر آگئی۔ یہ ہے کل تفصیل......اب بتاؤ......بھلا ان حالات میں میں تم لوگوں کو کیسے اور کب اطلاع دیتا۔''
محب اللہ نے ایک مرتبہ پھر سے وہ تفصیل گوش گزار کی جو وہ اس سے پہلے بھی دو مرتبہ سنا چکا تھا۔
''تو، دو سو بار بھی یہ واقعہ سنادے نا تب بھی تیری سزا معاف نہیں ہوگی۔'' عادل، قطعی اس کو معاف کرنے کے موڈ میں نہیں تھا۔
''یار......یہ بھی کوئی سزا ہے۔'' حیدر نے مٹھائی کا ڈبا ہاتھ میں پکڑ کر محب اللہ کے سامنے کیا۔
''لے بچے......کھا......تو بھی کیا یاد کرے گا۔ کس سخی سے پالا پڑا ہے۔''
محب اللہ نے ممنون نگاہوں سے ان سب کو دیکھتے ہوئے ایک گلاب جامن اٹھا کر منہ میں رکھی عادل اور احسن نے محض اسے گھورنے پر اکتفا کیا۔
''تیری اصل سزا تو یہ ہوگی کہ اب تجھے کم سے کم دو ماہ گھر نہیں جانے دیا جائے گا۔'' حیدر نے ایک مکروہ سی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے کمینگی سے کہا۔
گلاب جامن محب اللہ کے حلق میں اٹک گیا۔

☆☆☆

شہر بانو اور مونا میم جانے کے لیے بالکل تیار تھیں۔ سائیکل منہ بسورے ایک طرف کھڑا تھا۔ وہ دل وجان سے ان کے ساتھ جانا چاہتا تھا۔ پر مونا میم میرب کے اکیلے پن کی وجہ سے اس کو گھر چھوڑ کر جارہی تھیں۔
میری کو بے چارے سائیکل پر ترس آرہا تھا سو، نانی کے سامنے سفارش کر بیٹھی ''لے جایئے نا، گرینڈ ما......اس کو بھی......دیکھیں کتنا اداس ہے۔''
''تو، تمہیں کیا گھر میں اکیلا چھوڑ جائیں۔'' مونا میم نے سخت ناراض نظروں سے پہلے سائیکل اور پھر میرب کو دیکھا۔
''تو، مجھے بھی لے چلیں......'' میرب نے شرارت سے ماں کو دیکھا۔
''یہ پاکستان ہے۔ یہاں ایسا نہیں ہوتا۔'' مونا میم کی طرف سے جواب آیا۔
''اوہ ہو بھئی......آپ لوگ اندر جا کر لڑکے کا گھر بار اور ضروری چھان پھٹک کرتی رہیے گا۔ میں گاڑی میں آپ کا ویٹ کرلوں گی۔'' میرب آج بھرپور شرارت کے موڈ میں تھی۔
مونا میم اور شہر بانو دونوں ہی نے اس کی بات کا جواب دینا غیر ضروری سمجھا۔ آج مونا میم اور شہر بانو لڑکے کے گھر والوں سے ملنے جارہی تھیں۔ پھر دو ایک روز میں انہوں نے آکر تاریخ وغیرہ طے کرنا تھی۔
ہفتہ، دس دن میں میرب کے بابا بھی پہنچنے والے تھے۔
میرب اپنی سی کوشش کررہی تھی خود کو خوش رکھنے

کی۔ لیکن اس میں بہت زیادہ کامیاب نہیں ہو پا رہی تھی۔

ان دونوں کے جانے کے کوئی آدھ گھنٹے بعد شدید بوریت محسوس کرتے ہوئے میرب نے سائیکل کو مارکیٹ تک جانے کی آفر کی۔

سائیکل کا چہرہ خوشی سے کھل گیا۔ ”ٹھیک ہے میری باجی...... واپسی میں آئس کریم بھی کھائیں گے۔“

اوکے...... میری نے ہامی بھرلی۔

کچھ دیر ونڈو شاپنگ میں لگائی۔ دو چار چیزیں اپنے لیے اور کچھ تھوڑی بہت شاپنگ سائیکل کو کروا کر وہ دونوں کیفے میں آگئے۔

کتنے مزے کا برگر ہے نا میری باجی......

سائیکل خوش ہوتے ہوئے بولا۔ میری نے سر ہلا کر تائید کی۔

وہ بل پے کر رہی تھی جب احتشام کو کسی لڑکی کی ہمراہی میں اندر داخل ہوتے دیکھا۔

☆☆☆

چکن کڑاہی، رائتہ، سلاد، نان اور میٹھے میں رس ملائی۔ وہ پانچوں کھانے سے خوب انصاف کر رہے تھے۔

فائیو اسٹار ہوٹل میں ڈنر سے بات ہوتے ہوتے فور اسٹار پھر تو اسٹار اور آخر بازار سے کھانا لا کر گھر میں کھانے پر فائنل ہوئی۔

”یار، ویسے تو سب سے اچھا رہا ــــ“ احسن نے مرغی کی ٹانگ جھنجوڑتے ہوئے کہا۔

محبت اللہ نے سوالیہ نظروں سے اسے دیکھا۔

احسن، اس کی نظروں کا مطلب سمجھتے ہوئے بولا۔

”دیکھ نا...... نہ تو جہیز اور بری کا کوئی ٹنٹا کھڑا ہوا۔ نہ رسموں کے نام پر بدمزگی، نہ دن تاریخ طے کرنے کا رولا، نہ ہوٹلوں، ہالوں کے چکر...... نہ ہی پارلر کی بکنگ کا کھڑاگ......“

احسن کی آخری بات پر سب سے پہلے عادل کے کان کھڑے ہوئے۔

”اوئے...... جگر...... اگر نارمل حالات میں نارمل طریقے سے شادی ہوتی تب بھی مولوی نے پارلر سے تیار نہیں ہونا تھا۔“

”میں، مولوی کی نہیں...... دلہن کی تیاری کی بات کر رہا ہوں۔ احمق آدمی۔“

احسن نے سخت بے مزہ ہو کر جھاڑ پلائی۔

”اوئے خبردار...... جو تو نے اس کو احمق کہا......“ عادل نے محبت اللہ کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے احسن کو دیکھا۔

”اب اس کا مقام خاصا بلند ہو چکا ہے۔ یہ دولہا کے مرتبے پر فائز ہو چکا ہے۔“

”احمق، میں نے اس کو نہیں تجھے کہا ہے۔“ احسن نے غصے سے عادل کو دیکھا۔ ”پھر تو بالکل ٹھیک کہا ہے۔“ حیدر نے تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

”ہاں بالکل ٹھیک ہے۔ میں احمق نہیں بلکہ احمقوں کا سردار ہوں۔“ عادل نے فوراً سے پیشتر مان لیا۔

حیدر اور احسن نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا اور ایک ہی وقت میں دونوں نے کندھے اچکائے۔

”اب تم دونوں کا فرض بنتا ہے کہ میری ہر بات بلا چوں چراں مان لیا کرو۔“ عادل نے بات جاری رکھتے ہوئے کہا۔

”کیوں......؟ تو نے ہمیں گود لے لیا ہے۔“ حیدر نے ابرو اچکائے۔

”نہیں، میں تم لوگوں کا سردار ہوں نا۔“ عادل نے دانت نکالے۔ چند لمحے لگے ان کو بات سمجھنے میں۔ پھر پہلے حیدر نے مکا لہرایا۔ پیچھے پیچھے احسن نے کشن اٹھا کر نشانہ باندھا۔

”او، یار...... میں نے تم لوگوں کو ایک بہت ضروری بات بتانا تھی۔“ عادل کو اچانک ہی کچھ یاد آیا۔

”بتایئے......“ انس متوجہ ہوا۔ باقی سب لوگ بھی سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔

”یارو!...... وہ میں نے تم لوگوں سے ذکر کیا تھا نا کہ مونا میم کی بیٹی کے داماد کو دیکھ کر مجھے ایسا لگ رہا تھا۔ جیسے میں نے اس کو پہلے بھی کہیں دیکھا ہوا ہے۔“

”ہاں تو......؟“ محبت اللہ نے کہا۔

”تو یہ...... کہ وہ معمہ حل ہوگیا۔ مجھے یاد آگیا کہ میں نے اس سے پہلے اس کو کہاں دیکھا تھا۔“
تم دونوں بچپن میں ایک ہی اسکول میں پڑھتے تھے۔ ہے نا۔“ حیدر نے جوش سے چٹکی بجاتے ہوئے کہا۔
”نہیں......وہ اس کا گم شدہ بھائی ہے جو آج سے بائیس برس قبل کمبھ کے میلے میں کھوگیا تھا۔ آج برسوں بعد اس کو وہ پرانی یادداشت واپس مل گئی ہے۔“ احسن نے ٹکڑا جوڑا۔
”اور گم شدہ بھائی بھی......“ حیدر نے احسن کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔
”اگر تم دونوں کی چار چار آنے والی جگتیں ختم ہوگئی ہوں تو میں کچھ بولوں۔“ عادل نے سکون سے بات مکمل کی۔
”ضرور......ضرور......“ احسن نے سر کو ہلکا سا خم کیا۔ ”لیکن کوئی فلمی واقعہ نہیں ہونا چاہیے۔“
”ہاں......ڈرامہ چلے گا۔“ حیدر بولا۔
”یار......آپ لوگ ان کی بات تو سننے دیں۔“ انس سخت زچ ہوکر بولا۔
”اچھا تو سنو۔“ عادل نے بولنا شروع کیا۔
”تم لوگوں کو یاد ہوگا، کچھ عرصہ قبل میں اپنے باس کے بیٹے کے ولیمے میں ایبٹ آباد گیا تھا۔ آفس کے کولیگز کے ساتھ۔“
”ہوں......“
”ہاں......“ تقریباً سب ہی نے اثبات میں سر ہلایا۔
”آج اتفاقاً اس سفر بلکہ دوران سفر کی تصویر نظر آگئی۔ میرے کولیگ نے فرنٹ سیٹ سے سیلفی لی تھی۔ ہم سب کی تو۔ آدھی ادھوری سی تصویر ساتھ بیٹھے ڈرائیور کی بھی آگئی تھی جسے سائیڈ پوز کہنا زیادہ مناسب ہے۔ اس ڈرائیور کی تصویر بلکہ سائیڈ پوز دیکھ کر مجھے فوراً سے یاد آگیا کہ محترم احتشام صاحب کو میں نے پہلے کہاں دیکھا تھا۔“ عادل نے چند لمحے کا ڈرامائی وقفہ دیا۔
”بک بھی دے اب......“ حیدر سے رہا نہیں گیا تو بول پڑا۔
”وہ گاڑی جو اس دن ہم نے بک کروائی تھی اس کو احتشام صاحب بنفس نفیس خود ڈرائیو کررہے تھے۔“
”بڑی بات ہے یار......“ محب اللہ خاصا متاثر نظر آیا۔
”اتنے بڑے شوروم کا مالک خود ڈرائیونگ کے فرائض بھی سرانجام دیتا ہے۔“ چھلکتی عقیدت نے حیدر کو تپ چڑھائی۔
محب اللہ کے لہجے سے
”اوئے مولوی، شادی شدہ ہوگیا ہے۔ ذرا سیانا بننے کی کوشش کرو۔ اور کبھی کبھار اپنے دماغ کو سوچنے سمجھنے کی زحمت دینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔“
”کیا مطلب......؟“ محب اللہ نے حیران ہوکر اس کی بات کا مطلب سمجھنے کی کوشش کی۔
”مطلب یہ ہے محب اللہ بھائی کہ اتنے بڑے شوروم کے مالک کو ڈرائیور بننے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔“ انس نے سمجھداری سے کہا۔
باقی سب نے توصیفی انداز میں انس کو دیکھا۔
”بچہ، سمجھ دار ہوگیا ہے یار۔“ عادل نے اپنے انداز میں شاباش دی۔
”میرا خیال ہے اب اس کی شادی بھی ہوجانی چاہیے۔“ حیدر نے یونہی بات کی۔ پر انس بری طرح جھینپ گیا۔
”تو، پھر اب کرنا کیا ہے......؟“ احسن کچھ بے چین ہوکر بولا۔
”ہم نے کیا کرنا ہے۔ جو کرنا ہے اس کے امی، ابو نے کرنا ہے۔ ہم تو صرف ولیمہ کھانے جائیں گے۔“ حیدر نے ہاتھ سر کے پیچھے باندھتے ہوئے کہا۔
”میں مونا میم کی بیٹی کے داماد کی بات کررہا ہوں۔“ احسن نے کچھ غصے سے ان سب کو دیکھا۔
”چھان بین“ عادل نے کچھ زور دے کر کہا۔
”ایک مکمل تفتیشی چھان بین ارجنٹ بنیادوں

پر کرنی پڑے گی۔"
"مگر، وہ سائیکل بتا رہا تھا کہ مونا میم اور ان کی بیٹی آج لڑکے والوں سے ملاقات کرنے ہیں۔ ایک دو دن میں وہ لوگ شادی کی تاریخ فائنل کرنے آئیں گے۔ ایسے حالات میں اگر کوئی ایسی ویسی بات پتا بھی چلتی ہے تو یہ کوئی مناسب موقع نہیں ہے ان کو بتانے کا۔" محب اللہ نے اپنا تجزیہ پیش کیا۔
"یہی تو مناسب وقت ہے بتانے کا۔" احسن کی بات پر سب نے اس کو دیکھنا شروع کیا۔ "اگر وہ شخص واقعی کوئی فراڈ ہے تو اچھا ہے بات شادی سے پہلے پہلے کھل جائے۔"
"ہوں...... ٹھیک کہہ رہا ہے تو۔" حیدر نے تائید کی۔
"تو ایسا ہے کہ کل کچھ وقت نکال کر سب اپنے اپنے طور پر اس کے شوروم جاتے ہیں۔ اور کچھ پتا چلانے کی کوشش کرتے ہیں۔" عادل نے اپنی رائے پیش کی۔
"ٹھیک ہے۔" محب اللہ نے اتفاق کیا۔ باقی سب نے بھی تائیدی انداز میں سر ہلایا۔

☆☆☆

"کیا بات ہے ماما......؟ جب سے آپ اور گرینڈ ماوہاں سے آئی ہیں کچھ خاموش خاموش سی ہیں۔"
میرب نے لمبے، سلکی بالوں میں برش کرتے ہوئے آئینے میں نظر آتے ماں کے عکس کو دیکھتے ہوئے بات شروع کی۔
شہر بانو نے کچھ چونک کر اس کی شکل دیکھی۔ بولیں کچھ نہیں۔ میرب برش سائیڈ پر رکھ کر ماں کے قریب آ گئی۔
"کیا کوئی ایسی بات ہے جو آپ مجھ سے شیئر نہیں کرنا چاہتیں؟" نرمی سے ماں کا ہاتھ اپنے ہاتھوں میں لے کر اس نے ان کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے کہا۔
"میری! مجھے لگتا ہے ہمیں اتنی جلدی نہیں کرنا چاہیے اور یہ بات تمہارے بابا کو سمجھانا بہت ضروری ہے۔ انہوں نے بغیر تحقیق کے اپنے دوست کے کہنے پر اس کے کسی جاننے والوں پر اعتماد کر لیا ہے۔ مام بھی کل سے بہت پریشان ہیں...... عجیب لالچی سے لوگ لگ رہے ہیں۔"
"ایک منٹ ماما......" میری نے ہاتھ اٹھا کر ان کو کچھ بولنے سے روکا۔ "باہر چلتے ہیں۔ گرینڈ مام کے سامنے بات کرتے ہیں تاکہ ان کا نقطہ نظر بھی جان سکیں۔"
بات مکمل کر کے میری نے باہر کی جانب قدم بڑھائے۔ شہر بانو بھی ٹھنڈی سانس بھرتی اس کے پیچھے ہو لیں۔
"کیا ہو رہا ہے گرینڈ ما......؟" میرب نے صوفے کے پیچھے سے نانی کے کندھوں پر دباؤ ڈالتے ان کے کان میں سرگوشی کی۔
مونا میم نے پیار سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھا۔ تم دونوں ہی کو بلوانے والی تھی ابھی۔
ہمارا شیف زبردست پکوڑے بناتا ہے سوچا آج تم لوگ پکوڑے ٹرائی کرو۔" میری کا ہاتھ پکڑ کر اپنے برابر بٹھاتے انہوں نے کہا۔
شہر بانو، سامنے والے صوفے پر براجمان ہو گئیں۔
"اور آپ نے بتایا نہیں۔ کل کیسا وقت گزرا آپ کا میری ہونے والی سسرال میں۔" میری نے بات کے لیے تمہید باندھی۔
"کمال کے لوگ تھے۔" مونا میم نے ہلکا سا قہقہہ لگاتے ہوئے کہا۔
مطلب......" میری نے ناسمجھی سے انہیں دیکھا۔
"مطلب یہ کہ ٹرالی کھانے کے سامان سے ایسے بھر رکھی تھی جیسے فوجیں محاذ پر جانے سے پہلے اپنا آخری کھانا کھانے والی ہوں۔ پھر ہر آئٹم پیش کرنے سے پہلے یہ بتایا جاتا کہ یہ شہر کی کس مشہور و معروف بیکری سے منگوائے گئے ہیں۔ اس کے بعد لگے ہاتھوں ان کی قیمت بتائی جاتی۔ پھر اس کا تقابلی جائزہ پیش کیا جاتا کہ فلاں جگہ سے اتنے کی ملتی ہے ہم نے تو یہاں سے اتنے کی منگوائی ہے۔ بندہ چار پیسے فالتو

لگائے لیکن چیز کوالٹی کی ہونی چاہیے۔"

میری حیرت سے منہ کھولے ان کی بات سن رہی تھی۔

"گرینڈ ما...... ریئلی...... کیا وہ لوگ واقعی اس طرح کی گفتگو کر رہے تھے۔"

"یہ تو کچھ بھی نہیں...... اصل گفتگو تو اس کے بعد شروع ہوئی تھی۔"

شہر بانو بھی ماں کے انداز پر کچھ پرسکون ہوتے ہوئے بولیں۔ میری نے روئے سخن ماں کی جانب کیا۔

"مثلاً...... آپ اپنی بیٹی کو کتنے تولے سونا دیں گے۔ داماد کو سلامی میں نقدی دیں گے یا گاڑی وغیرہ اور" شہر بانو کی بات جاری تھی کہ میری کی بس ہوگئی۔

"بس، بس مام...... گرینڈ مام......" وہ دونوں کو باری باری دیکھتے ہوئے بولی۔

"میرے پاس بھی ایک خبر ہے آپ لوگوں کو سنانے کے لیے۔" شہر بانو اور مونا میم متوجہ ہوئیں۔

"کل، آپ دونوں کے جانے کے بعد میں اور سائیکل مارکیٹ گئے تھے واپسی میں کیفے سے نکلتے ہوئے احتشام کو کسی لڑکی کے ہمراہ وہاں داخل ہوتے دیکھا۔ اس کی نظر، ہم پر نہیں پڑی اور میں ہرگز کسی قسم کے شک وشبہ کا شکار نہیں ہوئی تھی۔

باہر آکر میں نے اس کو کال ملا کر اس کی مصروفیت پوچھی تو کہنے لگا، شوروم میں بزی ہوں۔ کلائنٹس کا تانتا بندھا ہوا ہے سر کھجانے کی فرصت نہیں ہے۔"

بات ختم کرکے میری نے کندھے اچکائے۔

"اس کا کسی لڑکی کے ساتھ ہونا میرے نزدیک کوئی زیادہ بڑا ایشو نہیں ہے۔ لیکن بات کو چھپانا، خوامخواہ جھوٹ بولنا یہ اس کی شخصیت کو خاصا مشکوک بنا رہا ہے۔ میرا خیال ہے مام ہمیں مزید کچھ وقت لینا چاہیے۔ اس رشتے کے سلسلے میں۔" شہر بانو سنجیدگی سے گویا ہوئیں۔

"جب کہ میرا خیال ہے، ہمیں مزید ایک منٹ کی بھی تاخیر نہیں کرنی چاہیے اس رشتے کو ختم کرنے میں۔" مونا میم کی بات پر شہر بانو اور میری دونوں نے چونک کر ان کی جانب دیکھا۔

"میری کے باپ سے میں خود بات کرلوں گی۔" شہر بانو کو مخاطب کرکے وہ بات مکمل کرنے لگیں۔ "وہ نہیں چھوڑنا چاہتا میری کو ایسے میرے پاس نہ سہی۔ لیکن میری کی زندگی سے کھیلنے کی اجازت میں کسی کو نہیں دوں گی۔"

ماحول میں ایک دم ہی کچھ اداسی سی در آئی۔

ٹی وی لاؤنج کے بیرونی دروازے پر ہونے والی دستک نے ان سب کی توجہ اپنی جانب مبذول کرائی۔

سائیکل، بوتل کے جن کی طرح اللہ جانے کہاں سے نمودار ہوا اور کھٹ سے دروازہ کھولا۔

سلام کرکے وہ پانچوں اندر داخل ہوئے۔

"بھئی آج تم سب کو ایک ساتھ بن بلائے، نیچے آنے کا خیال کیسے آگیا۔" ان کے نشستیں سنبھالتے ہی مونا میم شگفتہ لہجے میں گویا ہوئیں۔

"نہیں، بن بلائے تو نہیں آئے۔ پکوڑوں کی سوندھی سوندھی خوشبو نے ہمیں بلایا۔ تو ہم کھنچے چلے آئے۔" عادل کی بات نے سب کے چہروں پر مسکراہٹ بکھیر دی۔

"سائیکل! جاؤ بیٹا۔ شیف کو چائے کے لیے کہو اور تم پکوڑوں کے ساتھ بسکٹ اور ڈرائی فروٹ بھی پلیٹوں میں نکالو۔" مونا میم کی بات پر سائیکل سر ہلاتا کچن کی طرف بڑھ گیا۔

میری بھی اٹھ کھڑی ہوئی اور سائیکل کے پیچھے پیچھے کچن میں جاکر غائب ہوگئی۔

"میں بھی چلا جاؤں مدد کروانے۔" میرب کو جاتے دیکھ کر احسن نے جھک کر حیدر کے کان میں سرگوشی کی۔

"تھوڑی دیر رک جا، چائے آجانے دے، اس کے بعد جاکر برتن دھو دینا۔" حیدر نے جوابی سرگوشی کی۔

احسن برا سا منہ بنا کر خاموش ہوگیا۔ نظر البتہ دور نظر آتے کچن کے دروازے پر ہی ٹکی ہوئی تھی۔ جہاں، گلابی آنچل کا ایک ہلکا سا کنارہ سرسرا رہا تھا۔

وہ خیالوں ہی خیالوں میں جانے کہاں پہنچا ہوا تھا۔ عادل کی آواز اسے واپس کھینچ کر حال میں لے آئی۔

احسن نے جب پچھلی بار احتشام صاحب کے بارے میں سب او کے کی رپورٹ دی تھی۔ اس وقت چھان بین سے احتشام وارثی صاحب کے بارے میں سب اچھا ہے سننے کو مل رہا تھا۔

"آج ہم سب نے فرداً فرداً جا کر اپنے طور پر جو معلومات حاصل کی ہیں۔ ان سے پتا چلا ہے کہ احتشام وارثی صاحب جو احتشام موٹرز کے مالک ہیں ایک ادھیڑ عمر شادی شدہ انسان ہیں جن کے بچے مختلف کالجز اور یونیورسٹی میں زیر تعلیم ہیں۔"

اس نے سانس لینے کے لیے چند لمحے کا توقف کیا۔ سب لوگ خاموشی سے اس کی بات سن رہے تھے۔

"جب کہ یہ احتشام صاحب۔" اس نے مونا میم کے تاثرات جانچتے ہوئے بات جاری رکھی۔ احتشام موٹرز کے سامنے رینٹ اے کار کا کام کرتے ہیں اور گاڑی بھی ان کی ذاتی ملکیت نہیں ہوتی بلکہ کچھ کمیشن طے کر کے وہ احتشام موٹرز سے حاصل کرتے ہیں اور اپنے کسٹمرز کے لیے ڈرائیو کا فریضہ بھی سر انجام دیتے ہیں۔"

بات ختم کر کے وہ مونا میم کے چہرے پر حیرت اور پریشانی کے آثار کھوجتا رہا۔ لیکن کچھ خاص کامیابی نہیں ہوئی۔

"یار......! یہ مونا میم کے چہرے پر زلزلہ کیوں نظر نہیں آرہا۔" احسن نے حیدر کے کان سے منہ جوڑ کر کہا۔

"کیوں......؟ زلزلہ زمین پر آنے سے قبل بزرگوں کے چہرے پر آتا ہے؟" حیدر نے جوابی سرگوشی کی۔

اس سے قبل کہ وہ مزید کوئی بات کرتے۔ محب اللہ کی بات نے سب کو اس کی جانب متوجہ کیا۔

"مجھے لگ رہا تھا...... کہ اب جبکہ شادی کی تیاریاں دونوں طرف تقریباً مکمل ہیں ایسی کوئی بات کرنا یقیناً پریشانی کا ہی باعث ہوگا۔"

"نہیں......ایسا کچھ نہیں ہے۔" مونا میم بولیں تو لہجے میں بلا کا اعتماد تھا۔ میں خود بھی اس رشتے سے کچھ زیادہ خوش نہیں تھی۔ نہ ہی شہر بانو مطمئن تھی۔" انہوں نے بیٹی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ "اور تم لوگوں کے ذریعے، ایسی حقیقت کا اس وقت میں پتا چلنا در حقیقت مجھے کوئی غیبی مدد محسوس ہو رہی ہے۔ بہر حال......تم لوگوں کا بہت شکریہ......جس طرح تم لوگ میرے ہر کام میں بڑھ چڑھ کر مدد کرتے ہو۔ مجھے رشک آتا ہے تم لوگوں کی ماؤں پر جن کے بیٹے اتنے مخلص اور سعادت مند ہیں۔"

"یہ تو ہے......" احسن بولا تو زیر لب تھا پر پتا نہیں آواز اتنی اونچی کیسے ہوگئی کہ سب نے ہی چونک کر اس کی جانب دیکھا۔

بے چارہ کچھ شرمندہ ہو کر دائیں بائیں دیکھنے لگا۔

"اس کا قصور نہیں ہے میم!" حیدر نے احسن کی طرف دیکھتے ہوئے مونا میم کو مخاطب کیا۔ "اصل میں آج اس کی پروموشن ہوئی ہے تو بس خوشی دماغ کو چڑھ گئی ہے۔"

"اچھا اچھا۔ ماشاءاللہ مبارک ہو۔"

مونا میم اور شہر بانو ایک ساتھ بولیں۔ احسن بس شرما کر رہ گیا۔

"اوئے، وہ مبارک باد دے رہی ہیں۔ تیرا رشتہ نہیں مانگ رہیں جو یوں شرما رہا ہے۔" حیدر نے اس کے پاؤں پر پاؤں مارتے ہوئے آہستگی سے کہا تاکہ احسن کے علاوہ کوئی اور نہ سن سکے۔

"پہلی دفعہ سیکشن ہیڈ بنایا گیا ہوں۔ اتنی بڑی پروموشن کا تو تصور بھی نہیں کیا تھا میں نے۔ مجھے کیا معلوم، ایسے وقت میں کیا کرتے ہیں۔"

احسن نے بھی اتنی ہی آہستگی سے جواب دیا۔

"شکریہ کہتے ہیں بے وقوف آدمی!" حیدر نے اسے گھورتے ہوئے کہا۔

"دوسری طرف ان کے رازونیاز سے بے نیاز مونا میم، عادل سے استفسار کرنے لگیں کہ اس کا کب تک شادی کا ارادہ ہے......؟"
"شادی تو بہت جلد کرنے کا ارادہ ہے، بس ماں باپ کے نہ ہونے کی وجہ سے دیر ہورہی ہے۔ وہ ہوتے تو اب تک دن تاریخ طے ہو چکے ہوتے۔"
"جی شکریہ......" احسن کا باآواز بلند کہا جانے والا شکریہ خاصا بے موقع و محل تھا۔
حیدر کا جی چاہا اپنا ماتھا پیٹ لے۔
اور احسن کا دل چاہا حیدر کو اچھی طرح پیٹ دے۔ سب نے ہی عجیب وغریب نظروں سے اسے دیکھنا شروع کر دیا تھا۔ احسن گھبرا کر اٹھ کھڑا ہوا۔
"میں چلتا ہوں۔"
بغیر کسی کی طرف دیکھے وہ تیزی سے باہر نکل آیا۔
پکوڑوں کی خوشبو بے چارے کا پیچھا ہی کرتی رہ گئی۔

☆☆☆

صوفے پر آڑھا ترچھا لیٹا عادل خاصی غیر سنجیدگی سے اپنا ایک نہایت سنجیدہ مسئلہ ڈسکس کر رہا تھا۔
"فلزا کے بھائی کی شادی ہے۔ وہ لوگ ساتھ ہی فلزا کی بھی شادی کرنا چاہ رہے ہیں۔ اب مجھے بتاؤ اگر کہیں سے کرائے پر ماں باپ ملتے ہوں تو لے آؤں۔ کیوں کہ ایک بھائی پاکستان سے باہر ہے۔ دوسرا ناراض ہے۔ بات آگے بڑھے تو کیوں کر......؟"
"ناراض بھائی کو منانے کی کوشش کر۔" احسن نے مشورہ دیا۔
"بہت مشکل ہے۔"
عادل نے مایوسی سے نفی میں گردن ہلائی۔
"افضال بھائی کو باہر سے بلالے" حیدر
"ناممکن، قطعی ناممکن۔"
ایک مرتبہ پھر اس نے گردن دائیں بائیں ہلائی۔
"بھاگ کر شادی کرلیں۔" انس نے پھلجڑی چھوڑی۔
"بھاگ کر شادی نہیں ہوگی۔ جیل ہی ہوگی۔" عادل نے دکھ سے کہتے سر سیدھا کیا۔
"تو بس پھر صبر کرلے۔" پرسکون لہجے میں کہتا محب اللہ، عادل کو آگ ہی لگا گیا۔
"منحوس آدمی، خود دو دن کے لیے گھر گیا اور بارات ولیمہ سب نمٹا کر آگیا۔ ہمیں صبر کے مشورے دے رہا ہے۔"
"بچو! اب تو، توبہ کرے گا۔ بیٹا دو مہینے سے پہلے تجھے جانے دیا نا اگر تو میرا نام بدل دینا۔" عادل انتقامی انداز میں منہ پر ہاتھ پھیرتا ہوا بولا۔
"یار، میں تو مذاق کر رہا تھا۔" محب اللہ سچ مچ گھبرا گیا۔
"میرا خیال ہے ابن بطوطہ مناسب رہے گا۔"
احسن کی بات پر سب نے چونک کر اس کو دیکھا۔
"مطلب......؟" حیدر نے ابرو اچکائے۔
"مطلب عادل جنجوعہ صاحب کا نیا نام"
"نام بدلنے کی فرمائش کی ہے نا ابھی ابھی جناب نے۔"
"ابن بطوطہ......" حیدر نے باآواز بلند نعرہ لگایا۔
"بغل میں جوتا......" باقی سب نے سر ہلائے۔
ابن بطوطہ......
بغل میں جوتا......
ابن بطوطہ......
بغل میں جوتا......
وہ سب یار، دل دار مل کر تب تک یہ راگ الاپتے رہے۔ جب تک کہ عادل احتجاجاً واک آؤٹ نہیں کر گیا۔

☆

انتباہ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ کی جانب سے تنبیہہ کی جاتی ہے کہ جو ویب سائٹس ہمارے ادارے کا نام لے کر "آفیشل پیج" کی اصطلاح استعمال کررہی ہیں ان سائٹس سے ادارے کا کوئی تعلق نہیں، اسے فوری ترک کیا جائے تاکہ ہمارے معزز قارئین کسی غلط فہمی کا شکار نہ ہوں۔ ایسی تمام ویب سائٹس اور سوشل میڈیا گروپس کو مرتب کرنے والے منتظمین جو اپنے سطحی مفادات کی خاطر ادارے سے شائع ہونے والے ماہناموں کے مضامین، افسانے اورکہانیاں بلا اختیار اور غیر قانونی طور پر اَپ لوڈ کرکے ادارے کو سنگین مالی نقصان پہنچانے کے ساتھ ادارے کی ساکھ متاثر کررہے ہیں، انہیں خبردار کیا جاتا ہے کہ اس قبیح فعل کو فوری ترک کردیں، بصورت دیگر ادارہ، سائبر کرائمز کے قانون

Prevention of Electronic Crimes Act 2016

اور

Copyright Ordinance 1962 / 2000

کے تحت کسی بھی قسم کی کارروائی کا حق رکھتا ہے۔ ایف آئی اے اور دیگر متعلقہ اداروں میں بھی ان افراد/ اداروں کے خلاف شکایات درج کرائی جائیں گی۔

خواتین ڈائجسٹ — ماہنامہ شعاع

ماہنامہ کرن — عمران ڈائجسٹ

ادارہ خواتین ڈائجسٹ

نوشین فیاض

آسمان کالے کالے بادلوں سے اٹا پڑا تھا۔ سرِ شام ہی رات ہوگئی تھی۔ وہ بالکنی میں کھڑا دن کو اندھیرے میں گم ہوتا دیکھ رہا تھا۔ گو کہ سردی کا آغاز تھا پھر بھی سرد ہوا ہڈیوں کے اندر تک اترتی محسوس ہوتی تھی۔ اس سردی میں بھی اس نے ٹراؤزر اور بنیان پر کچھ نہیں پہنا تھا۔ اندر جیسے آگ لگی ہوئی تھی۔ سب کچھ جل رہا تھا۔ اس کا دل۔۔ اس کا بدن۔ اور اب دل چاہ رہا تھا دنیا بھی جل جائے۔

وہ روز آئینہ دیکھتا تھا۔ آئینہ روز اسے سامنے کھڑا سچ دکھاتا تھا لیکن جو سچ آئینے نے اسے آج دکھایا تھا وہ اسے پہلے نظر نہیں آیا تھا۔ اسے اپنا آپ بہت پیارا تھا، اپنی زندگی اور خود سے جڑی ہر شے پیاری تھی مگر آج پہلی بار اس کا دل چاہ رہا تھا، ہر شے فنا ہو جائے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا۔ کاش اسے سردی لگ، جائے اور وہ سردی سے مر جائے۔۔ ہائے محبت۔ دل نے دہائی دی۔ وہ چونکا تھا محبت لفظ پر۔ نہیں۔ اس کا مسئلہ محبت نہیں۔ اس نے دل کی نفی کی۔ اس کی محبت اس کے پاس تھی۔ اس کی بیوی کی شکل میں۔ اس کے کمرے میں۔

اندر کوئی قہقہے لگا لگا کر ہنس رہا تھا۔ محبت......
اگر مہر اس کی محبت تھی تو وہ کون تھی جسے دیکھ کر آج اسے اپنے خالی پن کا احساس ہوا تھا۔ جس کو کھو دینے کے احساس نے اس کی ساری خوشیوں اور سکون کو نگل لیا تھا؟ اور اگر آج دکھائی دینے والی وہ لڑکی اس کی محبت تھی تو نو سال پہلے کمرے کے دروازے میں روتی بلکتی وہ لڑکی کون تھی جسے اس نے ایک نظر دیکھ کر سیڑھیوں کی طرف قدم بڑھا دیے تھے؟ سوال در سوال خنجر بن کر اس کے دل کو چیر رہے تھے۔

مکمل ناول

"پاپا۔ چلیں نا اندر، وڈیو گیم کھیلتے ہیں۔"
سات سالہ صالحہ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچا۔
"آپ کھیل لو۔ میری طبیعت نہیں ٹھیک۔"
اس نے جھوٹا بہانہ گھڑا۔
"میں ڈاکٹر بن کر آپ کو میڈیسن دے دیتی ہوں آپ اندر آجائیں۔"

''اچھا آپ جاؤ میں آتا ہوں۔'' اس نے گہرا سانس بھر کر اسے اندر بھیجا۔

''توبہ ہے، مان دروازہ تو بند کر دیں۔ سارا کمرا ٹھنڈا ہو گیا ہے، آپ کو سردی نہیں لگتی؟'' صالحہ کے جاتے ہی مہر باہر آ گئی تھی۔ وہ اگر حواسوں میں ہوتا تو کوئی پھڑکتا ہوا جواب دیتا لیکن وہ ہوش میں تھا ہی کہاں۔ مہر نے بھی اس کی خاموشی محسوس کی۔

''کیا ہوا ہے مان؟'' اس کا ہاتھ تھام لیا۔

''اللہ۔ آپ کو تو اتنا تیز بخار ہے اور آپ بتانے کے بجائے یہاں ٹھنڈی ہوا میں کھڑے ہیں۔ چلیں اندر، میں فراز کو بلاتی ہوں۔''

وہ اسے بازو سے کھینچ کر اندر لے آئی۔ وہ خالی خالی ذہن سے اپنے لگوری بیڈ پر بیٹھ گیا۔ مہر اپنے بھائی کو فون کر رہی تھی۔ اسے کچھ پتا نہیں چلا کب فراز آیا کب اسے چیک کیا اور کب کیا دوائی دی۔ اسے کچھ پتا نہیں چل رہا تھا۔ اندر اتنا شور تھا کہ نہ کچھ سنائی نہیں دے رہا تھا۔ نظر کے سامنے سالوں پہلے کے اتنے منظر تھے کہ حال دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ یہ سب بلاوجہ نہیں تھا۔ وجہ تو اس کی کم بختی تھی۔

آج اتوار کا دن تھا۔ وہ صبح کچھ جلدی اٹھ گیا تھا۔ وہ نہیں جانتا تھا کہ اسے کس درد نے پکارا ہے، کس زخم نے اپنی اور کھینچا ہے۔ مہر نے کل شام ہی اسے فون پر بتا دیا تھا کہ ناشتے کے لیے انڈے، بریڈ، مکھن اور جیم ختم ہو گئے ہیں تو وہ لے آئے۔ رات وہ معمول سے زیادہ لیٹ گھر آیا تھا جس کی وجہ سے کچھ بھی نہیں لا پایا۔ صبح اس نے صالحہ اور تین سالہ اسد کو گاڑی میں بٹھایا اور ٹاؤن کے آغاز میں بڑی سی بیکری میں لے گیا۔ اسے یہاں شفٹ ہوئے ابھی دو ماہ کا عرصہ ہوا تھا۔ یہاں تک کہ گھر کا اوپر والا حصہ ابھی مکمل نہیں ہوا تھا لیکن وہ چونکہ آبائی گھر بیچ چکے تھے تو اس نے بجائے کرائے پر رہنے کے اپنے نا مکمل نئے گھر میں شفٹ ہونے کو ترجیح دی۔ مہر نے بھی کہا تھا کہ ابھی ان کے استعمال کے لیے نیچے کا حصہ کافی ہے۔ اوپر کا پھر کام کروالیں گے۔

سارا سامان لے کر اس نے صالحہ کو گاڑی میں بٹھایا اور اسی وقت اسد نے چاکلیٹس کے لیے شور کرنا شروع کر دیا۔

''آپ، بیٹھو میں لے کر آتا ہوں۔'' وہ واپس مڑا اور تیزی سے اندر کی طرف گیا۔ شیشے کے دروازے کے عین بیچوں بیچ وہ ایک لڑکی سے ٹکرا گیا۔

''آئم سو سوری پلیز...... میں......'' اس نے لڑکی کے چہرے پر نظر ڈالی۔ وہ شناسا سا شفاف نکھرا نکھرا چہرہ اس کی نامکمل بات کی وجہ تھا۔

''کوئی بات نہیں۔'' کہہ کر ایک رسمی مسکراہٹ کے ساتھ وہ باہر نکل گئی۔

سفید جینز پر لمبا ہلکا نیلا کرتا اور اسی پر اسٹیپر پہنے وہ متوازن چال چلتی اس سے دور ہو رہی تھی۔ اس کا سانس رکا۔ وہ آواز دینا چاہتا تھا لیکن حلق سے آواز نہیں نکلی۔

کتنی جھوٹی تھی وہ۔ کہتی تھی جس ہوا میں تم سانس لو گے اس ہوا سے تمہارا پتا پوچھ کر تم تک آ جاؤں گی اور اب۔ اب اس نے پہچانا ہی نہیں تھا۔ ہاں۔ نہیں پہچانا تھا۔ اس نے نعمان شاہ کو نہیں پہچانا تھا۔ اگر پہچان لیتی تو ویسے ہی قدموں میں آ بیٹھتی جیسے ریلوے اسٹیشن پر اس کے قدموں میں آ کر بیٹھ گئی تھی۔

کیا وہ اتنا بدل گیا تھا کہ مریم کی پہچان میں نہیں آ سکا؟ اس نے خود سے سوال پوچھا۔

اس کا دل چاہا وہ آئینہ دیکھے اور آئینے سے پوچھے کیا واقعی وقت نے اسے اتنا بدل دیا ہے کہ مریم اس سے ٹکرا کر گزر جائے؟ وہ وہیں کھڑا اسے سوچتا رہتا اگر لوگ اسے دروازے میں کھڑے رہنے پر نہ ٹوکتے۔

''وہ اگر جان لیتی کہ نعمان شاہ اسے ایسی بے اختیاری سے سوچ رہا تھا تو خوشی سے مر جاتی۔'' اس نے پھر سوچا۔

چاکلیٹس لے کر وہ گاڑی میں آ بیٹھا۔ شیشے کا

رخ اس نے اپنی سمت موڑا اور پھر جیسے حرکت کرنے کے قابل بھی نہیں رہا۔ آئینہ اس سے سالوں سے جھوٹ بولتا آیا تھا۔ سامنے دکھائی دینے والے شخص کو اس نے خود بھی پہچاننے سے انکار کر دیا تھا۔ اس سے شناسائی صرف اتنی تھی کہ جانے کتنے عرصے سے وہ نعمان شاہ کے آئینے میں نظر آتا تھا۔

ماتھے کے اطراف سے بال اڑ چکے تھے۔ کشادہ ماتھا کچھ اور چوڑا ہو گیا تھا۔ اس بات پر اکثر یار احباب سے مذاق بھی رہتا تھا۔ وہ کہتے تھے سر پر کم بال امیری کی علامت ہے۔ وہ ہنس کر کہتا عنقریب دنیا کی ساری دولت میرے قدموں میں ہو گی۔ وہ بھوری آنکھیں جنہیں مریم پہروں چشم تصور سے دیکھتی اور خیالوں میں چومتی تھی اور پھر اس کی بے قراریوں کے قصے وقت کی کمی کے باعث ادھورے رہ جاتے۔ وہ آنکھیں چمڑی کی موٹی تہہ تلے دب گئی تھیں۔ اب تو ان جھروکوں سے رنگ کشید کرنا بھی خاصا توجہ طلب کام نظر آتا تھا۔ ڈھلکی ہوئی عمر رسیدہ جلد کا رنگ البتہ پہلے سے بھی زیادہ سرخ و سفید ہو گیا تھا۔

یہ چہرہ تو وہ نہیں تھا جس کے بارے میں مریم نے کہا تھا اگر زندگی میں کوئی رات میری مرضی کی مجھے ملے تو اپنے ہاتھوں میں اس چہرے کو تھام کر ساری رات دیکھوں گی۔ کیسے ان بھوری آنکھوں پر نیند اترتی ہے۔ کیسے یہ بند آنکھیں میرے شاہ کو خواب دکھاتی ہیں۔ کیسے اس چہرے پر رات کا ایک ایک پل گزرتا ہے اور کیسے صبح مہربان ہوتی ہے۔ میں دیکھوں گی شاہ۔ میں دیکھوں گی آنے والے وقت میں کیسے کوئی ماہ جبین اس ماتھے پر لکھا اپنا نام پڑھے گی۔

اسے حرف بہ حرف مریم کی بات یاد تھی لیکن یہ چہرہ وہ نہیں تھا جس کے بارے میں مریم نے ایسا کہا تھا۔ پھر وہ کیسے اسے پہچان لیتی؟

''پاپا چلیں بھی۔'' اسد اور صالحہ کی آواز پر آئینے سے نظر چرا کر اس نے گاڑی آگے بڑھا دی۔

''توبہ ہے بندہ بتا کر جاتا ہے۔ میں صبح سے ہلکان ہوئی جا رہی ہوں کہ پتا نہیں کہاں چلے گئے ہیں۔ فون بھی نہیں اٹھا رہے۔''

گھر میں داخل ہوتے ہی مہر تیر کی مانند ان کی طرف لپکی۔ اس کے کہنے پر نعمان کو اپنے فون کی خیال آیا تھا۔ اس نے جیب میں ہاتھ ڈالا۔ اس کا مہنگا اور جدید ترین فون گاڑی میں پڑا تھا۔ اب وہ حیران ہوا تھا۔ اس کا جاگنا سونا فون کے ساتھ ہوتا تھا۔ وہ کبھی فون کہیں نہ رکھ کر بھولا تھا نہ غلطی سے کہیں چھوڑ کر گیا تھا۔ اسے شدید ترین حیرت تھی۔ مریم اس کے حواسوں پر اتنی طاری ہو چکی تھی کہ وہ اپنے ہوش کھو بیٹھا تھا۔

''اچھا اب اندر چلیں۔'' بچوں کے ہاتھ سے ساز و سامان پکڑنے کے بعد وہ اس کی طرف متوجہ ہوئی۔ میکانکی انداز میں وہ فون لیے بغیر اپنے کمرے میں چلا گیا۔ غسل کے دوران بھی اس کا ذہن مریم کی طرف ہی تھا۔ ٹینکی کے سرد پانی سے نہا کر وہ باہر نکلا تو اس کا بدن بری طرح کانپ رہا تھا۔

اس سے ملاقات کی نعمان کو کوئی خواہش نہیں تھی اس کے باوجود اس نے برسوں سے تیاری کر رکھی تھی۔ آخری ملاقات پر مریم نے اسے چرمی تھیلا دیا تھا جس میں کچھ یادیں تھیں۔ اس تھیلے کا خیال آتے ہی وہ سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا۔ یہاں صرف ایک کمرہ تھا جسے آنے والے وقت میں بیڈ روم کے طور پر تیار کیا جانا تھا۔ رف حالت کے اس مستطیل کمرے میں گھر کا کاٹھ کباڑ جمع تھا۔ دوسرے لفظوں میں یہ ایک اسٹور تھا جہاں اس دو ماہ میں پہلی بار کسی نے قدم رکھا تھا۔ ابھی اسے آئے تھوڑی دیر ہی ہوئی تھی جب مہر بھی اس کے پیچھے آ گئی۔

''کیا ہو گیا ہے آج آپ کو؟ مجھے لگا آپ پھر کہیں نکل گئے ہیں، وہ تو صالحہ نے بتایا آپ اوپر ہیں۔ کیا تلاش کر رہے ہیں؟'' اس کے ساتھ جڑ کر کھڑی وہ پوچھ رہی تھی اور نعمان کے پاس جواب

کوئی نہیں تھا۔

"کچھ نہیں۔ بس سوچ رہا ہوں، اچھے خاصے کمرے کا بیڑا غرق کیا ہوا ہے ہم نے۔ اسے تھوڑا صاف ستھرا کروا لوں۔" اس نے جھوٹ گھڑا۔

"کیا کریں گے صاف کروا کر؟ ابھی تو میری شفٹنگ کی تھکن نہیں اتری اور آپ کو نئے کام یاد آ رہے ہیں۔" کہتے ہوئے اس نے آگے بڑھ کر بالکنی کا دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں ہوا کی ایک سرد لہر داخل ہوئی اور وہ تھرا کر رہ گیا۔

"واؤ۔۔ کتنا خوب صورت ہے۔ آئیں یہاں۔۔" مہر کی بات نظر انداز کر کے وہ اس تھیلے کی تلاش میں چیزیں یہاں وہاں پٹخ رہا تھا۔ وہ واپس آئی اور زبردستی اس کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتی ہوئی باہر لے گئی۔

"کتنا پیارا بیڈ روم ہے۔ مجھے بھی ایسا فرنیچر لے کر دیں۔" سامنے مختصر سے فاصلے پر موجود گھر کا بالکنی کا دروازہ کھلا ہوا تھا جس کی وجہ سے نہ صرف اس کمرے میں نظر جا رہی تھی بلکہ کمرے کے کھلے دروازے سے دوسری طرف چھت کا کھلا حصہ بھی نظر آ رہا تھا۔ گملوں کی ایک قطار جس پر خزاں کا بسیرا تھا ان کے سامنے تھی۔

"پیارا ہے ناں؟"

"ہاں۔ لے لینا۔" اس نے فرنیچر پر دھیان دیے بنا جان چھڑائی۔

"بلکہ آپ کہہ رہے ہیں اس کمرے کو سیٹ کروانے کا تو ٹھیک ہے ایسا فرنیچر لے لیتے ہیں۔" حسب عادت مہر نے جلدی مچائی۔

"اچھا ٹھیک ہے۔" جان چھڑا کر وہ اندر کی طرف مڑنے لگا تھا جب مریم اس کمرے میں داخل ہوئی۔ اس کے دل کی دھڑکن رکی تھی۔ اس کے متوجہ ہونے سے پہلے مہر سے نظر چرا کر وہ اندر ہو لیا۔

"ماں جی۔ دھوپ بھی ٹھنڈی ہے اور اب تو بادل بھی آ رہے ہیں دروازہ بند کر دیں۔" سر سے اسکارف نما دوپٹہ اتارتے اس نے آواز لگائی۔ نعمان نے کھڑکی سے اسے دیکھا۔ وقت کی ہوا نے بہت نرمی سے اسے چھوا تھا۔ بلکہ وہ تو جیسے خزاں کے موسموں سے بہاروں کے دیس سدھاری تھی۔ اس کی زرد رنگت میں گلابیاں گھلی ہوئی تھیں۔ صحت پہلے سے کافی اچھی ہو رہی تھا۔ گالوں کی ہڈیوں پر سرخی لیے ماس چڑھا تھا۔ اس کی آواز آج بھی ویسی ہی تھی دل کو سکون دیتی ہوئی۔

"ایکسکیوز می۔"

وہ بالکنی کا دروازہ بند کرنے آئی تھی جب مہر نے اسے آواز دی۔ ایک لمحے کے لیے اس کی آنکھوں میں تحیر ٹھہرا۔

"جی فرمایئے......"

"آپ کا فرنیچر بہت پیارا ہے اور آپ بھی۔ کیا میں آپ کا گھر دیکھنے آ سکتی ہوں؟" عادت کے مطابق مہر نے بلا جھجکے اس کے فرنیچر اور اس کی تعریف کی تھی۔ وہ متذبذب تھی۔

"ٹھیک ہے، آ جایئے گا کسی وقت۔ کوئی مسئلہ نہیں۔" رسمی مسکراہٹ کے ساتھ وہ چاند غروب ہونے کو تھا۔

"آپ بولتی بہت پیارا ہیں۔" مہر نے کہا تو وہ پورے دل سے ہنسی۔ نعمان کو اس کی ہنسی کے آگے کچھ دکھائی نہیں دیا تھا۔ مہر اگر اس کی دوست ہوتی تو وہ اسے بتاتا، یہ مریم کا بولنا ہی تھا جو اسے تباہ کرنے کے در پے تھا۔ کاش اس نے محبت نامے لکھے ہوتے۔ ان میں مریم کی آواز کا سوز نہ ہوتا۔ ان میں مریم کے لہجے کا گداز نہ ہوتا اور وہ عمر کے اس حصے میں شادی شدہ اور بچوں والا ہونے کے بعد...... برباد نہ ہوتا۔

مریم نے اسے نعمان سے شاہ بنایا تھا۔ پہلی بار جب مریم نے اسے شاہ پکارا تو وہ جانتا تھا مریم بلاوجہ اسے شاہ نہیں کہہ رہی پھر بھی اس نے دل جلانے کے لیے طنز کیا تھا۔

"کس شاہ کے نام سے مجھے پکار رہی ہو؟"

اس کے چہرے کا اڑا ہوا رنگ مزید اڑا تھا۔

''جو میرے دل اور روح کا مجازی بادشاہ ہے، کیا مجھے اسے شاہ بلانے کا بھی اختیار نہیں؟''

اس کے سوال پر وہ کچھ نہیں بولا تھا۔ وہ جانتا تھا مریم کہہ نہیں رہی بلکہ وہ واقعی اس کے لیے بادشاہ تھا، اس کے سیاہ و سفید کا مالک و مختار۔ اگر وہ نہ بھی ہوتا تو ایسے جھوٹے استعارے اور تشبیہات انسان کو ہواؤں میں اڑنے کے لیے پر عطا کرتی ہیں اور یہاں تو سب سچ تھا، وہ کیسے زمین پر پیر جمائے رکھتا۔

آج وہ جانے کس آسمان سے زمین پر گرا تھا جب مریم نے اس شاہ کو پہچانا ہی نہیں تھا۔ اسی بات نے اس کے اندر الاؤ دہکا چھوڑے تھے۔ اور ایک اس کے نہ پہچاننے کا غم نہیں تھا۔ سوال یہ بھی تھا کہ اسے اس مریم کے نہ پہچاننے کا غم کیوں ہے؟ مریم۔ وہ تھی ہی کیا؟ ایک عام سی شکل و صورت والی لڑکی جو اس کے پیروں میں خاک بنی پھرتی تھی۔ اس نے اس وقت اپنی مرضی سے اسے زندگی سے علیحدہ کیا تھا پھر آج کیوں وہ اس کے دل و دماغ پر سوار ہو گئی تھی؟ محبت تو یہ تھی نہیں کہ محبت اسے جس لڑکی سے تھی وہ ملی نہیں۔

پھر مہر سے اس کی شادی ہو گئی اور اسے پتا چلا کہ وہ لڑکی بھی اس کی محبت نہیں تھی۔

اب اس کی محبت مہر تھی۔ مہر...... اس کے بچوں کی ماں اور اس کی رفیقِ حیات۔ مریم کون تھی اس کا سکون برباد کرنے والی؟

نیم اندھیرے کمرے کا دروازہ وا ہوا اور مہر اندر آئی۔ اسے جاگتے ہوئے وہ دیکھ چکی تھی۔

''اب کیسا محسوس کر رہے ہیں؟'' اس نے کمبل اوڑھاتے اس کے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر حرارت دیکھی۔

''سردی کی شروعات ہے اور اس موسم میں زیادہ احتیاط کی ضرورت ہوتی ہے کہ جاتی اور آتی سردی بندے کی جان لے لیتی ہے۔ اور آپ جناب نہا کر چھت پر چلے گئے تھے اسی لیے سردی لگ گئی ہے شاید۔ کل تک ان شاء اللہ آرام آ جائے گا۔''

اس کے پہلو میں لیٹتے اس نے تسلی دی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اب اس نے کبھی ٹھیک نہیں ہونا۔ خود اسے بھی کہاں معلوم تھا۔ آدھی رات کو اسے دیکھنے کی خواہش نے بے تاب کیا تو کمبل اتار کر وہ اوپر جانے کے لیے اٹھ کھڑا ہوا۔

''کچھ چاہیے تو میں لا دیتی ہوں۔'' اس نے دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھا تو مہر کی آواز عقب سے سنائی دی۔

''نہیں میں...... میں بچوں کو دیکھنے جا رہا تھا۔''

''سوئے ہوں گے۔ صبح دیکھ لیں۔ ابھی جائیں گے تو نیند خراب ہو گی۔''

وہ چپ چاپ آ کر لیٹ گیا۔ باہر بارش ہو رہی تھی۔ سردی صحیح معنوں میں آ گئی تھی۔ وہ چشم تصور سے اس بالکنی پر بارش کی بوندوں کا رقص دیکھتا ہوا جانے کب نیند کی آغوش میں جا سویا۔

☆☆☆

بچوں کو ناشتہ کروا کر مہر کمرے میں واپس آئی۔ وہ تیار ہو رہا تھا۔

''آپ کہاں جانے کی تیاری میں ہیں؟''

اسے تیار ہوتا دیکھ مہر حیران ہوئی۔

''آفس جا رہا ہوں اور کہاں جانا ہے۔'' ٹائی کی گرہ بناتے اس نے جواب دیا۔ شیشے میں ان دونوں کا عکس بڑا پرایا اور غیر لگ رہا تھا۔

''ابھی آپ کا بخار ٹھیک نہیں ہوا۔ کم سے کم ایک دن تو ریسٹ کرتے اور پھر بارش بھی ہو رہی ہے رات سے۔''

''اب مجھے ہمیشہ بے آرام رہنا ہے۔'' اس نے زبان پر آئی بات کو روکا۔ ''ہو جاؤں گا ٹھیک اور بارش کا کیا ہے۔ میں نے کون سا لوکل یا بائیک پر جانا ہے۔ دوپہر کو کھانا تیار رکھنا میں آؤں گا کسی کو لے کر۔ اوپر کا کام کروانے کے لیے دیکھتا ہوں کسی کو۔''

مہر سے نظر ملائے بغیر اس نے اپنی مہنگے برانڈ کی گھڑی اٹھا کر کلائی میں باندھی۔ دل کے چور نے نظر

ملانے کے قابل چھوڑا کہاں تھا۔

''اتنی جلدی کیا ہے؟ اتنی سردی ہے کام وہاں بن جائے گا اور میں سب برداشت بھی کر لیتی اگر ہمیں واقعی ضرورت ہوتی۔ بچوں کے اپنے اپنے بیڈ رومز ہیں۔ گیسٹ روم الگ ہے۔ کچن، باتھ اور ڈرائنگ روم۔ ہم سہولت سے گرمیوں تک کا وقت گزار سکتے ہیں۔''

مہر جھنجلائی ہوئی تھی۔ اسے کیا پتا تھا مریم کی ایک جھلک کے لیے وہ مرا جا رہا تھا۔ اوپر کمرے سے وہ اسے بآسانی اور بار بار دیکھ سکتا تھا۔

''آج کل سردی کی وجہ سے تقریباً ہر جگہ کام رکا ہوا ہے۔ کسی کے گھر کا چولھا جل جائے تو تھوڑی تنگی میں کیا برائی ہے۔''

''یہ آپ کو سوشل ورک کا شوق کب سے ہو گیا؟''

''مہر...... جو کہہ دیا سن لیا نا؟ بحث کرنا ضروری ہے؟ اگر ہاں تو رات کو کر لینا۔'' وہ ایک دم بھڑک اٹھا تھا۔ مہر نے ابرو اچکا کر اس کی طرف دیکھا۔ شاید بخار کی وجہ سے چڑچڑا ہو رہا ہے۔ اس نے خود ہی اس کے رویے پر دل کو مطمئن کیا۔

''ناشتا تو کرتے جائیں۔'' اسے باہر نکلتا دیکھ وہ اس کے پیچھے نکلی۔

''آفس میں کر لوں گا۔'' مڑے بغیر اس نے جواب دیا۔

اس کا فون رات سے یہیں تھا۔ اس نے اٹھا کر ایک نظر دیکھا اور پھر واپس رکھ دیا۔ گاڑی اسٹارٹ کرتے اسے ایک بار پھر وہ یاد آئی تھی۔ جب وہ ایک ملٹی نیشنل کمپنی کے لیے کام کر رہا تھا تب اس کے پاس بائیک تھی۔ وہ بائیک نکال کر باہر گلی میں آتا تو اتنی دیر ضرور رکتا کہ کھڑکی میں کھڑی مریم آیت الکرسی پڑھ کر پھونک دے۔ وہ کہتی تھی۔

''شاہ تم میری زندگی ہو۔ میری ساری دعائیں تمہارے گرد طواف کرتی ہیں۔ میری دعائیں تمہاری حفاظت کرتی ہیں۔ میں ہر صبح شام تمہیں اپنی دعاؤں کے حصار میں باندھتی ہوں۔''

وہ چڑتا تھا، ناراض ہوتا تھا، نخرے کرتا تھا مگر پھر بھی روز رکتا ضرور تھا۔ مہر نے کبھی ایسا کوئی تکلف نہیں کیا تھا۔ وہ روز کمرے کے دروازے پر اس کے پاس آتی اور وہ پہلو سے لگا کر اس کا گال چومتا تھا۔ آج اسے محسوس ہوا، اس سب میں محبت تو بہت پہلے ختم ہو چکی تھی۔ اب تو وہ صرف الوداعی رسم ادا کرتے تھے۔ وہ بھی آج چھوٹ گئی تھی۔ وہ اپنے حواس میں نہیں تھا لیکن مہر کو تو یاد ہونا چاہیے تھا۔

اس نے سر جھٹک کر گیٹ سے نکلتے سامنے گھر کا گیٹ دیکھا۔ وہی گھر جسے اس نے آباد کیا تھا۔ بارش کی ننھی ننھی بوندیں بھی جیسے اس بند دروازے کو چوم رہی تھیں۔۔ بالکل مریم کے شاہ کی نظروں جیسے۔ اگر مریم جان لیتی کہ اس کا شاہ کیسے دیوانوں کی طرح اسے سوچے چلا جا رہا ہے تو خوشی سے پاگل نہ ہو جاتی؟ اس نے آئینے پر نظر ڈالی۔ عمر کے نو سال وہ کیسے واپس لا سکتا تھا؟

اس شام ایک دوست کے توسط سے اس نے ہیئر ٹرانسپلانٹ کا پتا کروایا اور اب اسے وہ بھوری آنکھیں واپس چاہیے تھیں جن میں اپنا عکس دیکھ کر مریم کا جو حال ہوتا، اسے سوچ کر ہی اسے راحت مل رہی تھی۔ وزن کم کرنے کے لیے اس نے ایک جم کی ممبر شپ لے لی تھی۔ یہ نہیں تھا کہ اس کا وزن ایک دم اتنا بڑھا تھا۔ وہ پہلے بھی موٹا تھا لیکن اتنا نہیں۔ وہ مریم کو چھیڑتا تھا۔

''کسی کو پتا چلے کہ تم مجھ پر مرتی ہو تو وہ کتنا ہنسے کہ بھری دنیا میں تمہیں ایک موٹا لڑکا ہی ملا تھا؟''

''میرے اختیار میں ہوتا تو تم کچھ بھی ہوتے۔ کالے، بھینگے یا کچھ اور۔ لیکن تم موٹے نہ ہوتے۔ اب تم ہو تو میں کیا کر سکتی ہوں؟ میرا کون سا بس چلتا ہے۔'' وہ ہنستی تھی اور شاید جانتی تھی کہ اسے بہانے بہانے مریم کا اظہار، اقرار سکون دیتا ہے۔ اس کی بے بسی شاہ کو مزہ دیتی ہے۔ وہ جانتی تھی پھر بھی ہر بار نئے سرے سے سب کھول کھول کر بتاتی تھی۔

"زندگی میں تو سب ہی پیار کیا کرتے ہیں
میں تو مر کر بھی میری جاں تجھے چاہوں گی"

یہ وہ غزل تھی جو وہ اکثر صحن میں فرش دھوتے ہوئے یا کام کرتے ہوئے گنگنایا کرتی تھی اور پھر جب وہ اس کے ساتھ کسی وجہ سے لڑتا تب بھی روتے ہوئے دیوار کے ساتھ بیٹھ کر سسکیوں میں گایا کرتی تھی۔ اب بھی گھر واپسی پر وہ یہ غزل سن رہا تھا لیکن کانوں میں آواز مریم کی گونج رہی تھی۔

اس کا گیٹ اب بھی بند تھا۔ بالکنی پر لگی روشنیاں جگنو کی طرح لگ رہی تھیں۔ اسے راہ دکھاتی ہوئی۔

"بس اب کچھ دن اور۔۔" اس نے خود کو مریم کے روبرو پایا۔ چاہ کر بھی ذہن میں وہ اس کے احساسات کی تصویر نہیں بنا پایا۔

☆☆☆

گھر کا کام شروع ہوئے ایک ہفتہ ہو چکا تھا۔ ایک تو سردی ایک دم بڑھ گئی تھی، اوپر سے دن بھی انتہائی چھوٹے سو کام چیونٹی کی رفتار سے چل رہا تھا۔ مہر نعمان سے ناراض ناراض پھر رہی تھی۔ نعمان نے اس پر دھیان ہی نہیں دیا تھا۔ اس کا سارا دھیان مریم کے توسط سے خود پر تھا۔ پچھلے دنوں اس نے ہیئر ٹرانسپلانٹ بھی کروالیا تھا۔ اس سے اور کچھ ہوا تھا یا نہیں کم از کم مریم کا سامنا کرنے کے لیے وہ پر اعتماد ضرور ہوا تھا۔ باقاعدگی سے جم بھی جا رہا تھا وہ۔ یہ پہلی بار تھا کہ اس نے خود میں کسی تبدیلی پر دھیان دیا تھا ورنہ اسے کبھی ضرورت ہی محسوس نہیں ہوئی تھی۔ مریم نہ ملتی تو اب بھی وہ خود کو خوب صورتی کا شاہکار ہی تصور کرتا۔ اس میں اس کا بھی قصور نہیں تھا۔ پہلے لڑکیاں اس کی صورت دیکھ کر کھنچی چلی آتی تھیں اور اب ایک عرصہ ہوا، اس کی دولت کی وجہ سے۔ اسے پتا ہی نہیں چلا کہ کب کشش کی وجہ بدلی۔ جو بھی تھا اسے مریم کے ملنے کے بعد ایک دھکا لگا تھا وہ دھکا جس نے اس کی آنکھیں کچھ کھول دی تھیں۔

اس دن وہ اردو بازار سے گزر رہا تھا جب اچانک اسے یاد آیا مریم کیسے اسے اشعار سنایا کرتی تھی۔ جب وہ بہت مصروف ہوتا تب وہ اسے ایک ہی میسج بھیجتی تھی۔

بہت مصروف رہتے ہو
سحر سے شام ہونے تک
کوئی لمحہ نہیں ملتا
کوئی گمنام سی ساعت
کوئی بے نام سی فرصت
کہیں بیٹھے ہوئے تنہا
کہیں جو شام ہو جائے
ہماری التجا ہے یہ
کوئی لمحہ چرا لینا
جو میرے نام ہو جائے
کہ ہم جیسے اسیروں کا
کوئی تو کام ہو جائے

یہ میسج ایک تواتر سے اس کے فون کی اسکرین پر نمودار ہوتا تھا کہ اس کے حافظے میں آج بھی پوری طرح محفوظ تھا۔ مریم کے لیے بھیجے تحائف میں ایک نیا تحفہ شاعری کی کتاب کا ہونا چاہیے یہ سوچ کر اس نے گاڑی ایک جگہ روکی۔

"شاعری کی کوئی بھی اچھی سی کتاب لا دو۔ کسی کو تحفہ دینی ہے۔ خوشبو کے علاوہ۔" اس نے لڑکے کو آواز دے کر کہا۔

وہ سر ہلا کر اندر چلا گیا۔ وہ سوچ رہا تھا کیسی بات ہے مریم سے اسے محبت نہیں تھی لیکن اس کے بارے میں ہر ایک شے اسے روزِ اول سے یاد تھی۔ وہ کچھ نہیں بھولا تھا۔ شاید اس لیے کہ وہ اس کے اعصاب پر ہر وقت سوار رہتی تھی۔ اس کے پاس خوشبو موجود تھی۔ میرون رنگ کی جلد میں وہ کتاب اب بھی اسے مریم کے سینے سے لگی دکھائی دے رہی تھی۔ جانے کب اور کہاں سے اس نے لی تھی۔ لیکن اس کے پاس موجود تھی۔

"یہ لیں سر۔ باذوق شخص کے لیے اس سے بہتر تحفہ نہیں ہو سکتا۔"

فیض احمد فیض کا مجموعہ کلام ''نسخہ ہائے وفا'' ہاتھ میں لیے وہ اس سے کہہ رہا تھا۔اس نے قیمت پوچھ کرادائی کی اور گاڑی آگے بڑھادی۔

اس رات اس نے جانے کتنے سالوں بعد کوئی کتاب کھولی تھی۔ کمرے میں ایل ای ڈی پر کوئی ڈرامہ چل رہا تھا۔ ہیٹر نے کمرے کا درجہ حرارت کافی حد تک قابلِ برداشت بنایا ہوا تھا۔ مہر ہاتھ پیروں پر لوشن ملتے ہوئے مسلسل بول رہی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہیں تھی۔ نئی بات تو وہ کتاب تھی جو اس کے ہاتھ میں تھی۔ وہ اسے پڑھ کر موقع محل کی مناسبت سے دل کا حال عیاں کرتے اشعار پر پنسل سے نشان لگانا چاہتا تھا لیکن مہر کے بولنے اور ڈرامے کی آواز سے اس کا ارتکاز نہیں بن پا رہا تھا۔

''یار! تھوڑی دیر پڑھ بھی لینے دو کچھ۔۔ مجال ہے جو کچھ سمجھ میں آ رہا ہو'' وہ جھنجلا کر بولا تھا۔ مہر حیران ہوئی تھی۔ وہ بھلا ایسے کب چلاتا تھا۔

''اچھا سوری! کتاب پڑھ رہا ہوں۔ ایک تو پکڑی اتنے عرصے بعد ہے، دوسرا تمہارا ٹی وی اتنا شور مچا رہا ہے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔'' اپنے بدصورت رویے کا احساس ہوتے ہی وہ معذرت خواہ ہوا۔

''کوئی بات نہیں، میری غلطی ہے میں نے دھیان نہیں دیا۔'' آنکھوں میں بے یقینی اور پانی لیے اس نے لوشن ڈریسنگ پر رکھ کر ٹی وی بند کیا اور ملحقہ کمرے کا دروازہ کھول کر بچوں کے سونے کا یقین کر کے بیڈ پر آ گئی۔

''سوری مہر۔'' اس سے مہر کا دکھی ہونا برداشت نہیں ہوا تھا۔

''کوئی بات نہیں۔'' کہہ کر مہر نے سر تک کمبل تان لیا۔ ایک نظر ہاتھ میں پکڑی کتاب پر ڈال کر اس نے کتاب بیڈ کی سائیڈ ٹیبل پر رکھی۔ ''اچھا یہ بتاؤ، اپنی نئی سہیلی کا فرنیچر دیکھ آئی ہو؟''

''نہیں۔ یہ جو آپ نے بے وقت کا کام شروع کروا دیا ہے، اس کے بعد تو مما سے فون پر بات کرنے کا وقت نہیں مل رہا تو یسریٰ کے گھر جانے کا وقت کہاں ملے گا۔'' اس نے کمبل کے اندر سے جواب دیا۔

''کون یسریٰ؟''

''وہی سامنے گھر میں جو رہتی ہے۔ اس کا نام یسریٰ ہے۔''

اس کی بات پر نعمان نے بے یقینی سے کمبل میں لپٹا اس کا وجود دیکھا۔ ہوسکتا ہے اس گھر میں کوئی اور بھی رہتا ہو۔ اس نے خود کو تسلی دی۔ وہ تو مریم تھی نا؟ شاہ کی مریم۔

''اچھا گھر کا کام مکمل ہو لینے دو، مہینہ رہ لینا مما کے پاس۔''

حسب توقع فوراً کمبل منہ سے اترا تھا۔ ''سچ کہہ رہے ہیں نا آپ؟ بعد میں مکر نے نہیں دوں گی۔''

''ہاں نا۔ بالکل سولہ آنے کھرا سچ۔'' اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

''تھینک یو۔ بہت اچھے ہیں آپ۔'' اس کا گال چوم کر اس نے لاڈ سے اس کے بازو پر سر رکھا۔ ''مجھے نہیں پتا تھا، آپ کو کتابوں کا بھی شوق ہے۔ اوپر کے بیڈ روم میں کتابوں کے لیے شیلف بھی بنوائیں یا الماری یا کچھ بھی جو آپ کو مناسب لگے۔'' مندی مندی آنکھوں سے وہ کہہ رہی تھی اور نعمان کو ایک بار پھر وہ یاد آ گئی تھی۔

''یہ بازو جب کسی کا تکیہ بنیں گے ناں تو شاہ مجھے بھول مت جانا۔ میں جہاں بھی جس تکیے پر بھی سوؤں گی وہ میرے لیے اینٹ ہوگا۔'' بے اختیار اس نے مہر کے سر کے نیچے سے بازو کھینچا۔

''کیا ہوا؟''

''کچھ نہیں۔ تم سو جاؤ، میں ذرا کتاب پڑھ لوں۔'' ہاتھ بڑھا کر اس نے کتاب پکڑی۔

رات یوں دل میں تری کھوئی ہوئی یاد آئی
جیسے ویرانے میں چپکے سے بہار آ جائے
جیسے صحراؤں میں ہولے سے چلے بادِ نسیم
جیسے بیمار کو بے وجہ قرار آ جائے

پہلا شعر ہی حسب حال لگا تھا۔ مسکرا کر اس نے پنسل سے ستارہ بنایا۔ باہر بادلوں کی گڑگڑاہٹ سنائی دے رہی تھی۔ سیمنٹ اور اوزار غیرہ باہر نہ پڑے ہوں یہ سوچ کر اس نے چھت کا رخ کیا۔ کشادہ چھت پر ایک طرف اسٹور روم کے ڈھانچے کا اضافہ ہو چکا تھا۔ اس نے دیکھ کر دھیان سے سب کچھ اندر رکھا اور دل کے ہاتھوں مجبور ہو کر ایک نظر اس کی بالکنی کے بند دروازے پر ڈالنے کے لیے ایک بار پھر اس کمرے میں موجود تھا۔

جب سے اسے مریم کے یہاں ہونے کا علم ہوا تھا اس کی آنکھوں نے جانے کتنی بار اس دروازے پر سجدے کیے تھے۔ اپنی بالکنی کا دروازہ کھولنے سے پہلے ہی جانے کیوں اسے دوسری طرف کسی کی موجودگی کا احساس ہوا تھا۔ اس کی سانس مدہم ہو گئی تھی یہ سوچ کر کہ وہ وہاں موجود ہے جس کی ایک جھلک کے لیے اس نے دیوانگی اوڑھ لی ہے۔ اس نے سرد کھڑکی سے لگ کر دیکھا۔

بالکنی پر پڑی چار کرسیوں میں سے دو خالی تھیں اور دو پر وہ دو موجود تھے۔ موسم کی شدت سے بے نیاز۔ وہ تو تھی ہی ایسی پاگل۔ لیکن اس کے ساتھ بیٹھا وہ مرد بھی کیا پاگل تھا؟ ایک لمحے کو اس کا دل مٹھی میں آیا۔ جس کے دل میں محبت کا شعلہ بھڑک رہا ہو بھلا اسے سردی کیسے لگے گی؟ اس نے سوچا۔

"تو میری زندگی ہے
تو میری ہر خوشی ہے
تو ہی پیار تو ہی چاہت...... تو ہی بندگی ہے
تو میری زندگی ہے

ہوا کے پروں پر اس کی مدہم گنگناہٹ رقص کرتی اس کی سماعت تک آئی تھی۔ اس لمحے اندھیرے میں بیٹھے اس شخص سے اسے بے انتہا نفرت محسوس ہوئی۔ مریم جھوٹی۔ کہتی تھی۔

"شاہ تم میرا عشق ہو اور عشق ایمان ہوتا ہے۔ میں منکر نہیں ہو سکتی۔ میری روح ازل سے اس عشق کے نام تھی اور رہے گی۔ یہ عشق میری آکسیجن ہے۔ مر نہ جاؤں اگر یہ عشق روٹھ جائے۔ میری آواز، میرے گیت تمہارے لیے ہیں اور رہیں گے۔ پھر چاہے تم مجھے صدیوں بعد ہی کیوں نہ ملو۔"

وہ ایسے گانے سناتی تھی، شاعری اس کے لیے پڑھا کرتی تھی پھر کیسے وہ یہ اس شخص کو سنا رہی تھی۔ مریم جھوٹی۔ کہتی تھی۔

تم ہمارے بنو نہ بنو، تم کو ہے اختیار
تقدیر نے تو ہم کو تمہارا بنا دیا

وہ اگر شاہ کی تھی تو اسے گانا کیوں سنا رہی تھی؟ کیا اب وہ مریم کی زندگی تھا؟ باہر بارش کی بوندیں گرنا شروع ہوئیں اور اور وہ دونوں اٹھ کر اندر چلے گئے۔ اس سخت سردی میں وہ وہیں جم کر کھڑا رہا۔ شاید اب۔ شاید اب پھر دروازہ کھلے اور وہ باہر آئے۔ ایک نظر ایک جھلک کے لیے اس نے جانے کتنے گھنٹے وہاں بتا دیے تھے۔ اسے آج کھڑکی میں کھڑی مریم کی تڑپ سمجھ میں آئی تھی۔

☆☆☆

سرما کا یہ دن کھلا کھلا تھا۔ سارا دن دھوپ جم کر نکلی تھی جس کی وجہ سے شام بھی باقی دنوں کی نسبت قدرے گرم تھی۔ وہ بچوں کو قریبی پارک لے کر گیا ہوا تھا۔ جب سے وہ اس گھر میں آئے تھے تب سے وہ بچوں کے ساتھ وقت نہیں گزار پایا تھا۔ ایک تو گھر کی قیمت کے لیے اس نے کاروبار سے پیسے نکالے تھے تو اب وہی ریکور کرنے کی کوشش میں لگا ہوا تھا۔ صبح کا گیا دیر رات کو لوٹتا اور تب تک بچے سو چکے ہوتے اور پھر مریم کی خاطر اس نے خود پر توجہ دینی شروع کی تو بچوں کا وقت جم اور اوپر کے پورشن کی تعمیر میں لگ گیا۔ اب اوپر کا کام ختم ہو چکا تھا بس سیٹنگ وغیرہ رہتی تھی۔ فرنیچر وغیرہ ڈلوانا تھا اور بس۔ وہ ذہنی طور پر تھوڑا پرسکون ہوا تھا اور آج کافی دن کے بعد موسم بھی اچھا تھا اور بچے بھی کہہ رہے تھے۔ ایک بھرپور شام گزار کر وہ بچوں کے ساتھ واپس آ رہا تھا تب اس نے اس گھر کا دروازہ کھلتے دیکھا۔ وہ باہر آئے گی۔ یہ سوچ کر دل کی دھڑکن سست پڑ گئی تھی لیکن

اندر سے ایک ادھیڑ عمر عورت کو دیکھ کر وہ بے مزہ ہوا۔ لیکن یہ عورت تو اماں کی کزن تھیں، ان کے ساتھ نو یا دس سال کا بچہ تھا۔ ان کے ساتھ اماں کے اچھے خاصے مراسم تھے۔ وہ بچوں کو آہستہ آہستہ چلتا چھوڑ کر ان کی طرف تیزی سے بڑھا۔ اسے دیکھ کر ان کے چہرے پر اترتے خوف اور بے یقینی کے سائے اس نے واضح دیکھے تھے۔ اگر وہ ان کی طرف نہ جاتا تو وہ اسے دیکھ کر بھی ان دیکھا کر جاتیں۔ شاید واپس اندر چلی جاتیں یا پتا نہیں۔

''السلام علیکم خالہ۔ کیسی ہیں؟''

''وعلیکم۔ ٹھیک ہوں۔'' اس کی طرف دیکھے بنا جواب دے کر وہ واپس دروازے کی سمت مڑیں۔

''یہاں کسی سے ملنے آئی ہیں؟'' اس نے زبردستی بات بڑھائی۔

''نہیں۔ میں یہیں رہتی ہوں۔''

اس بات پر وہ چونکا۔ مہر نے بتایا تھا کہ اس گھر میں رہنے والی اس لڑکی کا نام یسریٰ تھا اور اب خالہ کہہ رہی تھیں کہ وہ اس گھر میں رہتی ہیں۔ وہ جانتا تھا ان کی بیٹی کا نام یسریٰ ہے لیکن اس نے ایک بھی دن یسریٰ کو نہیں دیکھا تھا۔

''ماں جی! چلیں بھی۔'' اس لڑکے کا انداز بڑا اکھڑا اکھڑا تھا اور صورت میں وہ مریم جیسا تھا۔ بے ساختہ اس نے اس بچے کا چہرہ چھوا۔ ردِعمل کے طور پر تیوری چڑھائے وہ اس سے دور ہو کر کھڑا ہوا۔

''آپ یہاں رہتی ہیں؟ بڑی اچھی بات ہے۔ شکر ہے ہمیں ہمسائے بھی رشتہ دار ملے ہیں۔''

اس کی بات مکمل ہونے سے پہلے ہی وہ اس بچے کا ہاتھ تھامے کشادہ سڑک نما گلی کے داخلی راستے کی طرف چل پڑیں۔

''کیا ہوا خالہ؟ کوئی بات بری لگ گئی ہے کیا؟'' اس نے پوچھا لیکن وہ جواب دیے بنا چادر مزید لپیٹے ناک کی سیدھ میں چلتی جا رہی تھیں۔

''اچھا آپ واپس آ جائیں تو میں مہر کو آپ کے گھر لاتا ہوں۔'' واپسی کی طرف قدم بڑھاتے اس نے آواز دی۔

''نن...... نہیں...... نہیں تم نہ آنا۔'' وہ بجلی کی رفتار سے پلٹیں اور ان کی بات نعمان کی سمجھ سے باہر تھی۔ ''تم کل اسی وقت پارک آنا، میں تمہیں بتاؤں گی۔ تم گھر مت آنا۔ ٹھیک ہے نا؟''

''ٹھیک ہے۔'' اس نے نا سمجھی سے ہامی بھر لی۔ یہ سوچے بغیر کہ کل تو اسے اس وقت آفس میں ہونا ہے۔ لیکن بات مریم کی ہو سکتی تھی۔ وہ اس وقت بسترِ مرگ پر بھی ہوتا اور کوئی مریم کے نام پر اسے بلاتا تو وہ سر کے بل چلا کر جاتا۔ مریم اور مریم کی بات اس کے لیے اتنی ضروری تھی۔

اگلے دن اسی وقت وہ پارک میں موجود تھا۔ کچھ دیر بعد وہ بھی آ گئیں۔

''میں توقع رکھوں کہ تم پردہ رکھو گے؟'' انہوں نے سوال سے بات شروع کی۔ اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔

''تمہیں یاد ہو گا، میں نے یسریٰ کی شادی کر دی تھی۔''

اسے یاد تھا، اتنی قریبی رشتہ داری تھی اور ان کی ایک ہی ایک تو بیٹی تھی پھر وہ کیسے نہ ان کی شادی میں جاتے۔ ویسے بھی یہ کوئی بہت پرانی بات بھی نہیں تھی۔

''جی یاد ہے۔'' اس نے جواب دیا۔

''اس کے سسرال والے اللہ جانے کیسے لوگ تھے کہ میں نے تو اپنی بیٹی کی پرورش بھی ایسی کی تھی کہ جیسے گیلی مٹی ان کے ہاتھ تھما دی تھی۔ جیسے چاہتے ڈھال لیتے۔ اس کے باوجود وہ ایک وقت میں سونا اور ہیرا انہیں بن سکی تھی۔ کچھ مہینوں بعد ہی طلاق کے کاغذ لے کر گھر آ بیٹھی۔ طلاق کے ٹھیک ڈیڑھ ماہ بعد ایک کمزور سے بچے کو دنیا میں لاتے وہ زندگی سے منہ موڑ بیٹھی۔'' اکلوتی بیٹی کی جواں سالہ موت کی بات کرتے ان کی آنکھیں بھر آئی تھیں۔ وہ لفظی تسلی دینے کے حوالے سے بھی بہت کم ہمت تھا۔ وہ رو رہی تھیں اور اس سے دو لفظ تسلی کے نہیں بولے گئے۔

"لیکن خالہ! مہر کہہ رہی تھی آپ کے گھر میں یسرٰی بھی آپ کے ساتھ رہتی ہے۔"

انہوں نے سر اٹھایا۔ "جس رات میں یسرٰی کے ساتھ ہسپتال میں تھی مجھے وہاں وہ ملی۔ جانے کون سی قیامت اس نے اپنی جان پر جھیلی تھی جو ایک ناجائز بچ کوکھ میں سینچ رہی تھی۔ اس کی ماں اسے اندھیرے کونے میں پیٹ رہی تھی، کوسنے دے رہی تھی، رو رہی تھی اور نام پوچھ رہی تھی۔ جانے کس کا گناہ سر پر لیے وہ خاموش بیٹھی تھی۔ اس کی ماں چاہتی تھی، ابارشن ہو جائے لیکن جتنا وقت گزر چکا تھا ڈاکٹروں نے صاف منع کر دیا تھا۔

"کہیں جا کر مر جا گھر لے گئی تو تو موت کو ترسے گی اور موت نہیں آئے گی۔"

اس کی ماں یہ کہہ کر اسے اس ہسپتال کے احاطے میں چھوڑ کر نکل گئی تھی۔ تب میں مری ہوئی یسرٰی چھوڑ کر اس زندہ یسرٰی کو گھر لے آئی تھی۔ میرے شوہر کے بعد ایک یسرٰی ہی تو تھی میرا سہارا۔ وہ بھی نہ رہی تو میں جینے کا حوصلہ کہاں سے لاتی؟

سعد ہوا تو اپنا گھر بار بیچ کر ہم یہاں آ گئے۔ اپنے ملنے جلنے والے میں نے سب چھوڑ دیے تھے کہ کوئی یہ نہ کہے کہ یہ یسرٰی نہیں۔ اسے یسرٰی کا نام دے کر میں نے اس کی شادی کر دی اور اب تم مل گئے۔ اگر تم عین سامنے کے گھر میں نہ بستے ہوتے اور روز روز تم سے سامنے کا خطرہ نہ ہوتا تو میں تمہیں یہ سب نہ بتاتی۔ سعید بہت چاہتا ہے اسے۔ خود اس نے چھوٹی سی عمر میں اتنے عذاب جھیلے ہیں کہ میں نہیں چاہتی اب حالات کی گرم ہوا بھی انہیں چھوئے۔ اگر سعید کو پتا چلا کہ یہ میری بیٹی نہیں تو بتاؤ میں کیا کہوں گی یہ کون ہے؟"

نمکین پانی کا ایک ریلا تھا جو پہلے حلق میں اٹکا اور اب آنکھوں کے راستے بہہ نکلا۔ اترتی شام میں پارک کے سنگی بنچ پر بیٹھا وہ رو رہا تھا۔ اپنے کیے پر یا اس پر بیتی پر۔ وہ رو رہا تھا۔ دل چاہ رہا تھا ساری دنیا کے دریا اس کی آنکھ سے بہہ جائیں۔ شاید دل میں لگی آگ ٹھنڈی ہو جائے۔

وہ جا چکی تھیں۔ سارے سوال سارے جواب ختم ہو گئے تھے۔ اس نے اپنے ہاتھوں سے مریم کو مار دیا تھا۔ اس کی پہچان چھین لی تھی تو اب کس مریم کو تلاش کر رہا تھا۔ ایک دن مریم نے کہا تھا۔

"شاہ آگہی سے بڑا عذاب کوئی نہیں ہوتا۔"

اور آج وقت نے اس کی بات سچ کر دی تھی۔

اس سرد شام میں اس پارک کے بنچ پر بیٹھے اس نے اعتراف کیا۔ اسے مریم سے محبت پہلے بھی تھی لیکن اب جو دل پر اترا تھا وہ عشق تھا۔ یہ ایک لاحاصل عشق تھا۔ دل اندر کہیں جانتا تھا لیکن مریم کی طرح وہ بھی بے بس تھا۔ اسے اس بچے کا خیال آیا۔ سعد...... یہی نام بتایا تھا انہوں نے۔ اس کا اور مریم کا بیٹا۔ یہ وہی لڑکا تھا جو کل ان کے ساتھ تھا۔ مریم کے نقوش لیے انداز اس کا سارا نعمان پر تھا۔ وہی اکھڑ لہجہ اور وہی مردم بیزاری۔ دل مسلسل ایک درد میں مبتلا تھا۔

یہ بھی اچھا ہوا کہ جب وہ گھر گیا تو مہر گھر نہیں تھی۔ خالی کمرے میں اسے کچھ وقت مل گیا تھا کہ مہر کے آنے تک خود کو نارمل کر سکے۔ تھوڑی دیر میں مہر آ گئی۔

"میں یسرٰی کے گھر گئی تھی اور آپ بھی آج جلدی آ گئے۔" شال اتار کر تہ کرتے اس نے بتایا۔ وہ چپ چاپ لیٹا رہا۔

"میں آپ کے لیے کھانا لے کر آتی ہوں۔"

"جاتے ہوئے لائٹ بند کر جانا۔ روشنی آنکھوں میں چبھ رہی ہے۔" وہ کچھ دیر کے لیے بالکل اکیلا رہنا چاہتا تھا بلکہ کچھ دیر نہیں، کچھ دنوں کے لیے۔ کچھ دن کے لیے وہ مہر کو اس کے والدین کی طرف بھیج سکتا تھا۔ وہ ہمیشہ جانے کا کہتی تھی لیکن اس کا بچوں کے بغیر دل نہیں لگتا تھا سو مہر وہاں رہ نہیں پاتی تھی۔ اس بات پر مہر کو بھی اس سے گلہ رہتا تھا اور اس کی ماں کو بھی نعمان سے یہ واحد شکایت تھی۔

''میں حیران رہ گئی ماں۔ وہ مجھ سے بھی کوئی دو تین سال بڑی ہے لیکن دیکھنے میں کتنی ینگ لگتی ہے۔''

میز کے گرد بیٹھے کھانا کھاتے مہر نے کہا تو اس کی بات پر اس کا لقمہ حلق میں اٹکا۔ وہ جانتا تھا، مہر مریم کی بات کر رہی ہے۔ واقعی اس کے لیے سال لمحوں جیسے گزرے تھے۔ اس نے ایک نظر مہر کو دیکھا۔ دو بچوں کے بعد اس کا وجود اتنا پھیل گیا تھا کہ وہ اپنی عمر سے بڑی دکھائی دیتی تھی۔

''پاپا! مجھے ویسی گاڑی لا دیں جیسی سعد کے پاس ہے۔ وہ اتنا گندہ ہے مجھے ہاتھ بھی نہیں لگانے دے رہا تھا۔ اس کی ماما نے اس سے کہا تو پھر وہ کمرے سے ہی چلا گیا۔ پھر ہم نے خوب کھیلا۔''

صالحہ بتا رہی تھی اور وہ کان بنا ہوا تھا۔ اسے سکون مل رہا تھا جب وہ مریم اور اس کے بچوں کے بارے میں بات کر رہے تھے۔

''پاپا! آپ سن رہے ہیں نا؟''

''ہاں میں سن رہا ہوں، لا دوں گا جلد ہی۔''

''ماں وہ اتنا پیارا بولتی ہے۔ وہ باتیں کر رہی تھی اور میں سوچ رہی تھی۔ میں لڑکی ہوں تو میرا یہ حال ہے کہ دل چاہ رہا ہے وہ ہمیشہ بولتی رہے تو مردوں کا کیا حال ہوتا ہوگا۔'' مہر کی بات پر وہ تڑپا۔ اسے مریم کی لکھی ایک نظم یاد آئی۔

آسماں کی رفعتیں
چھونے کی خواہش نہیں مجھے

میرے مولا
مجھے وہ اسمِ اعظم عطا کر
جو مجھے میرے شاہ کے دل،
اس کی روح میں اتار سکے

اسے دنیا سے کیا غرض، وہ تو شاہ کی دیوانی تھی اور بڑے فخر سے کہتی تھی۔ ''مجھے بس تم سے مطلب ہے شاہ! دنیا کا میں کیا کروں گی۔''

اس کی باتیں، اس کی نظمیں اور خود وہ شاہ کے گرد گھومتی رہتی تھی۔ اس کی شاعری بھی ایک الگ کتا تھی۔ ایک دن اس نے مریم سے کہا تھا۔

''تم اتنے خوب صورت لفظ کہاں سے ڈھونڈ کر لاتی ہو؟ اتنی پیاری باتیں کرتی ہو کہ مجھے لگتا ہے جیسے شاعری سنا رہی ہو۔ کبھی لکھو نا کچھ۔''

وہ ہنسی۔ ''شاعری بڑے لوگوں کے کام ہیں۔ مجھے تم سے فرصت ملے تو میں کچھ لکھوں۔''

''تو تم مجھ پر لکھو کوئی نظم۔ مجھے یقین ہے اگر تم مجھ پر کچھ لکھو گی تو میں لافانی ہو جاؤں گا۔''

وہ چپ ہو گئی تھی۔ اس کے بعد اس نے شاعری کرنا شروع کی تھی۔ ''یہ صرف تمہارے لیے ہے۔ تم تک رہے گی۔ میں تمہیں لافانی نہیں بنا سکتی۔''

کھانے کے بعد وہ کمرے میں کتاب کھول کر بیٹھا تھا۔ مہر بچوں کو سلا کر کمرے میں آئی۔ روز کی طرح اس نے ٹی وی نہیں لگایا تھا۔ شاید اس کے مطالعے میں خلل کے خیال سے یا شاید آج اس کا بھی ذہن منتشر تھا۔ شیشے کے سامنے کھڑی کافی دیر تک وہ خود کا مختلف زاویوں سے جائزہ لینے کے بعد بستر پر آ بیٹھی۔

''ماں! ایک بات کہوں اگر برا نہ لگے؟'' مہر کی آواز نے اسے خیالوں سے باہر نکالا۔ کتاب سامنے کھلی تھی لیکن اس کا ذہن جانے کہاں تھا۔

''ہاں، بولو۔''

''میں جم جوائن کرنا چاہ رہی ہوں۔ مجھے لگتا ہے میں اوور ویٹ ہو گئی ہوں گھر میں رہ رہ کر۔'' اس نے جھجکتے ہوئے کہا۔

''تو مریم! تم نے مہر کو بھی احساسِ کمتری میں مبتلا کر دیا؟'' اس نے سوچا۔ مہر وہ لڑکی تھی جسے پا کر اسے کبھی مریم کا خیال بھی نہیں آیا تھا۔

''ہاں کر لو، کیا مسئلہ ہے۔''

''نہیں مسئلہ کچھ نہیں بس آپ کہیں پتا کر دیں۔''

''ٹھیک ہے اور کچھ؟'' پھیکی سی زبردستی کی ہنسی ہونٹوں پر لاتے اس نے پوچھا۔

"اور یہ کہ مجھے کچھ کپڑے خریدنے ہیں۔ اپنے بھی اور بچوں کے بھی۔"

"ٹھیک ہے یار! لے لینا۔ جس دن جانا ہو، بتا دینا، میں لے جاؤں گا یا فراز کو بلا لینا۔" بات ختم کر کے اس نے کتاب سائیڈ ٹیبل پر ڈالی۔ کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا تو بلاوجہ مغز ماری کا فائدہ؟ ہر ورق اس کی تصویر بن جاتا تھا اور ہر لفظ سے اس کی باتیں یاد آتی تھیں۔ مہر نے اسے کتاب بند کرتے دیکھا تو اٹھ کر نائٹ کریم لگائی، ایک نظر دروازہ کھول کر سوئے ہوئے بچوں پر ڈالی اور بتی بجھا کر اس کے پاس بستر پہ آ گئی۔

"مان! ایک بات کہوں؟"

"ہوں۔" آنکھوں پر بازو رکھے اس نے جواب دیا۔

"آج مریم کو قریب سے دیکھ کر جانے مجھے کیا ہوا ہے۔ مطلب...... میں نے ہمیشہ اچھے اور اپنی پسند کے کپڑے لیے ہیں۔ لیکن وہاں جا کر مجھے لگا جیسے مجھے دنیا کا علم نہیں تھا کہ دنیا میں یہ سب چیزیں بھی پائی جاتی ہیں جو اس کے گھر میں موجود ہیں۔ اتنی چاہت سے لی اپنی ساری چیزیں مجھے کچرا دکھائی دے رہی ہیں۔ جیسے میں نے آنکھیں بند کر کے خریداری کی ہو۔ ایسے لگا جیسے بچوں میں کھو کر میں نے اپنی حسیات گم کر لی ہیں۔ میں اتنی موٹی ہو گئی ہوں۔ میرے بال اتنے رف ہو رہے ہیں۔ ہر ماہ پارلر جانے کے باوجود اسکن اتنی ڈل لگ رہی ہے کیونکہ میں نے گھر میں کیئر نہیں کی۔" شادی کے شروع میں کافی عرصے تک وہ ایسے ہی کرتی تھی۔ ہر رات اس کے بازو پر سر رکھے پورے دن کی باتیں بتاتی، ساتھ میں اس کے اپنے تبصرے بھی شامل ہوتے تھے۔ اب ایسا بہت عرصے بعد ہوا تھا۔

"مان......"

"ہاں بولو سن رہا ہوں۔" اسے لگا مہر نے اسے سویا ہوا سمجھ لیا ہے۔

"مان! کچھ لوگ کتنے مکمل ہوتے ہیں نا۔"

وہ تائید نہیں کر سکا بلکہ اس نے مریم کے کامل رہنے کی دعا مانگی تھی۔ یہ اس کی پہلی دعا تھی جو اس نے مریم کے لیے مانگی تھی۔

"مکمل کوئی بھی نہیں ہوتا۔ بس جو لوگ ہمیں اچھے لگتے ہیں، ہم انہیں مکمل سمجھتے ہیں۔" وہ اسے پرسکون کرنے کے لیے ایسا کہہ رہا تھا۔

"پتا نہیں۔ شاید آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ لیکن سچ کہوں تو اس کے گھر جا کر اپنا آپ بہت بے حیثیت اور کم تر لگ رہا ہے۔" بات ختم کر کے اس نے منہ موڑا اور آنکھیں بند کر لیں۔ یہ اس کی طرف سے "اینڈ آف ڈسکشن" کا اشارہ تھا۔ وہ خاموشی سے اسے منہ موڑے دیکھتا رہا۔ یہ وہ لڑکی تھی جو اس کی زندگی میں آئی تو دل میں صبا کی محبت کے باوجود اسے بری نہیں لگی۔ پھر آہستہ آہستہ مہر اس کے دل و دماغ پر چھاتی چلی گئی۔ صبا سے محبت ایک خواب کی طرح دل و دماغ سے نکل گئی تھی۔ اور اب وہی کہہ رہی تھی اسے مریم کے سامنے اپنا آپ کم تر محسوس ہوتا ہے۔

وہ مریم جو کمہاروں کی لڑکی تھی۔ عام سے خدو خال والی۔ جس کے چہرے پر ہمیشہ ابٹن کی زردی کھنڈی رہتی تھی۔ ہڈیوں کی مالا۔ جس کے کپڑے سادہ اور اسی کی طرح بے رونق ہوتے تھے۔ سترہ سال کی عمر میں بھی وہ ایسی بے رونق تھی۔ مرجھایا ہوا پھول۔ یہ تو وہ موسم ہوتا ہے جب سانولے سلونے چہرے بھی جوانی کی چاندنی سے چمکنے لگتے ہیں۔ دل کے ارمان آنکھوں کے ستارے بن جاتے ہیں۔ پہننے اوڑھنے کا سلیقہ نہ بھی ہو تو پہنی ہوئی ہر شے پھبتی ہے۔ جانے کیوں وہ ایسی بے ذائقہ چائے جیسی تھی جو پڑی پڑی ٹھنڈی ہو جائے۔

اب وقت نے ایسا پلٹا کھایا تھا کہ اس کی ایک جھلک نے نعمان کا چین چھین لیا تھا تو ایک ملاقات نے مہر کو بے سکون کر دیا تھا۔ کھلی آنکھوں کے ساتھ وہ اس مریم کو دیکھ رہا تھا جسے اس نے دھتکارا تھا۔

"نیند نہیں آ رہی؟" اس نے کروٹ بدل کر

پوچھا۔
''اتنی لمبی تو رات ہے۔ کتنا سویا جائے؟''
''تو کتاب کیوں نہیں پڑھ لیتے؟''
''اتنے وقت بعد کتاب پکڑی ہے۔ سارے لفظ خوشبو بن کر اڑ جاتے ہیں۔ نہ مجھے کچھ دکھائی دیتا ہے نہ سمجھ میں آتا ہے۔ پھر کیا فائدہ کتاب پکڑنے کا۔ اس کا چہرہ دیکھنا ہے اس کی باتیں سوچنی ہیں تو کتاب کا تکلف بھی کیوں؟'' اس نے سوچا۔
''سر درد ہونے لگتا ہے۔ یہ کتابیں میرے بس کا روگ نہیں۔''
''اور میں؟'' وہ ناز سے بولی۔
جب سے مریم ان کی زندگی میں آئی تھی، وصل کا سکون ایک خواب کی صورت ہو گیا تھا۔ اب بھی یہی ہوا تھا۔ مریم اس کے اندر کرلا رہی تھی۔ مہر کا ہاتھ پرے کر کے اس نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور تھپتھپانے لگا۔ مہر نے فوراً آنکھیں موند لیں۔
مہر کی اس عادت نے اس کی زندگی میں بہت آسانی دی تھی۔ وہ ضد نہیں کرتی تھی۔ نہ ہی غصہ کرتی تھی۔ انا کی بیماری اسے نہیں تھی۔
''آئم سوری مہر۔'' اس کی سرگوشی نے مہر کا دل سکون سے بھر دیا تھا۔ وہ ایسی ہی تھی۔
صبح بہت خاموش سی تھی۔ سرد صبحیں یوں بھی اداس ہوتی ہیں لیکن اب تو ایسا لگ رہا تھا۔ کائنات کا ذرہ ذرہ اداسی کی لپیٹ میں ہے۔ دھندزدہ وہ سرد صبح میں وہ سو کر اٹھا تو مہر باورچی خانے میں تھی۔ آفس کے لیے تیار ہوتے ناشتہ لے کر مہر آ جاتی تھی لیکن آج ابھی تک نہیں آئی تھی۔ گھڑی پر نظر ڈالتے وہ اس کے پاس ہی چلا گیا۔
''گڈ مارننگ پاپا!'' صالحہ نے اس کا گال چوما اور اس کی گود میں آ گئی۔ یہ اس کا لاڈ کا مخصوص انداز تھا۔
''گڈ مارننگ! آج آپ جلدی اٹھ گئیں؟''
''رات سے طبیعت نہیں ٹھیک۔ شاید سردی لگ گئی ہے۔ الٹیاں کر رہی ہے، اب بھی کھانا بنانے آئی ہوں تو الٹی کر دی تھی۔ ابھی کپڑے بدلے ہیں۔'' جواب مہر نے دیا تھا۔ ساتھ ساتھ وہ پاس پڑے لنچ باکس میں کھانا ڈالتی جا رہی تھی۔
''اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاؤ گی یا میں شام کو آ کر لے جاؤں؟''
''میں لے جاؤں گی اور یہ آپ کا ناشتہ۔'' لنچ باکس اس نے نعمان کی طرف بڑھایا۔ وہ جانتی تھی جتنی دیر ہو گئی ہے، وہ بغیر کھائے نکل جائے گا اسی لیے کھانا لنچ باکس میں ڈال دیا تھا۔
''بس شام کو جلدی آ جائیں تو آسانی ہو جائے گی۔''
''ٹھیک ہے، آ جاؤں گا۔ اگر کوئی ضرورت پڑے تو مجھے فون کر لینا۔''
کہا تو اس نے شام کا تھا لیکن دوپہر سے پہلے ہی جیسے دل مٹھی میں آ رہا تھا۔ پہلے اس نے فون کرنے کا سوچا لیکن پھر ارادہ ترک کر کے خود ہی آفس سے نکل آیا۔ مہر گھر پر نہیں تھی۔ اس نے فون نکال کر اس کا نمبر ملایا۔
''میں اسے ہسپتال لے کر آئی ہوں۔ اس کی الٹیاں نہیں رک رہی تھیں۔ اب ڈرپ لگی ہوئی ہے۔''
دل گھبرانے کا سبب سمجھ میں آ گیا تھا۔ ''میں آتا ہوں بتاؤ کس ہاسپٹل میں ہو؟'' چابیاں واپس اٹھاتے اس نے کمرے کا دروازہ بند کیا۔
''عمر ہاسپٹل میں ہوں۔ آتے ہوئے اسد کو لے آئیے گا۔ یسریٰ کے پاس چھوڑ کر آئی تھی۔ مجھے کیا پتا تھا، اتنا وقت لگ جائے گا۔'' مہر کی بات پر اس کا سانس رکا۔ ابھی اس میں اتنی ہمت نہیں آئی تھی کہ وہ اس کا سامنا کر سکے۔ چاہے وہ پہچانے یا نہ۔
''آپ سن رہے ہیں؟''
''ہاں، لے آتا ہوں۔''
''میں اسے فون کر دیتی ہوں، گیٹ پر لے آئے گی۔''
مہر کے کہنے پر اس نے فون بند کیا اور گیٹ

لاک کر کے باہر جا کھڑا ہوا۔ مریم کی ایک جھلک اسے جلا دے گی، بھسم کر دے گی اور پھر وہ کچھ نہیں ہو گا۔ راکھ کا ایک ڈھیر جس کی کوئی پہچان نہیں ہوتی۔ اس نے سوچا لیکن ایسا ہوا نہیں۔ وہ خود دروازے پر نہیں آئی تھی۔

"بہت ضدی بیٹا ہے تمہارا۔ سعد کے ساتھ برابر کا ماتھا لگاتا ہے۔" خالہ نے ہنستے ہوئے اسد اس کے حوالے کیا۔ "اب کیسی ہے تمہاری بیٹی؟ مہر آ گئی؟"

"ہاسپٹل میں ہے ابھی، میں جا رہا ہوں۔"

"چلو میں شام کو چکر لگاؤں گی یسریٰ کے ساتھ۔"

"جی خالہ ضرور۔" اس نے کہا۔ جانے کیوں اسے یقین تھا وہ اس کے گھر نہیں آئے گی۔ کچھ صالحہ کی فکر تھی اس لیے اس نے اس پہلو پر سوچا ہی نہیں۔

شام ہوتے ہی سڑکوں پر دھند نے جال پھیلا دیا تھا۔ دھند بھی ایسی کہ چند فٹ کی دوری پر کھڑا شخص بھی دکھائی نہیں دے رہا تھا۔ آج سردی بھی انتہا کی تھی۔ وہ اسد کو کمبل میں لپیٹے بیٹھا تھا۔ پاس ہی اس کے بیڈ پر صالحہ سو رہی تھی۔ مہر اسد کے لیے باورچی خانے میں دودھ لینے گئی ہوئی تھی۔ وہ کمرے میں داخل ہوئی ہی تھی کہ مین گیٹ پر بیل کی آواز سنائی دی۔

"تم اسے پکڑو، میں دیکھتا ہوں۔" اسد کو اس کے حوالے کر کے وہ باہر نکلا۔ دروازے پر خالہ کھڑی تھیں اور ان کے پہلو میں وہ دشمنِ جاں۔ وہ دروازے کے سامنے سن ہوا کھڑا تھا۔

"میں نے سوچا صبح سے تو ہسپتال میں ہو کھانا کہاں بنایا ہو گا۔ کھانا لے کر آئی ہوں تمہارے لیے۔" خالہ کے کہنے پر وہ ہوش کی دنیا میں واپس لوٹا۔ وہ دروازے کے سامنے سے ہٹا تو وہ اندر داخل ہوئیں۔ جانے کون سا پرفیوم تھا جس کی بھینی بھینی خوشبو میں اس کے وجود کی مہک بسی ہوئی تھی۔ مشامِ جاں معطر کرتی وہ کب کی اندر چلی گئی تھی۔

"آنٹی! آپ نے یہ تکلف کیوں کیا۔ گھر میں رات کا سالن رکھا ہوا تھا میں روٹیاں بنا لیتی۔" وہ اندر داخل ہوا تو ہاتھ میں برتن لیے مہر ان سے کہہ رہی تھی۔

"یہ اماں کی کزن ہیں، میری خالہ۔ میرا ان پر حق بنتا ہے۔" اس کے کہنے پر مہر چونکی۔

"آپ نے کبھی بتایا ہی نہیں۔"

"مجھے خود نہیں پتا تھا کہ یہ یہاں رہتی ہیں۔ وہ تو پچھلے ہفتے پارک میں مل گئیں تو پتا چلا۔" اس نے بیڈ پر بیٹھتے اسد کو پکڑتے ہوئے کہا۔

"اللہ بخشے بہت اچھی تھی میری بہن۔ عین جوانی میں دل پر داغ لگا کر چلی گئی۔"

مہر کھانا لے کر باورچی خانے میں چلی گئی تھی جب کہ وہ اس کے بولنے کا منتظر تھا۔ رائل بلو لانگ شرٹ کے ساتھ اس نے سفید رنگ کی جینز پہن رکھی تھی۔ سیاہ اسکارف میں اس کا چہرہ دمک رہا تھا۔ وہ حیران تھا کہ اس کی شفاف جلد میں پہلے ہلدی کیوں گھلی رہتی تھی۔ گلابی ہونٹوں کا رنگ کیوں سویا رہتا تھا۔

"یسریٰ! آپ یہاں آ جائیں پلیز۔" مہر لوازمات سے بھری ٹرالی لیے کھڑی تھی۔ جہاں مریم بیٹھی تھی وہاں جگہ تنگ تھی تو ٹرالی آگے نہیں جا سکتی تھی اس لیے مہر نے اسے بھی خالہ کے پاس بلا لیا۔

"تکلف تو آپ نے کیا ہے۔ ہم کھانا کھا کر آئے ہیں۔" وہ بولی تھی اور نعمان کا سارا وجود کان بن گیا تھا۔ یہ وہ آواز تھی جو اس سے رات کے دو بجے بھی محض ایک تیسج کی دوری پر ہوتی تھی۔

وہ اکثر اس سے پوچھتا تھا۔ "یہ تم آدھی آدھی رات تک جاگ کر کیا کرتی ہو؟ سوتی بھی ہو کہ نہیں؟" ہر بار مختلف الفاظ کی مختلف ترتیب کے ساتھ اس کا ایک ہی جواب ہوتا تھا "جس دن شاہ مریم کو پکارے اور اس دن مریم میسر نہ ہو سکے تو مریم کا عشق جھوٹا ہو جائے۔"

ایک باراس نے صبح کے تین بجے اسے میسج کیا
''آنکھ میں محبوب کے خواب لیے
سو رہی ہو تو جھوٹی ہو
جاگ رہی ہو تو پاگل''
سیکنڈوں کے وقفے سے اس کا جواب آیا۔''مجھے پاگل کہلانا منظور ہے۔''
''آپ چائے لیں گے؟'' مہر پوچھ رہی تھی۔
اس نے خیالوں کو ذہن سے جھٹکا۔وہ تو سامنے تھی جس کے خیالوں نے اسے آکٹوپس کی طرح جکڑ رکھا تھا۔
''نہیں۔بس اسے پکڑلو۔'' اسد کو اس نے مہر کی طرف بڑھایا۔
''اسے نیند آ رہی ہے۔میں بس ایک منٹ اسے سونے کے لیے لٹا دوں آپ لوگ باتیں کریں۔''
مہر کے جاتے ہی کمرے میں خاموشی چھا گئی۔
مان لیا مریم نے اسے پہچانا نہیں تھا لیکن کیا اس نے آواز بھی نہیں پہچانی تھی؟ اسے دیکھ کر دل خوش تھا لیکن اس کا نظر انداز کرنا جیسے اسے قطرہ قطرہ مار رہا تھا۔وہ پاس تھی۔بات کر کے دیکھنے میں کیا جاتا ہے۔یہی سوچ کر اس نے ہمت باندھی۔
''تم کیسی ہو مریم؟'' وہ اس کے مریم پکارنے پر ہزار جان سے نثار جاتی تھی۔اسی لیے اس نے مریم کہہ کر بلایا تھا۔
''ماں جی نے آپ کو بتایا ہوگا، میرا نام یسریٰ ہے۔''
اس کے لہجے میں ایک سرد کاٹ تھی۔نگاہوں میں صاف وارننگ تھی۔وہ کچھ کہہ نہیں سکا۔
''چلیں ماں جی؟''
''مہر آ لے تو چلتے ہیں۔''
اس نے اٹھ کر مہر کو دیکھا۔وہ باہر ہی آ رہی تھی۔
''اچھا بیٹا، ہم چلتے ہیں۔'' خالہ کے ساتھ وہ بھی جانے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی۔

''ایک منٹ رکیں تو...... میں آپ کے برتن لے آؤں۔''
کوئی بات نہیں بچی کو دیکھنا تھا دیکھ لیا۔برتن صبح آ جائیں گے۔سعد نے گھر میں قیامت مچائی ہو گی۔باقی تو یسریٰ کے بغیر کچھ دیر رہ لیتے ہیں لیکن وہ اس کے بغیر ایک پل نہیں رہتا۔میں نے سوچا یہاں آ کر بھی تنگ کرے گا، اسی لیے ساتھ نہیں لائی۔''
''بہت شکریہ آنٹی۔اب آتی جاتی رہیے گا، ماشاءاللہ رشتے داری نکل آئی ہے اب تو۔'' مہر نے مریم کا ہاتھ تھاما ہوا تھا۔
''ہاں بیٹا ضرور۔''
وہ دروازہ بند کرنے ان کے ساتھ ہی باہر نکلا۔وہ دونوں گیٹ سے باہر نکلیں تو مریم پلٹ کر اس کی طرف آئی۔
''آئندہ مجھے مریم بلانے کی غلطی مت کرنا۔'' کٹیلے لہجے میں کہتی وہ دھند کے اس پار گم ہوگئی۔ایک بھرم تھا کہ اس نے اپنے شاہ کو پہچانا نہیں۔اب وہ بھرم بھی ٹوٹ کر ریزہ ریزہ ہو گیا تھا اس کے ساتھ ہی نعمان شاہ کی ذات بھی۔دروازہ بند کر کے وہ بہت مشکل سے پلٹا تھا۔
''یہ دیکھیں، ساگ اور مکئی کی روٹی دے کر گئی ہیں آپ کی خالہ۔'' مہر نے ٹرے اس کے سامنے بیڈ پر رکھی۔سارا دن اس نے واقعی کچھ نہیں کھایا تھا۔اب کھانا دیکھ کر بھوک چمک اٹھی تھی۔ہاتھ دھو کر وہ واپس آیا تو مہر کھانا نکال رہی تھی۔
''بہت مزے کا بنا ہوا ہے لیکن مرچ بہت تیکھی ہے۔'' مہر نے رکابی اس کے آگے رکھتے کہا۔
اسے پتا تھا کھانا اس کے شاہ کے لیے ہے پھر بھی تیکھی مرچ۔تو کیا وہ بھول گئی، تیکھی مرچ اسے پسند نہیں۔اداسی کچھ اور گہری ہوئی۔پہلا لقمہ ہی یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ کھانا اس کے ہاتھ کا بنا ہوا ہے۔اسے وہ سرد رات بھی بھولی ہی نہیں تھی۔تب بھی جب اسے مریم یاد نہیں تھی۔وہ سردیوں کی ایک رات تھی۔اماں کہیں فوتگی میں گئی تھیں۔گھر میں کوئی

نہیں تھا۔ اماں جاتے ہوئے اس سے کہہ کر گئی تھیں کہ بازار سے کچھ لا کر کھا لینا۔ اس کا کہیں جانے کا دل نہیں کر رہا تھا اس لیے اس نے مریم کو میسج کیا۔

"کچھ کھانے کو ہی لے آؤ۔ بہت بھوک لگی ہے۔" اور اس میسج کے بیس منٹ بعد اس کے فون پر مریم کا پیغام آیا۔

"کھانا دیوار پر رکھ رہی ہوں۔ آ کر لے لو۔"

اس کے پاگل پن پر ہنستے ہوئے وہ اٹھا۔ ساگ اور مکئی کی روٹی چنگیر میں ڈھکی پڑی تھی۔ وہ کھانا کمرے میں لے گیا۔ پہلا ہی نوالہ اس کی آنکھوں میں پانی لے آیا۔ مرچ اتنی تیکھی بھی نہیں تھی بس وہ نخرہ دکھانا چاہتا تھا۔ کھانا اٹھا کر اس نے ان کی دیوار پر رکھ دیا اور میسج کر دیا۔

"اپنے برتن لے جاؤ۔ کھانا نہیں کھلایا تھا تو منع کر دیتیں۔ میرا منہ جلانے کی کیا ضرورت تھی۔"

اس پیغام کے تیرہ منٹ بعد اس کا پیغام آیا۔

"جو سزا دینا چاہو، دے لو لیکن دوبارہ کھانا رکھا ہے وہ لے لو۔"

"تمہاری سزا یہ ہے کہ تم خود مجھے اپنے ہاتھ سے کھانا کھلاؤ۔" اس نے شرارت سے پیغام بھیجا۔ یہ جانے بغیر کہ اس کی اتنی سی شرارت مریم کو اندھیروں میں دھکیل دے گی۔

"شاہ جان مانگ لو۔ نہ نہیں کہوں گی۔ رات کے اس پہر آنا ممکن نہیں۔"

"تم جھوٹی ہو۔ نہیں چاہیے تمہارا کھانا۔ اٹھا کر لے جاؤ۔" اس کی انگلیاں فون کے کی بورڈ پر تھرک رہی تھیں۔ اس پیغام کے بعد خاموشی چھا گئی۔ کچھ لمحے بیتے اور دروازے پر دستک سنائی دی۔ اس کی نظر گھڑی پر گئی۔ رات کے سوا گیارہ کا وقت تھا۔

"پاگل کہیں سچ میں نہ آ گئی ہو۔" اس سوچ کے آتے ہی ساری سستی بھلا کر وہ چھلانگ لگا کر رضائی سے نکلا۔ دروازہ کھولنے سے پہلے اس نے بتی بجھا دی تھی۔ باہر سچ میں وہ کھڑی تھی۔

"تم پاگل ہو؟"

"ہاں۔ تمہاری پاگل۔" اندر آتے اس نے سکون سے جواب دیا۔

اس نے بلب روشن کیا۔ "خود تو تم ماری جاؤ گی ہی مجھے بھی مرواؤ گی۔ نکلو یہاں سے جلدی۔"

"ہاں تو جلدی کھانا کھاؤ پھر میں جاؤں۔" اس نے برا مانے بغیر اسی کے لہجے میں جواب دیا۔

اب کی بار ساگ میں مکھن تیر رہا تھا۔ مرچ بھی کم ہو گئی تھی۔ زیادہ تو خیر پہلے بھی نہیں تھی۔

"تم کیا کھانا پکا کر میرے میسج کا انتظار کر رہی تھیں؟ بڑی کوئیک سروس ہے۔"

مریم مسکرائی۔ اس نے بتایا نہیں کہ وہ اپنے لیے روٹی بنا کر سالن گرم کر کے کمرے میں لے جانے والی تھی جب اس کا میسج آ گیا۔

"باہر بادل ہیں؟" کھانا کھاتے اس نے پوچھا۔

"ہاں بہت۔ لگتا ہے بہت بارش ہونے والی ہے۔ بجلی بھی چمک رہی ہے۔" اس نے جواب دیا۔ اتنی سردی میں بھی وہ محض ریشمی لباس میں تھی۔ کچھ دیر خاموشی سے وہ نوالے بنا بنا کر کھلاتی رہی اور وہ فون میں گھسا چپ چاپ کھاتا رہا۔ اسے مریم کی موجودگی سے وحشت ہو رہی تھی۔ وہ چاہ رہا تھا بس جلد از جلد وہ چلی جائے۔ اسی لیے بغیر چبائے نوالے نگل رہا تھا۔

"چلو کھا لیا کھانا۔ نکلو اب یہاں سے۔"

"ساری زندگی کے لیے رکنے تو نہیں آئی۔ جا رہی ہوں۔" پھیکی سی ہنسی ہنس کر اس نے چادر کو اچھی طرح لپیٹا۔ وہ نہیں جانتی تھی اب ساری زندگی وہ اس کے ساتھ ہی رہنے والی ہے۔ ایک درد ایک تکلیف کی صورت۔ اتنے میں اس نے اٹھ کر پھر بلب بند کیا۔ دروازہ وا ہوتے ہی وہ یخ بستہ بوندوں کی پرواہ کیے بغیر بجلی کی تیزی سے نکل کر دیوار کے پاس پہنچی۔ یکدم برتنوں کا خیال ذہن میں آیا اور وہ واپس پلٹی۔

"اب کیا مصیبت ہے؟ اس نے دوبارہ

دروازہ بند کیا۔
"برتن تو دے دو یا وہ بھی کھاؤ گے؟" اس نے شوخی سے کہا۔
"یہ لے پکڑ اپنے برتن۔ مرناں۔" اس نے برتن مریم کے ہاتھ میں دیے۔ مریم کی چادر ڈھلکی اور اس کی نم ہنسلی کی ہڈی عین اس کی آنکھوں کے سامنے ٹھہر گئی۔ مریم نے اپنے دھیان میں چادر اٹھا کر کندھے پر ڈالنے کے لیے ہاتھ اونچا کیا مگر اس نے آہستہ سے پکڑ کر چادر کو دوبارہ نیچے چھوڑ دیا۔ وہ حیران حیران آنکھوں سے اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ اس نے نرمی سے ہنسلی کی ہڈی پر پہلے اپنا ہاتھ رکھا اور پھر...... وہ واقعی اگر اس سے جان مانگ لیتا تو وہ انکار نہ کرتی۔ اب بھی فطری حیا نے ذرا سر اٹھایا تھا ورنہ مزاحمت نہیں تھی۔
"تمہارا شاہ ہے مریم! اور کوئی نہیں ہے یہاں۔"
اس ایک سرگوشی پر مریم نے سنے پڑھے سارے سبق بھلا دیے تھے۔ وہ موم کی طرح پگھل کر اپنی صورت کھو کر چلی گئی تھی۔
اس کی دوشیزگی کی پامالی کے سارے نشان مٹانے کے باوجود وہ خود کو اس کے وجود سے مٹا نہیں پایا تھا۔ وہ گھبرایا ہوا تھا۔ صبح کے اجالے نے اسے ہمت بخشی تھی۔ رات کا خوف سرور میں بدل چکا تھا۔ اس کے بعد جب جب اس نے چاہا، مریم اس کے ہاتھوں میں کھلونے کی طرح بے وقعت ہوتی رہی۔ یہ اس کہانی کا آغاز تھا جس کے انجام سے وہ بے خبر تھا۔ وہ مرد ہو کر اس رات کو کبھی بھلا نہیں سکا تھا تو پھر وہ عورت ہو کر کیسے بھول گئی تھی؟

اذیت ہی اذیت ہے
مجھے تم سے محبت ہے

☆☆☆

اسے یاد تھا، شاہ کو تیکھی مرچ نہیں پسند بالکل اسی طرح جیسے اس نے اسے پہچان لیا تھا۔۔ ہاں اس نے نعمان شاہ کو پہچان لیا تھا۔ پہلی نظر میں پہچان لیا تھا۔ جب وہ اس گھر کو خریدنے کے لیے دیکھنے کی خاطر آیا تھا تب ہی مریم نے اسے پہچان لیا تھا۔ پہننے اوڑھنے میں وہ آج بھی بے مثال تھا۔ عمرِ رواں کے نشان چہرے پر سجائے وہ وہی تھا جس نے اسے پاتال کے اندھیروں میں پھینک دیا۔ اس کی ذات کوڑیوں کے بھاؤ بھی نہیں سمجھی تھی۔ وہ ان لوگوں میں سے تھی جن سے بندھن نہیں باندھے جاتے تھے۔ اسے پتا ہی نہیں چلا محبت کی کہانیاں پڑھتے وہ کب محبت کی کتاب ہو گئی۔
نعمان کب اس کتاب کا نصاب ہوا۔ اسے کچھ پتا نہیں چلا۔ کمہاروں کی لڑکی۔۔ نیچ ذات مریم۔ اسے نعمان مغل سے محبت ہو گئی تھی۔ وہ محبت جس کا اس نے کبھی اعتراف نہیں کیا تھا لیکن اس کی ایک ایک جنبش بتاتی تھی، وہ داسی ہے اس مغل بادشاہ کی۔ اس کا گریز اس کی ہتک۔ اسے ہر ہر شے سمجھ میں آتی تھی لیکن جو دل ہے نا۔ یہ شہنشاہوں کے بس میں بھی نہیں ہوتا۔ عمر کتنی ہی کیوں نہ ہو جائے یہ جب خوار کرنے پر آتا ہے تو بالوں میں اتری چاندی کا بھی لحاظ نہیں کرتا۔ وہ تو تھی ہی کم سن معصوم۔
اسے لگا تھا زندگی کتاب میں لکھی کسی کہانی کی طرح سادہ ہوتی ہے جہاں شہزادے ہاتھ میں شیشے کا جوتا لیے اپنی شہزادی کو ڈھونڈنے نگر نگر کوچہ کوچہ پھرا کرتے ہیں۔ اسے تو خبر ہی نہیں تھی کہ محبت کے نام پر تو نو آموز بھیڑیے بھی بہت پکا شکار کرتے ہیں۔ کہانی کب شروع ہوئی تھی؟
کہانی شروع ہوئی تھی اس وقت جب وہ گلی سے گزر رہی تھی۔ اس کی پتلی پتلی انگلیوں میں دبا نقاب گلی میں کسی لڑکے کے شرارت سے ہائے کہنے پر کھل گیا تھا۔
"تم کیا اکیلی منہ اٹھا کر گلی میں پھر رہی ہو؟ ایک منٹ سے پہلے گھر دفع ہو جاؤ" اس کے اتنی بے تکلفی سے ڈانٹنے پر وہ نقاب کرنا بھول گئی تھی۔ کیسی پروا تھی اس کے انداز میں۔
"اب منہ کیا دیکھ رہی ہو؟ منہ پر ڈالو اسے اور

جاؤ۔'' چادر کا کونا اٹھا کر اس نے مریم کے منہ پر پھینکا تھا۔ نظریں نیچی کر کے تیز تیز چلتی وہ گھر میں داخل ہو گئی۔ ساری رات وہ اس کے بارے میں سوچتی رہی۔ اس کا لہجہ تلخ تھا لیکن اس میں مریم کے لیے فکر تھی۔ وہ اس کے لیے فکر مند تھا یہ بات اس کے دل کو پھول کی طرح کھلا گئی تھی۔

وہ بچپن سے اسے دیکھتی آئی تھی۔ وہ ایسا ہی تھا۔ ہر وقت اکھڑا اکھڑا رہتا تھا۔ یہاں تک کہ بیوہ ماں کی بھی نہیں سنتا تھا۔ مریم کو پتا نہیں چلا، وہ کب اس کے اکھڑپن کی اسیر ہوئی۔ اس نے بس خود کو ہر لمحہ اس کے سامنے بے بس پایا تھا۔ وہ جانتی ہی نہیں تھی کب نعمان اس کے لیے سورج بنا اور وہ اس کی سورج مکھی ہو گئی۔ وہ اس کے آگے پیچھے دیوانہ وار پھرتی تھی لیکن زبان سے کبھی کچھ نہیں کہا تھا۔ یہ جیسے ایک خاموش معاہدہ دونوں کے درمیان طے پا گیا تھا۔ اس معاہدے کی خلاف ورزی بھی اسی نے کی تھی۔

اس کا کمپیوٹر خراب ہو گیا تھا اور نعمان کمپیوٹر ٹھیک کرنا جانتا تھا۔ اس کی ایک وقت میں دو کان بھی رہی تھی۔ امی نے اسے بلوالیا تھا۔

''تم بتاؤ، کیا ہوا ہے۔ میں جا کر پانی بھیجتی ہوں۔''

''تمہارے کمرے میں خوشبو کیسی آ رہی ہے؟'' امی کے جانے کے بعد اس نے ادھر ادھر نظر گھما کر دیکھا۔

''میں نے کچھ پھولوں والے پودے رکھے ہوئے ہیں۔'' وہ خود بھی جانتی تھی، اس سے بات کرتے اس کا لہجہ کانپ رہا تھا۔

''یہ تو بہت آسان ہے۔ یہ دیکھو۔'' اس کے کہنے پر وہ آگے جھکی۔ اس نے ایک دو ٹیب کھولے اور وہ اسے دیکھتی رہ گئی۔ جانے اس نے کیا کیا تھا کیا نہیں۔ اسے تو بس وہ نظر آ رہا تھا۔ اتنا قریب کہ ذرا سا ہاتھ بڑھا کر چھو لیتی۔

''دیکھا، کتنا آسان ہے۔ ایسا کرو، یہ میرا نمبر رکھ لو اگر ضرورت پڑے تو مجھے فون کر لیا کرو۔ یہ تو میں تمہیں فون پر سمجھا دوں گا، تم خود بھی دیکھ سکتی ہو۔''

اپنا نمبر دے کر وہ چلا گیا تھا اور کچھ دیر بعد مریم کو پھر وہی مسئلہ درپیش تھا۔ اس نے اسے میسج کیا۔ فون کرنے کی ہمت ہی نہیں ہو رہی تھی اس میں۔

''تم ایک بے وقوف لڑکی ہو۔ رٹا لگا کر انٹر تک آئی ہو؟'' فون کر کے وہ اس کی کلاس لے رہا تھا۔ وہ خاموشی سے سنتی رہی۔

''اچھا ایک منٹ باہر آؤ۔'' اس کی فرمائش پر وہ جھجکتے ہوئے کمرے سے باہر آئی۔

''بتاؤ آسمان پر اس وقت کتنے ستارے ہیں؟'' اس کے سوال پر اس کی سمجھ میں نہیں آیا کیا جواب دے۔

''اچھا بتاؤ، زمین پر کتنے چاند ہیں؟''

''زمین پر کہاں، چاند تو آسمان پر ہوتا ہے۔''

''فرض کرو اگر چاند زمین پر ہو؟''

''اگر زمین کی سطح پر کوئی چاند ہوا تو وہ تم ہو گے۔'' اس نے مسکرا کر پر اعتماد لہجے میں جواب دیا۔ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑا۔

''بہت تیز ہو تم۔ میں تو تمہیں ایک بے وقوف لڑکی سمجھتا تھا۔''

''اور میں تمہیں بہت کھڑوس۔'' اس نے جواب دیا۔ یہ پہلی ہنسی تھی جو ان دونوں میں مشترک ٹھہری۔ نہ اس نے کچھ کہا تھا نہ اس نے۔ بات بڑھتی رہی، معاملہ چلتا رہا۔ وہ اس کی حاضر جوابی سے بہت محظوظ ہوتا تھا۔ پھر اس کے بی اے کے پیپرز میں اس نے عجیب فرمائش کی۔

''میں یونی آؤں گا تمہیں لینے۔'' اس کے میسج پر وہ دنیا کا ڈراوا بھی نہیں دے سکی۔ اس کا ساتھ اعزاز سہی لیکن وہ نہیں جانا چاہتی تھی اس کے ساتھ، اس کے باوجود وہ انکار نہیں کر سکی۔ پیپر کے بعد وہ اپنی بائیک پر آیا تھا۔ وہ چپ چاپ اس کے ساتھ بیٹھ گئی۔ اس کے ساتھ بائیک پر بیٹھنا ایسے ہی

تھا جیسے وہ ہوا میں اڑ رہی ہو۔ ان دنوں وہ ایسا امیر نہیں تھا کہ جو چاہتا اسے لے کر دے سکتا۔ پھر بھی وہ اتنے میں ہی خوش تھی۔ ایک بیکری سے چاکلیٹس کا دل کی شکل کا ڈبہ اور سینڈوچ لے کر وہ ایک پارک میں جا بیٹھے۔ پہلی بار وہ ایک دوسرے کے روبرو بیٹھے تھے۔ اس نے ایک بار بھی مریم سے نقاب اتارنے کا نہیں کہا تھا۔ مریم اس کا چہرہ دیکھتی رہی اور اس وقت تک دیکھتی رہی جب تک وہ جانے کے لیے اٹھ کر کھڑا نہیں ہو گیا۔

پھر کچھ دن گزرے تو دو تین گلیاں چھوڑ کر وہ ماموں کی ارمش کی شادی میں گئی تھی۔ سجنے سنورنے کے نام پر کچھ کرنا آتا تھا نہ اجازت تھی۔ اس کے باوجود محض کاجل کی دھار اور سرخ لپ اسٹک سے وہ نکھری نکھری دکھائی دیتی تھی۔ مہندی کی تقریب میں وہ نعمان کے پیغامات کا جواب نہیں دے سکی تھی۔ بہانے بہانے سے چھپ کر اس نے فون نکال کر اس کے پیغامات کا صرف ایک جواب دیا۔ "میں مہندی میں آئی ہوں۔" وہ غصے میں بھرا بیٹھا تھا۔

"گھر جاؤ ابھی کے ابھی۔ مجھے بات کرنی ہے۔"

نعمان کا کہا وہ کیسے ٹالتی، امی سے سر درد کا جھوٹ بولا اور امی نے اسے ماموں کے حماد کے چھوٹے بیٹے کے ساتھ گھر بھیج دیا۔ اسے بھی مریم نے نعمان کے کہنے پر پچھلی گلی سے واپس بھیج دیا۔ دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے گلی میں قدم رکھا۔ وہ وہیں آغاز پر کھڑا تھا۔

"دل کرتا ہے، تمہیں جان سے مار دوں۔ کہاں مری ہوئی تھیں؟" ساتھ چلتے وہ غرا رہا تھا۔

"بتایا تو ہے مہندی میں گئی تھی۔"

"آگے سے زبان مت چلاؤ۔ کاٹ دوں گا۔" بچوں کی سی ناراضی کے ساتھ وہ بولا تو مریم کی ہنسی چھوٹ گئی۔ منہ پھلا کر اس نے مریم کے نقاب کی پن کھینچ دی۔ ایک لمحے کے لیے تو وہ خود بھی ٹھٹک کر رہ گیا تھا۔ نوخیز حسن کا روپ کتنا خالص، کتنا سچا تھا۔

"تمہارا دوپٹہ بہت پیارا ہے۔" کہہ کر وہ تیزی سے اپنے گھر کی طرف چلا گیا۔ اس رات اس نے مریم سے بات ہی نہیں کی۔ مریم تو ابھی تک اس کے لہجے میں کھوئی تھی۔ اس نے نعمان کا ٹھٹکنا محسوس کیا تھا۔ برا کیا تھا۔ اب اس کے لہجے کو جذب کرتے وہ ساری رات مسرور سی جاگتی رہی۔ اگلی صبح اس نے ثمرین سے اس کا وہ دوپٹہ ہمیشہ کے لیے مانگ لیا جو اس نے پچھلی رات اوڑھ رکھا تھا۔

اس کے کچھ دن بعد رمضان کا مہینہ شروع ہو گیا۔ عید سے تین چار دن پہلے اس نے مریم کو چھت پر بلایا۔

"یہ میں کسی کے لیے لے کر آیا تھا۔ اس نے لینے سے انکار کر دیا۔ اب تم رکھ لو۔"

مریم اس کے تحفہ دینے کے انداز سے دکھی نہیں ہوئی تھی۔ وہ جانتی تھی یہ جو بھی ہے اسی کے لیے ہے۔ بس وہ ماننا نہیں چاہتا تو اس کی مرضی۔ سرخ رنگ کا ایک انتہائی نفیس فراک جو کسی برانڈ کا تھا۔ ساتھ میں سرخ چوڑیاں اور مہندی۔ محبت میں تحفے خوشی دیتے ہوں گے لیکن نعمان جیسے شخص کا تحفہ اس کے لیے کیا تھا، یہ وہی جانتی تھی۔

"چاند رات کو یہ کپڑے پہن کر اوپر آنا۔" اس رات اس کی فرمائش مریم کے لیے بہت بہت مشکل تھی لیکن مامی اعتکاف سے اٹھی تھیں۔ سب نے جانا تھا۔ وہ گھر رک سکتی تھی۔۔ افطار سے کچھ دیر پہلے ہی اس نے پیٹ میں درد کا ڈرامہ شروع کر دیا۔ اس کے باوجود امی اسے ساتھ لیے بغیر نہیں گئیں۔ نعمان نے اسے بہت سخت سنائی تھیں۔ یہ پہلی بار تھا کہ رات کے دو بجے بھی وہ جاگ رہا تھا۔ سب کے سونے کے بعد وہ اسی فراک میں چھت پر آئی۔ ڈھیلا ڈھالا یہ فراک اس پر ایسے سج رہا تھا جیسے کسی نئی دلہن کے ماتھے پر بندیا۔ وہ ساری لڑائی بھول گیا تھا۔

"سرخ رنگ تمہارے لیے بنا ہے یا تم سرخ رنگ کے لیے بنی ہو؟" وہ کوئی جواب نہیں دے سکی۔ یہ آخری خوشی تھی جو اس نے ہنستے ہوئے اس کی

جھولی میں ڈالی تھی۔ اس کے بعد اس کی نوکری لگ گئی۔ کمپیوٹر کی دوکان ختم ہوگئی۔ اس کے پاس مریم کے لیے وقت ختم ہو گیا۔ مریم دیر رات تک اکیلی جاگتی رہتی۔ اس کا فون گم صم اس کے سینے پر دھرا رہتا۔ پہلے پہل تو وہ یہ سمجھتی رہی کہ وہ کام میں مصروف ہے۔ رات کو تھک کر جلدی سو جاتا ہے لیکن رفتہ رفتہ اسے اپنے اندازے غلط ہونے کا احساس ہوا۔

اس نے کئی بار اسے دیر رات کو کمپیوٹر پر گیمز کھیلتے دیکھا تھا۔ کبھی کبھی وہ فون پکڑ کر کمرے میں اپنے بستر پر لیٹا ہنس ہنس کر باتیں کرتا دکھائی دیتا تھا۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ اس کی سادگی ہار گئی ہے۔ فیشل اسکن پالش سے چمکتے چہرے اور نت نئے فیشن کے کپڑے پہنے دفتر میں شوخیاں اور چہلیں کرتی لڑکیاں جیت گئی ہیں۔

نعمان کو اندازہ ہو گیا تھا کہ دنیا اتنی بے رنگ نہیں ہے جتنی اس نے سمجھ رکھی تھی۔ ایک سے ایک اٹھتا رنگ، ایک سے ایک نظر باندھتا منظر اس کا منتظر ہے۔ ذہین اور خوب صورت لڑکیاں پیارا دن تتلیوں کی طرح آتی جاتی دکھائی دیتیں "بیوٹی ودھ برین" کی عملی تصویر دکھتیں۔

مریم جیسی بے رنگ پھیکی تصویر کب تک آنکھ کے فریم میں بجی رہ سکتی تھی۔ اس نے نئی نئی دوستیاں پالیں۔ فون، ہوٹلنگ، شاپنگ۔ زندگی ایک دم جیسے فاسٹ موڈ پر آ گئی تھی۔ ایسے میں کمہاروں کی سادہ سی بی اے پاس گھریلو لڑکی کیسے اسے دکھائی دیتی۔ ناز و ادا، نخرہ کس چڑیا کا نام ہے مریم کو کیا پتا۔ وہ تو بس اس کے آگے پیچھے پھرنا جانتی تھی۔ وہ ساتویں آسمان پر تھا اور مریم زمین کی سب سے نچلی سطح پر۔ دنیا کے رنگ نعمان کے لیے بدلے تھے، مریم کے لیے تو آج بھی دنیا نعمان ہی تھا۔

اس کا دل چاہتا کسی روز اس کا گریبان پکڑے اس سے پوچھے کہ اگر منزل کوئی نہیں تھی تو اسے اس راستے پر لانے کا مقصد۔ مگر مسئلہ یہ تھا کہ اس نے آج تک اس کے ہاتھ کوئی وعدہ تو کیا کوئی اعتراف، کوئی اظہار بھی نہیں دیا تھا۔ وہ پھوٹ پھوٹ کر روئی تھی۔ دنوں میں ہڈیوں کا ڈھانچہ ہوئی لڑکی کسی نے نہیں دیکھی تھی۔ ایک قیامت تھی جو وہ اپنے وجود پر جھیل گئی تھی مگر کسی کو کانوں کان خبر نہیں ہوئی تھی۔

تب اس نے کنارہ کش ہونے کا فیصلہ کیا۔ متروک اور مسمار شدہ راستوں پر مسافر کا انتظار لاحاصل ہی ٹھہرتا ہے۔ اسے اتنی سمجھ تھی لیکن دل۔۔ دل وہ کمزوری تھی جس کے آگے اسے گھٹنے ٹیکنے ہی پڑتے تھی۔ دل کے ہاتھوں مجبور وہ اب بھی اس کی ہر بات پر سر جھکاتی تھی۔ یہی وہ وقت تھا جو نعمان نعمان نہیں رہا شاہ ہو گیا۔

وہ اپنے روپ سے ہاری تھی لیکن دل تو جیت سکتا تھا ناں۔ خود سے ہر بار ناکام جنگ کے بعد اس نے شاہ کے سامنے ہتھیار ڈال دیے تھے۔ مریم کے بنا کہے بھی وہ جانتا تھا۔ جیسے وہ یہ جانتا تھا کہ مریم اس سے محبت نہیں کرتی بلکہ محبت سے بھی کچھ آگے کی چیز ہے جس نے مریم کو اس کے ساتھ باندھ رکھا ہے۔

وہ ہر بات کا غصہ اس پر نکالتا تھا۔ کسی لڑکی کے ساتھ جھگڑا ہو جاتا یا باس سے ڈانٹ ڈپٹ ہو جاتی وہ مریم کی ذات کے بخیے ادھیڑ ڈالتا۔

"کمہار کیا ہوتے ہیں مریم؟ مغل تو بادشاہ ہوتے ہیں۔"

مریم اس کے سوال پر پانی پانی ہو جاتی۔ اسے کبھی نہیں لگا تھا کمہار ہونا ذلت ہے لیکن اب وہ خالق سے شکوہ کرتی "مجھے کمہاروں کے گھر کیوں پیدا کیا۔" رفتہ رفتہ وہ عادی ہو گئی اور ویسے بھی اس نے جان لیا تھا اسے شاہ کے ہاتھوں رسوا ہونا ہی ہونا ہے پھر چاہے وہ کمہار ہوتی کہ نہ۔

"تمہارے منہ پر تو بلڈوزر پھرنا چاہیے۔ کیسا اونچا نیچا جغرافیہ ہے۔"

"تم ہڈیاں کیا کتے کو کھلانے کے لیے بڑھا رہی ہو؟ کچھ کھایا پیا کرو تا کہ تم انسان نظر آؤ نہ کہ ڈھانچہ۔"

وہ اس کی سنگ باری اپنے وجود پر جھیلتی ختم ہوتی جا رہی تھی۔ اپنی جان کو اس نے روگ لگا لیا تھا۔ کبھی کبھی وہ اچھے موڈ میں ہوتا تو پرانی باتیں یاد کر کے ہنستا تھا۔

''تمہیں یاد ہے جب میں تمہارے لیے سوٹ لے کر آیا تھا اور تمہارے بالوں میں گجرے لگائے تھے؟ ویسے مریم تمہارے بالوں جیسے خوبصورت بال میں نے آج تک نہیں دیکھے۔ چھت پر آؤ نا تمہارے بال دیکھنے ہیں۔'' اور مریم بے دام غلام کی طرح چوٹی کے بل کھولتی سیڑھیاں چڑھ جاتی۔ وہ اب بھی ہنستی مسکراتی باتیں کرتی تھی لیکن اس ہنسی میں خوشی نہیں ہوتی تھی۔ یہ مسکرانا بھی ایک طرح کی مجبوری تھی۔ وہ روتی یا اداس ہوتی تو وہ ساتھ ہی ڈانٹ دیتا۔

''کوئی مر گیا ہے تیرا جو منحوس شکل لیے بیٹھی ہے۔''

اس نے اداس ہونا، رونا چھوڑ دیا۔ پھر اس سیاہ رات میں اس نے خود کو شاہ کی خواہش کے دار پر چڑھتے دیکھا۔ ایک بار، دو بار، تین بار، بار بار۔۔۔ وہ اس کے ہاتھوں پامال ہوتی رہی۔ اسے یقین تھا جو شخص اپنی استعمال شدہ شے کسی کو نہیں دیتا وہ اسے کسی اور کو نہیں دے گا۔ پھر ایک دن اسے اپنے وجود میں پلتے شاہ کے وجود کا پتا چلا۔ محبت، عشق میں اندھی لڑکی سر تا پیر کانپ گئی تھی۔

پہلی بار اسے خود سے جڑے لوگوں کا خیال آیا۔ امی، ابو، بھائی اور بہنیں، رشتہ دار، محلے والے۔ وہ اکیلی ہو کر بھی اکیلی نہیں تھی۔ وہ تو حسب نسب کے شجر کی ایک شاخ تھی جس سے نسب کا شجر پھیلنا تھا۔ اس کی محبت اور وہ کچھ نہیں تھی۔

یہ ان دنوں کی بات ہے جب نعمان صبا کے آگے ہار گیا تھا۔ وہ اسے زندگی میں شامل کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ مریم اس کے سامنے بیڈ پر بیٹھی تھی۔ وہ اسی دن کے انتظار میں تھی جب اس کی خواہش جاگے اور وہ اسے بلائے تا کہ وہ سامنے بیٹھ کر بات کر سکے۔ اس کے کانوں میں وہ سیسہ انڈیل چکی تھی۔ وہ حق دق اس کا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

''کتنا وقت ہوا ہے؟''

''تین ماہ سے کچھ دن زیادہ۔''

''تم بے وقوف لڑکی اب بتا رہی ہو۔ پہلے مر گئی تھیں کیا؟ اچھی بھلی زندگی کا ستیاناس کرنے پر تلی ہو۔'' دھیمی آواز میں وہ اس پر چلا رہا تھا۔ جیسے وہ اکیلی مجرم ہو۔ اٹھ کر اس نے دراز سے پرس نکالا۔ ہزار ہزار کے دس نوٹ اس نے نکال کر اس کی گود میں پھینکے۔ اب اس کے پاس پیسے ہوتے تھے اور بہت زیادہ ہوتے تھے۔

''جتنی جلدی ہو سکے جان چھڑواؤ۔ اور پیسے چاہیے ہوں تو بتانا۔ جاؤ اب دل نہیں کر رہا کسی چیز کا۔''

''تم گھر میں بات کرو۔ میں کیا کروں، مجھے کچھ سمجھ میں نہیں آ رہا۔ میں کسی کو نہیں جانتی۔'' کپکپاتی آواز میں وہ بولی۔

''کیا بات کروں گھر میں؟'' وہ تیوری چڑھائے پوچھ رہا تھا۔

''تمہاری اور میری......''

''تم پاگل ہو گئی ہو؟ میں نے کب کہا، میں تم سے شادی کرنے کا ارادہ رکھتا ہوں؟ میں نے تمہیں کبھی پیار محبت کا لارا نہیں لگایا۔ شادی کی بات کہاں سے آ گئی؟'' اس کی چنگھاڑ سے مشابہ آواز نے اسے پتھر کر دیا تھا۔ پھر اسے بدنامی کا خیال آیا کہ اگر وہ شور مچا دے تو وہ کیا کر لے گا۔ اس نے ساتھ ہی پینترا بدلا۔

''مریم! میں کچھ سوچ نہیں پا رہا ہوں۔ تم ابھی اس مصیبت سے چھٹکارے کا سوچو۔ کوئی حل نکالو پھر مل کر آگے کا سوچتے ہیں۔'' اس کے کندھے کے گرد بازو حمائل کیے کہتا وہ کتنا جھوٹا لگ رہا ہے اگر وہ یہ جان لیتا تو ایک لفظ منہ سے نہ نکالتا۔

مریم خاموشی سے اٹھ گئی تھی۔ اسے کچھ نہیں پتا تھا۔ دس ہزار اس کے تحائف کے ساتھ رکھ کر وہ

آنے والے وقت کی بدصورتی کے لیے خود کو تیار کرنے لگی اگرچہ وہ وقت اس کی سوچ سے بھی زیادہ بھیانک تھا۔ دو دن بعد ہی وہ سرگودھا کے لیے تیار ہو گیا۔ وہ نہیں چاہتا تھا اس کی غیر موجودگی میں وہ کچھ شور کرے، اس لیے جاتے ہوئے اسے نہ صرف بتا کر بلکہ مل کر بھی گیا تھا۔ وہ دہلیز پر بیٹھی تھی۔ اس کی ہمت اس کا صبر ٹوٹ چکا تھا۔

''شاہ میں مر جاؤں گی۔ مجھے ایسے مت چھوڑ کر جاؤ پلیز۔''

''نہیں جا رہا پاگل۔ دفتر کا کام ہے۔ جلد آ جاؤں گا۔ تم فکر مت کرو اور میرے آنے تک اس سب سے جان چھڑاؤ پھر دیکھنا تمہیں کتنی خوشی دیتا ہوں۔'' کپڑوں کا بیگ دیوار کے ساتھ رکھتے اس نے کھوکھلا وعدہ کھوکھلی مسکراہٹ کے ساتھ اس کے ہاتھ تھمایا۔

''شاہ! مجھے لگتا ہے اب جب تم آؤ گے تو میں تمہیں نہیں ملوں گی۔ میں کبھی تمہیں دیکھ نہیں سکوں گی۔ تم مت جاؤ شاہ۔''

''پاگل دفتر کا کام ہے، بتایا تو ہے۔ آ جاؤں گا جلدی اور تم بھی یہیں ہو۔ میں بھی یہیں رہوں گا۔ فضول مت سوچو، نیچے اماں انتظار کر رہی ہیں کھانے پر، پھر اسٹیشن بھی پہنچنا ہے۔ میں نیچے جا رہا ہوں۔ تم بھی جاؤ گھر۔''

اسے چوکھٹ پر سسکتا چھوڑ کر وہ سیڑھیاں اتر گیا۔

جانے کیا جھوٹ بولا تھا، کیا وجہ بتائی تھی بس اتنا تھا کہ زندگی میں پہلی بار اس نے انجان راستوں پر اکیلے قدم رکھا تھا۔ تین بجے کی ٹرین تھی اور دو بج کر چالیس منٹ پر وہ اسٹیشن پہنچی تھی۔ ایک ایک چہرے کو کھوجتے، جگہ جگہ گھومتے اس نے اسے ڈھونڈ لیا تھا۔

''تم یہاں کیا کر رہی ہو؟'' وہ اسے دیکھ کر غصے میں آ گیا تھا۔

''میں۔۔۔ تمہیں دیکھنے آئی ہوں۔''

''گھر میں دیکھا تو تھا۔''

''شاہ۔ میں ولی نہیں ہوں لیکن میرا وجدان کہتا ہے کہ اب ہم کبھی نہیں ملیں گے۔ میں نے اپنی تمام تر شدتوں سے تمہیں چاہا ہے۔ ایک آخری ملاقات کا حق تو مجھے ملنا چاہیے نا۔'' وہ بڑے متوازن لہجے میں بول رہی تھی۔ اس کا غصہ ایک دم ٹھنڈا ہوا۔

''کوئی آخری ملاقات نہیں۔ اس ماہ کے آخر تک آ جاؤں گا اور تمہارے لیے کپڑے لاؤں گا۔'' نہ چاہتے ہوئے بھی اس کے لبوں سے نکلا۔

''نہیں شاہ۔ اب کسی شے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ بلکہ یہ لائی ہوں تمہارے لیے۔'' چرمی تھیلا اس نے نعمان کی طرف بڑھایا۔ نعمان کی پہلے اس تھیلے پر نظر نہیں پڑی تھی۔

''اس میں کیا ہے؟''

''اس میں...... میرے کچھ ٹکڑے ہیں، میری کچھ آسودہ نا آسودہ خواہشیں۔ کبھی میری یاد آئے تو کھول کر دیکھ لیا کرنا ورنہ دریا برد کر دینا۔''

ریل آدھا گھنٹہ لیٹ تھی۔ وہ دونوں اسٹیشن پر بیٹھے باتیں کرتے رہے۔ نعمان کو اس کی نارمل باتوں سے حوصلہ ہوا تھا ورنہ وہ بہت ڈرا ہوا تھا۔ جب وہ ریل پر چڑھنے کے لیے اپنا بیگ اٹھانے جھکا تو اس نے کان میں سرگوشی کی۔

''مجھے معاف کر دینا شاہ۔ میں لڑکی ہوں اور لڑکیاں مجبور ہی ہوا کرتی ہیں۔ اس کے باوجود میں اتنی مجبور کبھی نہیں ہوں گی کہ تمہارا نام اپنے لبوں پر ایسے لے کر آؤں جو تمہیں رسوا کر دے۔''

''پاگل۔'' وہ اس کے علاوہ اور کیا کہہ سکتا تھا۔ پاؤں جھٹک کر وہ ریل پر چڑھ گیا تھا۔ وہ کتنی دیر وہاں بیٹھی روتی رہی۔ سرگودھا پہنچ کر سب سے پہلا کام اس نے نمبر بدلنے کا کیا تھا۔

''اماں! فون گم ہو گیا تھا راستے میں۔ اب نیا نمبر لیا ہے۔'' اس نے ماں کو مطمئن کر دیا تھا۔

مریم نے رابطے کی کوشش کی تھی۔ نمبر مسلسل بند آ رہا تھا۔ طرح طرح کے وسوسے دل میں سر اٹھانے

لگے۔ وہ اس کی ماں کے پاس چلی گئی۔
''نعمان کا نمبر بند ہے اور میرا کمپیوٹر چل نہیں رہا۔'' اس نے جھوٹ گڑھا۔
''تو تم کسی کو دکھا لو۔ اب کیا وہ اتنی دور بیٹھا تمہارے کاموں کی ٹینشن لے گا؟''
جہاں دیدہ عورت نے اس کے چہرے پر جھوٹ کی تحریر پڑھ لی تھی۔ وہ خاموش بیٹھی رہی۔ کچھ اور کہنے کا حوصلہ نہیں ہوا تو اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ ریشمی دوپٹہ ذرا سا سر کا تھا۔ اتنا معمولی کہ اگر وہ عورت اس پر نظریں گاڑے نہ بیٹھی ہوتی تو اس کا راز نہ پا سکتی۔ بجلی کی تیزی سے وہ اس کی طرف بڑھی اور ہاتھ مریم کے پیٹ پر رکھا۔ مریم دوبارہ وہیں بیٹھتی چلی گئی۔
''عورت بہت کمزور ہے اور مرد وہ شکاری ہے جو اس کمزور کڑی کو کہیں نہ کہیں ڈھونڈ لیتا ہے۔'' وہ اٹھ کر اندر گئی۔ واپس آئی تو ہاتھ میں پرس تھا۔ ''یہ لو...... اس سے اپنی جان چھڑا لو۔'' پیسے اس کی گود میں پھینکتی وہ بالکل اپنے بیٹے جیسی بے حس لگ رہی تھی۔
''میں حیران ہوں بیٹیوں کی ماؤں کو تو نیند نہیں آتی اور تمہاری ماں پانچ بیٹیاں پیدا کر کے کیسے بے ہوش رہی ہے۔'' وہ گم صم بیٹھی رہی۔ اس سے کہا نہیں گیا کہ نو بچوں کی ماں کس کس پر توجہ دے۔ جس کا ایک ہی ایک بیٹا تھا جب وہ اسے نہیں سنبھال سکی تو وہ نو بچوں والی کو کیسے طعن کر سکتی ہے۔
''میں کسی کو نہیں جانتی۔'' اس نے آہستہ سے کہا۔
''تو اپنی ماں کو بتاؤ۔ آج یا کل پتا تو چلنا ہے۔ تماشا بننے سے پہلے کچھ سوچ لو تو بہتر ہے اور آئندہ کبھی ادھر کا رخ بھی مت کرنا۔ اسے اگر تم سے واسطہ رکھنا ہوتا تو جاتے ہی نمبر نہ بدل لیتا۔'' بیٹے کا جھوٹ ایک لمحے میں پکڑ لیا تھا اس نے۔
وہ ساری زندگی بھی ہمت اکٹھا کرتی رہتی تو خود سے بتانے کی ہمت کر ہی نہیں سکتی تھی۔ وہ اب اس انتظار میں تھی کب یہ بات کھلتی ہے۔ نعمان کی یاد میں گھل گھل کر وہ ختم ہوتی جا رہی تھی۔ یہ چھٹا ماہ تھا۔ سفید بے داغ شلوار قمیص پہنے وہ نہا کر نکلی تھی۔ تولیہ کندھے پر پھیلائے دوپٹے سے سر ڈھکے وہ گیلے کپڑے الگنی پر پھیلا رہی تھی جب اس نے ماں کی نظر محسوس کی۔ چھپانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ تیر کی طرح وہ اس کے سر پر پہنچی تھیں۔
''مریم۔'' ان کی بے یقینی محسوس کر کے وہ نظر جھکا گئی۔ انہوں نے اس کے منہ پر تھپڑوں کی برسات کر دی تھی۔ گالیاں کوسنے دیتی وہ اسے پیٹتی جا رہی تھیں۔ وہ پہلے رکوع میں جھکی اور پھر سجدے میں۔ شور سن کر بہنیں بھی باہر آ گئی تھیں۔
''کیا ہوا امی؟ کیوں مار رہی ہیں؟'' سب سے بڑی نے آگے بڑھ کر ماں کا ہاتھ روکا۔
''منہ کالا کر کے آئی ہے اور اب اسی سیاہی کو ہم سب کے منہ پر ملے گی۔ تو مر کیوں نہ گئی مریم؟ میرے گناہوں کی سزا بن کر زندہ کیوں ہے؟'' وہ چپ چاپ پڑی رہی۔ بہنیں خاموشی سے دیکھ رہی تھیں۔
''اچھا اندر چلیں، یہاں سب سنیں گے۔''
''سب نے دیکھنا بھی تو ہے سن لیں تو کیا برا ہے۔ مریم تجھے ایک بار بھی اپنی ان بہنوں کا خیال نہ آیا؟ کیا سلوک کرے گا تیرا باپ اور زمانہ ان کے ساتھ۔۔۔ تیرے بھائی کیسے سر اٹھا کر چلیں گے اس گلی محلے میں۔'' وہ بلند آواز سے رونے لگی تھیں۔
اگلی رات اس کے پیٹ میں درد کا بہانہ کر کے امی اسے ہسپتال لے گئی تھیں۔ یہ ایک نجی ہسپتال تھا جائز ناجائز حلال حرام ہر کام پیسوں کے عوض ہو جاتا تھا۔
''وقت بہت زیادہ گزر چکا ہے۔ اب کچھ نہیں ہو سکتا۔'' سارے ٹیسٹ ہونے کے بعد ڈاکٹر نے ٹکا سا جواب دیا تھا۔ ماں یہ بات سن کر آپے سے باہر ہو گئی تھی۔ وہیں اسے پیٹتے، کوسنے دیتے چھوڑ گئی تھی۔
''چلو بیٹی، گھر چلیں۔'' وہ وہیں لاوارث

کھڑی تھی جب نسیم نے اسے گھر چلنے کا کہا۔ بنا کسی سوال جواب کے وہ اس کے ساتھ چل دی۔ جو ہوا کم برا نہیں تھا۔ اب کیا ہو سکتا تھا؟ وہ بے خوف تو تھی ہی لیکن فی الحال اپنے حواس میں بھی نہیں تھی۔

باقی کے تین ماہ اس نے منہ چھپا کر گورنمنٹ ہسپتال کے چکر کاٹے تھے۔

جب سعد پیدا ہوا تو اس کی شکل دیکھ کر وہ بہت روئی تھی۔ وہ سارے کا سارا مریم جیسا تھا۔ اسے شاہ تو ملا نہیں شاہ کا بیٹا بھی اس کے جیسا نہیں نکلا۔

سعد تین ماہ کا تھا جب سعید کا رشتہ آیا۔ وہ وکیل تھا، اچھا کھاتا کماتا تھا۔ نہ سر پر ماں باپ تھے نہ کوئی بہن بھائی۔ نسیم نے اسے اپنی بیٹی ظاہر کر کے اس کا رشتہ طے کر دیا۔ اس نے بڑا واویلا کیا تھا۔

''میں اکیلی رہ لوں گی۔ پال لوں گی اپنا بچہ۔ مجھے کسی کی ضرورت نہیں۔''

''جس مرد ذات نے تجھے تیرے بھرے گھر میں رہنے نہیں دیا، وہ تجھے یہاں اکیلا رہنے دیں گے؟ میں آج ہوں کل نہیں ہوں۔ کتوں کی طرح تیری بوٹیاں نوچ لیں گے۔ کیا یہ بہتر نہیں کہ عزت کے ساتھ کسی ایک کا گھر بسا لے؟ سب اس جیسے کم ذات نہیں ہوتے جو تجھے چھوڑ گیا تھا۔ دنیا میں عزت دار لوگ بھی ہوتے ہیں۔ باقی تیری اپنی مرضی۔ اسے تو سعد کے ساتھ رہنے پر بھی کوئی اعتراض نہیں۔'' وہ سمجھ رہی تھیں کہ وہ ایک مرد سے ڈسی سب کو اس جیسا سمجھ رہی ہے۔ پھر وقت کے گزرتے نہ چاہتے بھی اسے سعید کا بڑھا ہاتھ تھامنا پڑا۔ اس نے سعید سے مل کر ماں جی کا جھوٹ کھول دیا تھا۔

''میں ماں جی کی بیٹی نہیں ہوں۔ مجھ پر ترس کھا کر، خدا خوفی کے تحت انہوں نے مجھے اپنے گھر میں رکھا ہے۔''

''مجھے اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ میں نے ماں جی کی بیٹی کا ہاتھ نہیں مانگا۔ میں نے تمہیں مانگا ہے۔''

سعید کی بات پر وہ چپ رہ گئی۔ ''پھر آپ کو اس بات سے فرق پڑے گا کہ میرا بیٹا سعد کسی حلال تعلق کا نتیجہ نہیں......''

''مجھے اس بات سے بھی کوئی فرق نہیں پڑتا۔'' اس نے مریم کی بات پوری نہیں ہونے دی تھی۔ ''وہ کسی جانور کا قہر تھا جو تم نے جھیلا لیکن اس میں تمہارا یا اس بچے کا کوئی قصور نہیں اور میرا وعدہ ہے میں آخری دم تک اس بچے کو، تمہیں اس بات کا نہ احساس دلاؤں گا نہ طعنہ دوں گا۔''

وہ سمجھ رہا تھا مریم کے ساتھ کوئی زور زبردستی ہوئی ہے۔ وہ اس کے بیٹے کو اپنانے اور اسے سہارا دینے پر تیار تھا۔ مریم نے اس کی غلط فہمی دور نہیں کی اور پہلی مرتبہ دل پر دماغ کو فوقیت دی تھی۔ فیصلہ سعید کے حق میں ہو گیا۔

سعید نے ثابت کیا کہ اس کا فیصلہ غلط نہیں تھا۔ وہ اس کی سانس کے ساتھ سانس لیتا تھا۔ اس نے مریم کو گھر کا وہ سکون دیا تھا کہ مریم سارے دکھ بھول گئی تھی۔ ذلت کا احساس ختم ہو گیا تھا۔ اب وہ منہ پر کپڑا نہیں ڈالتی تھی۔ وہ دنیا کا سامنا اسی منہ کے ساتھ کرتی تھی۔ اب اسے کسی کا خوف نہیں تھا۔ نہ باپ بھائی کا نہ گلی محلے والوں کا کہ وہ اسے دیکھ کر کیا کہیں گے۔ سعید نے اس کے ادھڑے اکھڑے وجود کی رفوگری کر کے اسے ایک نئی شکل عطا کی تھی۔

پھر کچھ عرصے بعد اس نے چپکے سے اعتراف کر لیا تھا کہ اسے سعید سے محبت ہے۔ وہ شخص چاہے جانے کے لائق تھا۔ وہ کیوں نہ اس سے محبت کرتی۔ اس نے تو اس شخص کو مجازی خدا کا روپ دے کر دل کے طاق پر سجا رکھا تھا جو پیروں میں روندے جانے کے قابل تھا۔

وقت نے آنکھیں کھول دی تھیں۔ ایک پلڑے میں سعید تھا اور دوسرے میں اس کی یادیں۔ وہ جتنا دکھ اٹھا چکی تھی، اس کا دل از خود سعید کی طرف جھک گیا تھا۔ وہ شکر کرتی تھی سعد، نعمان کی صورت پر نہیں تھا ورنہ وہ اسے دیکھ دیکھ کر مرتی۔ اب وہ سوچتی، کبھی نعمان اس کے سامنے آئے تو وہ اسے اس

کی حیثیت بتائے۔ یہ مریم کی محبت تھی جس نے اسے
شاہ بنایا تھا۔ ورنہ اس جیسا کم ہمت، بزدل اور گھٹیا
شخص مریم کی نفرت کے بھی قابل نہیں تھا۔ احساسِ
ندامت اور احساسِ زیاں اسے چین نہیں لینے دیتا تو
وہ اٹھ اٹھ کر روتی۔ نماز پڑھتی تو سجدے میں سر رکھ کر
روتی۔ سعید ہر طرح سے اس کی دلجوئی کرتا۔ پھر اللہ
نے اسے احد اور اس کے بعد عبید سے نواز دیا۔ زندگی
مصروف ہو گئی۔ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اس
کے آنسو ختم ہو گئے۔

اس نے نعمان تو کیا اس کی یادوں کو بھی بھلا دیا
تھا۔ اب دل میں خواہش نہیں جاگتی تھی کہ وہ آ کر
اسے دیکھے اور وہ اسے اس کی اوقات بتائے۔

اور تب وہ ایک دن واپس آ گیا۔ مریم کے دل
میں کوئی ہلچل نہیں ہوئی۔ نہ دل نے دھڑکن چھوڑی
نہ سانسوں نے رفتار پکڑی۔

اس کی بیوی جب ان کے گھر آئی تو اس نے
ایک فاصلہ رکھا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ مراسم بنانے
میں دلچسپی نہیں رکھتی تھی۔ سعید اچھا تھا بہت اچھا۔
لیکن وہ اس کے دل میں کسی شک کا بیج نہیں بو سکتی
تھی۔ نعمان جیسے گھٹیا شخص سے کچھ بھی بعید نہیں۔ اور
پھر ماں جی نے بتایا وہ ان کی رشتے کی بہن کا بیٹا
ہے۔ ماں جی نے اس کی ذات پر جو احسان کیے تھے
اس کے عوض وہ یہ تو کر سکتی تھی کہ اس شخص کا پردہ
بنائے رکھتی جسے وہ بیٹا کہتی تھیں۔ اسے اب انتظار تھا
کب وہ اس کی طرف قدم بڑھائے اور وہ اسے اس
کی حد بتائے۔ اسے یقین تھا وہ پیش قدمی ضرور
کرے گا۔ اس کے ساتھ ساتھ وہ دعا مانگتی تھی کہ اللہ
نے سعید کی صورت جو سائبان اسے عطا کیا ہے وہ
ہمیشہ قائم رکھے۔ زندگی اس موڑ پر تھی جہاں ایک غلط
چال پوری بازی پلٹ سکتی تھی۔

☆☆☆

سرما کے بے رونق اور خزاں رسیدہ دن جیسے
زندگی میں ٹھہر گئے تھے۔ وہ جو بھی کرتا، اسے سکون
اور خوشی نام کی کوئی شے نہیں ملتی تھی۔ مہر کو اس نے گھر
بھیج دیا تھا۔ پہلی بار وہ زیادہ دنوں کے لیے گئی تھی۔
بچے بھی گھر پر نہیں تھے۔ سب کچھ اداس اور ویران
نظر آ رہا تھا یہاں تک کہ وہ خود بھی۔ ہفتے کا آخری
دن تھا۔ وہ کھانا کھانے کے لیے نکلا۔ پھولدار سفید
پونچو پہنے وہ کہیں نکل رہی تھی۔ اس کے ساتھ ایک
بچہ تھا جو تقریباً اسد کا ہم عمر تھا۔ اس سے کچھ فاصلے پر
چلنے کے باوجود وہ اس کے ساتھ ساتھ تھا۔

"مریم۔"

"ہاں۔" اس کی دھیمی آواز پر اس نے بنا
مڑے جواب دیا۔

"میں تم سے ملنا چاہتا ہوں۔ ایک آخری بار۔
پلیز نہ مت کہنا۔" اس نے اتنی لجاجت سے کہا کہ
بے ساختہ اس نے مڑ کر دیکھا۔ یہ وہ شخص تھا جسے اس
نے شاہ بنایا تھا۔ وقت نے اسے گدا بنا کر اسی کے در
پر لا کھڑا کیا تھا۔

"دن کے اجالے میں جب چاہو میرے گھر کا
دروازہ کھٹکھٹا لینا۔" کہہ کر رخ بدل کر اس بچے کا
ہاتھ تھامے آہستہ آہستہ چلتے وہ اس کی نظر سے دور ہو
گئی۔

کھانے کو بھول کر وہ واپس گھر گیا۔ سارا
سامان چھان مارا تب کہیں جا کر وہ گوہرِ مقصود ملا۔
کمرے میں بستر پر جا کر اس نے وہ تھیلا الٹا۔
گزرے ماہ و سال زندہ ہو کر اس کے سامنے آ
ٹھہرے تھے۔ ہر شے خود سے جڑی کہانی سنانے لگی
تھی۔ ساری رات اس نے ان چیزوں کو چھو کر ان
کے زمانے محسوس کیے تھے، ان کی کہانیاں سنی تھیں۔
وہ سب سنا تھا جو مریم نے اس سے کہنا تھا لیکن کہہ
نہیں پائی یا اس نے سنا نہیں تھا۔ سرخ فراک جو اس
نے مریم کو دیا تھا اور ایک ہی بار اس کے تن پر سجا تھا۔
اس میں لپٹے وہ خشک پھول جو اس نے مریم کے
بالوں میں باندھے تھے۔ ان خشک پھولوں میں اس
رات کی مہک تھی۔ مہندی اور ٹوٹی ہوئی سرخ
چوڑیاں بھی اسی کی لائی ہوئی تھیں۔ یہ زنگ آلود پن
وہ تھی جو اس نے مریم کے نقاب سے کھینچی تھی۔ اس

پن کو تھام کر وہ وہیں گلی میں جا پہنچا تھا جہاں اس کے سرخ لبوں پر ہنسی تھی۔ سادہ سچی آنکھوں میں بس شاہ کا عکس تھا۔ ان لمحوں میں بے تحاشا محبت تھی۔ یہ ہزار ہزار کے دس نوٹ وہی تھے جو اس نے اس سے پیچھا چھڑانے کے لیے دیے تھے۔ دل کی شکل کا چاکلیٹ والا ڈبہ اور اس میں چاکلیٹس جوں کی توں موجود تھیں۔ کچھ اور چھوٹی چھوٹی محبت کی یادگاریں تھیں۔

ساری رات جاگ کر کٹی تھی۔ صبح دم اسے نیند نے آلیا۔ ڈھلتی دوپہر اس کی آنکھ کھلی تھی۔ گزشتہ رات کا سفر اس کی آنکھوں میں لکھا تھا۔ منہ پر پانی کے چھینٹے مار کر اس نے سارا سامان سمیٹ کر رکھا۔ اس تھیلے میں اس نے اس کتاب کا اضافہ کیا تھا جو اس نے مریم کے لیے خریدی تھی۔

وہ اس سے ملنے کے لیے بے تاب تھا اگرچہ اسے خود علم نہیں تھا کہ وہ کہنا کیا چاہتا ہے، کیا پوچھنا چاہتا ہے، کیا بتانا چاہتا ہے۔ پتا تھا تو بس یہ کہ وہ اس کا سامنا کرنا چاہتا ہے۔ شاید اس کے اوپری خول کو توڑ کر وہ اس مریم کو باہر نکالنا چاہتا تھا جس کا وہ شاہ تھا۔

شام کے سائے اترنے لگے تو اس نے خود کو اس کے دروازے پر پایا۔ حسب وعدہ دروازہ کھل گیا۔ اندر داخل ہوتے ہی خوشبو کے تیز جھونکے نے گلے لگ کر خوش آمدید کہا تھا۔ کام والی نے اسے بیٹھک کا راستہ دکھایا۔

''کون آیا ہے ماسی؟'' زعفرانی رنگ کے جلتے شعلے جیسی ساڑھی میں وہ خود بھی آگ کا شعلہ دکھائی دے رہی تھی۔ ایک کان میں موتیوں والا بندا تھا اور دوسرا اس کے ہاتھ میں تھا جسے پہنتے ہوئے وہ باہر آئی تھی۔ اس کے ادھ کھلے ہونٹوں پر بات ٹھہر گئی تھی۔ اسے رکتے دیکھ کر مریم کا دل چاہا واپس پلٹ جائے۔ یہ سب تیاری سعید کی سالگرہ کے لیے تھی۔ پھر اس نے تھوڑی سی بے ایمانی پر خود کو معافی دی اور اسی تیاری میں اس کے پیچھے بیٹھک میں پہنچ گئی۔ وہ اس کو اپنے سامنے گڑگڑاتا ہوا دیکھنا چاہتی تھی۔ ایک ملکہ ایک شہزادی کی طرح۔

''کیسی ہو؟''

''تم دیکھ چکے ہو، میں کیسی ہوں۔ تمہارے بغیر بہت خوش ہوں اور اسی بات نے تمہاری نیند اڑا رکھی ہے۔ پھر کیوں پوچھ رہے ہو؟'' اس کے باخبر ہونے پر وہ حیران ہوا تھا۔

''ہمیشہ خوش رہو۔''

''تمہاری منافق دعاؤں کے بغیر ہی بہت خوش ہوں۔ اب بتاؤ، کیوں آئے ہو؟'' اس نے بے زاری سے گھڑی کی طرف دیکھتے اسے اس کی اوقات باور کروائی۔

میں...... کچھ نہیں، بس تھک گیا ہوں۔ اکیلا یادوں کا بوجھ ڈھوتے۔ تمہاری کچھ چیزیں واپس دینے آیا ہوں۔''

یہ کہہ کر اس نے شیشے کی میز پر وہ تھیلا الٹ دیا۔ اس کی بات پر مریم نے ایکسرے کرتی نظر سے اسے سرتا پیر دیکھا اور پھر ایک نظر تفصیل سے سامنے میز پر پڑے ساز و سامان پر ڈالی۔ اس کے بعد وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔ وہ جانتا تھا یہ ہنسی اس پر لعنت ملامت کی ہنسی ہے، اس کے باوجود وہ اس کی خوب صورتی میں کھو گیا تھا۔

''تم جھوٹے تھے، تم جھوٹے ہو اور ہمیشہ جھوٹے رہو گے۔ جانے کہاں کاٹھ کباڑ میں اس کو پھینک رکھا ہوگا اور مجھے دیکھ کر اس کی یاد آگئی۔'' اس نے اس نعمان کا چہرہ دیکھا تھا جسے علم نہیں تھا مریم یہیں بستی ہے۔ وہ چہرہ یہ نہیں تھا۔ وہ تو بڑا بے فکرا اور خوش و مطمئن تھا۔ وہ جان گئی تھی وہ پھر اسے ورغلانے آیا ہے۔ جب کہ اس کے درست اندازے پر وہ اسے دیکھتا رہ گیا تھا۔ یہ وہ معصوم مریم نہیں تھی جو اس کی ہر بات پر آنکھیں بند کر کے یقین کر لیتی تھی۔

''مریم۔''

''بولو جو بولنا ہے۔ یہ پہلی اور آخری بار ہے اس کے بعد روز قیامت بھی میں تمہارا سامنا نہیں کروں گی۔'' اس کی بات نے نعمان کا دل چٹکیوں میں مسلا

تھا۔

''میں تمہارا گناہ گار ہوں مریم! مجھے معاف کر دو پلیز۔''

''میں ابھی اتنی اعلا ظرف نہیں ہوئی۔ بس یا اور کچھ کہنا ہے؟'' اپنے بندے کو ہاتھ میں گھماتے اس نے ابرو اچکا کر پوچھا۔

''تمہیں کچھ بھی یاد نہیں آتا؟'' بے بسی سے اس کا چہرہ دیکھتے اس نے پوچھا۔

''مجھے کچھ نہیں بھولا۔ میں نے غلطی نہیں گناہ کیا تھا اس کے باوجود اللہ نے میرا پردہ رکھا، مجھے رسوا نہیں کیا۔ میں وہ سب بھول جانا چاہتی ہوں جو مجھے ملنی چاہیے تھی۔ تم کیا یاد کروانا چاہتے ہو؟''

''مریم ایک بار۔ بس ایک بار مجھے اس نظر سے دیکھو جس نظر سے اپنے شاہ کو دیکھتی تھیں۔ ایک بار مجھے ویسے ہی شاہ پکارو میں سر کے بل کھڑا ہو کر تمہاری ہر بات سنوں گا۔'' بے اختیار وہ اس کے پاس جا کھڑا ہوا تھا۔

''یہ اپنا کچرا اٹھاؤ اور جاؤ یہاں سے۔ جاتے ہوئے پانی پی کر جانا۔''

''مریم ایک منٹ۔ ایک منٹ رکو پلیز۔''

''جلدی بولو۔''

''میں نے تم سے اس وقت بھی محبت کی تھی جب تم...... میں تم سے آج بھی......''

''بکواس بند کرو۔ کس محبت کی بات کر رہے ہو تم؟ جس محبت نے دن کے اجالے میں تمہاری ماں کے ہاتھوں ذلیل کروایا تھا اور رات کے اندھیرے میں میری ماں کے ہاتھوں مجھے گھر سے نکلوایا تھا؟''

''اماں جانتی تھیں؟'' اسے حیرت کا جھٹکا لگا تھا یہ سن کر۔ اسے یاد آیا جب اماں اس کے پاس سرگودھا آئی تھیں۔ وہ ان سے صبا کے بارے میں بات کر رہا تھا اور انہوں نے کچھ بھی سنے بغیر انکار کر دیا تھا۔

''لڑکی حیا والی اور خاندانی ہونی چاہئے کیونکہ اس نے ایک نسل کی تربیت کرنی ہوتی ہے۔ جو لڑکی خود نین مٹکا کرتی پھرے، وہ کیا تربیت کرے گی؟ اس کی تو اپنی تربیت میں کمی ہوگی۔ بالفرض وہ اچھی تربیت کرے بھی تو اس کی تربیت میں وہ تاثیر نہیں ہوگی جو ایک پاک عورت کی تربیت میں ہوگی۔''

''میں نے بہت عذاب جھیلے ہیں، جانے کس کی دعا ہے کہ اللہ نے مجھے سعید جیسا پیارا شخص عطا کیا ہے۔ وہ ایسا شخص ہے جس نے مجھے ہر غم بھلا دیا ہے۔ میں اس سے محبت کرتی ہوں اتنی محبت کہ اگر میں آج اس محبت کا موازنہ اس بیوقوفی سے کروں جو تم جیسے نیچ شخص سے محبت کر کے کی تھی تو مجھے ایسا لگتا ہے وہ زہر تھی اور یہ ندی کا میٹھا پانی۔ اس میں میرا کوئی کمال نہیں وہ شخص ہے ہی اس لائق کہ اسے چاہا جائے۔ ایسے ہی بے حد اور بے تحاشا۔ اسے منہ مارنے کی عادت نہیں ہے اسی لیے اس کی ہونے کے بعد کسی آنکھ نے مجھے نظر بھر کر نہیں دیکھا۔ آئندہ مجھے مخاطب کرنے کی کوشش بھی مت کرنا۔ سمجھے؟ بزدل اور گھٹیا انسان۔''

اس کی بات کاٹ کر سرد لہجے میں کہتے وہ باہر نکل گئی۔ اس کا خون کھول رہا تھا اس اظہارِ محبت پر۔ کھلے دروازے سے وہ جا چکی تھی۔ کمرے کے ساتھ ساتھ اس کی زندگی سے بھی۔ بنا چھوئے میز پر پڑی چیزیں وہ اس کے منہ پر مار گئی تھی۔ کاش اس نے نظر بھر کر ان چیزوں کو نہ دیکھا ہوتا تو وہ خود کو تسلی دے لیتا کہ اس نے انجانے میں نظر انداز کر دیا۔ مگر اس نے دیکھا تھا۔ سرخ فراک، سوکھے گجرے، مہندی، ٹوٹی سرخ چوڑیاں۔ سب سے بڑھ کر اس کا دل۔ وہ ہر شے بے مول کر گئی تھی۔

اس نے ان پر ایک بھرپور نظر ڈالی تھی اور کہا بھی تو کیا؟ کیا اس کے دل میں کوئی احساس نہیں جاگا تھا یہ سب دیکھ کر؟ شاید نہیں۔

اس کے لفظوں کے طمانچوں سے سرخ چہرہ لیے بڑی مشکل سے اس نے خود کو اور ان چیزوں کو سمیٹا تھا جو کانچ کی میز پر بکھری پڑی تھیں۔ کاش وجود کو بھی ایسے ہی سمیٹ کر کسی تھیلے میں ڈال کر کسی کمرے میں رکھ کر بھول سکتا۔ وہ اپنا آپ ہار کر وہاں

سے اٹھا تھا۔

☆☆☆

وہ مریم اور نعمان کی کہانی کا ایک اہم کردار تھا۔ سعید ورک۔ اپنے چیمبر میں وہ کسی اہم کیس کے سلسلے میں ایک دوسرے وکیل کے ساتھ بیٹھا تھا۔ اس کا فون بجا۔ اس نے نمبر دیکھا۔ اس نمبر سے آنے والی کوئی کال اس نے کبھی چھوڑی نہیں تھی یہ اور بات کہ اس نمبر سے فون بہت کم آتا تھا۔ اس نے فون پکڑا اور کال وصول کر کے فون میوٹ کر کے واپس میز پر رکھ دیا۔ اس نمبر سے آنے والی ساری کالز وہ ریکارڈ کرتا تھا پھر چاہے وہ فارغ بیٹھا کان سے فون لگا کر سن رہا ہوتا۔ پینتیس منٹ گزرنے پر ایک بار پھر اس کا فون بجا۔ پہلی کال یقیناً بند ہو چکی تھی۔ معذرت کرتا فون اٹھا کر وہ چیمبر سے باہر نکل آیا۔

"آج آپ کی سالگرہ ہے اور اب آپ یہ مت کہیے گا، میں بھول گیا۔"

سلام دعا کے بعد اس کی زندگی سے بھرپور چہکتی آواز میں شکوہ ایئر پیس میں گونجا۔ اس نے فوراً ہاتھ پر بندھی گھڑی پر نظر ڈالی۔

"یارررر...... ایک بہت اہم کلائنٹ کے ساتھ میٹنگ ہے۔ میں دو گھنٹے تک آسکوں گا۔"

"تو ٹھیک ہے پھر میرے روٹھنے کے لیے تیار ہو کر آیئے گا۔ مجھے منانا پڑے گا۔" اس کی دھمکی پر وہ زیرِ لب مسکرایا۔

"اچھا ایک دو چھوٹے چھوٹے کام ہیں، وہ نمٹا لوں پھر آتا ہوں۔"

کام نمٹا کر وہ چیمبر سے نکلا تو رات کے آٹھ بج رہے تھے۔ گاڑی میں بیٹھ کر دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے ریکاڈنگ چلے کی۔

"کیسی ہو؟"

اس شخص کی آواز سے اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ یہ وہی ہے جس کے تعاقب میں وہ پچھلے نو سالوں سے ہے۔ جس کی وجہ سے اس کی زندگی پوری ہو کر بھی ادھوری ہے۔ وہ سانس روک کر وہیں پارکنگ میں گاڑی کھڑی کیے بیٹھا رہا۔

"تم دیکھ چکے ہو، میں کیسی ہوں۔ تمہارے بغیر بہت خوش ہوں اور اسی بات نے تمہاری نیند اڑا رکھی ہے۔ پھر کیوں پوچھ رہے ہو؟"

مریم کی آواز میں ٹھہرا سکون یہ بتانے کے لیے کافی تھا کہ اس شخص کو دیکھ کر کوئی خاص فرق نہیں پڑا۔ کال چلتی رہی۔ ختم ہوئی۔ پھر چلی۔ پھر ختم ہوئی پھر چلی۔ وہ مریم کو سننا چاہتا تھا۔ بار بار سننا چاہتا تھا۔ وہ کس شدت سے اس سے محبت کا اظہار کر رہی تھی۔ اس کا لہجہ سچائی کا گواہ تھا۔ وہ اتنا اچھا نہیں تھا جتنا اچھا مریم اسے سمجھ رہی تھی۔

وہ ایک طوائف زادہ تھا۔ خاندانی طوائف کا بیٹا۔ جس کی ماں اور پھر ماں کی ماں اور پھر اس کی بھی ماں طوائف تھی۔ جانے کتنی نسلوں سے یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا۔ اس کی چھٹی سالگرہ کی رات ماں نے خاص طور پر "مہمان نوازی" سے چھٹی طلب کی تھی۔ وہ یہ رات اپنے بیٹے کے ساتھ گزارنا چاہتی تھی۔ شاید یہ پہلی رات تھی جب اسے اس کی ماں کا لمس محسوس ہوا تھا۔ ورنہ اسے تو دن میں بھی اس کے پاس پھٹکنے نہیں دیا جاتا تھا۔

وہ اس کے ساتھ مسہری پر لیٹی اس کا سر سہلا رہی تھی۔ ساتھ ساتھ اس سے باتیں کر رہی تھی۔

"تم سمجھ رہے ہو نا میری بات؟" ہر تھوڑی دیر بعد وہ اس سے یقین دہانی لینا نہیں بھولتی تھی۔ اور اسے کچھ سمجھ میں آیا کچھ نہیں۔ اس کے باوجود وہ اقرار کرتا جا رہا تھا۔ اس رات اس نے جانا تھا کہ جس جگہ وہ رہتا ہے وہ باعزت لوگوں کے رہنے کی جگہ نہیں بلکہ گناہوں کا گڑھ ہے جہاں سے اس کی ماں اب اسے باہر نکالنے لگی تھی۔

"تو پھر آپ بھی ساتھ چلیں۔" وہ معصوم بچہ اتنی خراب جگہ پر اپنی ماں کو چھوڑ کر کیسے جا سکتا تھا۔ آج تو ویسے بھی ماں نے اپنی مامتا نچھاور کر کے بتایا تھا کہ ماں کتنی پیاری شے ہوتی ہے۔ اس کی بات پر ایک پھیکی سی ہنسی ہنس کر اسے زور سے خود میں بھینچتی

وہ رو پڑی تھی۔

"میری ایسی ہی لکھی ہے، یہاں بھی اور باہر بھی۔ یہیں گزر جانے دے۔ تو اپنی زندگی زیرو سے شروع کر جس میں میرے نام کی کوئی عورت تیری ماں نہیں۔"

وہ کچھ نہیں سمجھا تھا مگر چپ رہا۔

"زندگی میں کسی مقام پر پہنچ جاؤ تب بھی مجھے ڈھونڈنے مت آنا اور میری کہی باتیں بھولنے لگو تو یہ سن لینا۔"

بیٹری سے چلنے والا کیسٹ پلیئر اس نے سعید کے لیے تیار کیے بیگ میں ڈال دیا تھا۔

اگلی صبح نہ چاہتے ہوئے بھی ماں کی قسم نبھانے کی خاطر وہ وہاں سے بھاگ گیا تھا۔ پیسوں کے نام پر چند روپے اس کے پاس تھے۔ ان پیسوں سے سفر کرتا وہ جانے کس شہر جا پہنچا تھا۔ بس اڈے پہ اتر کر وہ پیدل کچھ دور گیا تھا کہ اسے پٹرول پمپ دکھائی دیا جہاں اسی کی عمر کے دو ایک لڑکے ہاتھ میں شاور اور تولیہ لیے آتی جاتی گاڑیوں کے شیشے صاف کر رہے تھے۔ یہ تو آسان تھا اور وہ کر بھی سکتا تھا۔ ماں کے دیے پیسوں میں سے جو بچے تھے ان سے اس نے ایک تولیہ اور شاور خریدا اور وہیں ایک طرف ہو کر بیٹھ گیا۔ اس دن ناشتہ اس نے اپنی کمائی سے کیا تھا۔

رات ہوئی تو وہیں فٹ پاتھ پر پڑ کے سو رہا۔ ماں کی نصیحت کے مطابق وہ بیگ میں رکھی کتابیں نکال کر بیٹھ جاتا اور آتے جاتے لوگوں سے پوچھ کر سبق یاد کرتا۔ اسے یہاں چار روز گزر چکے تھے۔

"تمہیں جج صاب بلا رہے ہیں۔" اگلی صبح وہ منہ ہاتھ دھو کر کتابیں لے کر بیٹھا ہی تھا کہ ایک لڑکے نے آ کر کہا۔ اس کے اشارے کے تعاقب میں اس نے دیکھا۔ سیاہ رنگ کی لمبی سی گاڑی اس نے پہلے بھی دو بار صاف کی تھی۔ کتاب بستے میں ڈال کر وہ اس گاڑی کے پاس پہنچا۔

"السلام علیکم سر۔ آپ نے بلایا ہے۔"

"آج گاڑیوں کے شیشے صاف نہیں کرو گے؟"

انہوں نے مسکرا کر کہا تو وہ بھی مسکرایا۔

"آج آپ نے گاڑی اتنی دور کھڑی کی ہے، مجھے پتا ہی نہیں چلا۔" جلدی جلدی ہاتھ چلاتے اس نے جواب دیا۔

"ویسے تم ہو کون؟ یہاں کے تو نہیں ہو۔"

"اب تو یہیں سے ہوں۔" اس نے اسی مسکراہٹ سے جواب دیا۔ "مجھے آپ کوئی کام ڈھونڈ کر دے سکتے ہیں؟ میں ساری زندگی اس پٹرول پمپ پر گاڑیوں کے شیشے صاف کرتا نہیں گزارنا چاہتا۔"

"تو کیا کرنا چاہتے ہو؟" انہوں نے محض دل لگی کے لیے نہیں پوچھا تھا۔ وہ اس لڑکے سے متاثر ہوئے تھے۔

"میں آپ جیسا افسر بننا چاہتا ہوں۔" اس نے انتہائی سنجیدگی سے جواب دیا۔ اس کے پاس کوئی رول ماڈل تھا ہی نہیں۔ بس یہ پتا تھا کچھ بننا ہے۔ کیا......؟ یہ ابھی قسمت نے طے کرنا تھا۔

"میرے دفتر میں کام کرو گے؟"

"میں بھلا کیا کام کروں گا دفتر میں؟"

بیٹھو گاڑی میں، میں تمہیں سمجھاتا ہوں۔"

"زندگی بار بار موقع نہیں دیتی۔ خطروں کا سامنا کرنا سیکھنا۔ نیا کرتے ہوئے گھبرانا نہیں اگر وہ غلط راستے پر لے جانے والا نہ ہو۔" ماں کی آواز اس کے کانوں میں گونجی اور وہ بھاگ کر اپنا بستہ اٹھائے جج صاحب کے کھولے دروازے سے گاڑی میں جا بیٹھا۔

"اصل میں تمہاری عمر کے لڑکوں کو تمیز سکھانا بہت مشکل کام ہوتا ہے اور تم ماشاءاللہ ادب و آداب سیکھے سکھائے ہو۔ کسی اچھے گھر کے چشم و چراغ لگتے ہو اور مجھے یقین ہے، تمہیں پڑھنے کا شوق بھی ہے۔"

شوق کا تو اسے پتا نہیں تھا مگر ماں کی نصیحت تھی جس پر وہ عمل کر رہا تھا۔

"دفتر میں چھوٹے چھوٹے کام ہوتے ہیں۔ فائل ایک کمرے سے دوسرے کمرے میں لانا لے جانا وغیرہ۔ تم جیسے ہوشیار بچے کے لیے تو یہ کچھ مشکل نہیں ہوگا۔ میں تمہیں پڑھا بھی دیا کروں گا اور تمہیں

فٹ پاتھ پر سونا بھی نہیں پڑے گا۔"
ہامی بھرنے میں اس نے بالکل وقت ضائع نہیں کیا تھا۔ وقت نے ثابت کیا کہ اس نے اس شخص پر اعتبار کر کے گھاٹے کا سودا نہیں کیا تھا۔
"تم میری وہ نیکی ہو جو میرے جنازے کا کندھا بنے گی۔" وہ اکثر کہا کرتے تھے۔
سعید اس شخص کے لیے اور وہ سعید کے لیے پورا خاندان تھا۔ انہوں نے غالباً شادی کی تھی جو ناکام ٹھہری اور اس کے بعد ان کا دل ہی اٹھ گیا اس تعلق سے۔
اب سعید ان کے لیے سب کچھ تھا۔ وہ ایک بیوی کی طرح ان سے لڑ لیتا تھا، ایک محبوبہ کی طرح ناز دکھا لیتا تھا اور ایک ضدی بچے کی طرح اپنی بات منوا لیتا تھا۔ ان کے طفیل ہی وہ اپنی تعلیم جاری رکھ سکا تھا۔ بعد میں ان کے مشورے سے اس نے وکالت کا شعبہ اپنا لیا۔ ماں کی دی گئی کیسٹ اب بھی وہ رات کی تنہائی میں سنا کرتا تھا۔ اب تو اسے وہ لفظ وہ لہجہ پوری طرح ازبر ہو گیا تھا۔ پھر بھی یہ آواز اسے سکون دیتی تھی۔ اسے بتاتی تھی کہ اس کے ہونے کی وجہ ہے۔ اس کی ماں کی ہی خواہش تھی کہ وہ زندگی میں کسی ٹوٹی لڑکی کا سہارا بنے۔ وہ لڑکی اسے ایسا مضبوط کر دے گی کہ دنیا کی کوئی طاقت اسے توڑ نہیں سکے گی۔ اسے یہ خواہش بھی ویسے ہی یاد تھی جیسے باقی ساری باتیں۔ اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے بعد وہ ماں کے پاس گیا تھا لیکن وہ دنیا سے رخصت ہو چکی تھی۔
اس شام وہ ایک کلائنٹ کے قریب المرگ باپ کی وصیت کے لیے ہسپتال گیا تھا۔ وہ کام نمٹا کر باہر نکلا تو گاڑی کی طرف جاتے اس نے اس لڑکی کو دیکھا۔ سرسوں کا پھول کچھ اتنا دلکش بھی نہیں تھا پھر بھی نظر نے لوٹنے میں وقت لیا تھا۔
"ماں جی! دعا کریں اس گناہ کی پوٹ کے ساتھ میں بھی دنیا میں گناہ کا بوجھ کم کر جاؤں۔ ہم دونوں کی گندگی آپ کب تک اور کہاں تک سمیٹیں گی؟ کب تک دنیا سے منہ چھپا کر پھریں گی۔ میری زندگی کی نہیں موت کی دعا کریں۔"
چلتے ہوئے اس کے کان میں اس کی آواز پڑی اور وہ وہیں رک گیا۔ وہ کیا بات کر رہی تھی؟ ماں کی خواہش تو بہت بعد میں ذہن میں آئی تھی لیکن دل......
دل نے اس کی سنی ہی نہیں۔ زندگی میں اکیلے پن کا احساس یک لخت نہیں جاگا تھا۔ ایک عرصے سے اب گھر کی خواہش دل پر دستک دے رہی تھی۔ وہ وہیں سے واپس ہوا اور اس کی فائل تک رسائی حاصل کر ہی لی۔ اس کا نام اس کا گھر اور پھر اس گھر کے پتے سے آس پاس کے لوگوں سے اس نے معلومات بھی اکٹھی کر لی تھیں۔ اس نے رشتہ بھیجا۔ ماں باپ بہن بھائی تھے نہیں اور آج کے دور میں بہت سے لوگوں کے لیے یہ رشتے کا پلس پوائنٹ سمجھا جاتا ہے اور پھر مریم کے حالات ایسے تھے کہ یہ رشتہ جیسے آسمان والے نے ہاتھ سے گھڑ کر بھیجا تھا۔ رشتے کا جواب اقرار کے علاوہ کیا ہو سکتا تھا۔ چاہے جھوٹ کی آمیزش کے ساتھ ہی سہی پر وہ اس کی زندگی میں آ رہی تھی۔
اس نے کچھ ظاہر نہیں کیا تھا اور پھر وہ اس کے روبرو ہر بات کھول گئی تھی۔ اس نے اسے اپنا لیا اور زندگی ایک سیدھی سڑک پر رواں دواں ہو گئی۔ ایک طوائف زادہ ہونے کی نسبت سے وہ جانتا تھا ناجائز بچہ ہونا کیا ہوتا ہے۔ اس نے سعد کو کبھی اس نظر سے دیکھا ہی نہیں تھا۔ قدرت نے احد اور عبید دیے تو جیسے ہر مراد پوری ہو گئی۔ بظاہر سب ٹھیک تھا لیکن اس کے دل میں ایک کھٹکا تھا۔ اسے لگا تھا مریم کے ساتھ کوئی حادثہ ہوا ہے لیکن جلد ہی اس کے رویے سے اس نے جان لیا تھا کہ یہ حادثہ محبت تھا۔ وہ لاکھ کوشش کرتی مگر اپنی بناوٹی پرواہ کو چھپا نہیں پاتی تھی۔ اسے لگتا تھا کہ اس کا دل اب بھی اسی کے لیے دھڑکتا ہے جو اسے بیچ راستے میں چھوڑ گیا تھا۔ گھر کی کل وقتی ملازمہ کے پاس اس کا دیا ہوا ایک فون تھا جو وہ کسی کے بھی گھر میں آنے پر کال کر کے وہیں رکھ چھوڑتی تھی۔ ہر ہر کال پر اس کا سانس رکتا تھا۔ اسے لگتا تھا وہ اب اسے نیچا دکھائے گی، اب اسے چھوڑ کر راہ جدا کر لے گی مگر آج اس کی باتوں نے اسے جھنجھوڑ ڈالا تھا۔

"کہاں رہ گئے ہیں آپ؟" اس کی کال پر سوچوں کے گرداب سے نکلا تو اس نے گھڑی پر نظر ڈالی۔
"پندرہ بیس منٹ میں آرہا ہوں۔" گھر جانے سے پہلے اس نے ایک گلدستہ خریدا تھا۔
"بچے سو گئے ہیں آپ کا انتظار کرتے۔" اس کے ہاتھ سے بریف کیس پکڑ کر اس نے ایک طرف رکھا اور اس کی طرف پلٹی۔ سعید نے اسے بازو سے پکڑ کر اپنے سامنے کیا۔ سرد موسم میں وہ اس کے لیے زعفران کا پھول بنی ہوئی تھی۔
"کیا میں نے تمہیں کبھی بتایا تم میرے لیے کیا ہو؟" اس کا ہاتھ پکڑے وہ پوچھ رہا تھا۔ مریم نے حیرت سے اس کا چہرہ دیکھا۔ وہ رومینٹک ٹائپ کا بندہ نہیں تھا۔ نہ ہی کبھی کوئی فلمی سین ان کی زندگی میں آیا تھا۔
"میں آپ کی زندگی بھر کی ساتھی ہوں۔ آپ نہ بھی بتائیں تو بھی میں جانتی ہوں۔" اس نے سینے پر سر رکھا۔
"تم میری ماں کی وہ دعا ہو جو وہ رات کے اندھیرے کے دن کے اجالے میں بدلنے کے وقت میرے لیے مانگا کرتی ہوگی۔"
اس نے ٹھنڈے ہونٹ اس کی سرد پیشانی پر رکھے۔ ایک شعلہ تھا جو بھڑکا تھا۔ اس کا دل چاہا تھا وہ اسے بتائے اس نے کیسے خود کو شک کی کسوٹی پر برسوں سولی پہ لٹکائے رکھا۔ لیکن زندگی کے کردار قصے کہانیوں کے کرداروں کی طرح اعلاظرف نہیں ہوتے۔ زندگی کے اس موڑ پر وہ کچھ بھی خراب نہیں کرنا چاہتا تھا۔
"میں جس کے انتظار میں برسوں برہنہ پا صحراؤں میں بھٹکا ہوں تم وہ نخلستان ہو مریم۔ تم میری محبت ہو۔ شدید ترین محبت۔ جیسے نوخیز لڑکے کو کسی لڑکی سے محبت ہوتی ہے۔ جس کے بغیر زندگی بے معنی ہو جائے۔ وہ محبت۔ تم سے دوری میری موت ہے مریم! تم زندگی ہو۔"
وہ خواب ناک لہجے میں بول رہا تھا اور مریم حیرتوں کے سمندر میں غوطہ زن تھی۔ یہ سب اسے سعید نے کہا تھا؟ اسے یقین نہیں آرہا تھا۔ کیسے خوب صورت سحر انگیز الفاظ تھے۔
"اور میری زندگی آپ ہیں۔" وہ اس کی گرفت سے نکلی۔ "کھانا نہیں کھانا کیا؟"
اس کے الفاظ پر آج پہلی بار وہ مسرور ہوا تھا۔
"آج کھانا کھانے باہر چلیں؟"
"آج آپ ٹھیک تو ہیں؟" اس نے مصنوعی فکرمندی سے اس کا ماتھا چھوا۔ وہ باہر نہیں جاتی تھی، وہ جانتا تھا۔
"بالکل ٹھیک۔" اس نے جواب دیا۔ "آج ہی تو ٹھیک ہوا ہوں۔" اس نے سوچا۔
"بچوں کو جگا لو، میں بس کپڑے بدل لوں۔ میری سالگرہ ہے اور میں پہلی بار اپنے انداز سے منانا چاہتا ہوں۔ ہم سب باہر جا رہے ہیں۔"
"میں بھی کپڑے بدل......"
"سوچنا بھی مت۔ یہ سجا سنورا روپ میرے لیے ہے، ابھی مجھے جی بھر کر اسے دیکھنے تو دو۔" اس کے ہونٹوں پر انگلی رکھ کر بات کاٹتے اس نے کہا اور کپڑے لے کر غسل خانے کی طرف چلا گیا۔ مریم اس کی وارفتگی پر حیران ہوتی باہر نکل گئی۔

☆☆☆

اس کی زندگی میں جو کمی تھی وہ ہمیشہ رہنی تھی۔ اس درد کا مداوا کچھ نہیں ہو سکتا تھا اس کے باوجود گھر کی ویرانی دیکھ کر اس نے مہر کو فون کر دیا تھا۔ وہ جانتا تھا کہ تھوڑی دیر میں وہ اس کے پاس ہوگی۔ وہ اس کی اتنی پروا کرتی تھی، لیکن وہ مریم نہیں تھی۔ سرد بالکنی میں کھڑے اس نے لہو گرماتا منظر دیکھا۔ شور مچاتے بچوں کے ساتھ وہ باہر نکل رہے تھے۔
نعمان نے زندگی سے بھرپور یہ منظر دیکھا اور پیچھے ہٹ گیا۔ اب کی بار سرد موسم زندگی کے کینوس پر منجمد ہو گیا تھا اور بہاروں نے کسی در پر ہمیشہ کے لیے ڈیرہ ڈال لیا تھا۔

شب آرزو میں جو سو گیا برا ہوا میرے دوستو!
میری طلب تھا جو ایک شخص کسی اور شخص کا ہو گیا

☆

نورین ناز زہرا

آئی گا صاحب

''پتا نہیں کون بے وقوف اتوار کی چھٹی پر خوش ہوتا ہے، میرا کام تو اتوار کے دن عام دنوں سے بھی زیادہ ہوتا ہے۔''

دودھ ابالنے کے لیے چولہے پر رکھتے ہوئے مسلسل شگفتہ کی بڑبڑاہٹ جاری تھی۔

''شکر ہے بچے ٹی وی کے آگے بیٹھے ہوئے ہیں۔'' کچن کے سامنے ٹی وی لاؤنج کی طرف دیکھتے ہوئے اس نے دل ہی دل میں سکون کا سانس لیا۔

''امی! نیند آرہی ہے۔'' چھوٹا شہریار آنکھیں مسلتا کچن کے دروازے میں آکھڑا ہوا راتوں کو ویسے ہی سردی بہت بڑھ جاتی تھی اس لیے شیری کو واش روم سے فارغ کر کے وہ بستر میں بٹھا کر آئی تھی۔

''بیٹا سونا نہیں! بس میں ابھی دودھ لائی۔'' وہ الٹے قدموں سے کچن میں لوٹ آئی، تھوڑا سا دودھ برتن

میں نکال کر پرات میں ٹھنڈا پانی ڈال کر شیری کے لیے دودھ ٹھنڈا کیا۔ اس سارے عمل میں اپنی نیند سے جلتی آنکھوں اور تھکن سے ماؤف ذہن کو کئی دفعہ جھٹکا۔

شیری کو دودھ دے کر وہ برتن دھونے لگی تھی کہ کچھ دیر بعد ہی پھر شیری اسے آوازیں دینے لگا۔

''کیا ہوا؟''

''مما! دودھ میٹھا نہیں ہے، مجھے چینی اور ڈال دیں۔''

''چینی ڈالی ہے اس میں جلدی پیو تم!'' اس نے بچے کو گھورا۔

''کیا ہو گیا ہے یار! تھوڑی اور چینی لے آؤ ڈال کر، کیا ختم ہو گئی ہے گھر میں؟ کبھی تو بحث نہ کیا کرو۔'' اس کے شوہر نے خبروں کا چینل لگاتے ہوئے بےزاری سے کہا۔

''ویسے ہی یہ مشکل سے دودھ پیتا ہے تم اس کا بہانہ ختم کر دو۔''

وہ سوجے منہ سے دوبارہ چینی مکس کر رہی تھی فوراً میاں جی کی تسلی بھری آواز آئی، وہ بے شک کام میں ہاتھ نہیں بٹاتا تھا۔ لیکن یہ بھی طے تھا کہ وہ شگفتہ کو پریشان یا دکھی بھی نہیں دیکھ سکتا تھا۔ دونوں بچیوں نے اپنا اسکول بیگ تیار کر کے رکھا تو انہیں بھی دودھ دے کر سونے لٹایا۔

''مما! مجھے ان کپڑوں میں نیند نہیں آرہی کوئی اور کپڑے دیں۔''

اچانک چھوٹی بیٹی اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے اس کے موٹے کپڑے تبدیل کروا کر کھلے سے لباس میں سونے لٹایا۔

اب پھر وہ کچن میں تھی۔ برتن دھوتے ہوئے اس کے ذہن میں کافی عرصہ پہلے پڑھا ہوا منٹو کا افسانہ چکرا رہا تھا جس کا نام تھا ''آیا صاحب۔'' جس میں ایک دس گیارہ سالہ بچہ ایک پولیس افسر کے گھر نوکر ہوتا ہے، وہ معصوم کاموں سے بہت تنگ ہوتا ہے۔ بچپن کی معصوم نیند کے ظلم سے تنگ آ کر بوٹ پالش کرتے ہوئے زمین پر ہی سو جاتا پھر ایک دفعہ اس کی انگلی اپنے صاحب کے بلیڈ سے زخمی ہو جاتی ہے۔

زخم کے مندمل ہونے تک اسے کچھ دن آرام مل جاتا ہے پھر تو وہ ہر دو تین، ہفتے بعد یہ معمول بنا لیتا ہے۔ جان بوجھ کر خود کو چوٹ پہنچا کر کچھ دن آرام کے گزار لیتا ہے۔ ماں باپ کی ڈانٹ پھٹکار کی فکر نہیں رہتی کہ ایسے غریب جن کی اولاد بھی زیادہ ہو وہ اولاد کا سکھ نہیں اولاد کی اجرت اور ''دہاڑی'' دیکھتے ہیں۔ آخر کار ایک دفعہ اسے کچھ زیادہ گہرا زخم لگ جاتا ہے اور برسات کا موسم ہونے کی وجہ سے اس کا زخم ناسور میں بدل جاتا ہے۔ ایک سرکاری اسپتال میں تمام ڈاکٹر اس بات پر متفق ہوتے ہیں کہ اس کا ہاتھ کاٹ دیا جائے، اس غریب کی آیا صاحب والی کہانی ختم ہو جاتی ہے۔''

☆☆☆

''شگفتہ یار!'' میاں کی آواز وہ خیالوں کے سمندر سے ابھری۔ برتن دھل گئے تھے اس نے دل میں شکر ادا کیا۔

''یار! وہ گاجر کا حلوہ ختم ہو گیا کیا؟''

''نہیں، ہے ابھی فریج میں۔'' پرسوں گاجر کا حلوہ بنایا تھا جو بچ گیا وہ فریز کر کے رکھ دیا تھا کہ پھر میاں یا بچوں کو گرم کر کے دے دے گی خود تو اسے میٹھے کا شوق کم ہی تھا۔ ''یار گرم تو کر دو۔ کھانا جلدی کھا لیا ہے تو بھوک لگ گئی ہے۔''

پتھر بنے حلوے کو گرم کرتے ہوئے شگفتہ سوچنے لگی کہ کاش وہ بھی منٹو کے افسانے والے بچے کی طرح خود کو کوئی چوٹ پہنچا کر چار دن آرام ہی کر لے، کم از کم یہ آئی صاحب، آئی صاحب، والی روٹین تو کچھ دنوں کے لیے ختم ہو۔

خبریں ختم ہو گئی تھیں اب میاں جی نے کوئی میوزک چینل لگا لیا تھا جس پر وہی دشمن جان گانا پورے زور و شور سے چل رہا تھا وہ بے اختیار ہنس پڑی۔

''خون چوسنے آیا۔''

"خون چوسنے بلڈی منڈے او آیا خون چوسنے۔"

حلوے کی پلیٹ لے کر وہ کمرے کی طرف بڑھی کہ اب سوجانا چاہیے کیونکہ کل بلڈی منڈے تھا۔

☆☆☆

بتیس سالہ شگفتہ اپنے نام کی طرح شگفتہ تھی۔ نہایت حسین اور اتنی ہی ذہین، اس کے والد ایک درمیانے درجے کے زمیندار تھے۔ چار بہنوں میں وہ سب سے چھوٹی تھی اور دو بھائی اس سے چھوٹے تھے بڑی بہنیں تو پرائمری پاس کر کے گھر بیٹھ گئیں اور مناسب وقت پر باری باری ان کی اپنے خاندان میں شادیاں بھی ہوتی گئیں۔ لیکن شگفتہ نے پانچویں کے بورڈ کے امتحانات (صوبہ پنجاب میں پانچویں کے بھی بورڈ کے امتحان ہوتے ہیں) اپنے ضلع میں پہلی پوزیشن لی تو دل میں ٹھان لیا کہ بہت زیادہ پڑھے گی اور ٹیچر بن کر اپنی قوم کی خدمت کرے گی۔ میٹرک تک تعلیم اپنے گاؤں میں حاصل کی، باقی تعلیمی سلسلہ اپنے ماموں کے گھر راولپنڈی میں رہ کر جاری رکھا جو فوج میں بحیثیت صوبیدار تعینات تھے۔

وہ تعلیمی میدان میں جھنڈے گاڑتی رہی اور جب بی ایس سی بی ایڈ کر کے اپنے گاؤں پہنچی اور گورنمنٹ جاب کے لیے اپلائی کیا تو اسے محض چار ماہ کے عرصے میں پرائمری گورنمنٹ اسکول میں نوکری مل گئی۔ ابھی اسے نوکری پر لگے چھ ماہ بھی نہ ہوئے تھے۔ اس کی خالہ محترمہ اس کی شادی کی تاریخ بھی لینے آن پہنچیں۔

شگفتہ کی میٹرک کے بعد اپنے ایف اے پاس کزن جو اس کی سگی خالہ کا بیٹا تھا سے منگنی ہوگئی تھی جس میں شگفتہ کی بھی رضامندی شامل تھی۔ وہ ایک سمجھدار اور باشعور لڑکی تھی۔ جانتی تھی کہ بہترین تعلیم کا مقصد پسند کی شادی اور خاندان کے اصولوں کے خلاف چلنا نہیں ہے ورنہ اس کے گاؤں، برادری کا کوئی بھی شخص اپنی بیٹی کو اعلیٰ تعلیم نہ دلواتا۔ وہ جانتی تھی کہ وہ لوگ برادری اور خاندان سے باہر رشتہ نہیں کرتے۔ یوں اس رشتے میں

اس کی سو فیصد رضا مندی شامل تھی اور ہوتی بھی کیوں ناں برادری ہی نہیں۔

بلکہ پورے گاؤں میں اس کے خالہ زاد رضا جیسا کوئی نہیں تھا۔ نکلتا ہوا قد مناسب جسامت، بڑی بڑی بھوری آنکھیں، گھنے بال۔ اتنا ہی عادات میں بھی یکتا جب صورت و گفتار ایسی ہو تو کوئی کیسے رشتے کو انکار کرتا سو دونوں کی شادی ہو گئی۔

☆☆☆

جس نے دیکھا اس چاند سورج کی جوڑی کو سراہا کچھ دن تو بڑے امن و سکون سے گزرے۔ ایک ماہ کی چھٹی پر لگا کر آ گئی پھر روٹین لائف شروع ہو گئی رضا کی مین بازار میں کاسمیٹکس کی دکان تھی جو بس گزارے لائق ہی چلتی تھی۔ شگفتہ کو اسکول سے واپس آ کر زیادہ کام کی عادت نہیں تھی لیکن یہاں پر کرنا پڑتا۔ ماں باپ کے گھر میں چھوٹی بہن ہونے اور پڑھی لکھی ہونے کی وجہ سے بہت اہمیت دی جاتی مگر یہاں ایسا کچھ نہ تھا۔ ساس کا رویہ تو اس کے ساتھ بہتر تھا مگر جٹھانیاں بالکل بھی لحاظ نہ کرتیں اگر کبھی وہ کوئی بات بھی کر دیتی تو رضا کی دونوں بھابھیاں طنز کرنا شروع کر دیتیں۔ "کہ تم کون سا دیہاڑیاں کر کے، تگاریاں اٹھا کر آئی ہو، کرسی پر بیٹھ کر پڑھانا کون سا مشکل کام ہے۔"

وہ دوپہر کو جب کمرے میں آرام کرنے کی غرض سے آتی تو وہ دونوں اپنے جھگڑالو اور بدتمیز بچوں کو اس کے پاس چھوڑ جاتیں کہ انہیں تو پڑھا دو، کم از کم تمہاری تعلیم کا ہمیں بھی کوئی فائدہ تو ہو اور خود جا کر سو جاتیں۔

رضا اپنے بہن بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا دو بھائی اور دو بہنیں اس سے بڑی تھیں اور شادی شدہ تھے۔ مسئلے جب زیادہ بڑھنے لگے تو ساس نے پاس بٹھا کر پیار سے سمجھایا کہ بیٹا یہاں ایک کمرے میں اسی طرح گزارا ہو گا سکون اور آرام تمہیں نہیں مل سکے گا۔ اگر اپنی زندگی میں سکھ چاہتی ہو تو اپنا علیحدہ گھر بنا لو تم تو پڑھی لکھی ہو اپنا کماتی ہو تمہارے لیے کون سا مشکل کام ہے یہ!"

وہ سیدھی سادی ان پڑھ دیہاتی عورت کیا جانیں کہ ایک پرائمری ٹیچر کی اتنی بھی زیادہ تنخواہ نہیں ہوتی اور پھر جس کے میاں کا کاروبار بھی اتنا خاص نہ ہو اس کے لیے گھر بنانا بہت مشکل کام ہے۔ جو بھی تھا لیکن وہ اس کے لیے نئی سوچ کا در وا کر گئیں۔ یوں شگفتہ نے اپنی تنخواہ سے کمیٹیاں ڈالیں اور کچھ اس کے میاں نے پیسوں کا انتظام کیا اس طرح وہ پلاٹ لینے میں کامیاب ہو گئے۔ کمیٹیوں کی مد میں رقم خرچ کرنے کے بعد اس کے پاس بمشکل چند ہزار ہی بچتے چھوٹی بچی کا ساتھ بھی تھا۔ جب اس کے گھر دوسری بچی کی پیدائش ہوئی مکان کا ڈھانچہ کھڑا ہو چکا تھا۔ بیٹے کی پیدائش اس کے اپنے گھر میں ہوئی لیکن جب تک اس کی تنخواہ تین حصوں میں بٹ چکی تھی۔ قرضہ، کمیٹیاں، گھریلو خرچہ۔

اس پر مستزاد کہ ایک سال اس نے پانچویں کی بورڈ کی کلاس کو پڑھایا تو اس سال اس کے اسکول کا پانچویں کا شاندار رزلٹ آیا پھر تو ہیڈ مسٹریس نے یہ فیصلہ کیا کہ پانچویں کلاس کو شگفتہ کے سوا کوئی نہیں پڑھائے گا۔ اس سلسلے میں امتحانات کے آخری تین مہینوں میں اسے اپنی کلاس کے بچوں کو گھریلو ٹیوشن بھی دینی پڑتی۔ اس وجہ سے وہ گھن چکر بن کر رہ گئی اور اس کی اتنی گنجائش نہ تھی کہ کوئی کام والی ہی رکھ لیتی۔

بیٹیوں کو اتنا سکھایا ہوا تھا کہ وہ کوئی پھیلاوا نہ کرتیں بلکہ جہاں تک ہو سکتا ماں کے ساتھ ہاتھ بٹا دیتیں جبکہ رضا ان مردوں میں تھا جو گھر کے کاموں میں بیوی کا ہاتھ کبھی نہیں بٹاتے کیونکہ ان کی ماؤں نے انہیں یہ کام سکھائے ہی نہیں ہوتے اس لیے اگر کبھی وہ گھریلو کاموں میں اس کی مدد کرنے کی کوشش بھی کرتا تو کام غلط ہی ہو جاتا۔ ویسے تو وہ کام سے جان نہ چھڑاتی بس کبھی کبھی خود ترسی کا شکار ہو جاتی اور اپنے اس آئی صاحب والی روٹین کی وجہ سے دل میں سوچتی کہ اسے بھی چوٹ لگ جائے اور وہ کچھ دن آرام کر لے۔

☆☆☆

زوردار چھناکے کی آواز سے اس کا غنودگی میں

ڈوبتا ذہن ایک جھٹکے سے جاگ اٹھا۔ درد کی ایک لہر دائیں بازو میں اٹھی۔ وہ ہڑبڑا کر بستر پر بیٹھ گئی۔ آواز کی سمت دیکھا تو دل دھک سے رہ گیا شیشے کا گلاس فرش پر ٹوٹا پڑا تھا۔ شیری ننگے پیر فرش پر گھوم رہا تھا۔

"علیشا علیشا!" بیٹی کو آوازیں دیتے ہوئے غصہ بے بسی میں ڈھل گیا۔ اس کا کل اسکول سے واپس آتے ہوئے ایکسیڈنٹ ہو گیا تھا۔ اس کا اسکول والا رکشہ دوسرے مخالف رکشے سے ٹکرا گیا تھا جس میں اس کے علاوہ اس کے اسکول کی اور چار ٹیچرز بھی تھیں۔ شکر ہے جان تو بچ گئی تھی لیکن سب ٹیچرز کو کوئی نہ کوئی چوٹ لگی تھی۔ خود اس کے بازو کی ہڈی بھی فریکچر ہو گئی تھی۔ اس لیے رضا نے فون کر کے اپنی بڑی بہن زاہدہ کو بلا لیا تھا۔ شگفتہ کی اپنی بہنیں نہیں آسکتی تھیں، بڑی بہن دو سال پہلے سعودیہ چلی گئی تھیں۔ ایک بہن اپنے شوہر کے ساتھ ملتان میں رہتی تھیں جبکہ تیسرے نمبر کی بہن کا پچھلے ہفتے اپنڈکس کا آپریشن ہوا تھا۔ ساس خاصی ضعیف ہو گئی تھیں اور والدہ کا پچھلے سال انتقال ہو گیا تھا۔

☆☆☆

سو اب زاہدہ باجی اپنے بچوں کو ساتھ لے کر آئی ہوئی تھیں۔ بچوں کے پیپرز کے بعد اسکول کی چھٹیاں ہو گئی تھیں۔ علیشا شیری کا ہاتھ پکڑ کے باہر لے گئی تھی۔

"کیا ہوا، سوئیں نہیں تم۔" زاہدہ باجی جھاڑو لے کر آگئی تھیں۔

"نہیں باجی! ابھی آنکھ لگی تھی کہ۔ آپ کے نومی نے گلاس توڑ دیا میری آنکھ کھل گئی۔" لہجے میں شکوے کا رنگ نمایاں تھا۔

"ہاں یہ دونوں بھائی جوس کے لیے لڑ رہے تھے اور جوس بس ہی ایک گلاس تھا اس لیے دانش سے چھینتے ہوئے نومی نے گلاس توڑ دیا۔" انہوں نے اپنے بچوں کا کارنامہ بڑے فخر سے بتایا۔

"لو اب فرش صاف ہو گیا تھا تم سو جاؤ میں کچن دیکھ لوں۔"

"کچن؟ باجی! رات کے کھانے میں تو بہت وقت ہے ابھی۔"

"ہاں وقت تو ہے لیکن عابدہ نے فون کر کے کہا ہے کہ اس کے بچوں کے پیپر ہو گئے ہیں وہ بھی بچوں کو لے کر رہنے کے لیے آرہی ہے۔"

"کیوں؟" بے ساختہ اس کے منہ سے نکل گیا۔

"ارے کیوں کا کیا سوال؟"

"اپنے بھائی کے گھر آرہی ہے تمہاری عیادت کرنے۔ کچھ دن رہنے کے لیے، پہلے تو ہم دونوں اگر کبھی یہاں آئیں تو ایک دو دن تک واپس چلی جاتیں کہ تم اسکول جاؤ گی ہم خالی گھر میں کیا کریں گی؟ اور چھٹیوں میں تم بھی لاہور چلی جاتیں، کبھی فیصل آباد، اپنے بہن بھائیوں کے پاس۔"

انہوں نے شگفتہ کو شرمندہ کر دیا۔ واقعی وہ چھٹیوں میں زیادہ تر کہیں نہ کہیں چلی جاتی (اس کا بھائی لاہور میں سرکاری ملازم تھا) بہن ایک ملتان میں، ایک فیصل آباد میں تھی۔

☆☆☆

کچن سے اٹھتی خوشبوئیں کمرے تک آرہی تھیں۔ ساتھ والے کمرے سے باجی کے بچوں کے لڑنے کی آوازیں آرہی تھیں وہ کسی ٹی وی چینل کو لگانے کی وجہ سے لڑ رہے تھے۔ زاہدہ باجی کے چاروں بیٹے بہت جھگڑالو تھے۔ ابھی عابدہ اپنے دو بچوں سمیت آنے والی تھیں۔ وہ دو بھی بیس کے برابر تھے۔ اس نے ٹھنڈا سانس بھر کے تکیے پر سر رکھا اور اس وقت کو کوسنے لگی جب اس نے خواہش کی تھی کہ کاش اسے کوئی چوٹ لگ جائے اور وہ آرام کرلے۔ وہی روٹین ٹھیک تھی جب کام کرتی تھی اور کہتی تھی آئی صاحب، آئی صاحب۔

حمیرا شفیع

احساس

نماز جمعہ کی ادائیگی کے بعد جونہی شہاب صاحب گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو اچانک اندرونی حصے سے اسٹیل کی کٹوری کسی میزائل کی مانند اڑتی ہوئی آئی اور سامنے دیوار سے ٹکرا کر سالن سمیت زمین بوس ہوگئی۔ اس کے ساتھ ہی محترم صاحب زادے کی گرجدار آواز بھی سنائی دی۔

''اتنا بدمزہ سالن...... کھانے کے لائق ہے کیا......؟؟''

وہ کچھ دیر تک صدماتی کیفیت میں فرش پر یہاں سے وہاں تک بہتے سالن کو دیکھتے رہے۔ چھینٹوں کی زد میں آ کر ان کا سفید براق شلوار سوٹ بھی داغ دار ہو چکا تھا۔ رزق کی اس قدر بے حرمتی پر ان کا خون کھول اٹھا اور وہ تن فن کرتے ہوئے سیدھے باورچی خانے میں ان دونوں کے سر پر جا پہنچے۔

''یہ کیا بے ہودگی ہے برخوردار ......؟؟''

انہوں نے کڑک دار آواز میں پوچھا۔ بہو چولہے کے پاس سر نیہوڑے کھڑی تھی اور وہ اسے خشمگیں نظروں سے گھورتے ہوئے مزید برسنے ہی والا تھا کہ اچانک باپ کو دیکھ کر تھوڑا سا سٹ پٹایا۔ مگر بدستور نروٹھے لہجے میں بولا۔

''ابا جان! اتنی محنت سے چھانٹ کر پہاڑی بکرے کا گوشت لے کر آیا تھا محترمہ نے اتنا خراب سالن بنایا ہے۔ دیکھیں ذرا......!!''

اس کے ساتھ ہی اس نے پتیلے کا ڈھکن ہٹایا۔ انہوں نے سرسری سی نظر ڈالی۔ شوربے کا رنگ کچھ سیاہی مائل سا تھا۔ اور اس کے اوپر انچ دو انچ تیرتی چکنائی کی تہ سے پتا چل رہا تھا کہ گھی کا بھی کافی کھلے ہاتھ سے استعمال ہوا ہے۔

''چلو خیر ہے...... ہوجاتا ہے کبھی کبھار ایسے...... اگر سالن اچھا نہیں بنا تو اس میں اتنا ہنگامہ برپا کرنے کی کیا ضرورت ہے۔ کچھ اور بنوا کر کھا لیتے۔ تمہیں معلوم ہے کہ ساری دنیا اس وقت کس قدر غذائی بحران کا شکار ہے اور تم ہو کہ رزق کو دھکے دے رہے ہو۔

خبردار! آئندہ یہ بدتمیزی نہیں چلے گی۔ تہذیب کے دائرے میں رہا کرو۔'' انہوں نے شہادت کی انگلی اٹھا کر اسے وارننگ دی اور پھر وہاں سے نکل کر لمبے لمبے ڈگ بھرتے ہوئے اپنے کمرے کی جانب چل

دیے۔

☆☆☆

جاتی گرمیوں کی خوش گوار سی شام تھی۔ وہ تینوں بہنیں گھر کے پچھواڑے کرکٹ کھیل رہی تھیں۔ اماں پڑوس میں گئی تھیں اور ابا مسجد، بھائی شاید کسی دوست کی طرف، اسی لیے راوی چین ہی چین لکھ رہا تھا۔

ماہین بولنگ کر رہی تھی اور سبین اپنی بیٹنگ کے شان دار جوہر دکھا رہی تھی۔ ان دونوں سے چھوٹی فرحین پیچھے کھڑی اچھل اچھل کر بال کیچ کرنے کی ناکام کوشش کر رہی تھی۔ تنگ آ کر وہ سبین کے سر ہو گئی

"بیٹ دو مجھے۔ میں نے بھی بیٹنگ کرنی ہے......"

کچھ پس و پیش کے بعد سبین نے بیٹ اس کے حوالے کیا اور خود جا کر پاس پڑی کرسی پر بیٹھ گئی اور ان دونوں کو کھیلتا ہوا دیکھنے لگی۔

ماہین کی بال پر فرحین نے پورے جوش خروش سے زوردار شاٹ مارا۔ بال اڑتی ہوئی دیوار پار دور کہیں جا گری۔

"اف بدتمیز...... یہ کیا کیا......؟ بڑی آئی شاہد آفریدی کی جانشین نا ہو تو۔" ماہین جھنجلا کر اسے لتاڑنے لگی۔

"میرا خیال ہے کہ بال شاید شاہ صاحب کی چھت یا پھر صحن میں جا کر گری ہے۔" سبین نے بیٹھے ہوئے منہ اوپر کی طرف کر کے قیاس آرائی کی۔

"ہائے اللہ......! شاہ صاحب کی تو بیگم بہت سٹریل سی ہیں۔ کبھی بھی بال واپس نہیں کریں گی۔" فرحین نے دہل کر کہا۔

"بھیا کی بال ہے۔ انہوں نے تو ہم تینوں کے ٹکڑے ٹکڑے کر دینے ہیں۔" ماہین نے دونوں سے کہا۔

"ہائے اب کیا کریں؟؟" تینوں فکر مند تھیں۔

"ایسا کرتے ہیں، تینوں مل کر بال لینے جاتے ہیں۔ ہوسکتا ہے ترس کھا کر واپس کر دیں۔" فرحین نے تجویز پیش کی اور ساتھ ہی اپنے سینڈل پہننے لگی۔

ماہین الگنی پر لٹکتا اپنا دوپٹہ اتار رہی تھی کہ اچانک اسے سبین کی گھٹی گھٹی سی چیخ سنائی دی۔ اس نے کرنٹ کھا کر پلٹ کر دیکھا تو اس کا اوپر کا سانس اوپر اور نیچے کا نیچے رہ گیا۔

"بھ بھ بھیا......" وہ سیدھا انہیں کی طرف آ رہا تھا۔ اور چہرے کے غضب ناک تاثرات بتا رہے تھے کہ وہ ان کی آدھی پونی گفتگو بھی سن چکا ہے۔ گیٹ کھلنے کی تو آواز ہی نہیں آئی تھی۔ غالباً ڈرائنگ روم کے راستے سے آیا تھا جس کی چابی ہمہ وقت اس کی جیب میں موجود ہوتی تھی۔

وہ پہلے بھی کئی بار ان تینوں کو گھر کے پچھلے صحن میں جانے سے منع کر چکا تھا۔ آج تو وہ رنگے ہاتھوں پکڑی گئی تھیں وہ بھی کرکٹ کھیلتے ہوئے اسی کے بیٹ بال کے ساتھ تو شامت یقینی تھی۔ حالات کی سنگینی کا اندازہ ہوتے ہی فرحین اور سبین تو بھاگتی ہوئی واش روم میں گھس گئیں اور اندر سے کنڈی چڑھا لی۔

ماہین کا سکتہ ٹوٹا تو اس نے بھی راہ فرار اختیار کرنے کی کوشش کی۔ اس کا رخ اوپر جاتی سیڑھیوں کی جانب تھا۔ مگر وائے قسمت ابھی قدم پہلی سیڑھی پر ہی پڑا تھا کہ وہ بالکل اس کے سر پر پہنچ گیا اور اس کی سنہری لمبی سی چٹیا اس کے ہاتھوں میں آ گئی۔

☆☆☆

بیٹے کو سرزنش کرنے کے بعد جب وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئے تو دیکھا کہ زوجہ محترمہ اپنے پلنگ پر براجمان نہایت سکون سے اپنے جدید موبائل پر اپنے ایک نواسے کی ویڈیو ملاحظہ فرما رہی تھیں۔

"ہیں...... تم گھر میں موجود ہو......؟" وہ اچنبھے سے کہنے لگے۔

"میں تو سمجھا تھا کہ کہیں دورے پر نکلی ہوئی ہو۔ وہ تمہارا لاڈلا سپوت اپنی بیوی پر اپنی بری طرح سے چلا رہا تھا۔ تمہیں سنائی نہیں دے رہا تھا۔ منع نہیں کر سکتی تھیں......!!"

زوجہ محترمہ نے بدقت اپنی نظریں موبائل سے ہٹائیں اور خفگی سے بولیں۔

"ٹھیک ہی تو کہہ رہا تھا بچہ، آلو گوشت کا سادہ سا سالن بھی نہ بنا سکیں بہو رانی، میرے تو اپنے حلق میں دو نوالے نہ اتر سکے۔ وہ تو اللہ بھلا کرے آپا سلیمہ کا۔ انہوں نے کٹوری بھر کھیر بھجوائی تھی وہی کھا کر پیٹ بھر لیا ہے۔"

"تو تم خود پکا لیا کرو ہنڈیا۔"

"میرے گھٹنوں میں اب اتنا دم خم نہیں رہا کہ کھڑے ہو کر کھانا بناؤں۔" ان کی تجویز پر وہ بھڑک اٹھیں۔

"تو چلو ایک چولہا نیچے بھی فٹ کروا دیتے ہیں۔ بیٹھ کر پکا لیا کرنا۔" انہوں نے مزید گل افشانی کی تو وہ اور زیادہ ناراض ہو گئیں۔

"بڑے افسوس کی بات ہے۔ بجائے بہو کی اصلاح کرنے کے آپ مجھ بڈھی کو کام کرنے کا مشورہ دے رہی ہیں۔"

"حیرت کی بات ہے۔ آج آپ خود ہی اپنے آپ کو بوڑھا کہہ رہی ہیں۔ ویسے تو اگر کوئی راہ چلتا ہوا بھی آپ کو "اماں جی" کہہ دے تو آپ بہت چیں بہ چیں ہوتی ہیں اب کام کرنے کے واسطے بوڑھی بن گئیں۔" وہ انہیں مزید سلگاتے ہوئے بولے۔

"اچھا تو آپ مجھے کام چور کہہ رہے ہیں۔ ساری عمر میں نے ہی آپ کو پکا کر کھلایا ہے۔ اب تو یہ بہو بیٹیوں کے کام کرنے کے دن ہیں۔ بیٹیاں تو اپنے گھر کی ہو گئی ہیں۔ اس لیے بہو کا ہی فرض بنتا ہے کہ وہ چولہا چوکی سنبھالے۔" وہ بھی ہار ماننے پر تیار نہ تھیں۔

"بہرحال میں کچھ نہیں جانتا۔ یا تو کھانا تم خود بنایا کرو یا پھر بیٹے کو سمجھاؤ کہ جیسا بھی بہو بنائے چپ چاپ کھا لیا کرے۔ میں گھر میں کوئی تماشا برداشت نہیں کر سکتا۔" انہوں نے دوٹوک انداز میں بحث سمیٹی اور برابر والے پلنگ پر نیم دراز ہو گئے اور وہ بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ اپنے موبائل کی طرف متوجہ ہو گئیں۔

☆☆☆

اس دن بھائی کے ہاتھوں ماہین کی خوب درگت بنی۔ اماں جب پڑوس سے واپس آئیں تو وہ برآمدے میں بیٹھی چھکوں پھکوں رو رہی تھی۔ فرحین اور سبین اس کے آس پاس بیٹھی تھیں۔

"ارے کیا ہوا ہے......؟؟ کیوں رو رہی ہے یہ......؟؟" انہوں نے چادر اتارتے ہوئے ان دونوں سے پوچھا۔

"اماں! بھیا نے مارا ہے......!!" فرحین کھٹ سے بولی۔

"ہیں...... وہ کیوں بھئی...... کیوں مارا ہے بھائی نے؟"

"اماں ہم ان کے بیٹ بال سے کرکٹ کھیل رہے تھے کہ بال گم ہو گئی۔" سبین نے دھیرے سے فرد جرم سنائی۔

"ہاں تو پھر غلطی تم لوگوں کی ہی ہوئی نا...... کیوں کھیل رہی تھیں کرکٹ بھلا یہ بھی کوئی لڑکیوں کے کھیلنے کا کھیل ہے۔ ہزار بار سمجھایا ہے کہ اب بڑی ہو رہی ہو۔ گھر کے کام دھندے سیکھا کرو۔" وہ انہیں ڈپٹے ہوئے بولیں۔

رات کو جب ابا گھر آئے تو ان تینوں نے (جو کہ اماں کے رویے سے بہت مایوس ہوئی تھیں) بھائی کی شکایت ان سے جڑ دی۔

"ابا جان! بھیا ہمیں مارتے ہے۔"

"ارے کیوں مارتا ہے وہ بہنوں کو...... بلاؤ ذرا اس نانہجار کو ہم ابھی پوچھتے ہیں۔" ابا سخت برہم ہوئے۔

مگر اس سے پہلے ہی نانہجار کی والدہ میدان میں آ گئیں۔ "ان کا بھی تو قصور ہے۔ ہزار بار کہا ہے کہ اس کی چیزوں کو نہ چھیڑا کرو۔ بچہ اپنی

چیزوں کے بارے میں بہت حساس ہے۔"

"چیزوں سے زیادہ حساس اسے اپنی بہنوں کے بارے میں ہونا چاہیے۔ یہ تو ہمارے آنگن کی پیاری پیاری سی چڑیائیں ہیں۔ اڑ جائیں گی کسی دن ایک ایک کر کے۔" ابا بچیوں کو محبت بھری نظروں سے دیکھتے ہوئے بولے مگر لہجہ فکرمندی سے لبریز تھا۔

☆☆☆

شاہ جہاں' شہاب صاحب اور صادقہ بیگم کا پہلوٹی کا فرزند تھا۔ جو ماں باپ کے ساتھ ساتھ دو دادیوں کا بھی راج دلارا اور آنکھوں کا تارا تھا۔ شہاب صاحب کے والد مرحوم نے دو شادیاں کی تھیں۔ پہلی بیوی سے اولاد نہ ہونے کی وجہ سے دوسری کرنی پڑی تھی۔ اور دوسری بیوی کے بطن سے شہاب صاحب اور ان کی دو بہنوں نے جنم لیا تھا۔ شادی کے پورے پانچ سال بعد پیدا ہونے والا شاہ جہاں پانچ سال تک گھر بھر کا اکلوتا بچہ ہونے کی حیثیت سے بلاشرکت غیرے لاڈ پیار کے مزے لوٹتا رہا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے ان کے گھر میں سال سال کے وقفے سے یکے بعد دیگرے تین ننھی منی سی رحمتیں بھیج دیں۔ اور صادقہ بیگم تو بچیوں کو پالنے پوسنے میں اتنی مصروف ہوگئیں کہ شاہجہاں کو کلی طور پر دادیوں کے ہی سپرد کر دیا جو اس پر واری صدقے جاتی نہ تھکتی تھیں۔ یوں تو شہاب صاحب کے والد حیات نہیں تھے مگر دونوں خواتین میں بہرحال سوتن جیسا کڑوا کسیلا رشتہ تو قائم تھا۔ اس لیے فطری طور پر دونوں میں تھوڑی بہت چپقلش اور مقابلہ کی سی فضا تو رہتی تھی جس کے لامحالہ اثرات شاہ جہاں کی تربیت پر بھی پڑتے تھے۔ اگر وہ کسی وقت کوئی بے جا ضد کرتا ایک دادی منع کرتی تو دوسری فوراً گود میں اٹھا کر لے جاتی اور مطلوبہ چیز دلا دیتی۔ چالاک بچہ بھی جان گیا تھا کہ اگر ایک دادی فرمائش پوری نہیں کرے گی تو وہ دوسری کی ٹانگوں سے لپٹ کر نہایت آسانی سے وہی بات منوا لے گا۔

شہاب صاحب تو بچے کے رنگ ڈھنگ دیکھ رہے تھے مگر وہ احتراماً دونوں ماؤں کو ٹوک نہیں سکتے تھے کیونکہ وہ سگی سوتیلی کا فرق روا رکھے بغیر دونوں کی ہی بہت عزت کرتے تھے ہاں البتہ وہ علیحدگی میں بیگم کو ضرور احساس دلاتے۔ "بچہ بہت خود پسند ہوتا جارہا ہے۔ آپ خود بھی اس کی تربیت پر کچھ وقت نکال کر توجہ دیا کریں۔"

مگر وہ کیا کرتیں۔ اوپر تلے کی ایک جیسی تین بچیوں کا ساتھ تھا۔ کبھی ایک بیمار پڑ جاتی اور کبھی دوسری۔ اکثر تینوں کبھی ہی فلو یا بخار میں مبتلا ہوجاتی۔ وہ سمجھتی تو تھیں کہ دونوں دادیاں ایک دوسرے کی ضد میں بچے کو بگاڑ رہی ہیں مگر کر کچھ نہیں سکتی تھیں۔ اگر کبھی وہ فارغ ہو کر اسے اپنے پاس بلاتیں بھی تو وہ ان کو ذرا برابر بھی لفٹ نہ کرواتا اور مسلسل کسی نہ کسی دادی کی گود میں ہی چڑھا رہتا۔

وقت کی جھولی میں ماہ و سال کے سکے گرتے رہے۔ بچے بڑے ہوگئے۔ دونوں دادیاں بھی مختصر علالت کے بعد باری باری اپنے ابدی سفر پر روانہ ہوگئیں۔

شاہجہاں کئی روز تک مضطرب اور نڈھال سا پھرتا رہا۔ صادقہ بیگم کی آغوش بھی اب فارغ تھی۔ انہوں نے بکھرے بکھرے سے بیٹے کو سمیٹ لینا چاہا مگر اس کے رویے میں عجیب سا گریز اور سرد مہری تھی وہ جانتی تھیں یہ اسی عدم توجہ کا شاخسانہ ہے جس کا وہ ان کی طرف سے چند سال پہلے شکار ہوا تھا۔ اس لیے انہوں نے ہمت نہ ہاری اور بدستور اس کی دلداری میں لگی رہیں۔ دادیوں کے جانے کے بعد اس کی زندگی میں ایک بہت سے خالی پن سا آ گیا تھا اور اب اماں کی بے لوث محبت اس خالی پن کو بھرتی ہوئی محسوس ہوئی تو وہ زیادہ دیر تک منہ موڑے نہ رہ سکا۔ اور آخر کار راضی بہ رضا ہوگیا مگر صرف ماں کے ساتھ۔ بہنوں کے ساتھ اس کا رویہ ہنوز جارحانہ ہی
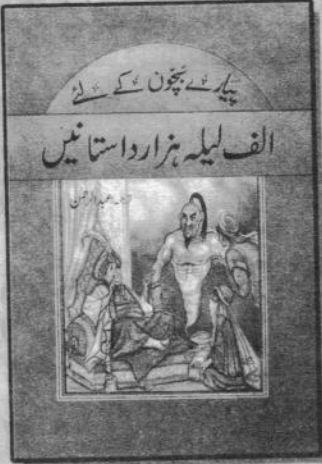
رہا۔ وہ چیزیں شیئر کرنے کا عادی نہ تھا۔ وہ ذرا سا اس کی کسی چیز کو ہاتھ لگاتیں ۔ تو وہ انہیں روئی کی مانند دھنک کر رکھ دیتا۔

صادقہ بیگم بھی اس خوف میں کہ کہیں وہ پہلے کی مانند اپنے خول میں نہ سمٹ جائے زیادہ روک ٹوک نہیں کرتی تھیں۔ وہ ان کی جانب لوٹ آیا تھا۔ ان کے مزید قریب آتا جا رہا تھا۔ ان کے لیے یہی غنیمت تھا۔ انہوں نے بہنوں کے ساتھ اس کے پتھر مار رویے کی اصلاح کرنے کی کوشش ہی نہیں کی تھی الٹا وہ انہیں ہی اس سے دور رہنے کی تلقین کرتی تھیں۔ اس لیے گھر میں بھائی اور بہنوں کے بیچ جو بے تکلفی اور گرم جوشی کی فضا ہوتی ہے وہ کبھی پنپنے ہی نہ پائی۔ بچیاں بھی نہایت حساس واقع ہوئی تھیں۔ بھائی سے لیے دیے ہی رہتیں۔ جانتی تھی کہ ماں کی تمام تر توجہ کا مرکز اب بھائی ہی ہے۔ پہلے انہوں نے بچیوں کی خاطر بیٹے کو نظر انداز کیا تھا۔ اور اب بیٹے کی خاطر بچیوں کو نظر انداز کر رہی تھیں۔ رویے کے اس عدم توازن پر اکثر شہاب صاحب چڑ جاتے اور انہیں سمجھاتے۔

''بیگم! ساری اولاد یکساں پیار و محبت اور توجہ کی مستحق ہوتی ہے ورنہ اس کی شخصیت میں بگاڑ پیدا ہو جاتا ہے۔''

''مگر وہ کچھ نہ جانتی تھیں۔ وہ تو ہر صورت بھرپور طریقے سے ازالہ کرنا چاہتی تھیں اپنی محبت اور توجہ سے اس محرومی کا جس کا وہ اس وقت شکار ہوا تھا جب وہ بری طرح سے بچیوں میں مصروف تھیں۔

دوسری طرف ان کے لاڈ پیار کے یہ غیر معمولی مظاہرے شاہجہاں کو از سر نو وہ وقت یاد دلاتے جب ان ہی بہنوں نے اس سے ماں کی گود چھینی تھی تو وہ مزید ان سے خار کھانے لگتا۔ ماؤں کی یہی جذباتیت اکثر بہن بھائیوں میں فاصلے پیدا کر دیتی ہے۔ زندگی کے ہر رشتے، ہر جذبے کا حسن اعتدال میں ہی پوشیدہ ہے خواہ وہ ممتا جیسی انمول شے ہی کیوں نہ ہو۔

دیکھتے ہی دیکھتے تینوں بچیوں نے اچھا خاصا قد

کاٹھ نکال لیا تو انہیں ان کو بیاہنے کی فکر دامن گیر ہوئی۔ یوں تو اصولی طور پر پہلے شاہجہاں کی باری تھی مگر یہاں بھی وہی روایتی ماؤں والی سوچ آڑے آگئی کہ پہلے بچیاں نمٹ جائیں پھر سکون سے بیٹے کی دلہن تلاش کروں گی۔ اچھے رشتے ملنے پر انہوں نے تینوں کو آگے پیچھے بیاہ دیا۔ شاہجہاں کے بارے میں شہاب صاحب نے صاف صاف کہہ دیا۔

"دیکھو بیگم! خاندان میں بہت سی اچھی اچھی بچیاں موجود ہیں۔ اس لیے ادھر ادھر تانکا جھانکی کرنے کی کوئی ضرورت نہیں۔ ان ہی میں سے کوئی ایک پسند کرلو۔"

مگر یہاں انہوں نے اپنا موقف پیش کیا۔

"ہر گھر میں بچیاں موجود ہیں۔ اگر کسی ایک گھر کی بچی منتخب کریں گے تو لامحالہ دوسرا ناراض ہوجائے گا۔ پھر رشتہ داروں میں رشتہ جوڑنے سے پہلے سے قائم اچھے مراسم متاثر ہوتے ہیں۔ اس لیے غیر ہی بھلے۔"

جب وہ شاہجہاں سے صلاح لیتیں تو وہ بے فکری سے ہنس دیتا۔

"اماں! جہاں مرضی کرو۔ آپ کی پسند قبول ہی قبول ہوگی۔" بیٹے کی اس قدر فرمانبرداری پر ان کا دل خوشی سے جھوم جھوم جاتا۔ پھر آخر کار تلاش بسیار کے بعد انہیں وہ ہیرا مل ہی گیا جو انہوں نے اپنے شاہجہاں کے تاج میں ٹانکنا تھا۔

ہوا یوں کہ چھوٹی فرحین کے سسرال میں قرآن خوانی تھی۔ وہیں انہیں دو بچیاں بہت بھائیں۔ ایک تو منگنی شدہ نکلی۔ دوسری کے ہاں رشتہ ڈالا تو مثبت جواب آیا۔ یوں باہمی صلاح مشورے سے انہوں نے زینب کو بطور بہو پسند کرلیا۔ اور پھر خوب دھوم دھام سے اسے بیاہ لائیں۔

☆☆☆

وہ کراؤن سے ٹیک لگائے۔ بیٹھی تھی اور نظریں سامنے دیوار پر لگی ایل ای ڈی پر جمی تھیں۔ جس پر اس وقت میگن مارکل اور شہزادہ ہیری کی شادی کی ریکارڈنگ چل رہی تھیں۔ مہین سے دیدہ زیب سفید گاؤن میں ملبوس دلہن اور اس کا سرخ بالوں والا دولہا شہزادہ ہیری دونوں ایک دوسرے کے سنگ کتنے سرشار اور مسرور نظر آرہے تھے۔ ایک طرف شہزادے کی آنکھوں میں ٹھاٹھیں مارتا محبت کا سمندر موجزن تھا تو دوسری طرف اس کی دلہن کے چہرے پر اپنی محبت پالینے کی خوشی میں اک الوہی سی چمک تھیں۔ وہ سارے خواب جو انہوں نے ایک دوجے کے حوالے سے دیکھے تھے آج تعبیر پارہے تھے۔

وہ بھیگی پلکوں سے دونوں کو دیکھتی رہی اور لاشعوری طور پر اسے بھی اپنے وہ تمام خواب اور سپنے یاد آگئے جو کبھی اس نے بھی اپنے جیون ساتھی کے بارے میں اور اپنی آئندہ زندگی کے بارے میں دیکھے تھے۔ ہر لڑکی ہی دیکھتی ہے خواہ وہ میگن مارکل کی طرح کوئی سیلیبریٹی ہو یا پھر کوئی عام گھریلو سی لڑکی۔" خواب تو شاید تمام لڑکیوں کے ہی ایک سے ہوتے ہیں مگر مقدر اور نصیب ہر ایک کا مختلف ہوتا ہے۔

شادی تو اس کی بھی بہت دھوم دھڑکے سے ہوئی تھی۔ ان کے ہاں پارلر سے تیار ہونے کا رواج نہیں تھا۔ گھر پر ہی بیوٹیشن کو بلوایا گیا تھا۔ شادی کی تقریب بھی پڑوسیوں کے وسیع و عریض لان میں منعقد ہورہی تھی۔ اس لیے جونہی بارات آئی اس کی شوخ و چنچل بہنوں اور کزنز نے بالکونی سے جھانک کر دولہا دیکھ لیا اور پھر بھاگتی ہوئیں اس کے کمرے میں آئیں جہاں پارلر والی باجی اسے تیار کررہی۔

"آپی! تمہارا دولہا تو بہت شان دار ہے۔"

"قسم سے بہت ہینڈسم ہے۔"

"اور خوب گورا چٹا بھی ہے۔"

اس نے صرف دولہا کی سرسری سی تصویر دیکھ رکھی تھی۔ منگنی کی مختصر سی مدت میں اس کا موقع نہیں مل سکا تھا ویسے بھی اس کے گھر کا ماحول بھی اس معاملے میں خاصا روایت پرست سا تھا۔ اس لیے کہ تبصرے سن کر خوش ہونے کے ساتھ ساتھ وہ تھوڑا نروس بھی ہوگئی۔ یوں تو وہ خود بھی ایک کھلتے ہوئے رنگ وروپ

کی مالک تھی مگر جس طرح سے دولہا کی خوب صورتی کے قصیدے پڑھے جا رہے تھے۔ اس میں تو مقابلتاً وہ تھوڑا پیچھے ہی تھی۔ اس لیے پھر اس نے سارا وقت بیوٹیشن کا سر کھالیا۔

"بس باجی! تم مجھے بہت زیادہ گورا کر دو۔" اس نے بھی جھنجلا کر اسے ڈپٹ دیا۔

"خاموش بیٹھی رہو۔ اگر زیادہ بیس تھوپ دی تو تم بالکل سفید بلا لگو گی۔"

پھر جب اسے تیار کر کے دولہا کے برابر اسٹیج پر بٹھایا گیا اس کے کانوں میں مختلف آوازیں پڑیں۔

"ماشاءاللہ سے چاند سورج کی جوڑی ہے۔"

"اللہ نظر بد سے بچائے۔ دونوں بہت خوب صورت ہیں۔" تو اس کے دوبتے ابھرتے دل کو قرار آیا۔

حجلہ عروسی میں پہنچ کر تنہائی ملتے ہی اس نے پرس سے چھوٹا سا شیشہ اور میک اپ کا سامان نکال کر گھونگھٹ کے اندر سے ہی اپنی نوک پلک از سر نو سنواری اور دولہا کا انتظار کرنے لگی۔

کئی گھنٹوں کے بعد رات گئے کہیں جا کر دولہا نے کمرے میں قدم رنجہ فرمایا۔ اور آتے ہی فرمانے لگے۔

"سوری یار! بہت دیر ہوگئی۔ دراصل دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں کھانا کھانے چلا گیا تھا۔ مائنڈ نہ کرنا تمہارے ہاں کا کھانا ذرا اچھا نہیں بنا تھا۔ ڈھنگ سے کھایا نہیں گیا۔"

وہ بھونچکی رہ گئی۔ اس کے بابا نے شہر کے سب سے ماہر نائی سے کھانا پکوایا تھا جو موصوف کو پسند نہیں آیا تھا اور بغیر کسی مروت کے نئی نویلی دلہن کے سامنے ناپسندیدگی کا اظہار بھی کر دیا تھا۔

پھر وہ باقی سارا وقت اپنے گھر کے طور پر طریقوں، امور خانہ داری میں اپنی اماں کی مہارت، پکانے ریندھنے میں ان کی ہنر مندی، بہنوں کی فرمانبرداری اور خاص طور پر اپنی پسند وناپسند اور عادات واطوار کے بارے میں تفصیلی لیکچر دیتا رہا۔

وہ رنگ وروپ جس کو لے کر وہ اتنی پریشان تھی اس نے شاید دیکھا بھی نہیں۔ اپنے ماؤف ہوتے دماغ اور بوجھل پلکوں کے ساتھ جو اس نے آخری جملہ سنا وہ یہ تھا۔

"مجھے امید ہے تم میری توقعات پر پورا اترو گی۔"

☆☆☆

لوگ اس کی قسمت پر رشک کرتے تھے۔ مختصر خاندان اور خوبرو شوہر، اور بظاہر تھا بھی ایسا ہی۔ گھر میں اس سمیت کل چار نفوس تھے۔ تینوں نندیں شادی شدہ تھیں۔ دو تو دور دراز شہروں میں بیاہی گئی تھیں۔ ایک چار گلیاں چھوڑ کر رہتی تھی مگر وہ بھی اس کی طرح اکلوتی بہو تھی۔ ہفتوں بعد چکر لگاتی۔ سسر نہایت شریف النفس ٹھنڈی، میٹھی سی طبیعت کے مالک تھے۔ ساس البتہ کافی دبنگ شخصیت کی مالک تھیں مگر وہ بھی خوش دلی سے سارا راج پاٹ اسے ہی سونپ چکی تھیں۔ اصل ٹیڑھی کھیر تو خود اس کا میاں تھا۔ بے تحاشا خود پسند، نخریلا اور نکتہ چیں۔

گھر میں صرف وہ اپنی ماں کے بہت قریب تھا۔ بلکہ ایک طرح سے ماما از بوائے تھا۔ اس نے نوٹ کیا تھا کہ اس کا رویہ اپنی بہنوں کے ساتھ بھی عجب روکھا روکھا سا تھا۔ شادی کی تقریبات میں بھی وہ ریزرو ہی رہی تھیں۔ بھائی بہنوں کے بیچ لاڈ پیار کا کوئی مظاہرہ اس نے تو اب تک نہیں دیکھا تھا۔

☆☆☆

شادی کے ابتدائی دنوں میں اس کی ذمہ داری صرف برتن لگانے، اٹھانے اور میاں کے کپڑے لتے کا خیال رکھنے تک محدود رہی۔ اصل امتحان تو اس وقت شروع ہوا جب ساس نے میٹھے میں اس کا ہاتھ ڈالو کر باقاعدہ کچن اسے سونپا۔

سسر کی جانب سے کھیر کی فرمائش آئی تھی اور یہ اس کے لیے قطعی اجنبی ڈش نہ تھی۔ اس کے ابا میٹھے کے بہت شوقین تھے اور وہ بارہا اپنی ماں کی زیر نگرانی کھیر اور فرنی وغیرہ بنا بھی چکی تھی۔ مگر یہاں وہ کچھ

نروس سی تھی۔ اس نے کام شروع کیا تو ساس صاحبہ نے بھی ڈھیروں ہدایات دیں۔

"پہلے چاول ابال کر گرائنڈ کر لو۔"

"دودھ دھیمی آنچ پر کاڑھ لو۔"

"کھیر کا رنگ بالکل سفید نہیں بلکہ ہلکا پیلا ہونا چاہیے۔"

"نہ بہت پتلی ہو اور نہ زیادہ گاڑھی ورنہ شاہجہاں نہیں کھائے گا۔" یوں اس نے ڈرتے ڈرتے پتیلا بھر کھیر نہایت جانفشانی سے تیار کی۔ سسر ہر چمچ کے ساتھ ماشاء اللہ، سبحان اللہ کہہ کر کھاتے رہے۔ مگر صاحب بہادر نے ایک دو چمچ لینے کے بعد پلیٹ پرے سرکا دی اور فرمانے لگے۔

"اماں! جہاں اسے اتنا کچھ بتایا تھا وہیں میوے ڈالنے کا بھی درست ٹائم بتا دیتیں۔ ناریل اور پستہ کسی قدر سخت ہیں۔ چبائے نہیں جا رہے ہیں۔"

"ہائے...... بچے کو میٹھا پسند نہیں آیا۔" ماں پر تو اوس سی پڑ گئی۔

"بچے نے اس سے پہلے دو پلیٹیں بریانی کی بھی ٹھونسی تھیں۔ اب گنجائش ہی کم ہو گی۔" شہاب صاحب جھنجلا کر بولے تو وہ اپنا سا منہ لے کر رہ گئیں۔

☆☆☆

بات یہ نہیں تھی کہ وہ کوئی کام چور یا گھریلو کام کاج سے نابلد پھوہڑ لڑکی تھی۔ ماں نے اچھے سے تربیت کی تھی۔ شادی سے پہلے اس نے کوکنگ اور بیکنگ کے بھی کچھ کورسز کیے گئے مگر اس کی ماں کا خیال تھا۔

"بچیوں کو روزمرہ کی سادہ ہانڈی روٹی بھی آنی چاہیے۔ اب گھر میں روز تو دعوتی کھانے نہیں پکتے۔"

اس لیے ہر طرح کا کھانا پکانا ہی سیکھنے کی کوشش کی تھی۔ اور اس کے پکے ہوئے کھانے کی میکے میں اکثر واہ واہ بھی ہو جاتی تھی مگر یہ تو اس نے شادی کے بعد جانا تھا کہ میکے میں واہ واہ کروانا کتنا آسان ہے اور سسرال میں تو لوہے کے چنے چبانے کے مترادف ہوتا ہے خاص طور پر اس وقت جب میاں اتنا نخریلا اور ساس اتنی نکتہ چیں اور باریک بین ہو۔

شاہجہاں ماں کے ہاتھ کے ذائقے کا اس قدر عادی تھا کہ اسے اس کے ہاتھ کی کوئی چیز نہیں بھاتی تھی۔ وہ دیکھتا، سونگھتا اور چکھتا اور پھر پرے دھکیل دیتا۔ صادقہ بیگم کو خود اٹھ کر اس کے لیے کچھ بنانا پڑتا۔

اس نے اپنی ایک شادی شدہ دوست سے بھی مشورہ کیا تو اس نے کہا۔

"دیکھو زینب! ہر عورت کے ہاتھ کا اپنا ذائقہ اور لذت ہوتی ہے۔ کوئی بھی عورت باوجود کوشش کے بالکل دوسری عورت جیسا ٹیسٹ نہیں لا سکتی خواہ وہ اس کی ماں ہی کیوں نہ ہو۔ چہ جائیکہ تم ساس کی بات کر رہی ہو۔ تم اپنی ساس کی نقل نہ کرو۔ آزادی اور اعتماد سے پکاؤ۔ ان شاء اللہ ایک دن کامیاب ہو جاؤ گی۔"

مگر وہ آزادی کہاں سے لاتی۔ گھر میں اوپن کچن تھا اور بالکل سامنے ساس صاحبہ ہر وقت صوفہ کم بیڈ پر براجمان رہتی تھیں۔ جونہی وہ پکانا شروع کرتی۔ ان کی ہدایات شروع ہو جاتیں۔

"پیاز چوپ مت کرنا۔ چھری سے لچھے دار کاٹو۔"

"مسالا ٹھیک سے بھوننا، کچا پن نہ رہ جائے۔"

"سالن کی رنگت جلی جلی سی نہ ہو۔"

ڈھیروں ڈھیر ہدایات کے ساتھ وہ بہت اچھا پکانے کی کوشش کرتی۔ مگر عام سا بھی نہ پکا پاتی۔ اس کی ساری خود اعتمادی کہیں اڑن چھو ہو گئی تھی۔

شاہجہاں صرف کھانے پینے کے معاملے میں ہی مشکل پسند نہ تھا بلکہ وہ ہر لحاظ سے اپنی مرضی مسلط کرنے کا عادی تھا۔ وہ گھر کے کام کاج سے فارغ ہونے کے بعد دوپہر میں آرام کرنے لیٹتی تو اچانک آفس سے بغیر اطلاع دیئے چلا آتا اور پھر آتے ہی افراتفری ڈال دیتا۔

"چلو چلو...... جلد کرو...... شاپنگ پر چلتے ہیں...... مجھے اپنے کپڑے جوتے لینے ہیں۔ تمہیں

بھی دلا دیتا ہوں۔"

پھر وہ لاکھ منع کرتی کہ شام میں چلیں گے مگر وہ ایک نہ سنتا۔ مارکیٹ لے جا کر ہی دم لیتا۔ پھر وہ تو ہزاروں خرچ کرنے پر تیار ہوتا مگر تھکے ہارے وجود کے ساتھ اسے شاپنگ میں ذرا مزہ نہیں آتا۔

☆☆☆

آج بہت دنوں کے بعد وہ میکے آئی تھی۔ اس کی چھوٹی بہن فاہا جس کی شادی اس کی شادی کے کچھ عرصہ بعد ہوئی تھی وہ بھی آئی ہوئی تھی۔ ویسے بھی وہ تو جلدی جلدی چکر لگا لیتی تھی مگر اسے تو شاہجہاں مہینہ بھر بعد بھی بامشکل ہی جانے کی اجازت دیتا تھا۔ آج بھی وہ جب آئی تو ماں نے حسب معمول حال چال پوچھا تو اس نے بھی ہمیشہ کی طرح سب اچھا کی رپوٹ دی۔ اسے وہ لڑکیاں اچھی نہیں لگتی تھیں جو شادی کے بعد بھی اپنے ذاتی مسئلے مسائل کے سلسلے میں ماں باپ کو پریشان رکھتی تھیں۔ ویسے بھی اس کی ماں مطمئن ہی تھیں کیونکہ ان کے خیال میں اتنی مختصر سی فیملی میں اسے بھلا کیا پریشانی ہوسکتی تھی ہاں البتہ فاہا کے بارے میں وہ کچھ فکر مند ضرور تھیں کیونکہ اس کی شادی ایک بھرے پڑے خاندان میں ہوئی تھی۔ دو دو جٹھانیاں، دو بن بیاہی نندیں اور ایک دیور ان کے نزدیک فاہا کے لیے اس سے زیادہ مشکلات تھیں۔ پھر وہ تھی بھی بہت جذباتی اور بے صبری سی۔ شوہر کے ساتھ تو اس کی اچھی ذہنی ہم آہنگی ہو چکی تھی مگر دیگر سسرالیوں سے اسے ڈھیر سارے شکوے تھے۔

کھانے کے بعد دونوں بہنیں فارغ ہوئیں تو اس کے حال چال پوچھنے پر فاہا بیگم نے تو فوراً اپنے سر پر دھری شکوے شکایتوں کی گھٹڑی اتاری اور بہن کے سامنے اپنا بوجھ ہلکا کرنے لگی۔

"ہائے اللہ آپی کیا بتاؤں...... جٹھانیوں کے بچے کس قدر بدتمیز ہیں۔

پرسوں میرے صوفے پر اسکوائش سے بھرا جگ انڈیل دیا۔ تمہیں تو پتا ہے مجھے وہ صوفہ کتنا پیارا ہے۔

ابا جان سے ضد کر کے اتنا مہنگا لیا تھا۔"

"تم سرف اور سرکہ ملا کر اسفنج پھیر دیتیں اور آئندہ کے لیے کور چڑھا دو۔" اس نے مشورہ دیا۔

"اچھا آپی! ایک دن ساسو ماں نے کہا کہ بڑی بھابھی زردہ بنا رہی ہیں۔ تم بھی مدد کروا دو۔ آپ کو تو پتا ہے کہ مجھے زردہ بنانا نہیں آتا۔ میں نے پوچھ لیا کہ پیاز کتنی کاٹوں فرائی کرنے کے لیے تو ساس سمیت سبھی نے اتنا ریکارڈ لگایا کہ تمہیں اتنا بھی نہیں پتا کہ زردہ میں پیاز نہیں ڈلتی۔ سسر صاحب کی بھی ہنستے ہنستے مصنوعی بتیسی باہر آ گئی۔

"اوہو فاہا! غلطی تمہاری ہے نا...... تم پہلے مجھ سے یا امی جان سے زردہ بنانے کی ترکیب پوچھ لیتیں یا پھر گوگل پر کر لیتیں تو تمہیں سبکی کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔"

"ایک اور دن کی روداد سنیں۔ آلو مٹر بنے تھے۔ آپ کو پتا ہے کہ مجھے آلو مٹر کا سالن اچھا نہیں لگتا۔ ذوہیب بھی جانتے تھے۔ وہ رات کو میرے لیے برگر لے آئے۔ صبح کام والی نے جھاڑو لگائی تو میرے کمرے سے برگر کا شاپر برآمد ہونے پر چھوٹی جٹھانی صاحبہ نے اتنا ناک منہ چڑھایا۔ حالانکہ وہ بھی تو علیحدہ سے لا کر کھاتے پیتے ہیں میں نے کبھی کوئی اعتراض کیا ہے کبھی......!!"

وہ اپنی داستان غم سناتے سناتے روہنسی ہو گئی تو اسے اس پر بہت پیار آیا پھر وہ اسے سمجھانے لگی۔

"دیکھو فاہا...... شکر کرو تمہارا میاں اتنا خوش مزاج اور نرم دل ہے۔ تمہارا اتنا خیال رکھتا ہے۔ یہ تو بہت چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہیں۔ نظر انداز کر دیا کرو۔"

"کیا یہ چھوٹی چھوٹی سی باتیں ہیں......؟؟"

فاہا نے حیرت سے اپنی آنکھیں پٹپٹائیں تو وہ اس کی زلفیں پیار سے سنوارتے ہوئے دھیرے سے بولی۔

"ہاں فاہا چندا...... یہ بہت چھوٹی سی باتیں ہیں۔" اور پھر نم آنکھوں کے ساتھ پھیکا سا مسکرا دی۔

☆☆☆

موسم بدل رہا تھا۔ گرمیاں اپنا رخت سفر باندھ رہی تھیں۔ صبح اور شام کے وقت خنکی بھلی تو لگتی تھی مگر ساتھ ہی جسم و جان میں بخار اور درد کی سی کیفیت بھی محسوس ہوتی تھی۔ سب سے پہلے صادقہ بیگم ہی اس موسمیاتی تبدیلی کا شکار ہوئیں۔

شاہجہاں بہت مصروف تھا وہ زینب کے ہمراہ ہی ڈاکٹر کے پاس چلی گئیں۔ وہ بھی انہیں کچھ نڈھال اور پژمردہ سی محسوس ہوئی۔ وہ ان ساسوں میں سے نہیں تھیں جو صرف اپنی ہی صحت کے بارے میں تشویش میں مبتلا رہتی ہیں۔ وہ اچھی طرح سے جانتی تھیں کہ گھر کا انتظام انفرام بہت طریقے سے چلانے کے لیے بہو کا فٹ فاٹ ہونا بھی بہت ضروری ہوتا ہے۔ اس لیے زنیب کے نہ نہ کرنے کے باوجود انہوں نے زبردستی اپنے ساتھ ساتھ اس کا بھی چیک اپ کروایا اور پھر اس حیران کن خوش خبری کے ہمراہ لوٹیں جس کا وہ شاہجہاں کی شادی کے فوراً بعد سے ہی انتظار کر رہی تھیں۔

خوشی اور جوش سے لبریز لہجے میں جب شہاب صاحب سے ذکر کیا تو وہ فوراً بولے۔

''بیگم! اب آپ کو بہو کا بہت زیادہ خیال رکھنا ہوگا۔''

''تو کیا میں پہلے اس کا خیال نہیں رکھتی۔'' وہ کھٹ سے برا مانتے ہوئے بولیں۔

پھر واقعی انہوں نے گھر کے کام کاج میں پہلے سے زیادہ اس کا ہاتھ بٹانا شروع کر دیا۔ شاہجہاں کے بھی کئی چھوٹے موٹے کام نمٹا دیتیں۔ لیکن وہ دھان پان سی تو پہلے ہی تھی مگر اب اس حال میں مزید کمزور ہوتی جا رہی تھی۔

ایک دن شاہجہان کے کپڑے استری کرتے وقت چکرا کر قریبی صوفے پر ڈھے گئی۔ وہ بھی اس وقت وہیں موجود پی ٹی سی ایل پر اپنی بہن سے بات کر رہی تھیں۔ فوراً لپک کر آئیں۔ اس کو سیدھا کر کے لٹایا۔ فرج سے نکال کر جوس پلایا۔ ہاتھ پاؤں سہلائے اور شام کو ڈاکٹر کے پاس لے جا کر ڈرپ بھی لگوائی۔ واپس آئیں تو شہاب صاحب نے فکر مندی سے کہا۔

''بیگم! میرا خیال ہے دلہن کو اس کے میکے بھیج دیتے ہیں وہاں زیادہ آرام سے رہے گی۔''

''تو یہاں وہ کون سے پہاڑ توڑ رہی ہے۔ اب تو کئی دن سے صبح کو ناشتے میں انڈے اور ڈبل روٹی چل رہی ہے۔ دوپہر کی روٹیاں کام والی ڈال جاتی ہے اور اب تو ہنڈیا بھی اکثر میں ہی چڑھا دیتی ہوں۔'' وہ بھی الجھ گئیں۔

''وہ تو ٹھیک ہے بیگم مگر یہ اپنا شاہجہاں جو گھڑی گھڑی ہر کام کے لیے اسے ہی آواز دیتا ہے......!!''

پھر انہوں نے ٹھنڈے دل سے سوچا تو میاں کی بات ٹھیک لگی۔

حالانکہ ابھی کافی وقت پڑا تھا مگر انہوں نے کمال فیاضی کا مظاہرہ کرتے ہوئے بہو کو میکے بھجوا دیا اور کسی نہ کسی طرح شاہجہاں کو سمجھا بجھا کر خاموش کروا دیا۔

☆☆☆

اب گھر کی بار کی تمام تر ذمہ داری ان پر آن پڑی تھی۔ اس عمر میں اکیلے ہانڈی چولہا ان کے بس کی بات نہ تھی مگر کیا کرتیں مجبوری تھی اب اس کام کے لیے تو کسی کام والی کو بھی نہیں رکھا جا سکتا تھا۔ لاڈلے سپوت کو تو صرف انہی کا بنا ہی پسند آتا تھا۔ وہ تو بیوی کے ہاتھ سے بنے کھانے میں سو نقص نکالتا تھا چہ جائیکہ کسی ماسی کا بنا کھا لیتا۔

انہوں نے اپنی سہولت اور اوپری کاموں کے لیے ایک اور کام والی رکھ لی تھی۔ یوں جیسے تیسے گھر کا نظام چل ہی رہا تھا۔ ایک دن وہ باورچی خانے میں تھیں وہ ہاتھ میں ایک شاپر تھامے چلا آیا۔

''اماں! کل میرے نئے آفس کا افتتاح ہے۔ یہ میں درزی سے سوٹ لایا ہوں۔ صغریٰ سے کلف لگوا کر اچھی طرح سے استری کروا دینا۔''

''اچھا بیٹا! میرے کمرے میں استری ٹیبل پر رکھ دو۔'' وہ مصروف سے انداز میں بولیں۔

پھر اگلے دن جب وہ صغریٰ کے سر پر کھڑی صحن دھلوا رہی تھیں تو وہ آندھی طوفان کی طرح آگ بگولا بنا چلا آیا۔

''اماں! آپ نے میرے کپڑے استری نہیں کروائے۔'' ہاتھ میں وہی شاپر تھام رکھا تھا۔

''ہائے اللہ...... میں تو بالکل بھول گئی تھی۔'' وہ اپنے سر پر ہاتھ مار کر بولیں۔

''بیٹا......! تم کوئی دوسرا نکال دو۔ صغریٰ استری کر دیتی ہے۔''

''اماں......!! آپ نے اتنی کام والیاں رکھی ہوئی ہیں۔ پھر بھی کوئی کام وقت پر ڈھنگ سے نہیں ہوتا۔'' وہ بالکل ہی آپے سے باہر ہو گیا اور پاس پڑے اسٹول کو ٹھوکر مارتا ہوا پاؤں پٹختا باہر نکل گیا۔

کام والی کے سامنے بیٹے کی زبان درازی اور بدتمیزی پر انہیں بہت سبکی محسوس ہوئی۔ پھر ان کا کسی بھی کام میں دل نہیں لگا۔ بڑے بھاری دل کے ساتھ انہوں نے ہانڈی روٹی کی اور سر شام ہی منہ پر چادر ڈال کر لیٹ گئیں۔ انہیں شدید رنج تھا۔ وہ تو اس کی بیوی کو آرام دینے کے لیے اس عمر میں خوار ہو رہی تھیں مگر وہ بجائے شکر گزار ہونے کے اکڑ رہا تھا۔

شہاب صاحب گھر آئے تو بیگم صاحبہ کو یوں بے وقت لیٹا دیکھ کر پریشان ہو گئے۔

''خیریت ہے...... بیگم......!! طبیعت تو ناساز نہیں ہے......!!'' انہوں نے چادر کا کونا ہٹا کر پوچھا۔

ان کی متورم آنکھیں اور رویا رویا سا چہرہ دیکھ کر مزید پریشان ہو گئے اور وہیں پلنگ کے کنارے پر ٹک گئے۔ وہ بھی بھری بیٹھی تھیں۔ میاں کے ذرا سے پوچھنے پر پھٹ پڑیں اور ساری داستان غم ان کے گوش گزار کر دی۔ پھر اختتام اس جملے پر کیا۔

''یہ شاہجہاں کس قدر بدتمیز ہو گیا ہے۔ پہلے تو ایسا نہیں تھا۔''

ان کے آخری جملے پر شہاب صاحب طنزیہ مسکرائے اور پھر چشمہ اتار کر اپنی آنکھیں رومال سے صاف کرتے ہوئے بولے۔

''بیگم صاحبہ! یہ آپ کی بھول ہے کہ وہ اب ایسا ہو گیا ہے۔ وہ تو شروع سے ہی اتنا اکھڑ اور بدمزاج سا ہے۔ بس آپ کو ہی آج احساس ہوا ہے۔''

''پہلے وہ بہنوں کے ساتھ بدتمیزی کرتا تھا۔ آپ نظر انداز کر دیتی تھیں۔ پھر بیوی آئی تو وہ بھی مشق ستم بن گئی۔ مگر آپ اس کے رویے کو نارمل ہی خیال کرتی رہیں اور کبھی اصلاح کی کوشش نہ کی...... آپ''

''میں کب ان میاں بیوی کے معاملے میں بولتی تھیں۔ اگر وہ بیوی پر چیختا تھا تو کب اس کی حوصلہ افزائی کرتی تھی؟'' ان کے الزام پر وہ تڑپ اٹھیں۔

''مگر کبھی حوصلہ شکنی بھی تو نہیں کی تھی۔ ہمیشہ خاموش اور غیر جانبدار تو رہتی تھیں اور یہی غیر جانب داری گناہ کے زمرے میں آتی ہے۔''

''بیٹوں کی تربیت کرتے وقت تم ماؤں کی اکثریت یہی غلطی کرتی ہے۔ تم بیٹوں کو ہر کام سکھاتی ہو۔ اچھا کھانا پینا، صاف ستھرا لباس زیب تن کرنا۔ پڑھ لکھ کر کچھ بن جانا وغیرہ مگر کبھی کسی دوسری عورت کی عزت کرنا نہیں سکھاتیں کیونکہ تم اس کی ضرورت محسوس نہیں کرتی ہو۔ بحیثیت ماں تم کو تو یہ چیز ویسے ہی مل رہی ہوتی ہے اس لیے کسی دوسری عورت کے لیے تم شاذونادر ہی اس کی ضرورت محسوس کرتی ہو۔ اس طرح آہستہ آہستہ ان کے رویے میں اکھڑپن راسخ ہو جاتا ہے۔

شاہجہاں کو بھی اپنے غصے کے نکاس کے لیے آج آس پاس کوئی ہدف نظر نہیں آیا تو اس نے تمام تر لحاظ اور مروت کو سمیٹ کر ایک طرف ڈالا اور تم پر ہی برس پڑا۔ اس کا نامناسب رویہ تمہیں اتنی تکلیف دے رہا ہے۔ زینب کا سوچو وہ تو جب سے آئی ہے اس سے بھی زیادہ سخت مزاجی جھیل رہی ہے۔'' انہوں نے اپنی طرف سے بیگم کو آئینہ دکھایا۔

میاں کی کڑوی کسیلی باتیں پہلے تو انہیں بہت ناگوار گزریں پھر جب تنہائی میں بیٹھ کر ٹھنڈے دل

سے سوچا تو سب کچھ درست لگا پھر اس کے ساتھ ہی ایک اور نکتہ ان کے ذہن میں آیا۔

وہ بچپن میں ان سے بہت نظر انداز ہوا تھا پھر موقع ملنے پر ازالے کے طور پر لاڈ پیار کی حد کردی۔ یوں اس کی شخصیت میں توازن نہ رہا۔ اب تو شاید آنے والا وقت ہی اس بگاڑ کو سدھار دے۔ انہوں نے ٹھنڈی آہ بھری اور صدق دل سے دعا کی۔

☆☆☆

پھر جمعۃ المبارک کی ایک بابرکت صبح کو زینب نے دو جڑواں بچوں کو جنم دیا۔ شہاب صاحب اور صادقہ بیگم تو خوشی سے نہال ہو گئے۔ ان کے اور زینب کے خاندان میں دور دور تک بھی کبھی جڑواں بچوں کی پیدائش کا واقعہ نہیں ہوا تھا۔ دونوں خاندانوں کی خوشی اور مسرت دیدنی تھی۔

آج تو شاہجہاں بھی سرشار سا ہسپتال کے کمرے میں مسلسل ننھے فرشتوں کی ویڈیو بنا بنا کر اس کی پھوپھیوں اور اپنے دوستوں کو بھیج رہا تھا جبکہ صادقہ بیگم اسے منع کر رہی تھیں کہ اتنے چھوٹے بچوں کے لیے کیمرے کی شعاعیں نہ صرف ضرر رساں ہو سکتی ہیں بلکہ نظر لگ جانے کا خدشہ بھی ہوتا ہے۔ ہسپتال میں چند روز قیام کے بعد زینب بچوں کے ہمراہ دوبارہ اپنے والدین کے گھر چلی گئی۔ صادقہ بیگم کا سوا مہینے کے بعد اسے لانے کا پروگرام تھا۔

وہ خوشی خوشی پوتوں کے استقبال کی تیاریاں کر رہی تھیں۔ ان کے لیے ننھی منی چیزیں تیار کر رہی تھیں۔ دو ایک جیسی چھوٹی چھوٹی کاٹ لا کر کمرے میں رکھیں۔ کام والی کو ساتھ لے کر بچوں کے حوالے سے سٹنگ میں بھی تھوڑی بہت تبدیلی کروائی، بہو کے لیے خالص دیسی گھی سے حلوہ وغیرہ تیار کیا۔

☆☆☆

اتنی خوشی شاید صادقہ بیگم کو راس نہ آئی۔ ایک رات جب وہ سوئیں تو صبح اپنے مخصوص وقت نہ اٹھیں۔ شہاب صاحب نے ان کا بازو ہلایا۔ سرد برف سا لمس کسی انہونی کی خبر دے رہا تھا۔ شاہجہاں ڈاکٹر کو بلا لایا۔ اس نے آتے ہی بدترین خدشے کی تصدیق کر دی۔ رات کے کسی پہر خاموش ہارٹ اٹیک جان لیوا ثابت ہوا تھا۔ ہنستے بستے گھر میں صف ماتم بچھ گئیں۔

روتی پیٹتی تینوں بیٹیاں آ پہنچیں۔ زینب بھی حواس باختہ سی دونوں بچوں کے ساتھ اپنے گھر والوں کے ہمراہ چلی آئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کے ان کے ساتھ ساس بہو والے روایتی اختلاف تو تھے مگر اس نے یہ تو کبھی نہیں چاہا تھا۔ اسے یاد تھا کہ ابھی کچھ دن پہلے تک تو بچوں کی پیدائش پر خوشی سے نہال وہ اس کی بلائیں لیتی نہ تھکتی تھیں اور اب یوں اچانک منوں مٹی تلے جا سوئیں۔

شاہجہاں پر خود سکتہ طاری تھا وہ کسی اور کی کیا دلجوئی کرتا۔ سوئم کے بعد جب پرسہ دینے آنے والوں کا ہجوم تھوڑا چھٹا تو اس کی دگرگوں حالت اور چھوٹے بچوں کی وجہ سے شہاب صاحب نے بعد اصرار اسے واپس کچھ دن تک مزید آرام کی غرض سے میکے بھجوا دیا۔ وہ جانا تو نہیں چاہتی تھی مگر اس کی تینوں نندوں نے سمجھایا کہ ابھی اسے مزید آرام کی ضرورت ہے۔ پھر کچھ دن بعد اس کی دو نندیں بھی اپنے اپنے گھر چلی گئیں مگر فرحین بدستور رکی رہی۔ آخر گھر بھی تو کسی نے سنبھالنا تھا۔ اسے باپ اور بھائی کا بھی خیال تھا۔ اس لیے اس نے جیسے تیسے بن پڑا مہینہ بھر گزار دیا۔ پھر شہاب صاحب نے ہی خود ہی اسے گھر جانے کا کہہ دیا کیونکہ اس کے بچے ڈسٹرب ہو رہے تھے۔ کبھی وہ یہاں ہوتے اور کبھی اپنے گھر میں۔ میاں کو بھی کھانا کھانے ادھر آنا پڑتا تھا۔ پھر ایک شام شاہجہاں جا کر اسے اور بچوں کو لے آیا۔ وہ اندر ہی اندر بہت ڈری ہوئی تھی کہ اب تو چھوٹے دو بچوں کا ساتھ ہے۔ گھر بار کیسے اکیلی سنبھال پائے گی۔ اوپر سے گھڑی میں تولہ گھڑی میں ماشہ جیسا مزاج رکھنے والا میاں۔ ماں کے صدمے سے تو ابھی الجھا الجھا سا لگ رہا تھا۔ میکے میں تو ماں بہنوں نے اسے ابھی تک ہلنے بھی نہیں دیا تھا۔ بچے بھی زیادہ تر

وہی دیکھتی تھیں۔ بہر حال جو بھی تھا اب سر پر پڑی تھی تو نباہے بنا گزارا بھی نہ تھا۔ کچھ دن لگے اسے روٹین سیٹ کرنے میں اور وہ کمر کس کر میدان جنگ میں اتر گئی۔ علی الصبح اٹھتی۔ شاہجہاں کے کپڑے، جوتے وغیرہ دیکھتی۔ پھر ٹیبل پر اس کی تمام ضروری چیزیں گھڑی، موبائل گاڑی کی چابیاں وغیرہ ڈھونڈ کر رکھتی اور ناشتہ بنانے کھڑی ہو جاتی۔ اس دوران اگر بچے اٹھ جاتے تو اس کا ایک پاؤں کچن اور دوسرا کمرے میں ہوتا۔ اسی اتفراتفری میں دوپہر اور رات کا کھانا تیار کرتی۔ ساری رات کبھی ایک بچہ اٹھ جاتا کبھی دوسرا۔ وہ کمرے کی لائٹ جلائے رکھتی۔ بچوں کی چوں چوں سے تنگ آ کر شاہجہاں نے ساتھ والے کمرے میں اپنا بستر لگا لیا تھا۔ وہ پوری کوشش کرتی کہ کوئی کمی بیشی نہ رہ جائے مگر اس کی تمام تر پھرتیوں کے باوجود بھی کھانا لیٹ پکتا اور کبھی سالن جلتے جلتے بچتا۔ خلاف معمول شاہجہاں اسے کچھ نہ کہتا اور چپ چاپ کھا لیتا۔ اسے کوئی خوش فہمی نہ تھی وہ اچھی طرح سے جانتی تھی کہ یہ طوفان سے پہلے والی خاموشی ہے اور ایک دن یہ آتش فشاں پھٹ جائے گا اسی دن کا سوچ کر وہ دہل جاتی تھی اور پھر آخر کار وہ دن بھی آ پہنچا۔

☆☆☆

شام کو اس نے شاہجہاں کے لیے جوس بنایا۔ تھوڑا سا بچ گیا۔ ضائع جانے کے خیال سے اس نے وہ پی لیا جس سے اس کا حساس گلا خراب ہو گیا۔ رات کو جب وہ بچوں کو فیڈ کروانے اٹھی تو ہلکی ہلکی کھانسی بھی آنے لگی۔ اس ڈر سے کہ کہیں بچوں کو جراثیم نہ لگ جائیں اس نے کھانسی کا سیرپ پی لیا۔ صبح جب مقررہ وقت پر الارم بجا تو غنودگی کی وجہ سے وہ اسے سنائی نہیں دیا۔

اس کی آنکھ تو دونوں بچوں کے رونے سے کھلی۔ اس نے انہیں دودھ پلایا۔ پھر کھڑکیوں سے پردے ہٹائے تو سورج کی کرنیں چھن چھن کر اندر آنے لگیں۔ اف بہت دیر ہو گئی۔ اس کا دل دھک سے رہ گیا۔ جلدی سے ساتھ والے کمرے میں جھانکا۔ شاہجہاں کا بستر خالی پڑا تھا۔ شاید وہ ناشتہ کے بغیر ہی آفس چلا گیا تھا۔ اسے بہت ملال ہوا۔ پھر اس نے اپنا موبائل اٹھایا تو دن اور تاریخ پر نظر پڑی۔ وہ چونک گئی۔ آج تو آفس سے چھٹی تھی۔ پھر شاہجہاں کہاں چلے گئے......؟؟ اسی شش و پنج میں اس نے واش روم میں جا کر منہ ہاتھ دھویا۔ سوئے ہوئے بچوں پر ایک نظر ڈالی اور کچن کا رخ کیا۔ وہاں سے کھٹر پٹر کی آوازیں آ رہی تھیں۔ غالباً شہاب صاحب اس سے مایوس ہو کر خود ہی اپنا ناشتہ بنا رہے تھے۔ وہ خود کو تیز قدموں سے دروازے تک پہنچی اور اندر کا منظر دیکھ کر حیرت سے بت بن گئی۔

سلیب پر جگہ جگہ سوکھا آٹا بکھرا ہوا تھا۔ چکنائی کے دھبے بھی نظر آ رہے تھے۔ چولہے پر پتیلی میں کچھ ابل رہا تھا۔ سنک کے پاس ٹونٹی کھولے کوئی کھڑا تھا۔ اس کی آہٹ پر دروازے کی جانب پشت کر کے کھڑے شخص نے پلٹ کر دیکھا تو اس کا سکتہ ٹوٹا۔

''شاہجہاں ......آپ...... یہاں...... !!''

پھنسی پھنسی آواز میں ٹوٹے پھوٹے الفاظ اس کے منہ سے نکلے۔ اس کے ہاتھ میں فرائنگ پین تھا اور وہ دو قدم مزید آگے آیا۔ اس کی جان ہوا ہو گئی۔ اب وہ یقیناً فرائنگ پین اس کے سر پر ماں نے والا تھا۔ مگر اس نے وہ فرائنگ پین سلیب پر رکھ دیا اور پاس لٹکتے تولیہ سے ہاتھ پونچھتے ہوئے بولا۔

''سوری یار! بہت بھوک لگ رہی تھی۔ ڈبل روٹی کھانے کا بالکل بھی دل نہیں تھا۔ میں نے خود الٹا سیدھا پراٹھا بنا کر کھا لیا ہے۔ انڈے ابل رہے ہیں۔ اب تم چائے بنا لو۔ ابا جان کو ناشتہ بھجوا دو اور ساتھ ہی خود بھی کر لو۔ مجھے ذرا گاڑی کی مرمت کروانے جانا ہے۔''

اس نے جنبش تک نہ کی اور سانس روکے وہیں کھڑی رہی۔ اس کی گومگو جیسی کیفیت پر وہ مزید آگے بڑھا اور پھر دھیرے دھیرے کہنے لگا۔

''دیکھو زینب! میں کئی دن سے نوٹ کر رہا ہوں

کہ تم گھر کے کام کاج میں الجھ کر بچوں پر بھرپور توجہ نہیں دے پا رہی ہو۔

(لو جی! فرد جرم آخر سنا ہی دی) اس نے تھوک نگلا۔

"زینب! میں ہر چیز برداشت کر سکتا ہوں، مگر اپنے بچوں کا نظر انداز ہونا برداشت نہیں کر سکتا۔ کیونکہ یہ وہ چیز ہے جسے میں خود اپنے بچپن میں بھگت چکا ہوں۔ میں تو ان سے بہت بڑا تھا اور پھر میرے پاس دو دو دادیوں کی آغوش بھی موجود تھی۔ مگر ماں کی انمول محبت اور توجہ کا نعم البدل کوئی نہیں ہوتا۔ میں آج بھی اس کی کمی کو محسوس کرتا ہوں۔ پھر میرے بچوں کے پاس تو ویسا کوئی متبادل ہے بھی نہیں۔"

اس کی سمجھ میں ہی نہیں آ رہا تھا کہ وہ جواب میں کیا کہے۔ وہ بھی اس کے ردعمل کا انتظار کیے بغیر بولتا رہا۔

"زینب! مجھے اب اماں بہت یاد آتی ہے۔ (اس کی آواز بھر گئی اور آنکھوں میں نمی سی چمکی) ایک دن تمہاری غیر موجودگی میں میں نے ان کے ساتھ بہت بدتمیزی کی۔ اس وقت تو مجھے بالکل احساس نہ ہوا۔ مگر اب جب میں یاد کرتا ہوں تو اپنے آپ سے بھی شرمندگی محسوس ہوتی ہے۔ وہ رومال سے آنکھیں صاف کرنے لگا۔

"کاش میں ان سے معافی مانگ لیتا۔ اب میں چاہتا ہوں کہ میرے بچے بہت محبت کرنے والے نرم خو انسان بنیں۔ اس لیے میں نے ایک فیصلہ کیا ہے......!!"

"ہیں...... کیسا فیصلہ......!!اس کا دل زور سے دھڑکا کہیں ایک اور امی لانے کا تو نہیں...... ایک خیال اس کے ذہن میں آیا۔ مگر وہ اپنی رو میں بولتا رہا۔

"ہمارے دفتر میں چائے وغیرہ بنانے کے لیے ایک لڑکا ملازم ہے۔ اس کی بڑی بہن بیوہ ہے۔ نہایت شرف النفس مگر ضرورت مند لوگ ہیں۔ میرا خیال ہے جب تک بچے بڑے نہیں ہو جاتے کھانا بنانے کے لیے اسے اپنے ہاں رکھ لیتے ہیں۔ تمہیں بہت سہولت ہو جائے گی۔ بچوں کی بہت اچھے سے دیکھ بھال کر سکو گی۔ ٹھیک ہے نا......؟؟"

وہ پوچھ رہا تھا۔ اس نے بغیر سوچے سمجھے جھٹ اثبات میں سر ہلا دیا۔ اور پھر نروس سی ہو کر سلیب کی طرف دیکھنے لگی۔ وہ سمجھا کہ وہ سامنے موجود پھیلاوے سے پریشان ہے۔ اس لیے اس کی نظروں کے تعاقب میں دیکھتے ہوئے کان کھجا کر بولا۔

"ویری سوری......! ابھی کام نہیں کیا۔ اس لیے چیزیں کچھ زیادہ ہی بکھر گئی ہیں۔ ابھی کام والی آتی ہے تو اس سے صفائی کروا لینا۔" پھر وہ اس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے ایک سائیڈ سے نکلتا چلا گیا۔

اس کے جانے کے بعد اس نے غائب دماغی سے چائے بنائی۔ ٹرے میں ناشتہ کا سامان رکھا اور شہاب صاحب کو دے کر آئی۔ پھر اس نے مگ میں اپنے لیے چائے انڈیلی اور اپنے کمرے میں چلی آئی۔ معصوم فرشتے ہنوز سو رہے تھے۔ ان کو دیکھ کر بے ساختہ اس کے منہ سے نکلا۔

"واہ میرے مولا......!! کیا ظالم شے ہے یہ اولاد بھی۔"

اس کے ابا جان کہا کرتے تھے کہ جب اللہ تعالیٰ انسان کو اولاد جیسی نعمت سے سرفراز کرتا ہے تو وہ پھر پہلے جیسا نہیں رہتا۔ سر تا پا بدل جاتا ہے۔ آج اس نے اس کا عملی مظاہرہ بھی دیکھ لیا۔

وہ اکھڑ اور سرکش شخص جس کو اس کی ماں بہنیں نہ سدھار سکیں۔ بیوی نہ رام کر سکی۔ ان ننھے منے بچوں نے چند دنوں میں ہی اتنا بڑا کارنامہ سرانجام دے دیا۔

اسے بے اختیار سوئے ہوئے ننھے منوں پر ایک بار پھر ڈھیر سارا پیار آیا۔ اس نے باری باری دونوں کے روئی کے گالوں جیسے پاؤں کو ہلکا سا گدگدایا تو وہ نیند میں ہی یوں مسکرا دیے جیسے آج وہ بھی ماں کی بے پایاں خوشی میں شریک ہوں۔

❋

نادیہ ایک جھٹکے سے گھر کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئیں، صحن کے تخت پر بیٹھی سارا جو اونگھ رہی تھی دروازے کی آواز پر ہڑبڑا کر جاگ گئی۔

''اف یہ گرمی۔'' نادیہ اس کے برابر تخت پر بیٹھ کر کپڑوں کا شاپر رکھتے ہوئے بولیں اور ماتھے پر آئے پسینے کو دوپٹے سے صاف کیا۔

سارا جلدی سے اٹھ کر باورچی خانے کی

جانب بڑھ گئی اور کچھ ہی دیر میں وہ ہاتھ میں شربت کا گلاس لیے چلی آئی۔

''آپا جان! یہ لیجیے، شربت پی لیں۔'' سارا شربت کا گلاس ان کو پیش کرتے ہوئے بولی جسے وہ غٹاغٹ چڑھا گئیں، شربت پینے کے بعد وہ وہیں تخت پر نیم دراز ہو گئیں۔ سارا پاس ہی بیٹھ کر جلدی سے کپڑوں کا شاپر کھول کر بیٹھ گئی۔ نادیہ بازار سے اپنی دونوں بہنوں کے لیے لان کے سوٹ لائی تھیں۔

''آپا جان! یہ ریڈ کلر کا سوٹ تو میں لوں گی۔'' سارا لال رنگ کے سوٹ کو دیکھ کر جلدی سے بولی، جس پر نادیہ کے لبوں پر مسکراہٹ آ گئی۔

''ہاں میں جانتی ہوں، میری گڑیا کو لال رنگ کس قدر پسند ہے۔ میں نے تم دونوں کی پسند کے کپڑے لیے ہیں۔'' نادیہ کے لہجے میں اپنی چھوٹی بہنوں کے لیے پیار بول رہا تھا۔

''السلام علیکم۔'' شیما دروازہ کھول کر اندر آتے ہوئے زور سے سلام کرتی ہوئی بولی۔

''ارے آؤ شیما باجی۔ بڑے دن بعد چکر لگایا۔'' نادیہ رشتہ کرانے والی شیما کو آتا دیکھ کر بولیں۔

''بس کیا کروں میں بیمار پڑ گئی تھی۔'' شیما تخت پر بیٹھتے ہوئے بولی۔

''سارا! جاؤ بیٹا، شیما باجی کے لیے شربت لاؤ۔'' نادیہ کپڑے سمیٹ کر شاپر میں رکھتی سارا سے بولیں جس پر وہ اثبات میں سر ہلاتی شاپر اٹھا کر اندر چلی گئی۔

''کاشف کے لیے کوئی لڑکی تو دکھاؤ۔'' نادیہ بولیں۔

''ہاں دکھاتی ہوں، میری نظر میں پانچ چھ لڑکیاں ہیں۔'' شیما سارا سے جوس کا گلاس لیتے ہوئے بولی۔

''شیما باجی! میں گھر گھر جا کر نہیں دیکھوں گی، بس مجھے ایک دو دکھا دینا۔ پڑھی لکھی ہو لڑکی، لوگ شریف ہوں بس اور کچھ نہیں چاہیے۔''

''ارے جب تک لڑکے والے سو گھر نہیں دیکھ لیتے تب تک ان کو اپنے راجا کے لیے کوئی لڑکی پسند کہاں آتی ہے۔'' شیما ہنس کر بولی۔

''نہیں، میری ایسی سوچ نہیں بس جو ہے میرے کاشف کے نصیب کی، اللہ سامنے لے آئے بہتری کے ساتھ۔ کوئی اچھا لگتا ہے ہر لڑکی کے گھر جاؤ، ماؤں کو بھی آس ہوتی ہے' میری بھی جوان بہنیں ہیں جو میں اپنی بہنوں کے لیے پسند کروں گی وہی دوسروں کی بہنوں کے لیے بھی کروں گی۔ بس مطلب کی ایک دو لڑکیاں دکھا دو، اللہ نے چاہا پسند آ جائے گی۔'' نادیہ کی بات پر شیما سر ہلانے لگی۔

''چلو ٹھیک ہے، میں بتاتی ہوں تم کو۔ سارا کے لیے بھی اگر کوئی ہوا اچھے لڑکے کا لے کر آؤں گی۔'' شیما کھڑی ہوتے ہوئے بولی پھر سلام کرتے ہوئے چلی گئی۔

''سارا! کہاں ہو؟'' شیما کے جانے کے بعد نادیہ' سارا کو آواز لگانے لگیں۔

''جی، آپا جان۔'' وہ کمرے سے باہر آتے ہوئے بولی۔

''میرا بچہ! تہمینہ کو فون کرو۔ کہاں رہ گئی، ابھی تک کوچنگ سے نہیں آئی۔ شام ہو رہی ہے۔'' نادیہ بڑھتے اندھیرے کو دیکھ کر فکرمندی سے بولیں۔ سارا تخت پر رکھے سیل فون کو اٹھاتے ہوئے تہمینہ کو کال کرنے لگی۔

''آپا جان! وہ کہہ رہی ہے راستے میں ہوں، بس آ رہی ہوں۔'' سارا کے بتانے پر نادیہ کو اطمینان ہوا۔

''چلو میں جا کر کھانے کا دیکھوں۔ کاشف اور جلال آفس سے آتے ہوں گے۔'' وہ چپل پاؤں میں ڈالتی اندر باورچی خانے کی جانب بڑھ گئیں۔ سارا کسلمندی سے وہیں تخت پر نیم دراز ہو گئی۔

☆☆☆

آمنہ اور اسحاق کی سب سے بڑی بیٹی نادیہ تھیں۔ نادیہ جب نویں جماعت میں تھیں تب آمنہ بیگم کے ہاں کاشف کی پیدائش ہوئی، اس کے بعد آمنہ بیگم کے ہاں یکے بعد دیگرے سارا اور جلال کی پیدائش ہوئی مگر تہمینہ کی دفعہ آمنہ بیگم کی طبیعت اس قدر بگڑ گئی کہ اس کی پیدائش کے کچھ دنوں بعد ہی آمنہ بیگم وفات پا گئی تھیں۔

ماں کی وفات کے بعد نادیہ نے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کی ذمہ داری اپنے ناتواں کندھوں پر لے لی تھی۔ اسحاق صاحب بیوی کی وفات کے بعد بہت گم صم سے ہو گئے تھے۔ نادیہ اکیلی پورے گھر کو نہ صرف سنبھالتی تھی بلکہ انہوں نے اپنے چاروں بہن بھائیوں کو بہت لاڈ سے پالا۔ نادیہ کو گھر میں سب آپا جان کہتے تھے۔

وقت گزرا نادیہ کی شادی اسحاق صاحب کے دوست کے بیٹے نعمان سے ہوگئی۔ نادیہ کا پورا سسرال لاہور میں مقیم تھا۔ نعمان کی کراچی میں اچھی نوکری تھی تو وہ پچھلے دو برس سے کراچی میں مقیم تھے۔ خوش قسمتی سے نعمان کا گھر اگلی گلی میں تھا اسحاق صاحب نے مطمئن ہو کر ہاں کر دی، شادی کے بعد نادیہ کو اطمینان تھا کہ ان کے بہن بھائی ان کے قریب ہیں، جب دل چاہا آرام سے مل سکتی ہیں۔

شادی کے بعد بھی نادیہ کے بہن بھائی ایسے ہی حق جتاتے تھے جتنا شادی سے پہلے۔ کوئی بھی کام یا بات ہوتی بلا جھجک آکر نادیہ سے کہہ دیتے تھے۔ نعمان بھی زیادہ بیوی کے معاملات میں کچھ نہ بولتے تھے۔

ابھی نادیہ کی شادی کو تین برس ہی ہوئے تھے کہ اسحاق صاحب کا بھی انتقال ہو گیا۔ باپ کی وفات کے بعد نادیہ کا شام سے رات تک کا وقت اپنے میکے میں ہی گزرتا تھا۔

''آپا جان! آج رک جائیں ناں۔'' رات تہمینہ کھانے کی ٹیبل پر بولی۔

''نہیں بیٹا! اب بس گھر جاؤں گی۔ منیب اور ماہا میرا انتظار کر رہے ہوں گے۔'' وہ اپنے بچوں کا نام لیتے ہوئے بولیں۔

''آپا جان! ایسا کریں، آپ ان دونوں کو یہیں بلا لیں۔'' سارا بولی۔

''ہاں ناں آپا جان! مزہ آئے گا۔ رات بھر جاگ کر خوب ساری باتیں کریں گے۔'' جلال بھی اصرار کرنے لگا۔ ''بس آپا! آپ یہیں رک رہی ہیں۔ نعمان بھائی کو فون کر دیں بلکہ یہ لیں ابھی کریں۔'' کاشف اپنا سیل فون نادیہ کے ہاتھ میں پکڑاتے ہوئے بولا۔

''تم لوگ بھی ناں، ابھی تک بچے بنے ہوئے ہو'' وہ مسکراتے ہوئے نعمان کو کال کرنے لگیں۔ دوسری ہی بیل پر نعمان نے فون اٹھا لیا تھا۔

''نعمان! آج میں یہی رہوں گی۔ یہ لوگ بہت ضد کر رہے ہیں۔''

''مگر ابھی تو تم دو دن رہ کر آئی تھیں۔'' نعمان، نادیہ کی بات پر بولے۔

''ہاں نا، کیا کروں۔ اب ضد کر رہے ہیں۔'' نادیہ کے لہجے میں اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کے لیے پیار ہی پیار بول رہا تھا۔

''اچھا ٹھیک ہے۔'' نعمان پھیکے لہجے میں بولے۔

''بچوں سے پوچھ لیں، وہ آ رہے ہیں۔'' نادیہ کے پوچھنے پر نعمان بچوں سے پوچھنے لگے۔

''نہیں۔ بول رہے ہیں ہم نہیں آرہے۔''

''چلیں ٹھیک ہے۔ ان سے بولیے گا، اپنا خیال رکھیں۔'' نعمان کی بات پر وہ خدا حافظ کہہ کر فون بند کر گئیں۔

''آپا جان! ذرا اپنی کالج کی شرارتیں تو سنائیں۔'' کاشف لاڈ سے نادیہ کا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولا۔

''ارے کتنی بار سنو گے۔'' نادیہ کاشف کی بات پر ہنستے ہوئے بولیں مگر اس کے اصرار پر ایک بار پھر کالج کے شرارت بھرے قصے سنانے لگیں جسے سن کر ہمیشہ کی مانند سب کی ہنسی کے فوارے چھوٹ گئے۔

''آہستہ۔ رات کے دو بج رہے ہیں۔'' نادیہ ان کے زور زور سے ہنسنے پر وقت کی نزاکت کا احساس دلاتے ہوئے بولیں۔

''آپا جان! اپنے ہاتھ کی مزیدار سی چائے تو پلادیں۔'' جلال کی فرمائش پر وہ اٹھ کر سب کے لیے چائے بنانے کے لیے کھڑی ہو گئیں۔

''آپا جان! بہت بھوک لگ رہی ہے۔'' تہمینہ کمرے میں بیٹھے بیٹھے بولی۔

''کیا کھاؤ گی؟'' وہ وہیں باورچی خانے سے اس سے پوچھنے لگیں۔

''آلو کے چپس۔'' تہمینہ کی بات پر نادیہ مسکراتے ہوئے آلو ٹوکری سے نکالنے لگیں۔

''پلیز زیادہ بنایے گا۔'' سارا بولی۔

تھوڑی دیر بعد نادیہ ٹرے میں گرم گرم بھاپ اڑاتی چائے کے ساتھ آلو کے چپس تل کے لے آئیں۔

''واہ آپا جان! مزا آ گیا۔'' جلال جلدی سے گرم گرم چپس کیچپ میں ڈبو کر کھاتے ہوئے بولا۔

ہنسی مذاق کرتے ہوئے وقت کا پتا ہی نہیں چلا۔ فجر کی اذان کی آواز پر نادیہ چونکیں۔

''ہیں...... صبح ہو گئی۔'' وہ حیرانی سے بولیں۔

''آپا جان! آپ تو ایسے بول رہی ہیں جیسے پہلی بار ہم ایسے جاگے ہوں۔ ہمیں تو ہر بار ہی باتوں میں صبح ہو جاتی ہے۔'' سارا ہنستے ہوئے بولی۔

''چلو اب سو جاؤ، مگر پہلے نماز ادا کر لینا۔'' وہ کمرے کے کونے میں رکھی ٹرے اٹھاتے ہوئے بولیں۔

''کیا ہوا، منہ کیوں ایسے لٹکائے ہوئے ہو۔''

وہ فجر کی نماز پڑھ کے آئیں تو جلال کو صحن میں بیٹھا دیکھ کر بولیں۔

''بھوک لگ رہی ہے آپا جان!'' وہ مسکین سی شکل بنا کر بولا۔

''ہیں...... ابھی کچھ گھنٹوں پہلے تو چپس کھائے ہیں۔'' سارا بولی۔

''خبردار، میرے بھائی کو مت ٹوکو۔'' وہ سارا کو ڈپٹتے ہوئے بولیں۔

''کیا کھائے گا میرا بھائی۔ آلو کا پراٹھا بنا دوں؟'' نادیہ کے پوچھنے پر وہ بچوں کی طرح خوش ہوتے ہوئے اثبات میں سر ہلانے لگا۔

اس کے اس طرح سے سر ہلانے پر ان کو بے اختیار پیار آ گیا۔

''آپا جان! ہم نے بھی کھانا ہے۔'' سارا بولی۔

''کیوں تمہارا تو پیٹ بھرا ہوگا۔ ابھی تو آلو کے چپس کھائے تھے۔'' جلال اسے گھورتے ہوئے بولا۔

''میں سب کے لیے بنا رہی ہوں۔ کوئی کسی کو کچھ نہ بولے۔'' نادیہ کی بات پر سارا جلال کو منہ چڑانے لگی۔

''اچھا، میں اب جا رہی ہوں۔ رات کے لیے میں نے چاول پکا دیے ہیں۔'' نادیہ شام کی چائے کے بعد چادر اوڑھتے ہوئے سارا اور تہمینہ سے مخاطب ہوئیں۔

''آپا جان! اب کب آئیں گی؟'' تہمینہ ان کے گلے سے لٹکتی ہوئی بولی۔

''ابھی تو جا رہی ہوں لڑکی۔'' وہ اس کی بات پر ہنستے ہوئے بولیں۔ ''اور تم تو ایسے پوچھ رہی ہو کب آئیں گی جیسے میں دنوں میں آتی ہوں۔ روز تو میں چکر لگاتی ہوں۔'' وہ اس کے سر پر پیار سے چپت لگاتے ہوئے بولیں۔

”میرا مطلب ہے رہنے کب آئیں گی۔“
”ہاں، آجاؤں گی کچھ دنوں میں۔ میرا تو خود دل اپنے چھوٹے بہن بھائیوں میں اٹکا رہتا ہے۔“
وہ پیار سے اپنی دونوں بہنوں کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

☆☆☆

”آپ کچھ چپ چپ سے ہیں؟“ نادیہ جب سے گھر آئی تھیں، محسوس کر رہی تھیں نعمان بہت خاموش سے ہیں۔ اب بھی وہ بیڈ پر لیٹے ٹی وی دیکھتے ہوئے انتہائی خاموش تھے۔ جب سے نادیہ آئی تھیں، انہوں نے ان سے ایک بات نہیں کی تھی۔
”کوئی بات ہوئی ہے۔“ نادیہ شوہر کی خاموشی پر بولیں۔
”نہیں۔ کوئی بات نہیں ہوئی۔“ وہ رکھائی سے کہتے ہوئے ٹی وی بند کر کے کروٹ بدل کر لیٹ گئے۔ نادیہ حیرانی سے نعمان کو دیکھنے لگیں۔ وہ پہلی بار ان کا اس قدر روکھا رویہ دیکھ رہی تھیں۔
اگلے دن ناشتے کی میز پر بھی نعمان چپ تھے۔
”نعمان! کیا ہو گیا ہے؟“ نادیہ نعمان کا کھنچا کھنچا انداز دیکھ کر پریشانی سے بولیں۔
”آپ کو میری فکر ہے؟“ نعمان کے سوال پر نادیہ دنگ رہ گئیں۔ نعمان نے کبھی اس انداز میں بات نہیں کی تھی، وہ تو بہت ٹھنڈے مزاج کے تھے۔
”میں آپ سے پوچھ رہا ہوں۔ شادی کو اتنے برس بیت گئے، آپ کو کبھی میری فکر ہوئی۔ آپ کی زندگی کا محور تو بس آپ کے چھوٹے بہن بھائی رہے، باقی اور کوئی رشتہ نہیں۔ شوہر، بچے کوئی بھی آپ کی زندگی میں اتنا اہم نہیں۔“
نعمان کی بات پر نادیہ کی آنکھوں میں حیرت اتر آئی۔
”میں چپ رہ کر کبھی نظر انداز کر کے ہر طرح سے اس کوشش میں ہوں کہ شاید آپ کو خود احساس ہو جائے مگر آج کل وہ زمانہ ہے جب تک آپ حلق کے بل چلا کر سامنے والے کو اس کی غلطی کی نشاندہی نہ کریں تب تک دوسرے میں احساس جاگتا ہی نہیں ہے، آپ کو کبھی اس بات کا اندازہ ہوا کہ آپ کے وہاں وقت گزارنے سے یہاں بچے کتنے نظر انداز ہوتے ہیں۔“
نعمان افسوس سے نادیہ کو دیکھتے ہوئے بولے۔
”میں بچوں کو بلاتی ہوں مگر وہ خود ہی نہیں آتے۔“ نادیہ نعمان کی بات پر بولیں۔
”ہاں تو وہ کیوں آئیں، کیا ہر وقت وہ وہیں بیٹھے رہیں۔ ان کا اپنا گھر نہیں ہے۔“
نعمان کی بات پر نادیہ اپنا غصہ ضبط کرنے لگیں۔
”وہ کسی غیر کا گھر نہیں ان کی نانی کا گھر ہے اور جن کے بارے میں آج آپ کے لہجے میں بولتے ہوئے تلخی در آئی ہے وہ میرے بہن بھائی ہیں۔ ماں کی موت کے بعد میں نے ان کو ماں بن کے پالا ہے۔ سارا وقت تو سارا اور تہمینہ ہی گھر کو دیکھتی ہیں۔ کیا ہوا اگر شام میں جا کر میں کھانا بنا دیتی ہوں۔ ویسے بھی ابھی سارا اور تہمینہ چھوٹی ہیں۔“
نادیہ ناگواری سے بولیں۔
”آپ کی اطلاع کے لیے عرض ہے کہ آپ کے چھوٹے بہن بھائی اب اتنے چھوٹے نہیں۔ کاشف ماسٹر کر کے نوکری کر رہا ہے۔ سارا گریجویٹ ہے اور ایک اسکول میں پڑھاتی ہے جبکہ جلال ایم بی اے کر چکا ہے اور وہ بھی نوکری کر رہا ہے اور سب سے چھوٹی تہمینہ وہ بھی ماسٹرز کر رہی ہے۔ اب یہ الگ بات ہے آپ نے ہتھیلی کا چھالا بنا لیا ہے اپنے چھوٹے بہن بھائیوں کو۔“
وہ چبا چبا کر بولے۔
نادیہ کو یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب نعمان بول رہے ہیں۔
”مجھے بہت ناز تھا میرے میاں بہت مختلف ہیں اور مردوں سے مگر افسوس آپ بھی وہی عام مرد نکلے۔“ نادیہ افسوس سے کہتی ہوئی کھڑی ہو گئیں۔

"ایک بات یاد رکھیے گا نادیہ! اپنے گھر کے معاملے میں سارے مرد ایک جیسے ہوتے ہیں اور سب ہی توجہ چاہتے ہیں۔ چاہے وہ عام ہو یا خاص۔" نعمان کی بات پر نادیہ گہرا سانس بھر کے رہ گئیں۔

کتنے ہی دن نادیہ منتظر رہیں کہ نعمان اپنی غلطی پر نادم ہوں مگر وہ ایسے رہے جیسے انہوں نے کوئی غلط بات کہی ہی نہیں۔ کچھ دن تو نادیہ سوچ سوچ کے کڑھتی رہیں مگر پھر خود ہی ٹھیک ہو گئی تھیں مگر ان کے دل میں یہ قلق تھا کہ نعمان کے دل میں اب پہلے کی طرح ان کے بہن بھائیوں کے لیے گنجائش نہیں رہی۔

☆☆☆

شیما نے جو لڑکی دکھائی تھی وہ کاشف کے لیے پسند آ گئی تھی۔ ثوبیہ اچھی، سلجھی ہوئی لڑکی تھی۔ پہلی نظر میں ہی نادیہ کو وہ بھا گئی تھی۔ کاشف کی منگنی کے کچھ دن بعد سارا کا بھی بہت اچھی جگہ سے رشتہ آ گیا تھا۔ نادیہ نے یہ طے کیا وہ سارا اور کاشف کی شادی ایک ساتھ کر دیں گی۔

"آپا جان! اس میں اب کیا جائے گا۔" سارا باورچی خانے میں کھڑی پتیلی میں کفگیر چلاتی ہوئی پوچھنے لگی۔ سارا کے شادی کے دن قریب آ رہے تھے وہ روزانہ نت نئے کھانے نادیہ سے سیکھ رہی تھی۔

"کیا تھا پہلے سیکھ جاتیں۔ ہمیں بھی کچھ فائدہ ہو جاتا۔" تہمینہ شرارت سے بولی۔

"ایسا کرو اب تم سیکھ جاؤ تاکہ میں جب آؤں تو تمہارے ہاتھ کے بھی کھانے کھاؤں۔" بریانی بناتی سارا شوخی سے بولی۔

"منہ دھو رکھو، تمہاری خاطر مدارت آپا جان ہی کریں گی، ویسے بھی جو لذت ان کے ہاتھوں میں ہے اس کی تو بات ہی الگ ہے۔" تہمینہ نادیہ کی پشت سے لگتی ہوئی بولی۔

"بس ہو گیا مکھن تو اب یہ مسالا پکڑاؤ۔" نادیہ ہنستے ہوئے بولیں۔

"ویسے ایک بات ہے تم لوگوں نے کبھی میری خاطر تو کی ہی نہیں۔ مجھے کبھی تو کبھی یہ سعادت ملے۔" نادیہ کی بات پر وہ دونوں جھینپی جھینپی سی ہنسی ہنس دیں۔

"اتنا شاندار انتظام کیا ہے، واقعی میں بھائی کی بری ہو یا بہن کا جہیز۔ کسی چیز میں کوئی کمی نہیں چھوڑی۔" نادیہ کی چچازاد مہوش نادیہ سے بولی۔

"بس کرم ہے اللہ کا کہ اس نے عزت سے ہر کام کرا دیا۔ اب خیر سے تہمینہ اور جلال کی بھی اچھی جگہ شادی ہو جائے تو مجھے سکون آئے۔" نادیہ کے لہجے میں ماؤں والی فکر بول رہی تھی۔

"سچ میں نادیہ! تم نے اپنے چاروں بہن بھائیوں کو ماں کے بعد جس طرح سے پالا اور ان کو بے تحاشا محبت اور اپنا سارا وقت ان کے ساتھ صرف کیا بہت بڑی بات ہے ورنہ آسان نہیں ہوتا۔ شادی کے بعد بھی یوں میکے کو دیکھنا، سسرالیوں کو تو بس یہ ہوتی ہے اب ہمیں دیکھو۔" راحیلہ چچی کی بات پر نادیہ فقط مسکرا کے رہ گئیں۔

☆☆☆

"آپا جان! آپ کو وہ خاتون بلا رہی ہیں۔"

تہمینہ اپنے شرارے کو سنبھالتی ہوئی آئی تو نادیہ اس کی بات پر آگے بڑھ گئیں۔ آج سارا کی بارات اور کاشف کا ولیمہ تھا۔ وہ اسٹیج پر دلہن بنی بیٹھی سارا کو دیکھنے لگیں جو بہت پیاری لگ رہی تھی۔

"ننھی سی سارا، جو میری گود میں کھیل کر بڑی ہوئی آج اپنی آپا جان کو چھوڑ کر پیا کے سنگ رخصت ہو رہی ہے۔" وہ اس کے پاس آتی شوخی سے بولیں مگر ان کا لہجہ بھرا گیا۔ وہ خود پر ضبط کرنے لگیں۔ سارا کی بھی آنکھوں میں آنسو چمکنے لگے۔

"خبردار، جو روئی۔ اتنا مہنگا میک اپ ہے تمہارا۔" تہمینہ جو چھپ کر کئی بار رو چکی تھی، سارا کے

پاس آتی ہوئی گھور کر بولی جس پر نادیہ اور سارا کو بے اختیار ہنسی آ گئی۔

رخصتی کے وقت نادیہ جو خود پر کب سے ضبط کی ہوئی تھیں ان کے آنسو بے اختیار ٹوٹ کر ان کے گالوں پر بہنے لگے۔

''سدا سکھی رہو میری جان۔ کوئی غم چھو کر بھی نہ گزرے۔'' وہ سارا کو خود میں سموتی ہوئی صدق دل سے دعا دینے لگیں۔

☆☆☆

شادی کے ہنگاموں نے اس قدر تھکا دیا تھا کہ دنوں نادیہ کو تھکن رہی۔ آسان تو نہیں تھا دونوں بہن بھائی کی شادی تیاری کرنا۔ ابھی شادی کی تھکن نہ اتری تھی کہ سارا کی شادی میں اس کی ساس کی سہیلی کو اپنے بیٹے کے لیے تہمینہ اس قدر پسند آئی کہ وہ کچھ دنوں بعد تہمینہ کا رشتہ لے کر آ گئیں۔

نادیہ جو ابھی بھائی بہن کی شادی کی تھکن اتار ہی رہی تھیں۔ تہمینہ کے لیے آنے والے رشتے پر بوکھلا سی گئیں مگر ان کو عثمان بہت پسند آیا تھا۔ انہوں نے سوچنے کا وقت مانگا تھا، اسی سلسلے کے لیے انہوں نے شام کی چائے پر سارا اور بلال کو بھی بلا لیا تھا۔

''میں نے تم کو مشورے کے لیے بلایا ہے۔ عثمان تمہاری والدہ کی سہیلی کا بیٹا ہے، تم لوگوں کے پڑوس میں بھی کافی عرصے سے رہ رہا ہے۔ تم مجھے اس کے بارے میں زیادہ بہتر بتا سکتے ہو۔'' نادیہ چائے پیتے سارا کے شوہر بلال سے بولیں۔ اس وقت سب ہی وہاں موجود تھے۔

''آپا! عثمان بہت اچھا لڑکا ہے، میں اس کو ایک عرصے سے جانتا ہوں۔ میں نے اسے بھی کسی برائی میں نہیں دیکھا بلکہ وہ تو اپنے اچھے اخلاق کی وجہ سے سب کو بہت پسند ہے۔ باقی آپ بڑے ہیں جو آپ کو مناسب لگے۔'' وہ سامنے بیٹھے نعمان اور نادیہ کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''نعمان بھائی! آپ کچھ نہیں بولیں گے۔'' ان کو خاموش بیٹھا دیکھ کر بلال بولا۔

''نہیں، میں زیادہ کچھ نہیں بولتا۔'' نعمان سادگی سے بولے جس کو کسی نے محسوس کیا ہو یا نہیں مگر سامنے بیٹھے بلال نے ضرور محسوس کیا تھا۔

''میری مانیں تو آپا جان! تہمینہ کے ساتھ ساتھ اپنے جلال کی بھی شادی کر دیں۔'' ثوبیہ سامنے بیٹھے جلال کو دیکھتے ہوئے شرارت سے بولی۔

''جی جی نیکی اور پوچھ پوچھ۔ ایسی عظیم بھابھی کو سات توپوں کی سلامی دینی چاہیے۔'' جلال کے شوخی سے کہنے پر سب ہی ہنسنے لگے۔

''میں بھی یہی چاہتی ہوں۔ اچھے سے دونوں کی شادی ساتھ ہو جائے گی۔'' نادیہ ثوبیہ کی بات کی تائید کرتے ہوئے بولیں۔

''آپا جان! آپ کی عظمت کو سلام۔'' جلال ان کا ہاتھ تھام کے چومتے ہوئے بولا۔

''چل ہٹ۔ شریر۔'' وہ اس کی کمر پر دھموکا مارتے ہوئے بولیں۔

''بچے سو گئے کیا۔'' واپسی میں نعمان کے ساتھ وہ گھر میں داخل ہوئیں تو لاؤنج میں بے خبر سوئے بچوں کو دیکھتے ہوئے بولیں۔

''جی کب تک تکتے آپ کی راہ، آخر کو تھک ہار کر سونا ہی تھا۔'' نعمان کہتے ہوئے بیڈروم میں چلے گئے۔

''نعمان! آپ کو کیا ہوتا جا رہا ہے، آپ پہلے اتنے عجیب تو نہ تھے۔'' نادیہ پیچھے پیچھے کمرے میں آتے ہوئے بولیں۔

''میں تو ہوں ہی عجیب۔'' نعمان الماری کا پٹ زور سے بند کر کے چینج کرنے کی غرض سے واش روم میں گھس گئے نادیہ لب بھینچ کے رہ گئیں۔

''آپ وہاں بھی اتنے بیزار بیٹھے تھے جیسے آپ کو کسی معاملے سے کوئی سروکار نہیں تہمینہ آپ کی بھی چھوٹی بہنوں کی طرح ہے۔'' نادیہ نعمان کو واش

روم سے نکلتا دیکھ کر بولیں جس کا نعمان نے کوئی جواب نہیں دیا۔ نادیہ کی جان جل کر رہ گئی۔

''آپ کو میرے بہن بھائیوں سے کیا مسئلہ ہے۔'' نادیہ بولی۔ وہ بہت دنوں سے محسوس کر رہی تھیں کہ نعمان کے انداز میں ان کے گھر والوں کے لیے پہلے جیسی گرم جوشی نہیں رہی تھی۔

''نادیہ! مجھے کبھی مسئلہ نہیں ہوا آپ کے بہن بھائیوں سے مگر ہر رشتے میں توازن کا ہونا نہایت ضروری ہے۔'' وہ ان کی بات پر نرمی سے بولے۔

''تو آپ بتائیں میں گھر صاف نہیں رکھتی، کھانا نہیں پکاتی، کپڑے وقت پر آپ کو صاف ستھرے نہیں ملتے۔'' نادیہ ان کو گھر کے کام گنوانے لگیں۔ بیوی کی بات پر وہ گہرا سانس بھر کے رہ گئے۔

''گھر صاف کرنا یا پکانا ہی سب کچھ نہیں ہوتا نادیہ! ایک چیز ہوتی ہے وقت جس کی مجھے بھی ضرورت ہے اور آپ کے بچوں کو بھی مگر ہمارے حصے کا سارا وقت آپ اپنے میکے والوں کو دے آتی ہیں اور جب واپس آتی ہیں تو آپ کے پاس ماسوائے ہمارے لیے تھکن کے کچھ نہیں ہوتا۔''

''نعمان! یہ آپ کے لیے کچھ نہیں، اگر وقت پر کھانا نہ پکے، گھر صاف نہ ملے۔'' نادیہ افسوس سے بولیں۔

''نادیہ! آپ میری بات ہی نہیں سمجھ رہیں یا شاید میں آپ کو سمجھا نہیں پا رہا۔'' نعمان مزید بحث سے بچنے کے لیے ٹی وی کھولتے ہوئے بولے۔ نادیہ بھی چپ ہوگئیں۔

''صاف بات ہے سارا مسئلہ میرے بہن بھائیوں سے ہے۔'' وہ دل ہی دل میں شوہر سے بدگمان ہوئیں۔

☆☆☆

''مجھے تو ثوبیہ کی خالہ زاد تانیہ بہت اچھی لگی ہے، اپنے جلال کے لیے جب ہمیں ثوبیہ کی خالہ نے اپنے ہاں چائے پر بلایا تھا تو ثوبیہ کی کزن تانیہ کس قدر محبت سے مل رہی تھی جیسے کتنی پرانی جان پہچان ہو اور جس قدر سلیقے سے ہر چیز پیش کر رہی تھی اسے دیکھ کر لگ رہا تھا دوسری ثوبیہ ہے۔'' نادیہ بولیں۔ آج نادیہ نے اپنے ہاں رات کھانے پر سب کو بلایا تھا اور کھانے کے بعد جب سب بیٹھے باتیں کر رہے تھے تو جلال کی شادی کی بات چھڑی تھی۔ نادیہ کی بات سے سب ہی متفق تھے، سب کو ہی تانیہ بہت اچھی لگی تھی۔

''منیب، ماما! آپ کو بولنا منع ہے؟'' بلال جو کافی دیر سے ان کو خاموش بیٹھا دیکھ رہا تھا۔ پیار سے ان دونوں کو دیکھتے ہوئے بولا۔

''یہ اپنے بابا پر ہیں، بہت کم گو ہیں۔'' نادیہ بچوں کو دیکھتے ہوئے مسکراتے ہوئے بولیں جو کچھ کنفیوز سے ماں کی شکل دیکھ رہے تھے۔

تانیہ کے والدین کو جلال کا رشتہ بہت پسند آیا تھا اور کچھ دنوں بعد ہی انہوں نے ہاں کر دی تھی۔

☆☆☆

''شکر اللہ کا کہ اس نے ہر کام عزت و آبرو کے ساتھ کرا دیا۔'' نادیہ تہمینہ کے ولیمے سے واپسی میں گاڑی چلاتے نعمان سے بولیں جس پر وہ محض سر ہلا کر رہ گئے۔

آج تہمینہ کا ولیمہ تھا۔ تہمینہ کا خوشی سے چمکتا چہرہ دیکھ کر نادیہ اندر تک شاد ہوگئی تھیں۔

تانیہ کے آنے سے بھی گھر میں کافی رونق ہوگئی تھی نادیہ اسی طرح شام میں چکر لگا لیتی تھیں۔

آج چھٹی کا دن تھا۔ نادیہ شام میں وہیں تھیں۔ شام کی چائے اور سینڈوچ نادیہ نے ہی بنائے سب مل کر بیٹھے ہنسی مذاق کر رہے تھے کہ پرانی باتیں نکلیں تو نادیہ بولیں۔

''ارے ثوبی! تانی میں تم لوگوں کو اپنی کالج کی شرارتیں سناتی ہوں۔'' وہ شوق سے ان دونوں سے بولیں جس پر وہ دونوں نادیہ کی جانب متوجہ ہوگئیں مگر کچھ دیر بعد انہوں نے محسوس کیا کہ وہاں بیٹھے

کاشف اور جلال جو ہر بار اصرار کر کے ان سے سننے کی فرمائش کرتے تھے۔ آج ان کا انداز نادیہ کو کچھ بیزار سا لگا۔ تانیہ اور ثوبیہ بھی بے توجہی سے ان کو سن رہی تھیں ان کا دھیان بھی ادھر ادھر تھا۔ یہ دیکھ کر نادیہ یک دم جھینپ کر چپ سی ہو گئیں، ان کی خاموشی کو کسی نے محسوس نہیں کیا تھا اور وہ چاروں آپس میں باتوں میں لگ گئے۔ پہلی بار نادیہ کو اپنا آپ مس فٹ سا محسوس ہوا وہ خاموشی سے وہاں سے کھڑی ہو گئیں۔

''آپا! کہاں جا رہی ہیں؟'' جلال ان کو اٹھتے دیکھ کر بولا۔ اس سے پہلے وہ خفگی سے کچھ کہتیں کاشف بولا۔

''آپا! کیا چائے بنانے جا رہی ہیں؟''

''ہاں چائے بنانے جا رہی ہوں۔'' وہ آہستگی سے کہتی ہوئیں باورچی خانے کی جانب بڑھ گئیں۔

''آپا پلیز میں بھی پیوں گا۔'' جلال کی آواز پر پھیکی سی مسکراہٹ نادیہ کے لبوں پر آ گئی۔

چائے بنا کر وہ آئیں تو کاشف اور ثوبیہ وہاں موجود نہیں تھے۔

''یہ دونوں کہاں گئے؟'' وہ جلال اور تانیہ سے بولیں۔

''اپنے کمرے میں گئے ہیں۔'' جلال بولا۔

''اچھا میں دے آتی ہوں ان کو چائے وہیں پر۔'' وہ دو کپ الگ ٹرے میں رکھ کے ان کے کمرے کی جانب بڑھ گئیں۔

''بھئی کیا مسئلہ ہے تمہاری آپا جان کے ساتھ۔ ہر وقت سر پر سوار رہتی ہیں۔ بس بھئی شادی کر دی بھائیوں کی، اب ان کو بھی آزادی کا موقع دیں۔ لیکن نہیں یہاں تو وہ خود ہی روزانہ ٹپک جاتی ہیں۔ بندہ نہ کہیں آنے کا نہ جانے کا، اتنا تھوڑی سر پر سوار ہوا جاتا ہے۔'' اندر سے ثوبیہ کی جھنجلائی آواز سنائی دی۔ یہ وہ لب ولہجہ تو نہ تھا جو نادیہ کے سامنے محبت برساتا ہوا معلوم ہوتا تھا۔ اس لہجے میں تو زمانے بھر کی بیزاریت تھی۔

''اچھا پیاری بیگم! ریلیکس۔ تمہارا آپا کیا بگاڑ رہی ہیں۔ کیوں فالتو میں غصہ ہو کر میری پیاری سی بیوی اپنا بی پی بڑھا رہی ہے۔'' کاشف کی آواز آئی جس کا لہجہ چاشنی میں ڈوبا ہوا تھا۔ باہر کھڑی نادیہ کو بہت زور کا چکر آیا تھا۔ انہوں نے سہارے کے لیے دیوار کو تھاما، وہ بمشکل چائے کی ٹرے پکڑے ہوئے تھیں۔

''پہلے جلال کی شادی پر اپنی پسند کا جوڑا دلا دیا تھا، ہر چیز میں آپا جان نے اپنی مرضی کرنی ہے۔'' ثوبیہ غصے سے بولی۔

''اوہ ہو۔ تو تم نہیں لیتیں ناں، منع کر دیتیں۔'' کاشف بولا۔

''بس کیا کروں، مروت میں نہیں بول پائی اور اس تانیہ کو دیکھیں، کس قدر ہوشیار ہے۔ بول رہی ہے اچھا ہے آنے دیا کرو۔ آپا جان کو کم از کم روز رات کا کھانا بنا کر تو جاتی ہیں۔'' نادیہ سے مزید کچھ نہیں سنا گیا۔ وہ وہاں سے تیزی سے ہٹ گئیں ان کی سماعتیں جو کافی دیر سے یہ سننے کو منتظر تھیں کہ کاشف شاید ان کے حق میں کچھ بولے۔ اب وہ ڈر کر وہاں سے ہٹ گئی تھیں کہ وہ ایسی بات نہ کہہ دے جسے سن کر ان کا مزید دل ٹوٹ کر بکھر جائے۔ وہ چادر اوڑھ کر خاموشی سے وہاں سے نکل آئیں ان کو لگ رہا تھا انہوں نے جو سنا وہ غلط ہے۔

نادیہ کے دل کو بڑا زبردست دھچکا لگا تھا۔

''چھوڑو۔ یہ بھائی ہوتے ہی ایسے ہیں۔ سب کچھ بھول جاتے ہیں۔'' وہ بار بار آنکھوں میں آئے آنسو صاف کرتی ہوئی دل کو جھوٹی تسلی دینے لگتیں مگر پورا دن وقفے وقفے سے وہ اپنی گیلی آنکھیں صاف کرتی رہیں ان کو لگ رہا تھا ان کی عمر بھر کی ریاضت ایک لمحے میں ختم ہو گئی۔

''کیا رشتے ایسے ہوتے ہیں جن کو آپ اپنے خالص جذبوں سے پروان چڑھاؤ وہ اس طرح سے ان کو اپنی خود غرضی کی بھینٹ چڑھا دیتے ہیں۔ کیا اپنوں کا رشتہ خالص نہیں۔ ضروری ہے اس رشتے میں بھی ملاوٹ ہو میں نے تو کبھی ایسا نہیں سوچا تھا کہ جن کے لیے میں اتنی مخلص رہی وہ میرے لیے ہی دل میں کھوٹ رکھتے ہوں گے۔ مجھے ثوبیہ سے شکوہ نہیں وہ تو غیر تھی مگر کاشف تو میرا اپنا تھا جن رشتوں کے لیے میں اپنے شوہر سے بدگمان ہو جاتی تھی۔ وہ میرے پیچھے میرے لیے فقط ایک لفظ نہ بول سکے۔ آج جو اکتاہٹ میں نے جلال اور کاشف کے رویے میں دیکھی تھی اس لمحے میں مجھے اپنے مقام کا تعین کرنے میں دیر نہیں لگی۔ میرا شاید اب کام ختم۔ اب میری ان لوگوں کو ضرورت نہیں رہی۔'' نادیہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپا کر بچوں کی مانند پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ سب سے تکلیف دہ امر ہوتا ہے جب آپ کو یہ پتا چل جائے کہ اگلا تو بس آپ کے خالص جذبات سے کھیل کر محض وقت گزاری کر رہا تھا۔

☆☆☆

اگلے دن نادیہ الماری کی صفائی کر رہی تھیں کہ ان کو سارا کی سونے کی انگوٹھی نظر آئی جو سارا ان کے گھر ہی بھول کر چلی گئی تھی۔

''ایسا کرتی ہوں اس کو دے آتی ہوں۔'' شام میں وہ اس کی طرف چلی گئیں دروازہ کام والی نے کھولا وہ اندر چلی آئیں۔ سارا کے کمرے سے تہمینہ کی آواز سن کر نادیہ کو خوش گوار سی حیرت ہوئی مگر سارا کی آواز پر ان کے قدم رک سے گئے۔

''تہمینہ! میں اتنے دن سے بلال سے کہہ رہی ہوں کہ میں میکے رہنے نہیں گئی۔'' سارا کی خفگی بھری آواز ابھری۔

''میں نے کہا تھا سارا کہ بس صبح سے رات تک کے لیے چلی جانا۔'' بلال کی آواز آئی۔

''میں نہیں چاہتا کل کو ہمارے بچے تمہاری آپا جان کے بچوں جیسے ہو جائیں۔ تم نے کبھی غور سے دیکھا ہے ان بچوں کو، کتنا عجیب احساس ہوتا ہے ان بچوں کو دیکھ کر۔ بالکل گم صم سے، جب ماں ہی ہر وقت میکے میں موجود ہو گی اور اپنے بچوں کو نہیں دیکھے گی تو کیا خاک بچوں کی پرورش ہو گی۔ بچے کو ماں کی ضرورت ہوتی ہے، ماں کی محبت اور توجہ ہی اس کو اعتماد بخشتا ہے۔''

نادیہ کو لگ رہا تھا وہ زیادہ دیر کھڑی رہیں تو ان کے دل کو کچھ ہو جائے گا۔ وہ وہاں سے پلٹنے والی تھیں کہ تہمینہ کی آواز ابھری۔

''بلال بھائی! بالکل ٹھیک بول رہے ہیں سارا! پہلے اپنا گھر ہے۔'' یہ وہی تہمینہ تھی جو نادیہ کو ضد کر کر کے روکا کرتی تھی اور نادیہ بہن کی محبت کے ہاتھوں مجبور ہو کر ہر بات مان جایا کرتی تھیں۔

وہ مردہ قدموں سے خود کو گھسیٹتی ہوئی واپس چلی آئیں۔ گھر آ کر بھی وہ کتنی دیر ساکت سی رہیں وہ جو خود کو بہت عقل مند سمجھتی تھیں۔ ان کو لگ رہا تھا ان سے زیادہ تو کوئی بے وقوف تھا ہی نہیں۔

''مما آپ رو رہی ہیں۔'' تیرہ سالہ ماہا ان کے گال پر بہتے آنسو صاف کرتی ہوئی بولی۔

''نہیں تو بیٹا! مما کہاں رو رہی ہیں۔'' وہ تیزی سے آنسو صاف کرنے لگیں۔

''مما! آپ کچھ بھی بولیں مگر میں نوٹس کر رہی ہوں آپ جب سے نانو کے گھر سے آئی ہیں، بہت گم صم ہیں۔'' ماہا کی بات پر نادیہ کا دل چاہا وہ بیٹی کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دیں۔ مگر وہ خود پر ضبط کر کے کھڑی ہو گئیں اور پھر کتنے ہی دن وہ وہاں نہیں گئیں مگر کسی نے پوچھنا ضروری نہیں سمجھا۔ وہ جو اگر ایک دن آنے میں ذرا سی دیر کر دیتی تھیں کوئی نہ کوئی ان کے گھر پہنچ جاتا تھا مگر پچھلے تین دن سے کسی کو اب ان کی غیر حاضری کا احساس ہی نہیں ہوا تھا۔

تب ہی نادیہ کے سیل کی اسکرین پر جلال کا نمبر جگمگانے لگا۔

''آپ آئیں کیوں نہیں؟'' جلال ان کا فون اٹھاتے ہی بولا۔

''آ گیا آپا کا خیال۔'' شکوہ ان کے لبوں سے نکلا۔

''جی آپا! بہت یاد آرہی ہیں اور پچھلے تین دن سے یہ جو میں اپنی بھابھی اور بیگم کے ہاتھ کے بدمزا کھانے کھا رہا ہوں ناں تو ایسے موقع پر تو آپ کی یاد بہت شدت سے آتی ہے۔ تانیہ نے ایسے پائے پکائے کہ میں نے کہا میں تو اپنی آپا جان کے ہاتھ کے کھاؤں گا۔ اب آپ آئیں اور سکھائیں اپنی دونوں بھابھیوں کو کھانا بنانا۔'' اس کی بات پر نادیہ جو کب سے ضبط کر رہی تھیں خود کو نارمل کرتے ہوئے بولیں۔

''جلال! میں سب کو کھانا بنانا تو اب سکھا نہیں سکتی۔ یہ تو ان کو اپنے گھر سے سیکھ کر آنا چاہیے تھا۔ آخر کو میں نے بھی سارا تہمینہ کو سکھا کر بھیجا ہے۔'' نرمی سے بولتے ہوئے بھی ان کے لہجے میں ذرا سی تلخی آ گئی تھی۔

''چلو میں جاؤں، بچوں کی چھٹیاں ہیں تو ہم لوگ گھومنے جا رہے ہیں۔ اور جہاں تک میرے آنے کی بات ہے جب وقت ملا ضرور چکر لگاؤں گی۔ آخر کو وہ گھر میرے ماں باپ کا ہے پیارے بھائی!'' وہ جتاتے ہوئے خدا حافظ کہہ کر فون بند کر کے پلٹیں تو نعمان پیچھے کھڑے تھے۔

''چلیں، میں تیار ہوتی ہوں اور بچوں کو بھی کہتی ہوں۔ ہم کہیں چلتے ہیں۔'' وہ تیزی سے وہاں سے ہٹ گئیں کہ کہیں ان کی آنکھوں میں چمکتی نمی نعمان نہ دیکھ لیں۔

''ویسے بیگم! اس انقلاب کی وجہ۔'' نعمان جھولا جھولتے بچوں کو دیکھتے ہوئے نادیہ سے بولے۔

''آپ ہی تو کہتے تھے ہر رشتے میں توازن رکھو، بس میں نے توازن رکھنا سیکھ لیا۔'' وہ دوپٹا ٹھیک کرتی ہوئی بولیں۔

نعمان کی ایک بات بہت اچھی تھی، وہ زیادہ کریدتے نہیں تھے۔ اب بھی انہوں نے زیادہ کچھ نہیں پوچھا تھا، ان کے لیے یہی کافی تھا کہ نادیہ ان کی بات سمجھ گئی ہیں۔

نعمان بچوں کی جانب بڑھ گئے اور وہاں کھڑی نادیہ سوچ رہی تھیں کہ انہوں نے کتنا قیمتی وقت برباد کر دیا اپنے ان بہن بھائیوں کی خاطر جن کے لیے وہ فقط ایک شیف یا وقت گزاری سے زیادہ کچھ نہ تھیں۔ بھائیوں کی بیویاں آ گئیں اب آپا جان ان کے لیے محض اتنی اہم تھیں کہ وہ ان کے لیے لذیذ کھانے پکا کر کھلا دیتی تھیں اور جن بہنوں کو اتنے لاڈ سے پالا اب ان بہنوں کو بھی آپا جان کی ضرورت نہیں رہی تھی کیونکہ اب وہ اپنے گھر میں بہت مصروف تھیں اور ایک میں تھی اپنا گھر چھوڑ کر۔ ایک ہوک سی ان کے سینے سے اٹھی۔

سامنے سے آتے نعمان کو دیکھ کر وہ خود کو نارمل کرنے کی کوشش کرنے لگیں کیونکہ وہ نہیں چاہتی تھیں کہ کبھی زندگی کے کسی مقام پر نعمان ان کے بہن بھائیوں کو خود غرض کہیں۔

''کسی اچھی سی جگہ پر ڈنر کرتے ہیں۔'' نعمان، نادیہ سے بولے جس پر وہ مسکرا کر اثبات میں سر ہلا کر ان کے ساتھ چلنے لگیں۔

''میں اب بھی تم لوگوں سے ملوں گی مگر شاید میرا دل پہلے کی مانند نہ مل سکے۔ تم لوگ میرے رشتے ہو اور رشتوں کو چھوڑا نہیں جاتا مگر جو پھانس میرے دل میں چبھی ہے، وہ میں عمر بھر نہیں نکال سکتی۔''

وہ تازہ ہوا اپنے اندر اتارتے ہوئے گاڑی کی جانب بڑھ گئیں۔

☆

عائشہ نصیر احمد

میری راہیں تیرے تک ہیں

رات کے کھانے کے بعد دادی نے اسے پیر دبوانے کے لیے بلایا تھا۔ اسے ابھی برتن بھی دھونے تھے پھر بھی اس بلاوے پر اسے اپنا کام پس پشت ڈالنا پڑا۔ وہ دادی کے کمرے میں آئی تو دادی کے پلنگ کے پاس رکھی کرسی پر اسے بیٹھے دیکھ کر اسے جی بھر کر دادی پر پیار آیا۔

''آپ نے بلایا دادی؟''

''آجا نوال! پیروں میں بڑا درد ہے آج۔ ذرا اچھے سے دبانا۔ حمنہ کو تو ابھی جھاڑ کے اٹھایا ہے۔ یوں دبا رہی تھی جیسے چٹکیاں کاٹ رہی ہو۔'' دادی اسے دیکھ کر خوش ہوئیں۔

''اچھا دادی! میں دبا دیتی ہوں آپ کے پیر۔'' بڑے شوق سے ان کے پیروں کے قریب بیٹھی، کن اکھیوں سے اس کی طرف دیکھا۔

کرسی کی پشت سے ٹیک لگائے، چائے کا کپ ہاتھ میں پکڑے، بائیں ہاتھ کی انگلیوں سے اپنی پیشانی سہلا رہا تھا۔ گہری پرسوچ بھوری آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخی بکھری پڑی تھی۔

''اف...... کہیں میں مر ہی نہ جاؤں۔'' دل قابو سے باہر ہوا تھا۔ اس نے گھبرا کر نظریں پھیر لیں۔

''سن شہریار! میں تو کہتی ہوں، اپنی ماں کو بھی یہیں بلا لے۔'' دادی اس سے مخاطب ہوئیں۔ وہ چونک کر اپنے خیالوں سے نکلا۔

''وہ نہیں آئیں گی دادی! اور پھر میں خود بھی انہیں بلانا نہیں چاہتا۔'' اس کے چہرے کے عضلات تن سے گئے تھے۔ بھوری آنکھوں میں بے نام سا اضطراب امڈ آیا۔

''اف...... کیا ضرورت تھی، دادی کو یہ موضوع

مکمل ناول

چھیڑنے کی۔" وہ دل ہی دل میں جھنجلائی۔
"ارے آئے گی کیوں نہیں۔ یہ اس کا بھی گھر ہے شہریار!" دادی قدرے برہم ہوئیں۔

"شاید وہ ایسا نہیں سمجھتیں۔" اس کے ہونٹوں پر ہلکی سی مسکراہٹ ابھری۔
نوال کو بہت عجیب سا لگا، شاید وہ کبھی مسکراتا
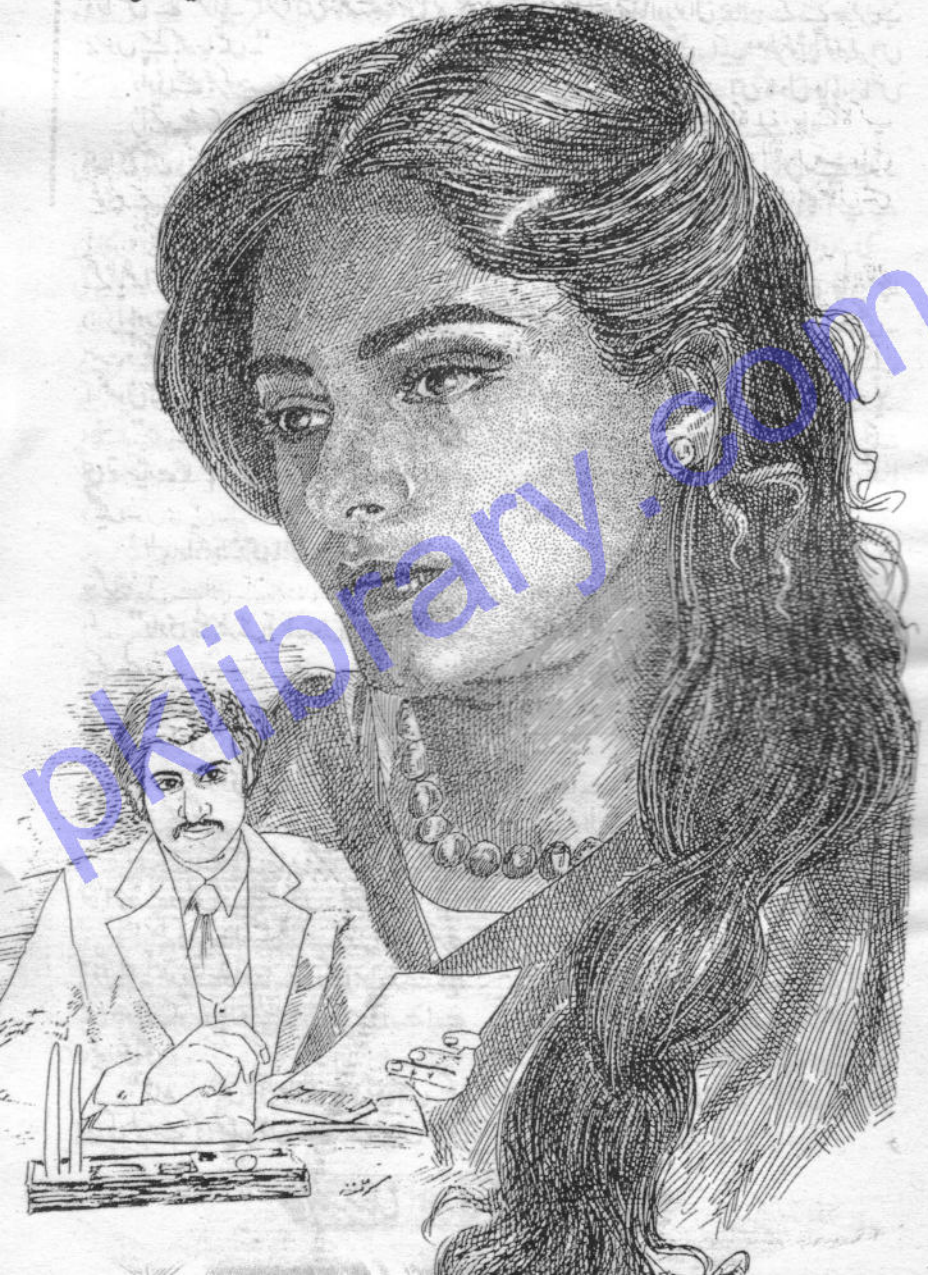
نہیں تھا اس لیے۔

''تو تم اسے سمجھاؤ ناں بچے۔'' اب کے دادی کا لہجہ نرم ہوا۔

''آپ بہت بھولی ہیں دادی!'' وہ ایک بار پھر ذرا کھل کے مسکرایا۔ ''اگر انہیں کچھ سمجھنا ہوتا تو کئی برسوں پہلے سمجھ جاتیں۔''

دادی لمحے بھر کو چپ سی رہ گئیں۔

''تم چلے جاؤ گے تو میرا دل کیسے لگے گا۔ پہلے ہی اتنی منتیں مانگ مانگ کے تو تمہاری صورت دیکھنے کو ملی ہے۔'' دادی آب دیدہ ہوئیں۔

''کیا شہریار جا رہے ہیں۔'' وہ پیر دبانا بھول کر ٹکر ٹکر اس کی صورت دیکھنے لگی۔

اور تب ہی شہریار نے بھی نظر اٹھا کر اس کی سمت دیکھا تھا۔ ایک پل کے لیے اس کی سرخ ہوتی آنکھوں میں استعجاب سا ابھرا۔

''میرے حیات کی نشانی...... تجھے دیکھ دیکھ کر ہی تو حیات کا غم بھولی ہوں میں۔'' دادی رو پڑی تھیں۔

نوال ساکت بیٹھی رہی۔ شہریار بے چین سا ہو گیا۔

''دادی پلیز۔ میں آتا رہوں گا آپ سے ملنے کے لیے۔''

''پہلے کب آیا ہے...... اگر تیرا باپ خود سے تجھے نہ بلاتا تو وہ بھی تجھے دیکھنے کی حسرت دل میں لیے ہی مرتا۔'' دادی اپنے ململ کے دوپٹے سے آنکھیں پونچھنے لگیں۔

اب اس کے پاس شاید کہنے کے لیے کچھ نہیں تھا' اس لیے وہ بس لب بھینچے انہیں دیکھتا رہا۔

''پہلے کی بات اور تھی مگر اب آؤں گا...... ضرور آؤں گا۔'' قدرے توقف سے وہ گویا ہوا۔ دھیمے لہجے میں دادی کے گرد بازو لپیٹے نوال خاموشی سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''شاید...... میں اتنی جلدی جاتا بھی نہیں۔ مگر امی کی طبیعت بھی ٹھیک نہیں ہے۔ میں یہاں رہ کر پریشان ہوتا رہوں۔ اس سے بہتر ہے خود ان کے پاس چلا جاؤں۔'' وہ ٹھہرے ٹھہرے لہجے میں کہہ رہا تھا۔

''دادی......!'' اس نے دادی کی جانب جھک کر ان کا ہاتھ تھاما اور نوال جو ان کے بے حد قریب بیٹھی تھی، جامد ہو کر رہ گئی۔ ایک معطر خوش گوار لہر اس کی سانسوں میں اتری تھی۔ اس کا دل چاہا، سانس روک کر یہ خوشبو اپنے اندر قید کر لے۔

''پلیز...... میں کہہ رہا ہوں ناں، مہینے بعد نہ سہی دو تین مہینوں بعد چکر لگایا کروں گا آپ کے پاس۔''

''دو تین مہینے......'' نوال کا دل چاہا، چلا اٹھے۔ یہ اس کے نزدیک کتنی معمولی سی بات تھی۔ جیسے دو تین مہینے نہ ہوں، دو تین گھنٹے ہوں۔ وہ یک دم اٹھی۔ یہ سنے بغیر کہ دادی نے اسے کیا جواب دیا۔ اپنا بھرم کھونے کے ڈر سے وہ بہت عجلت میں پلنگ سے اتری اور نہایت تیزی سے پیروں میں چپل گھسا کر وہاں سے نکل آئی۔

اپنے کمرے میں آتے ہی اس نے اپنی حالت کے پیش نظر باتھ روم میں بند ہو جانا ہی بہتر سمجھا۔ جلتی آنکھوں کو پانی سے ٹھنڈا کر کے اسے اچانک ہی یاد آیا کہ ابھی عشا کی نماز نہیں پڑھی۔ سو وضو کرنے لگی۔ چند منٹ بعد جب وہ باہر نکلی تو حسنہ کو کمرے میں ٹہلتے ہوئے پایا۔

وہ اسے دیکھ کر ٹھٹکی اور پھر گھورنے لگی۔

''نوال کی بچی...... کیا کر کے آئی ہو۔''

''کیا؟'' اس کا دل جانے کیوں دھڑکا۔

''چلو بے وقوف۔ شہریار بھائی کی چپل واپس کرو۔ وہ بے چارے پریشان بیٹھے ہیں۔''

''کیا......؟'' اس کی نظر اپنے پیروں پر گئی اور اس پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا۔ اسے احساس ہی نہ ہوا تھا کہ وہ اپنی چپل کے بجائے ان کی پہنے ہوئے ہے اور اپنی وہ لیدر کی اسٹائلش اور برانڈڈ چپل گیلی ہو کر مزید بھاری ہو چکی تھی۔

''اف...... میں اندھی تھی کیا؟'' اسے خود پر غصہ آیا۔

''لگ تو مجھے بھی ایسے ہی رہا ہے۔'' حمنہ تیکھے لہجے میں بولی۔ ''اچھا حشر خراب کیا ہے ان کا۔ اب وہ تو اسے پہننے سے رہے۔''

''میں خود ہی ان کے کمرے میں رکھ آتی ہوں۔'' وہ شرمندگی سے بولی۔

''ظاہر ہے۔'' حمنہ نے کندھے اچکائے، جیسے کہہ رہی ہو میں تو نہیں لے جانے والی۔

جس وقت وہ اس کے کمرے میں چپل اتار رہی تھی۔ وہ اندر داخل ہوا تھا۔ وہ ایک بار پھر شرمندہ سی کھڑی رہ گئی۔

''آئم سوری۔'' نظریں جھکائے اس کے پاس کہنے کے لیے اور تھا بھی کیا۔ وہ دیکھ رہی تھی، اس کے پیروں میں شاید علی کے جوتے تھے۔

''اٹس اوکے۔'' اس نے ہلکے سے سر ہلایا۔

''نہیں...... انہیں گیلا کرنے کے لیے سوری۔'' وہ جلدی سے بولی۔ اصل پریشانی تو یہ تھی۔

''اچھا......'' اس نے ایک نظر چپلوں پر ڈالی۔

''پھر بھی اٹس اوکے۔'' وہ اس کے چہرے کی طرف دیکھ کر بولا۔

نوال کی سمجھ میں نہیں آیا، کیسے اسے سمجھائے۔

''یہ لیدر کی ہیں، اتنی جلدی سوکھیں گے بھی نہیں۔''

''میرے پاس دوسری ہیں، میں وہ پہن لوں گا۔''

وہ جتنا پریشان تھی، شہریار اتنے ہی آرام سے تھا۔

''یہ خراب بھی ہو سکتی ہیں اور آپ شاید انہیں کبھی پہن نہ پائیں۔'' اس نے ڈرتے ڈرتے کہا۔

''آپ شاید تہیہ کر کے آئی ہیں کہ مجھے غصہ دلا کر ہی چھوڑیں گی۔'' وہ گہری نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے بولا۔ نوال سٹپٹا گئی۔

''نہیں...... میں تو...... وہ بس میں......''

''جوتے ہی ہیں نوال! آپ نے پہن لیے، گیلے ہو گئے تو کوئی بات نہیں۔ فکر اور قدر انسانوں کی ہونی چاہیے۔'' وہ دھیمے، ٹھہرے ہوئے لہجے میں بولا۔ نوال ایک پل کو ساکت ہو گئی۔

''اوکے، شکریہ۔'' سر ہلا کر کہتے ہوئے وہ جانے لگی۔

شہریار جو سینے پر ہاتھ باندھے دروازے کے پاس ہی کھڑا تھا۔ جلدی سے ایک طرف ہوا۔

''اور آپ کو اتنی سی بات پر رونے کی بھی کوئی ضرورت نہیں تھی۔''

اپنی پشت پر اس کی بھاری آواز سن کر اس کا دل سمٹا۔ اس نے بے اختیار گردن موڑی۔ وہ اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا، جہاں تھوڑی دیر پہلے کے بپھرے دریا نے انمٹ نقوش چھوڑے تھے۔ اس کے لب سل چکے تھے۔ وہ خاموشی سے پلٹ آئی، کیسے بتاتی...... یہ رونا چپل پہننے پر نہیں، آپ کے جانے پر تھا۔

☆☆☆

''کب آ رہے ہو شہریار! تم تو وہاں جا کر بیٹھ ہی گئے ہو۔'' امی کی پریشانی اور اضطراب وہ اتنی دور بیٹھے بیٹھے بھی باآسانی محسوس کر سکتا تھا۔

''آ رہا ہوں امی! پرسوں کی فلائٹ ہے۔'' آدھے چاند کو دیکھتے ہوئے اوس میں بھیگے لان کی نمی محسوس کر رہا تھا۔ ایک کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اس نے ٹانگ پر ٹانگ رکھی۔

''آپ کی طبیعت کیسی ہے؟ دوائیاں تو لے رہی ہیں ناں باقاعدگی سے۔ ڈاکٹر کو آپ نے اپنے ہائی بی پی کا بتایا؟''

''سب کچھ بتا چکی ہوں شہریار! وہ اسٹریس نہ لینے کے لیے کہتا ہے، مگر میں اسٹریس کیسے نہ لوں۔ جب تک تم وہاں بیٹھے ہو۔'' وہ شدید جھنجلاہٹ کا شکار لگ رہی تھیں۔

وہ ایک گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

''یہ خواہ مخواہ کا اسٹریس ہے امی! بلاوجہ پریشان

ہو رہی ہیں آپ۔ اپنے باپ کے گھر بیٹھا ہوں۔ کسی محاذ پر تو نہیں آیا۔" نہ چاہتے ہوئے بھی اس کا لہجہ تلخ ہوا۔

"ارے کسی محاذ پر ہوتے تو مجھے اتنی فکر نہ ہوتی۔ مگر تم تو ان سازشی، مکار لوگوں کے بیچ بیٹھے ہو جنہوں نے مجھے کہیں کا نہیں چھوڑا۔ اب تمہیں بھی چھین لینا چاہتے ہیں مجھ سے۔" ان کی آواز بھرا گئی۔

"بے فکر رہیں امی! جس نے مجھ کو آپ سے چھیننا تھا، وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔ اب کوئی مجھے آپ سے نہیں چھین سکتا۔" دانت پر دانت جمائے اس کے چہرے پر سرخی بکھر گئی تھی۔

"چھین سکتا ہے...... ابھی بھی چھین سکتا ہے شہریار! مگر تم نہیں سمجھو گے۔ تم ابھی ان لوگوں کو نہیں جانتے۔ وہ کیا کیا کر سکتے ہیں...... کاش تم سمجھ پاتے۔"

بے بسی سے کہتے ہوئے ان کا گلا رندھ گیا تھا۔ وہ خاموش رہ گیا۔ دل میں کہیں درد کی لہر سی ابھری تھی۔ اس کے لفظ ہی گم ہو گئے۔

"خیر...... اب تم آؤ گے تو ہی تم سے بات ہوگی۔" کچھ لمحوں بعد وہ خود کو سنبھال کر بولیں۔ "اپنا خیال رکھنا اور کسی سے زیادہ ملنے جلنے کی ضرورت نہیں ہے۔"

جب سے شہریار یہاں آیا تھا وہ ہر فون پر یہ تاکید کرنا نہیں بھولتی تھیں۔ اب تو شہریار اس کا عادی ہو چلا تھا۔

"ٹھیک ہے امی! اللہ حافظ۔" دھیرے سے کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کر دیا اور کرسی کی پشت سے ٹیک لگا کر سیاہ آسمان کو تکنے لگا۔ آج وہ خود کو حد سے زیادہ اکیلا محسوس کر رہا تھا اس پر امی سے ہونے والی یہ بات چیت۔

وہ ہمیشہ ہی اس کے حوالے سے ایک بے یقینی کی سی کیفیت کا شکار رہی تھیں اور ایسا بے وجہ نہیں تھا۔ بائیس سال پہلے جب وہ چار سال کے شہریار کو اپنی بانہوں میں سمیٹ کر لے جا رہی تھیں تو اس بے یقینی اور عدم تحفظ کے احساس کو آنچل میں باندھ کر ساتھ لے آئی تھیں تب انہیں احساس بھی نہیں تھا۔ تب وہ بہت کروفر اور گھمنڈ میں تھیں۔

حیات عالم سے ثمینہ نے محبت کی شادی کی تھی۔ ایک اونچے گھرانے کی خود پرست لڑکی ہونے کے باوجود اپنے مڈل کلاس کے پروردہ کلاس فیلو حیات عالم سے محبت ہو گئی تھی۔ اس نے سب کو ٹھوکر ماری اور حیات عالم کا ہاتھ تھام لیا۔ اس وقت دونوں ہی محبت کے نشے میں سرشار تھے۔ تب کوئی معاشرتی اور طبقاتی فرق ان کے لیے معنی نہیں رکھتا تھا۔ مگر شادی کے کچھ عرصے بعد ہی جوائنٹ فیملی سسٹم میں معاشی اور معاشرتی الجھنوں میں پھنس کر حیات عالم نے تو اپنا ضبط نہیں کھویا مگر ثمینہ ضرور اپنا آپ کھو بیٹھی تھی۔ اس پر ساس، سسر، نندوں، دیوروں، دیورانیوں کے جھنجھٹ......

ایک بار کسی معمولی سی تلخ کلامی سے ہونے والا جھگڑا ان تمام مسئلوں اور پریشانیوں سے دامن چھڑانے کے لیے اچھا موقع فراہم کر گیا اور وہ شہریار کو لے کر حیات سے الگ گھر کی شرط عائد کرتے ہوئے اپنے میکے چلی آئی تھیں۔

حیات کے لیے یہ شرط ماننا ممکن نہ تھا۔ وہ گھر کے بڑے بیٹے تھے۔ بہنوں کی ذمہ داری بھی ابھی سر پر تھی۔ پھر ثمینہ کی ضدی طبیعت اور اکڑ پسندی انہیں مزید دل برداشتہ کر چکی تھی۔

اب یہ ان کی انا کا مسئلہ بھی آ ٹھہرا تھا۔ اسی لیے جب الگ گھر نہ لینے کی صورت میں انہوں نے خلع لینی چاہی حیات نے یہ کہہ کر ان کی رہائی کے سارے راستے بند کر دیے کہ وہ پھر کسی صورت شہریار کو ان کے پاس نہیں رہنے دیں گے۔ سو انا پرست ثمینہ نے زندگی بھر میکے میں رہنے کا فیصلہ کر لیا۔ مگر واپس لوٹ کر ان کی دہلیز پر نہیں آئیں۔

حیات نے یہاں دوسری شادی کر لی مگر خدا کی قدرت کہ دوسری بیوی سے ان کی پھر کوئی اولاد نہ ہو سکی اور وہ شہریار کے لیے تڑپتے رہ گئے۔

ان برسوں میں انہوں نے کئی بار شہریار سے ملنے کی کوشش بھی کی مگر تب تک شہریار کے دل میں ماں اور باپ دونوں کے لیے اتنی تلخی اور کڑواہٹ بھر چکی تھی کہ اس نے ایک بار بھی ان سے ملنے میں دلچسپی نہیں لی۔ ماں کے ساتھ رہنا اس کی مجبوری نہ ہوتی تو وہ کب کا انہیں بھی چھوڑ کر جا چکا ہوتا کہ ان دونوں کے بیچ کھڑی انا کی اس دیوار نے اس کی زندگی کے سارے رنگ ختم کر دیے تھے۔

دو ماہ پہلے جب حیات نے کینسر جیسے موذی مرض سے لڑتے ہوئے اپنی آخری سانسوں میں اسے پکارا تو جیسے کسی الہامی کیفیت کے زیر اثر وہ انکار نہ کر پایا اور ان کی حالت دیکھ کر وہ سارے گلے شکوے بھول گیا تھا۔ اس کے ساتھ محض چند دن گزارنے کے بعد ہی وہ اس دنیا سے منہ موڑ گئے تھے اور اب...... شہریار بھی یہاں سے جانے کی تیاریوں میں تھا۔

☆☆☆

وہ صبح سے دیکھ رہی تھی، تائی آتے جاتے، مختلف کام کرتے، چپکے چپکے اپنی آنکھیں پونچھ رہی تھیں۔ اس وقت بھی وہ علی کے لیے ناشتا لینے کچن میں آئیں تو چائے تھرماس میں ڈالتے ہوئے ان کی آنکھیں پھر سے بھر آئی تھیں۔

''تائی! آپ رو رہی ہیں؟'' چند لمحے انہیں دیکھتے رہنے کے بعد اس نے دھیرے سے پوچھا۔ وہ سوچ رہی تھی۔ انہیں تایا جی کی یاد آ رہی ہے یا پھر...... وہ بھی شہریار کے جانے کا سوچ کر غمگین ہیں۔

''تم اماں کو چائے دے آئیں؟'' وہ اس کی بات ان سنی کر گئیں۔

اس نے لب کاٹے۔

''نہیں۔ انہوں نے منع کر دیا۔ فی الحال تو علی میری جان کھا رہا ہے۔''

''تم بیٹھو۔ میں دس منٹ میں ناشتا تیار کر دیتی ہوں۔'' انہوں نے کچن ٹیبل کی کرسی کی طرف اشارہ کیا۔ اس نے ایک نظر دیکھا مگر بیٹھی نہیں۔

''شہریار آج جا رہے ہیں ناں۔''

''اسے تو جانا ہی تھا۔ اب اس کا یہاں ہے ہی کون۔'' وہ اپنے لہجے سے کچھ ظاہر نہیں ہونے دے رہی تھیں۔

''ایسا تو نہ کہیں۔'' اس کا منہ بن گیا۔ ''کیا دادی ان کی کچھ نہیں لگتیں...... اور ہم بھی تو ہیں۔'' وہ اسے دیکھ کر یوں مسکرائیں جیسے کسی بچے کی حماقت پر مسکرایا جاتا ہے۔

''آپ کو بھی افسوس ہو رہا ہے ناں، اس کے جانے کا۔'' اسے یہ ذکر کرنا اچھا لگ رہا تھا۔

''ہاں۔'' انہوں نے بدقت جواب دیا۔ آنکھوں میں پھر سے دھند بھرنے لگی تھی۔

وہ ترحم بھی نظروں سے انہیں دیکھتی رہی۔

وہ ایک صابر اور قانع خاتون تھیں۔ اتنے برس تایا جیسے سرد مزاج شخص کے ساتھ گزارا کیا مگر کبھی حرف شکایت زبان پر نہیں لائیں۔ اس پر اولاد جیسی نعمت سے محرومی...... وہ اپنا سارا پیار اور ممتا ان ہی پر لٹاتی رہیں۔ سارا سارا دن کام میں مصروف رہتیں، کسی روبوٹ کی طرح۔ نوال نے بہت کم انہیں فارغ دیکھا تھا۔ شہریار کے بارے میں وہ اپنے شوہر سے، دادی سے بہت کچھ سنتی رہی تھیں۔

وہ ان کے محبوب شوہر کی اولاد تھا۔ اس لیے بنا دیکھے ہی انہوں نے اس سے ممتا کا گہرا رشتہ جوڑ لیا تھا۔ مگر ان کے اندر چھناکے سے کچھ ٹوٹ سا گیا۔ جب انہوں نے اس کے انداز میں اپنے لیے لاتعلقی اور گریز دیکھا۔ وہ یہی سمجھتیں کہ شاید سوتیلی ماں ہونے کی حیثیت سے وہ انہیں پسند نہیں کرتا۔ اگر وہ باقی سب کے ساتھ اس کا رویہ محسوس نہ کر لیتیں...... اور تب انہیں ذرا اطمینان نصیب ہوا۔ ہوش سنبھالنے کے بعد وہ پہلی بار ان سے یوں مل رہا تھا اور اس کی یہ جھجک شاید اسی سبب تھی۔ مگر اپنے اس محتاط رویے سے قطع نظر وہ اتنے بہترین عادات و اطوار کا مالک تھا کہ اسے جان کر ان کے دل میں اس کے لیے محبت اور بڑھ گئی تھی اور اسی لیے اب اس کے جانے کا سوچ کر

ہی باقیوں کی طرح ان کا بھی دل ہول اٹھا تھا۔

☆☆☆

اس دوپہر سب گھر پر ہی تھے۔ ہال میں نشست جمی تھی۔ شہریار بھی موجود تھا اور تھوڑی دیر میں اسے روانہ ہو جانا تھا۔ اسی لیے سب اپنے اپنے کام چھوڑ کر اسے رخصت کرنے کو گھر پر ہی موجود تھے، جب علی نے اس سے پوچھا۔

''شہریار بھائی! دوبارہ کب آئیں گے؟''

''جلد ہی آئے گا...... اب تو چکر لگاتا رہے گا شہریار! کیوں بیٹا؟'' چچا جی اس کا شانہ تھپک رہے تھے۔ ہمیشہ کی طرح اپنے خیالوں میں گم وہ ان کے لمس پر چونکا۔

''میری تو خواہش تھی کچھ دن اور رہ لیتا۔ مگر خیر کام کا بھی مسئلہ...... بھابھی جی کی طبیعت بہتر ہو جائے تو انہیں بھی لے کر آتا ساتھ۔''

اس کے چہرے پر مدھم سی استہزائیہ مسکراہٹ ابھر کر معدوم ہوئی۔

''جو اپنے مرتے ہوئے شوہر کو دیکھنے نہ آئے وہ اب کیا آئیں گی۔''

وہ جب سے یہاں آیا تھا، اس نے ایک بار بھی اس گھر کے کسی بھی فرد کے انداز میں امی کے لیے تحقیر و تنفر نہیں دیکھا تھا۔ انہیں اب بھی اس گھر کی بہو سمجھا جاتا تھا۔

اس نے ایک طائرانہ سی نگاہ کمرے میں موجود تمام نفوس پر ڈالی۔ اگر بائیس سال پہلے امی وہ فیصلہ نہ کرتیں تو وہ اس گھر کا ایک حصہ ہوتا۔ ان تمام لوگوں سے اجنبیت اور بے گانگی محسوس نہ کرتا۔ بائیس سالوں کی دوری کی گرد چند دنوں میں کیسے اڑ سکتی تھی۔

''میں دادی کے پاس ہو آؤں۔'' اس نے اجازت چاہنے والی نظروں سے چچا کی سمت دیکھا۔ وہ اپنے گھٹنوں کے درد کی وجہ سے اپنے کمرے تک محدود رہتی تھیں۔

''ہاں ہاں...... کیوں نہیں۔ وہ انتظار کر رہی ہوں گی تمہارا۔'' انہوں نے جلدی سے کہا۔ وہ اٹھ کھڑا ہوا۔ ادھر صوفے کے ہتھے پر ٹکی نوال کے دل میں پارہ سا مچلا۔

آج تو وہ ایک پل کے لیے بھی اسے نظروں سے اوجھل نہیں ہونے دینا چاہتی تھی۔ اس لیے جیسے ہی وہ وہاں سے نکلا، وہ بھی غیر محسوس انداز میں اپنی جگہ سے اٹھ گئی۔

دادی کے کمرے کے پاس پہنچ کر وہ دروازے کی اوٹ میں کھڑی اسے دیکھنے لگی۔ تقریباً پندرہ منٹ...... ٹھنڈے فرش پر اس کے گلابی پیر سرخ پڑ گئے تھے۔

جب وہ پیار لینے کے لیے دادی کے سامنے جھکا، اس کی سانس تیز ہو چلی۔

''بس جا رہا ہے...... چلا جائے گا......''

وہ اس وقت آئینہ دیکھتی تو خود کو دیکھ کر حیران رہ جاتی۔ اس کے چہرے پر زردی کھنڈ گئی تھی۔ آنکھوں میں ہراس بھر گیا تھا۔ اسی پل وہ باہر نکلا اور اس سے ٹکراتے ٹکراتے بچا۔

''نوال......!'' اس کو بازوؤں سے پکڑ کر اس نے قدرے تعجب سے اس کا نام لیا اور پھر اس کے چہرے پر نظر پڑتے ہی باقی کا جملہ اس کے منہ میں رہ گیا۔ وہ حیرانی سے اس کی وحشت زدہ آنکھیں، اس کا کملایا ہوا چہرہ دیکھ رہا تھا۔

جب اس کے گلابی لب دھیرے سے کپکپائے۔

''پلیز...... مت جائیے۔'' یہ بے اختیاری سی کیفیت تھی، ورنہ وہ کبھی تصور بھی نہیں کر سکتی تھی کہ وہ شہریار کے سامنے کھڑے ہو کر اس سے یہ بھی کہہ سکتی ہے۔ وہ آنکھوں میں عجیب سا تاثر لیے اسے دیکھتا رہا۔ پھر ہاتھ دھیرے سے بڑھا کر اس کے جلتے رخسار کو چھوتے ہوئے وہ اس کے پورے وجود میں برق دوڑا گیا۔

''میں واپس آؤں گا...... بہت جلد...... صرف تمہارے لیے......'' شاید یہ بھی بے اختیاری میں ہوا تھا ورنہ وہ ایسا وعدہ کرنے سے پہلے ہزار بار سوچ

لیتا۔

نوال کی آنکھوں میں سلگتی آگ ماند پڑی تھی۔ آہستہ سے اس کا بازو چھوڑتے ہوئے وہ پیچھے ہٹا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا وہاں سے چلا گیا تھا۔

☆☆☆

''نوال!'' وہ نماز پڑھنے کے بعد جانماز سمیٹ رہی تھی۔ حمنہ کی آواز پر چونکی۔

''تم نے یہ کُرتا دیکھا؟'' وہ لائٹ گرے کلر کا کُرتا اٹھائے اسے دکھا رہی تھی۔ اس نے غور کیا اور پھر ایک دم اٹھ کھڑی ہوئی۔

''شہریار بھائی یہیں بھول گئے۔ اس دن تائی نے دھوئے تھے ناں کپڑے۔ شاید انہیں اس کے بارے میں پوچھنا یاد ہی نہیں رہا۔''

''دکھاؤ مجھے۔'' اس نے اس کے ہاتھ پر جھپٹا سا مارا۔

''بتا تو رہی ہوں شہریار بھائی کا ہے۔'' حمنہ سمجھی، اسے یقین نہیں آیا۔

''جانتی ہوں۔'' وہ دھیرے سے بڑبڑائی۔ اس کی مہک ابھی تک ان کپڑوں میں بسی ہوئی تھی۔

''ایسے کپڑے ہمارے گھر میں کسی کے نہیں ہو سکتے۔ بہت چوزی لگتے ہیں شہریار بھائی۔''

''ٹھیک کہتی ہو۔'' وہ تھکے تھکے انداز میں بیڈ پر بیٹھی۔ کُرتا اس کے دونوں بازوؤں میں کسی قیمتی متاع کی طرح سمٹا ہوا تھا۔

''ان کے کپڑے، ان کے جوتے...... ان کا پرفیوم، ان کی رسٹ واچز...... کیا چیز ہیں شہریار بھائی۔'' حمنہ اب سر ہلا رہی تھی۔ اس نے ذرا ٹھٹک کر اسے دیکھا۔

''وہ چیز نہیں ہیں...... سوچ کر بولو۔''

''واہ جی۔ آپ کو بڑی تکلیف ہو رہی ہے۔'' حمنہ نے گھور کر اسے دیکھا۔ ''میں نے تو انہیں بڑی چیز کہا، بائی دا وے یہ جو آپ کر رہی ہیں ناں...... یہ مجھے ٹھیک نہیں لگ رہا۔'' اس نے یک دم سے پینترا بدلا۔ نوال ناسمجھی کی کیفیت میں اسے دیکھتی رہ گئی۔

''کیا کر رہی ہوں میں؟''

''تم سمجھتی ہو، میں گھاس چرتی ہوں۔ مجھے کچھ دکھائی نہیں دیتا۔'' اس کی بے نیازی پر وہ بھنا گئی۔

''کیا پتا...... لان کی گھاس روز ہی ترشی ہوئی ملتی ہے۔'' اس نے بات مذاق میں ٹالنے کی کوشش کی۔

''شہریار بھائی واپس نہیں آئیں گے نوال!'' وہ سنجیدہ ہوئی تھی۔ اس کا دل پھڑپھڑا کر رہ گیا۔

''وہ اس بار بھی بڑی مشکلوں سے آئے تھے۔ صرف اور صرف تایا جی کی آخری خواہش پوری کرنے کے لیے۔ نجانے ان کی ماں نے کس دل سے انہیں آنے دیا ہوگا۔ امی نے ہمیں بتایا ہے ناں ثمینہ تائی کا مزاج۔ خود ہی سوچو، وہ دوبارہ کس لیے آئیں گے۔ ہم سے تعلق رکھنے میں تو وہ خود بھی انٹرسٹڈ نہیں لگتے۔'' حمنہ بہت صاف گوئی سے کہہ رہی تھی۔

''اس نے مجھ سے کہا تھا، وہ آئے گا۔'' اس کا لرزتا لہجہ ابھرا۔

''تم سے کہا تھا؟'' حمنہ اچھل پڑی۔ ''کیا مطلب...... تم سے کیوں کہا تھا؟''

''مجھے نہیں پتا...... بس اتنا پتا ہے، وہ جھوٹ بولنے والوں میں سے نہیں ہے۔'' اس کا چہرہ تمتمانے لگا۔

''تو انہیں بھی پتا چل گیا کہ تم پاگل ہوگئی ہو۔'' کسی انجانے تصور سے حمنہ کی آواز ڈوب گئی۔

''نہیں...... میں تو......'' وہ گھبرا کر کچھ بولنا چاہتی تھی کہ اس لمحے تائی آگئیں۔

''کیا ہو رہا ہے لڑکیو! یہ کپڑے کس کے ہیں؟'' ان کی نظر نوال کے ہاتھوں میں پکڑے کُرتے پر تھی اور سوال کرتے ہی پہچان کے رنگ ان کی آنکھوں میں بکھرے۔

''شہریار بھائی کا ہے۔'' حمنہ نے جلدی سے بتایا۔ نوال نے اٹھ کر کُرتا انہیں تھمانا چاہا۔

''مجھے مت دو۔ جا کر اس کی وارڈ روب میں رکھ دو۔'' تائی سنجیدگی سے بولیں۔

''میں لے جاتی ہوں۔'' نوال کو موقع ملا تھا۔ ایک بار پھر اس کمرے میں جانے کا، جس میں بھی اس کی سانسیں بکھری رہی تھیں۔

''میں بھی آؤں گی۔'' حمنہ اس کے پیچھے آئی۔

شہریار کے آنے پر یہ کمرا جس طرح سیٹ کیا گیا تھا، آج بھی اسی حالت میں تھا۔ تائی روز اپنی نگرانی میں ملازمہ سے یہاں کی صفائی کروایا کرتی تھیں۔

وارڈروب کھول کر گرتا واپس رکھتے ہوئے اس نے مڑ کر حمنہ کو دیکھا جو کھڑکی میں جا کر کھڑی ہو گئی تھی۔

''شہریار بھائی اکثر رات کو یہیں پہ کھڑے ہو کر چاند کو دیکھا کرتے تھے۔'' وہ مڑے بغیر اس سے مخاطب ہوئی تھی۔

''پتا ہے مجھے۔'' بیڈ کے کنارے بیٹھتے ہوئے اس نے لائٹ بلیو بیڈ شیٹ پر ہاتھ پھیرا جو اس وقت بالکل بے شکن تھی۔

''میں جانتی ہوں، ان کا مسئلہ کیا تھا۔'' حمنہ نے کھڑکی سے ہٹتے ہوئے اچانک کہا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''ان کا کوئی مسئلہ بھی تھا؟'' اس کی آواز میں تعجب تھا۔ اس نے تو کبھی اس بارے میں غور نہیں کیا۔

''وہ ہم سے خوش نہیں تھے۔ انہیں لگتا تھا کہ شاید ہم نے ان کی ماں کے ساتھ ظلم کیا ہے۔ کون جانے ان کی ماں نے انہیں ہمارے بارے میں کس انداز میں کیا کیا کچھ بتایا ہو۔'' وہ کہہ رہی تھی۔

''اگر ایسی بات تھی، اور وہ ہم سے برگشتہ تھے تو پھر انہیں مجھ سے وہ بات نہیں کرنی چاہیے تھی۔'' یہ کہتے ہوئے اس کا چہرہ بجھ گیا۔

''کیا بات......؟ تم نے تو ابھی تک مجھے کچھ بتایا بھی نہیں کہ انہوں نے تم سے کیا کہا تھا۔'' اس بات کے ساتھ ہی حمنہ کو یاد آ گیا اور وہ پوچھتے ہوئے اس کے قریب آ بیٹھی۔

''اس ایک بات کی وجہ سے میں پچھلے تین دن سے ہواؤں میں اڑ رہی ہوں۔'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ حمنہ خاموشی سے اسے دیکھتی رہی۔

''اور تم ہر بار مجھے آئینہ دکھا رہی ہو۔ تم میرا دل توڑ رہی ہو حمنہ!'' اس کی آنکھیں بھر آئیں۔

''اف......'' حمنہ نے بے اختیار اپنا سر تھاما۔

''تم میری بہن ہو نوال! اور تمہارا دل ٹوٹنے کے ڈر سے میں تمہیں ان سنہرے خوابوں میں جینے نہیں دے سکتی۔ جو سچ ہے وہ سچ ہے۔ پتا نہیں انہوں نے کس رو میں بہہ کر تم سے کچھ کہہ دیا اور تم یقین کر بیٹھیں پاگل۔''

''اور فرض کرو وہ سچ بول رہے ہوں۔ فرض کرو وہ اپنا وعدہ نبھانے واپس آئیں پھر؟'' نوال نے روئی روئی آنکھوں سے اسے دیکھا۔

''تو پھر......سب سے زیادہ خوشی مجھے ہوگی۔ مگر وہ وقت تو آنے دو۔ ابھی اپنا ذہن کلیئر کرو۔ کوئی امید لے کر مت بیٹھو کیونکہ اگر وہ امید ٹوٹی تو تمہیں بہت تکلیف ہوگی۔''

''تکلیف تو مجھے اب بھی ہو رہی ہے۔'' اس کی آواز بھرانے لگی۔

''ابھی کم ہے، تب زیادہ ہوگی اور ابھی اٹھو۔'' حمنہ نے بات ختم کرتے ہوئے اس کا ہاتھ پکڑا اور کھڑی ہو گئی۔ اسے بھی اٹھنا پڑا۔

☆☆☆

اس کے آنے کے بعد امی نے بہت سوال کیے تھے سب کے بارے میں۔ ساری تفصیل انہیں چاہیے تھی۔ وہ ایک آدھ لفظ میں جواب دیتا تو ان کا پارہ چڑھ جاتا۔ آخر میں انہیں حمنہ اور نوال کا خیال آیا تھا۔

''کیسی ہیں وہ دونوں۔ تب تو حمنہ پیدا بھی نہیں ہوئی تھی۔ اب تو دونوں جوان ہو چکی گی اور خوب صورت بھی۔ ان کی ماں بھی بہت خوب صورت تھی اپنی جوانی میں۔ اب کوئی فرق آیا کہ نہیں۔''

''پتا نہیں...... میں نے غور نہیں کیا۔'' اکتاہٹ

سے کہتے ہوئے اس نے اخبار اٹھالیا۔
"تو کس پر غور کیا...... نوال پر یا حمنہ پر؟" اس کی عدم توجہی پر انہوں نے چبھتے ہوئے لہجے میں پوچھا۔ وہ ساکت رہ گیا۔
"فار گاڈ سیک امی! کچھ تو سوچ سمجھ کر بولیں۔ یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ۔"
"ایسا کیا کہہ دیا ہے میں نے۔ ایک بات ہی تو پوچھی تھی۔ کزنز ہیں تمہاری۔ بات چیت تو ہوتی رہی ہوگی تمہاری۔" اب ان کا انداز بدل گیا۔ قدرے نرم اور رسان بھرا۔ وہ سمجھنے کی کوشش میں ان کا چہرہ دیکھنے لگا۔
"نہیں...... ایسا کچھ نہیں تھا۔ میری کسی سے بے تکلفی نہیں ہوئی۔ نہ انہوں نے کوئی ایسی کوشش کی۔"
دھیرے سے کہتے ہوئے اس کی نظروں کے سامنے نوال کا چہرہ گھوم گیا۔ جس نے اس کی توجہ، اس کا ارتکاز، اس کی سوچیں گویا چھین کر خود پر مرکوز کر دی تھیں۔
"چلو...... یہ تو اور بھی اچھا ہے۔" ان کے چہرے پر طمانیت کی روشنی پھیلی۔
"تم نے میری بات کا پاس رکھا۔ وہ تو ہیں ہی خود پرست اور گھمنڈی لوگ۔ اپنے آگے کسی کو کچھ سمجھتے ہی نہیں۔" وہ ایک بار پھر اپنے پسندیدہ موضوع پر شروع ہو چکی تھیں۔ شہریار نے گھڑی دیکھی۔
"مجھے دوست کی طرف جانا ہے امی! چند گھنٹے لگ سکتے ہیں۔"
"کیا شہریار......" انہوں نے تعجب و تاسف سے اسے دیکھا۔ "چھٹی کے دن بھی تمہارے پاس ماں کے لیے ٹائم نہیں۔"
"اگر آپ اکیلے بور ہو رہی ہیں تو جیا کو فون کر کے بلا لیں۔" اس نے مشورہ دے کر اخبار سینٹر ٹیبل پر رکھا اور اٹھ کھڑا ہوا۔ ان کی آنکھوں سے خفگی جھلکنے لگی۔
"مجھے بتانے کی ضرورت نہیں ہے کہ مجھے کیا کرنا ہے۔ روز روز اپنی تنہائی دور کرنے کے لیے جیا کو بلانے سے بہتر ہے، میں اسے ہمیشہ کے لیے یہاں لے آؤں۔ میری کیا تمہاری تنہائی بھی دور ہو جائے گی۔"
"کیا...... کیا کہا آپ نے؟" وہ ٹھٹکا اور ٹھہر کر انہیں دیکھنے لگا۔ اسے پتا نہیں تھا، آج ان کے اس جملے کے پیچھے ان کی کئی ہفتوں کی سوچ بچار شامل تھی۔
"میں بھائی سے بات کرنا چاہتی ہوں شہریار! جیا کے لیے۔ مجھے یقین ہے وہ انکار نہیں کریں گے۔" وہ نہایت اطمینان سے بولیں۔
اس نے سختی سے لب بھینچے۔ اندرونی تناؤ اس کی گہری آنکھوں میں اضطراب بن کر آ بیٹھا۔
"میرا خیال ہے پہلے ہم خود اس موضوع پر بات کرلیں۔ اس کے بعد کسی اور کو اس معاملے میں شامل کرنے کی نوبت آئے گی۔"
"تم کہنا کیا چاہتے ہو؟" اس کا ردعمل دیکھ کر وہ پریشان ہوئیں۔
"یہی کہ پہلے ہم اس ٹاپک کو ڈسکس کریں گے، اس کے بعد فیصلہ ہوگا کہ ماموں سے بات کی جائے یا نہیں۔"
"تو ٹھیک ہے، بیٹھ جاؤ۔ کر لیتے ہیں ڈسکس۔" انہوں نے بمشکل اپنی بے چینی چھپائی۔
"ابھی میرے پاس وقت نہیں ہے اور یہ اطمینان سے بیٹھ کر کرنے کی باتیں ہیں۔" سنجیدگی سے کہتے ہوئے اس کی نظر ایک بار پھر اپنی رسٹ واچ پر گئی تھی۔ آج وہ دادی کو فون کرنا چاہ رہا تھا۔ گھر پر کرتا اور امی کو پتا چل جاتا تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا۔
"تو کب کرو گے بات۔ تمہارے پاس اطمینان سے بیٹھ کر بات کرنے کا وقت ہی کب ہے۔" ان کے لہجے میں برہمی در آئی۔ "تم بس مجھے ایک جملے میں بتا دو۔ تم راضی ہو یا نہیں حالانکہ راضی نہ ہونے کی کوئی وجہ نہیں۔ جیا تمہاری بہت اچھی دوست ہے۔"

''ظفر میرا اس سے بھی اچھا دوست ہے تو کیا میں اس سے بھی شادی کرلوں۔'' کاٹ دار لہجے میں کہتے ہوئے وہ انہیں آگ ہی لگا گیا۔

''کیا فضول بکواس کررہے ہو شہریار! یہ میرے سوال کا جواب نہیں ہے۔ میں دیکھ رہی ہوں، وہاں سے آنے کے بعد تمہارے رنگ ڈھنگ ہی بدل گئے ہیں۔'' وہ چلا اٹھیں۔ ان کا لاشعوری خوف رنگ لے آیا تھا۔

''آپ جو چاہیں سمجھتی رہیں۔ میں وضاحت نہیں دوں گا۔'' سلگتے ہوئے لہجے میں کہہ کر وہ وہاں سے نکل گیا تھا۔ کسی انجانے خدشے سے ان کی رنگت زرد ہوگئی تھی۔

☆☆☆

وہ جلے پیر کی بلی کی طرح کمرے میں ادھر سے اُدھر ٹہل رہی تھی۔ اضطرابی نظریں دادی پر تھیں اور انگلیاں دانتوں میں دبی ناخن کترتی، وہ بے چینی و بے تابی کی انتہا پر تھی۔

تائی اس وقت دادی کے پاس ہی بیٹھی تھیں۔ ان کے چہرے پر ایک خوش گوار حیرت بخوبی دیکھی جاسکتی تھی۔

''ٹھیک ہے بیٹا! بس اپنا خیال رکھنا۔ ابھی تو تمہیں گئے اتنے دن بھی نہیں ہوئے اور دیکھو۔ مجھے پھر سے تمہاری یاد ستانے لگی ہے۔ اٹھتے بیٹھتے ذکر کرتی ہوں تمہارا۔ تمہاری ماں تمہیں بہت یاد کررہی ہے۔ بات کروگے اس سے؟'' ایک جوش سے کہتے ہوئے دادی کو اچانک پاس بیٹھی تائی کا خیال آیا۔ جن کی آنکھوں میں یہ سنتے ہی امید و بیم کی کیفیت جھلکنے لگی تھی۔

تھوڑی دیر میں دادی نے ریسیور انہیں پکڑا دیا۔ شاید اس نے بات کرنے کی خواہش ظاہر کردی تھی۔ ادھر نوال بے دم ہوتے وجود کے ساتھ کرسی پر بیٹھی۔

''اور میں...... میں کب بات کروں گی اس سے۔ میں بھی تو ہر سانس کے ساتھ اسے یاد کرتی ہوں۔'' ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ دھندلی نظروں سے تائی کو بات کرتا دیکھ رہی تھی۔ چند منٹ بعد انہوں نے فون دادی کو دیا اور انہوں نے ڈھیر ساری دعائیں دے کر الوداعی کلمات ادا کرکے فون سائیڈ ٹیبل پر رکھ دیا۔

چائے لاتی حمنہ نے تاسف سے اس کی حالت دیکھی۔ مایوسی کا گہرا دھواں اس کے چہرے پر چھا گیا تھا۔ وہ یوں ہی ساکت و صامت بیٹھی رہی۔ تائی اور دادی کو چائے کے کپ تھما کر حمنہ نے غیر محسوس انداز میں سائیڈ ٹیبل سے سیل فون اٹھایا اور اس کے قریب آئی۔

''نوال اٹھو...... باہر آؤ۔'' اس کا لہجہ دھیما تھا۔ وہ چونک کر اسے دیکھنے لگی۔

''اٹھو ناں۔'' حمنہ نے اس کا بازو ہلایا پھر اپنے ہاتھ میں سیل فون کی جھلک اسے دکھائی۔

''باہر آؤ...... بات کرتے ہیں۔'' وہ یہ کہہ کر باہر نکل گئی تھی۔ تب ہی نوال کو جیسے ہوش آیا۔ وہ اٹھ کر اس کے پیچھے لپکی۔

''کیا کروگی؟''

وہ کچن میں آکر رکی تھی۔ نوال نے اس کا بازو تھاما۔

''فون کریں گے شہریار بھائی کو اور کیا۔'' وہ بغور اس کا چہرہ تک رہی تھی۔ ''اس سیل میں سیو ہے ناں ان کا نمبر۔ میں اپنے موبائل میں بھی سیو کردیتی ہوں۔''

''ابھی کریں گے؟'' نوال کچھ ڈری سی گئی۔

''نہیں...... تھوڑی دیر بعد۔ وہ ہمارے کزن ہیں۔ کیا ہم ان سے فون پر بات نہیں کرسکتے۔'' حمنہ نے دونوں ہاتھ سلیب پر ٹکائے۔

''پھر بھی...... انہیں اگر ہم سے بات کرنی ہوتی تو خود فون کرتے۔ انہوں نے علی کے سیل پر کال کیوں کی۔'' نوال تذبذب کا شکار تھی۔

''ٹھیک ہے۔'' حمنہ نے کندھے اچکائے۔ ''نہیں کرتی فون۔ صرف نمبر فیڈ کرلیتی ہوں۔ جب

تمہیں لگے کہ تمہیں ان سے بات کرنی ہے تب آجانا میرے پاس۔" ایک طرف لگے ریک سے اپنا سیل فون اٹھاتے ہوئے حمنہ نے مکمل لاپروائی اختیار کرلی۔

"ابھی علی آجائے گا اپنا فون مانگنے۔"

"اچھا سنو۔" نوال نے بے چین ہو کر اسے پکارا۔ "ہم......رات کو فون کریں گے مگر...... پہلے ان سے تم بات کرو گی۔"

"کیوں؟" حمنہ نے آنکھیں سکیڑ کر اسے دیکھا۔ "مجھ سے زیادہ تو وہ تم سے بات کرتے ہیں۔"

"کوئی نہیں۔ صرف ایک بار ہی تو کی تھی۔" نوال نے کسی قدر خفگی سے کہتے انگلیاں چٹخائیں۔

"اچھا ٹھیک ہے، تو پھر رات کو دس بجے۔ سارے کاموں سے فارغ ہونے کے بعد کرتے ہیں۔" حمنہ نے پروگرام طے کرلیا۔

"ہاں...... یہ وقت صحیح ہے۔" اس نے سر ہلا کر تائید کی تھی۔

☆☆☆

رات کو ڈنر کے بعد وہ لاؤنج میں بیٹھا ایک ٹاک شو دیکھ رہا تھا، جب امی چائے لے کر آئیں اور اس کے پاس ہی بیٹھ گئیں۔

"اب بتاؤ۔ شہریار کیا مسئلہ ہے؟" وہ بے حد سنجیدگی سے پوچھنے لگیں۔

"کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ کس مسئلے کی بابت پوچھ رہی ہیں۔" اس نے ریموٹ اٹھا کر آواز کم کی۔

"میں ہائی بلڈ پریشر کی مریضہ ہوں شہریار! مجھے اور اسٹریس مت دو۔" اس کی بے نیازی پر وہ چیخ گئیں۔

"جیا میں کیا خرابی ہے؟"

ایک گہری سانس لے کر اس نے ٹھوڑی سہلائی۔

"جیا میں کوئی خرابی نہیں ہے مگر نہ میں اس سے شادی کرنا چاہتا ہوں اور نہ وہ مجھ سے۔"

"کیا مطلب...... تم سے کس نے کہا وہ تم سے شادی نہیں کرنا چاہتی۔" وہ کچھ حیران ہو کر اس کی صورت دیکھنے لگیں۔

"کسی نے نہیں کہا مگر میں اسے اچھی طرح جانتا ہوں۔ اس کی پسند ناپسند، اس کے نظریات، اس کی ترجیحات......سب پتا ہیں مجھے۔"

"ٹھیک ہے۔ تم جانتے ہو مگر یہ شادی کا معاملہ ہے۔" وہ اس کی وضاحت سے مطمئن نہ تھیں۔

"تو پھر......اگر آپ یہ رشتہ کرنا چاہتی ہیں تو پہلے جیا سے پوچھیے۔ اگر اسے کوئی اعتراض نہ ہوا تو میں بھی سوچوں گا۔" قطعیت سے کہتے وہ لمحے بھر کو انہیں چپ کروا گیا۔

"اور اگر میں نے اسے راضی کرلیا تو......" کچھ دیر بعد انہوں نے سوال کیا۔ "اگر اسے کوئی اعتراض نہ ہوا تو پھر تم بھی کوئی اعتراض نہیں کرو گے؟"

اس نے سوچتے ہوئے کئی لمحے خاموشی کی نذر کردیے۔ کیا وہ جیا کو اس حد تک جاننے کا دعوا کرسکتا ہے۔ قدرے توقف کے بعد اس نے سر ہلا کر دھیرے سے کہا۔

"ٹھیک ہے۔"

امی کے چہرے پر ایک مطمئن سی مسکراہٹ پھیل گئی۔ اسی وقت اس کا سیل بجا۔

اس نے سینٹر ٹیبل پر پڑا اپنا سیل اٹھایا اور اسکرین پر نگاہ ڈالی۔ کسی قدر تذبذب میں اس نے کال ریسیو کر کے سیل کان سے لگایا تھا۔

"ہیلو۔"

دوسری طرف خاموشی تھی۔ اس نے ایک بار پھر اسکرین پر نگاہ کی۔

"ہیلو شہریار!" ایک نرم مہین سی، ڈری سہمی آواز ابھری تھی۔ وہ اپنی جگہ ساکت رہ گیا۔ امی اس کی طرف دیکھ رہی تھیں بہت غور سے۔ شہریار نے ایک نظر انہیں دیکھا اور پھر تیزی سے اٹھ کھڑا ہوا۔

"ایک منٹ۔" وہ امی کے حیران متجسس چہرے سے نظریں چراتا لاؤنج کا دروازہ کھول کر باہر نکل آیا تھا۔

"کیسی ہو نوال؟" دھیرے سے پوچھتے ہوئے پیشانی سہلاتے وہ ازحد مضطرب ہو گیا تھا۔ اسے ذرہ برابر بھی امید نہیں تھی کہ رات کے اس وقت نوال اسے فون بھی کر سکتی ہے۔

"پتا نہیں۔" اس کا لہجہ بے یقین تھا۔ "آپ حیران ہو رہے ہوں گے کہ میں نے آپ کو فون کیسے کیا؟" اس نے جیسے شہریار کے دل کی بات کہہ دی۔

"نہیں...... ایسی تو کوئی بات نہیں۔" وہ اور کیا کہتا۔

"آپ نے آج فون کیا تھا مگر مجھ سے بات نہیں کی۔ شاید آپ کو میں یاد نہیں رہی۔" وہ چبھتے ہوئے لہجے میں شکوہ کر رہی تھی۔ "اگر آپ کو میں یاد نہیں رہی تھی تو آپ کو اپنی کہی ہوئی بات کیسے یاد رہے گی۔"

اس نے جس انداز میں کہا تھا شہریار کے دل کو پہلی بار ایک انجانی بے چینی نے آگھیرا۔ وہ بھولا نہیں تھا۔ اسے اپنی بات یاد تھی۔ اسے تو نوال بھی یاد تھی۔ زندگی میں پہلی بار کوئی لڑکی اس کی یادداشت پر اس حد تک نقش ہوئی تھی۔

"آپ کچھ کہیں گے نہیں؟" وہ اس کی خاموشی پر الجھی۔

"مجھے یاد ہے نوال۔ اپنی بات بھی اور آپ بھی۔ ان فیکٹ میں کبھی بھولا ہی نہیں۔ آپ سے بات اس لیے نہیں کی کہ...... عجیب سا فیل ہوتا اگر میں آپ کا نام لے کر آپ سے بات کروانے کو کہتا۔" وہ وضاحت دینے پر مجبور ہوا۔

"میں آئندہ آپ کو فون نہیں کروں گی۔ مجھے خود بھی عجیب سا لگ رہا ہے یہ حرکت کر کے۔ مجھے یہ نہیں کرنا چاہیے تھا۔" اس کے لہجے میں تاسف و شرمندگی تھی۔

شہریار کے چہرے پر ہلکی سی مسکراہٹ آ گئی۔

"یہ کوئی اتنی بڑی بات نہیں ہے نوال! ہم کزنز ہیں۔ ہم آپس میں بات کر سکتے ہیں۔"

"تو پھر آپ کو مجھ سے بات کرنے میں عجیب سا کیوں لگا؟" اس نے سوال کیا۔

"شاید میرے دل میں چور تھا اس لیے۔" وہ دل میں کھٹکتی بات زبان پر لے آیا۔

نوال چپ سی رہ گئی۔

"ٹھیک ہے، آپ مجھے فون مت کیجیے گا۔ اب میں خود ہی آپ کو فون کر لیا کروں گا۔" وہ اس کی شرمندگی کا سبب بخوبی سمجھ رہا تھا۔

"سچ کہہ رہے ہیں۔ کریں گے ناں؟" وہ لہجے میں آس و اندیشے لیے پوچھنے لگی۔

"نوال......! مجھ پر یقین نہیں ہے؟" اس کے بھاری لہجے میں نرمی و اپنائیت سی در آئی تھی۔

"ہے......" وہ بے ساختہ بول اٹھی۔

"تو بس...... پھر بے فکر رہیے۔"

"ٹھیک ہے۔ میں انتظار کروں گی۔ اب میں فون رکھ رہی ہوں۔ سوری ڈسٹرب کرنے کے لیے۔"

"تم پہلے ہی مجھے جتنا ڈسٹرب کر چکی ہو، اس سے زیادہ میں اور کیا ہوں گا۔" وہ کہتے کہتے رک گیا۔ اس نے رابطہ منقطع کر دیا۔

"کس کا فون تھا شہریار؟" وہ اندر آیا تو امی غالباً انتظار میں وہیں بیٹھی تھیں۔ وہ چونک سا گیا۔

"کوئی خاص نہیں...... بس ایک دوست تھا۔" مختصر سا جواب دے کر وہ اپنے کمرے کی سمت چلا آیا تھا۔

پیچھے ان کے چہرے پر سوچ و تفکر کی پرچھائیاں بکھر گئی تھیں۔

☆☆☆

"کیا تمہیں رات کو ٹھیک سے نیند آئی تھی؟" ناشتے کی ٹیبل پر سلائس کترتے ہوئے حمنہ بغور اس کے گلابی اور تمتمائے چہرے کا جائزہ لے رہی تھی۔

اس نے بنا زبان کھولے نفی میں سر ہلایا۔

"تم ساری رات کروٹیں بدلتی رہیں اور تم نے مجھے بھی بے آرام کیا۔" ان کا کمرہ مشترکہ تھا۔ بلکہ ان کا بیڈ بھی ایک تھا۔ نوال اکثر رات کو سوتے میں ڈر

جایا کرتی تھی۔ اس لیے اس نے اپنے اور حمنہ کے سنگل بیڈ کمرے سے نکلوا کر ڈبل بیڈ ڈلوایا اور حمنہ کی ناراضی کی پروا کیے بغیر اس کے ساتھ سونے لگی۔

''میں ساری رات سوتی جاگتی رہی، مگر شاید یہی میری سزا تھی۔ اس غلطی کی جو میں نے شہریار بھائی سے تمہاری بات کروا کر کی۔'' حمنہ کے لہجے میں دبا دبا غصہ تھا۔

''میں جان بوجھ کر نہیں جاگتی رہی تھی۔ مجھے نیند نہیں آرہی تھی۔ میں نے بہت کوشش کی۔'' اس نے کمزور سے لہجے میں اپنا دفاع کیا۔

''کیا خیال ہے تائی کو نہ بتادیں کہ ہم نے کل رات شہریار بھائی سے بات کی۔ خوش ہوجائیں گی۔'' اس نے جس انداز میں کہا، چائے کا گھونٹ بھرتی نوال کو اچھو لگ گیا۔

''تم...... تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔'' گلا پکڑ کر کھانستی وہ بمشکل بول پائی۔ ''تم اس بات کا اشتہار لگواؤ گی۔''

''صرف تائی کو بتانے سے کیا ہوگا۔ دادی کو نہیں بتائیں گے۔'' حمنہ پوری سنجیدہ تھی۔

''چپ کرو حمنہ! ورنہ میں تمہیں کچھ دے ماروں گی۔'' کچھ غصے کے باعث، کچھ کھانسی اس کا چہرہ سرخ ہوگیا۔

''یہ صبح ہی صبح کیا مرنے مارنے کی باتیں ہو رہی ہیں۔'' اسی وقت یونیورسٹی جانے کے لیے تیار علی بھی اس طرف چلا آیا۔ حمنہ کی چوٹی پکڑ کر کھینچتے وہ اس کی برابر والی کرسی پر براجمان ہوا۔

''تم شہریار بھائی سے کچھ کیوں نہیں سیکھتے۔'' حمنہ کو اس کی حرکت پر جی بھر کے غصہ آیا۔

''کیا سیکھوں ان سے...... بتانا پسند کرو گی۔'' پانی کا گلاس بھرتے ہوئے وہ حیران ہو کر اسے دیکھنے لگا۔

''تھوڑی تمیز سیکھ لو ان سے۔ بات کرنے کا طریقہ سیکھو اور تھوڑا چپ رہنا سیکھو۔''

''بات کرنے کا طریقہ سیکھوں گا تو پھر چپ رہنا کیوں سیکھوں اور ویسے بھی تائی کہتی ہیں میں بولتے ہوئے زیادہ اچھا لگتا ہوں۔'' اس نے فخریہ انداز میں کالر اکڑائے۔

''کوے لگتے ہو بالکل...... کاں کاں کرنے والے۔'' حمنہ چڑ کر کہتے ہوئے اٹھ گئی۔

''تمہیں کیا ہوا؟'' اس کی نظر اس کی سرخ آنکھوں پر پڑی تو چونک کر پوچھنے لگا۔

''حمنہ سے لڑائی ہوئی ہے؟'' تھوڑی دیر پہلے اس کی سنی ہوئی بات سے وہ یہی نتیجہ اخذ کر پایا۔

''اف......'' اس نے بے اختیار لب کاٹے۔

''ایک تمہاری وجہ سے میں سب کو اپنی جانب متوجہ کرنے لگی ہوں۔'' دل ہی دل میں شہریار کو مخاطب کرتے اس نے کہا ''نہیں''۔

تائی اس کے لیے ناشتا لائیں تو وہ ان سے پوچھ بیٹھا۔

''حمنہ نے نوال کو کچھ کہا ہے، سمجھالیں اسے ورنہ مجھ سے بہت پٹے گی۔'' وہ اس کی چہیتی بہن تھی۔ اس کے لیے وہ ہر ایک سے لڑ لیتا تھا۔

''مجھے تو نہیں پتا۔ کیا واقعی؟'' تائی نے گھبرا کر اسے دیکھا۔

''کچھ نہیں ہوا ہے۔ تھوڑی سی بحث ہوگئی ہماری۔ یہ تو پاگل ہے۔'' کچھ گھور کر کہتے ہوئے نوال نے اس کے بازو پر ہاتھ مارا۔

''اچھا...... اب میں پاگل ہوگیا۔'' اس نے منہ پھلالیا۔

''چلو...... ناشتا کرو جلدی۔ تمہیں دیر ہو رہی ہے۔'' تائی نے اسے یاد دلایا۔

الجھی ہوئی نوال وہاں سے اٹھ آئی تھی۔

☆☆☆

''تو تم کیا چاہتے ہو؟' وہ جیا کے ساتھ ریسٹورنٹ میں بیٹھا تھا۔ جب ساری بات سننے کے بعد اس نے ایک پھیکی سی مسکراہٹ کے ساتھ پوچھا۔

''میں نے امی سے کہہ دیا کہ جیا بھی نہیں مانے گی۔ مگر ان کی اپنی ایک سوچ ہے۔ ہوسکتا ہے وہ

تمہیں پریشرائز کریں۔ مگر کوئی دباؤ مت لینا۔ وہی کرنا جو تمہیں صحیح لگتا ہے۔" اس کی بھوری آنکھوں میں سنجیدگی و اضطراب بسا ہوا تھا۔ جیا بغور اسے دیکھ رہی تھی۔

"تو کون ہے وہ؟"

"کون......؟" وہ اس غیر متعلق سوال پر چونکا۔

"وہی جس کے لیے تم اتنا پریشان ہو اور جس کا نام تم پھوپھو کے سامنے نہیں لے سکتے۔" وہ بے اختیار بالوں میں ہاتھ پھیرنے لگا۔

"میں کیا سوچتی ہوں وہ چھوڑو شہریار! تم کیا چاہتے ہو وہ کلیئر کرو۔"

"تم ایسا کیوں سمجھتی ہو کہ کوئی ہے؟" وہ ہونٹ چباتے ہوئے اس سے پوچھنے لگا۔ جیا مسکرا دی۔

"تمہیں بچپن سے جانتی ہوں شہریار! تم مجھ سے اپنا آپ نہیں چھپا سکتے۔ اگر ایسا نہ ہوتا تو میں تمہارے لیے پرفیکٹ چوائس ہوتی۔ تم اپنا آپ بچانے کے لیے یہ معاملہ مجھ پر نہ چھوڑتے۔" وہ اسے صحیح معنوں میں چپ کروا گئی تھی۔ "تو اب بتاؤ کون ہے وہ؟"

"جو بھی ہے، امی کے لیے کبھی قابل قبول نہیں ہوگی۔" اس نے ایک گہری سانس لے کر دل کا غبار نکالا۔ جیا کے چہرے کا رنگ پل بھر کو بدلا پھر وہ سر ہلانے لگی۔

"سمجھ گئی......یعنی پھوپھو کے خدشات صحیح نکلے۔"

"کیا......؟" وہ ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگا۔ "کم از کم تم تو یہ مت کہو۔"

"تمہاری کزن ہے ناں وہ؟" جیا نے اس کی بات ان سنی کر دی۔ پوچھتے ہوئے عجیب سی کیفیت ابھر آئی تھی اس کے چہرے پر۔ "بہت خوب صورت ہے وہ؟"

"یہ وقت ان باتوں کا نہیں ہے جیا! مجھے بس اب امی کو ان کے ارادوں سے باز رکھنا ہے اور میں چاہتا ہوں کہ اس میں تم میری مدد کرو۔" وہ قدرے رکھائی سے بولا۔

"ٹھیک ہے، میں انہیں سمجھا لوں گی۔" جیا کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ "شہریار! صرف میرا دوست ہے، میں اس سے شادی کے بارے میں سوچ بھی نہیں سکتی۔ یہی کہلوانا چاہتے ہو ناں مجھ سے؟"

"کیا مطلب میں کہلوانا چاہتا ہوں۔ کیا تم خود ایسا نہیں چاہتیں؟" وہ متحیر سا رہ گیا۔

"تم نے یہ کیونکر سوچ لیا کہ میں بھی ایسا چاہتی ہوں؟" جیا نے اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں۔ "تم نے کبھی ایک بار بھی مجھ سے پوچھا ہے؟"

"اف خدایا۔" وہ سر تھام کر بیٹھ گیا۔

"ویسے کتنی عجیب بات ہے ناں شہریار! میں تمہاری بچپن کی ساتھی ہوں مگر تمہیں کبھی مجھ میں وہ بات نظر نہیں آئی اور......اور......اس کے ساتھ چند دن گزارے ہیں، وہ تمہارے لیے ہر چیز سے بڑھ کر ہوگئی۔ ماں کی خواہش سے بھی بڑھ کر......مگر خیر، تم فکر مت کرو۔ جیسا تم چاہتے ہو ویسا ہی ہوگا۔ اپنے دوست کے لیے اتنا تو کر ہی سکتی ہوں۔" وہ عجیب سے لہجے میں بولتی بیگ شولڈر پر ڈالتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

شہریار دنگ سا بیٹھا اسے جاتے ہوئے دیکھتا رہا۔

☆☆☆

اس دن اچانک ہی بیٹھے بٹھائے دادی کی طبیعت خراب ہوگئی اور اتنی خراب ہوئی کہ ڈاکٹر نے دیکھتے ہی ہاسپٹل میں ایڈمٹ کرنے کا مشورہ دیا۔ سب ہی کے ہاتھ پاؤں پھول گئے تھے۔ شام تک دادی شہر کے ایک پرائیوٹ ہاسپٹل کے آئی سی یو میں پڑی تھیں۔ انہیں ہارٹ اٹیک ہوا تھا۔ دل کو لگا بیٹے کی موت کا غم بالآخر اس صورت تک پہنچا تھا۔ ہاسپٹل میں اس وقت نوال، تائی اور بابا ہی تھے۔ ستے ہوئے چہرے اور بڑھتی دھڑکنوں کے ساتھ بھاگ دوڑ کرتے۔ علی اتنا سمجھ دار نہیں تھا کہ یہ معاملات سنبھال سکتا۔ ان لمحات میں انہیں حقیقی معنوں میں شہریار کی

کمی محسوس ہو رہی تھی اور اتفاق کہ اسی وقت شہریار کا فون آ گیا اور وہ اس کی آواز سنتے ہی بکھر سے گئے۔

"اماں کی طبیعت بہت خراب ہے بیٹا۔ ہم اس وقت ہسپتال میں ہیں۔"

"کیسے چچا جی..... کیا ہوا انہیں؟" وہ یہ سنتے ہی بوکھلا گیا۔

"ہارٹ اٹیک ہوا ہے۔ ہم تو پہلے سمجھے بھی نہیں تھے، وہ تو ڈاکٹر نے دیکھتے ہی بتایا تو ہاسپٹل لے کر آئے۔ ابھی اماں آئی سی یو میں ہیں۔ ڈاکٹر کچھ بتا بھی نہیں رہے۔" لمبے چوڑے مضبوط اعصاب کے مالک بابا حوصلہ ہار گئے تھے۔ وہ کئی لمحے تو کچھ بول ہی نہیں پایا۔ نظروں کے سامنے دادی کا مشفق مہربان چہرہ گھوم رہا تھا۔

"آپ..... آپ حوصلہ رکھیے چچا جی! کچھ نہیں ہوگا دادی کو۔ وہ بالکل ٹھیک ہو جائیں گی ان شاء اللہ۔ میں دیکھتا ہوں جو بھی پہلی فلائٹ مجھے ملتی ہے۔ میں آنے کی کوشش کرتا ہوں۔"

"جیتے رہو بیٹا۔ نہیں بھی آ سکو تو کوئی بات نہیں ہے۔ تم سے بات کر کے دل کو ڈھارس بندھ گئی ہے۔" انہوں نے خود پر قابو پایا۔

"نہیں چچا جی! میرے دل کو تسلی وہیں آ کر ملے گی۔ دادی کو دیکھ کے، انہیں ہنستا بولتا پا کے۔ آپ بے فکر رہیں۔ میں ابھی فلائٹس کا پتا کرتا ہوں۔" اس نے نہایت سنجیدگی سے اس کی تشفی کرا کے فون بند کیا تھا۔

ان کے لبوں پر کئی دعائیں آ کے ٹھہر گئیں۔

☆☆☆

"تم تو بالکل پاگل ہو گئے ہو شہریار! تم نے ایسا سوچ بھی کیسے لیا۔" وہ ٹکٹ کنفرم کرا کے گھر آیا تھا۔ امی تو یہ سنتے ہی غصے سے بپھر ہو گئیں۔ وہ پینٹ کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے سپاٹ نظروں سے انہیں دیکھتا رہا۔

"دادی کی طبیعت بے حد خراب ہے امی! مجھے بس دو دن کے لیے وہاں جانا ہے۔"

"تو تمہارے وہاں جانے سے کیا وہ ٹھیک ہو جائیں گی..... اور کون جانے بیمار ہیں بھی یا تمہیں دوبارہ بلانے کا بہانا ہے۔ میں اچھی طرح جانتی ہوں، ان گھٹیا لوگوں کے اوچھے ہتھکنڈوں کو۔" غیظ و غضب سے کہتے ان کے چہرے کے نقوش بگڑ گئے تھے۔ شہریار کے چہرے پر سرخی چھا گئی۔

"خدا کے لیے امی! سوچ سمجھ کے بولیں۔ وہ آئی سی یو میں ہیں اور آپ....." تاسف و غصے سے اس نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

"آئی سی یو میں کیا قبر میں بھی پہنچ جائیں تب بھی تم وہاں نہیں جاؤ گے۔ سن لیا تم نے۔ تم کہیں نہیں جا رہے۔" وہ چلا رہی تھیں اور شہریار ان کے جملے پر کانپ کر رہ گیا۔ اس نے تصور بھی نہیں کیا تھا وہ اپنی نفرت میں اس حد تک بھی سفاک ہو سکتی ہیں۔

"اگر تم وہاں گئے ناں شہریار! تو پھر میرا اور اپنا رشتہ ختم سمجھو۔ مت آنا پھر واپس..... وہیں رہ جانا۔ مجھے نہیں ہے ضرورت تم جیسے بیٹے کی۔" ان کا لہجہ گلوگیر ہوا تھا۔

شہریار کی ساری مزاحمت دم توڑ گئی۔ چہرے پر ہاتھ پھیرتے ہوئے وہ ڈھیلے سے انداز میں صوفے پر گر سا گیا۔

"او کے نہیں جا رہا..... کہیں نہیں جا رہا۔"

"اور میں آج ہی جا رہی ہوں تمہاری اور جیا کی بات پکی کرنے۔" انہوں نے اگلا دھماکا کیا تھا۔ شہریار نے تڑپ کر سر اٹھایا۔

"میں جلد از جلد اپنی فکر کم کرنا چاہتی ہوں اور میں نہیں جانتی جیا مانے نہ مانے۔ بھابھی اسے خود منا لیں گی۔"

"آپ واقعی ایسا کرنے جا رہی ہیں؟" اس کی بادامی آنکھوں میں ہلکی ہلکی سرخ ابھرنے لگی۔

"ہاں۔ مجھے نہیں مطلب تمہارے فضول اعتراضات سے۔ میں فیصلہ کر چکی ہوں۔" وہ قطعی لہجے میں کہہ کر کمرے سے چلی گئیں۔

اس کے شانوں پر منوں بوجھ آ پڑا۔ بے اختیار

گردن سہلاتے ہوئے اس نے صوفے کی پشت سے ٹیک لگائی تھی۔

☆☆☆

"تمہیں لگتا ہے شہریار بھائی آئیں گے؟"

اسے کچھ ہی دیر ہوئی تھی گھر آئے۔ دادی کی حالت میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ وہ تو بالکل نہیں آنا چاہتی تھی مگر تائی نے اسے زبردستی گھر بھیج دیا اور اب جب وہ فریش ہو کر لاؤنج میں آ کر بیٹھی تو حمنہ نے اس کے سامنے چائے رکھتے ہوئے سوال کیا۔

"پتا نہیں۔ بابا سے تو یہی کہا ہے۔" وہ خود بھی بے یقین تھی۔

"مجھے نہیں لگتا آئیں گے۔ مطلب ثمینہ تائی کہاں آنے دیں گی انہیں۔"

"ٹھیک کہہ رہی ہو۔" اس نے چائے کا کپ اٹھایا۔

"یا پھر انہیں تائی کو بتانا ہی نہیں چاہیے۔" حمنہ کہہ رہی تھی۔ وہ کوئی جواب دینے ہی لگی تھی کہ اسی پل سینٹر ٹیبل پر پڑا اس کا سیل فون بجنے لگا۔ حمنہ نے ہاتھ بڑھا کر اٹھایا اور اسکرین کو دیکھتے ہی چونک گئی۔

"شہریار بھائی ہیں۔"

"لاؤ مجھے دو۔" وہ سیدھی ہو بیٹھی۔

"ہیلو۔" اس نے دھڑکتے دل سے کال ریسیو کر کے موبائل کان سے لگایا تھا۔

"نوال۔" اس کی بھاری آواز ابھری۔ "کیسی ہو؟"

"اچھی ہوں۔" اس نے دھیرے سے جواب دے کر حمنہ کی سمت دیکھا جو اس پر نظریں گاڑے بیٹھی تھی۔

"میں نے ابھی چاچا جی کو فون کیا تھا مگر زیادہ بات نہیں ہو سکی۔ تم کہاں ہو ابھی؟"

"میں تو گھر پر ہوں۔" اس نے جواب دیا۔ "کیوں؟"

"او کے۔" وہ قدرے رکا۔ "بات یہ ہے نوال کہ مجھے کوئی فلائٹ نہیں مل سکی، فی الحال تو جیسے ہی مجھے کوئی پہلی فلائٹ ملتی ہے۔ میں آ جاؤں گا۔ چاچا جی کو بتا نہیں پایا۔ میں بعد میں انہیں خود بھی فون کروں گا، مگر ابھی تم انہیں یہ بتا دو گی؟"

نوال کے منہ سے بے اختیار ایک گہری سانس خارج ہوئی تھی۔

"تو یہ بات ہے۔"

"ٹھیک ہے میں ان سے کہہ دوں گی کہ فی الوقت آپ نہیں آ رہے۔" اس نے کہا تو حمنہ کے چہرے پر ایک بے ساختہ سی مسکراہٹ اُمڈ آئی۔ شاید اپنا اندازہ صحیح ثابت ہونے پر۔

"اور تم پریشان بالکل مت ہونا۔ دادی بہت جلد ٹھیک ہو جائیں گی۔"

"مجھے یقین ہے۔" اس نے دھیرے سے کہا۔

"ٹھیک ہے، میں ابھی فون رکھ رہا ہوں۔ بعد میں بات کروں گا۔ اللہ حافظ۔" وہ بہت عجلت میں معلوم ہوتا تھا۔ نوال کو تشنگی سی محسوس ہوئی اس چند لفظی گفتگو سے۔

مگر ابھی اسے یہ حق حاصل نہیں ہوا تھا کہ وہ اسے روک کر خود سے باتیں کرنے پر مجبور کرتی۔ اسی لیے دل مسوس کر رہ گئی۔

"بس کر دو اور بھی غم ہیں زمانے میں شہریار کے سوا۔" حمنہ نے فوراً اس کے چہرے کی مایوسی بھانپ لی۔ موبائل اس کے ہاتھ سے لیتے ہوئے وہ اس پر چوٹ کر گئی تھی۔ اس نے جواب دینے کے بجائے گھٹنوں میں سر دے کر خاموشی اختیار کر لی تھی۔

☆☆☆

مگر رات کو اس کی یہ مایوسی سرشاری میں بدل گئی، جب اس کا فون آیا۔ وہ سونے کی تیاری کر رہی تھی۔

"سو تو نہیں گئی تھیں؟" وہ دریافت کر رہا تھا۔

"نہیں، ابھی تو نہیں۔" اس نے ہینڈ لوشن سائیڈ پر رکھا۔ اگر کہہ دیتی کہ بس سونے ہی والی تھی تو ہو سکتا تھا، اگلی بار وہ احتیاط کے پیش نظر فون ہی نہ کرتا۔

”مجھے کال ملانے کے بعد خیال آیا کہ کافی دیر ہوگئی ہے۔“ اس کے لہجے میں شرمندگی آسمائی۔

”نہیں، اتنی بھی دیر نہیں ہوئی۔ میں عادی نہیں ہوں اتنی جلدی سونے کی۔“ اس نے جھوٹ بول کر دانتوں تلے لب دبا لیے۔ اس کے لیے تو وہ آدھی رات کو بھی اپنی نیند قربان کرنے کو تیار تھی۔

”اچھا آپ بتائیں۔ کل آرہے ہیں ناں؟“ کتنے دن ہوگئے تھے اسے دیکھے۔

دوسری طرف خاموشی چھا گئی، شاید اسے اس سوال کی توقع نہیں تھی۔

”شہریار!“ اس نے دھیمے سے پکارا۔

”نہیں نوال۔“ قدرے توقف سے وہ گویا ہوا۔ ”میرے نہ آنے کی وہ وجہ بالکل نہیں ہے جو میں نے شام کو تمہیں بتائی تھی۔“

”پھر؟“ وہ بے چین ہوئی۔

شہریار نے اصل وجہ بتائی تو نوال نے تکیے سے ٹیک لگاتے ہوئے اپنے بکھرتے دل کو سنبھالا۔

”انہوں نے اپنے ماں ہونے کا جذباتی فائدہ اٹھایا نوال! اور یہیں پہ آکر میں چت ہوجاتا ہوں۔“ وہ بے بسی سے کہہ رہا تھا۔ ”سمجھ میں نہیں آتا کیا کروں۔ میں شرمندہ ہوں چچا جی کے سامنے۔“

نوال خاموش تھی۔ دل میں جوار بھاٹا سا اٹھ رہا تھا۔

دادی کو دیکھنے نہیں آسکتے۔ اپنا وعدہ نبھانے تو آؤ گے تم۔

”وہ شدید نفرت کرتی ہیں ان سے جن کے ساتھ بمشکل پانچ چھ سال گزارے تھے۔ بائیس سال کا عرصہ بھی ناکام رہا، ان کی اس نفرت کو مدھم کرنے میں۔ وجہ کوئی بھی ہو اتنی شدید نفرت کی کوئی وضاحت قابل قبول نہیں ہوسکتی کہ انسان...... انسانیت ہی بھول جائے۔“ تلخی سے کہتے ہوئے وہ چاہ کر بھی دادی کے لیے ان کا وہ نفرت آمیز جملہ نوال کے سامنے دہرا نہ سکا۔

”اس کی ایک دوسری وجہ بھی ہوسکتی ہے شہریار!“ اپنی ہتھیلی میں اس کا نام تلاشتے وہ دھیرے سے بولی۔ ”تایا جی نے ان کی رہائی کے راستے مسدود کر کے انہیں ایک بے رنگ زندگی جینے پر مجبور کیا جبکہ خود وہ اپنی زندگی میں مگن ہوگئے۔ وہ تب جوان تھیں۔ کئی لوگ ان کا ہاتھ تھامنے پر تیار ہوجاتے۔“

”تو کیا مانی ان کی شرط۔“ وہ تیزی سے بول اٹھا۔ ”دے دیتیں بیٹا انہیں واپس۔ عورت کا دل بہت بڑا ہوتا ہے نوال! وہ لگا لیتی ہے پرائی اولاد کو بھی سینے سے۔ مرد میں نہیں ہوتا اتنا ظرف۔ تم کیا سمجھتی ہو وہ کسی کا ہاتھ تھامتیں تو کیا وہ شخص مجھے قبول کرنے پر تیار ہوجاتا؟ اگر بابا یہ نہ کرتے اگر وہ دوسری شادی کر بھی لیتیں تب بھی قربان میں ہوتا نوال! جیسے اب ہوا ہوں۔“

ہمیشہ نرم اور دھیمے لہجے میں بات کرنے والے شہریار کا انداز کھردرا ہوا تھا، لہجے میں کڑواہٹ بھری تھی۔ وہ پہلی بار اس سے یوں کھل کر بولا تھا اور نوال کو پہلی بار احساس ہوا تھا کہ بظاہر اتنی بہترین شخصیت کا مالک ہونے کے باوجود وہ اندر سے کتنا اکیلا اور محرومیوں میں گھرا ہے۔

”خیر چھوڑو......“ لہجہ ہموار کرتے ہوئے اس نے خود پر قابو پایا۔ ”دادی ان شاء اللہ ٹھیک ہوجائیں پھر آؤں گا انہیں بنا بتائے۔ آج بھی غلطی ہوئی مجھ سے جو یہ سوچا کہ وہ دادی کے آئی سی یو میں ہونے سے کچھ نرم پڑیں گی۔ اب نہیں کروں گا ایسی غلطی۔“

”ہمم......“ نوال نے ہنکارا بھرا تھا۔ ”تم بنا بتائے آسکتے ہو۔ تم بنا بتائے مجھے اپنا نہیں سکتے۔ میں بھی کس سراب کے پیچھے بھاگ رہی ہوں۔ میں نے بھی کہاں آکر اپنا سر پھوڑا ہے۔ میں کیا کروں گی شہریار...... میں کیا کروں گی۔“

اس کی باتوں کا جواب دیتے ہوئے اس کے خاموش آنسو بہہ رہے تھے۔ رگ و پے میں اضطراب دوڑنے لگا تھا دھڑکنوں پر بے کلی و بے قراری کے نئے مفہوم آشکار ہو رہے تھے۔

☆☆☆

ایک قدرے سنسان سی سڑک کے کنارے گاڑی روکے وہ سیٹ کی پشت سے سر ٹکائے ساکت و صامت بیٹھا تھا۔ ہاتھ اسٹیئرنگ پر دھرے تھے۔ نظریں کسی غیر مرئی نکتے پر جمی تھیں۔ پچھلے دو گھنٹوں سے پاگلوں کی طرح بے مقصد ڈرائیو کرنے کے بعد اس نے بالآخر فرار کی یہ احمقانہ کوشش ترک کر دی اور اس سڑک کے کنارے گاڑی روکنے کے بعد وہ ذہن و دل میں برپا اس طوفان پر قابو پانے کی کوشش کرنے لگا جو اسے پاگل پن کی جانب دھکیلنے پر مائل تھا۔

پوری رات سوئی جاگی کیفیت میں رہنے کے بعد جب وہ صبح اٹھا تو اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا کہ آج اسے اتنی بڑی چوٹ ملنے والی ہے۔ وہ بہت بے دلی سے آفس جانے کی تیاری کر رہا تھا جب اس کا سیل بجا۔ چچا جی کا نمبر دیکھتے ہی اس نے بہت بے تابی سے کال ریسیو کی تھی۔

''شہریار!'' ان کے بھاری لہجے میں عجیب سی تھکن تھی۔ اس کا دل لمحے بھر کے لیے ساکت ہوا۔

''اماں اب اس دنیا میں نہیں رہیں۔'' رک رک کر کہتے ہوئے انہوں نے یہ سیسہ اس کے کانوں میں انڈیل ہی دیا۔ ''آخری وقت میں تمہارا نام لیا تھا...... تم آئے نہیں۔''

ان کا گلا رندھ گیا اور کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ اس لیے رابطہ منقطع کر دیا تھا۔ شہریار بے جان ہوتے وجود کے ساتھ وہیں ڈھے گیا۔ چند لمحوں کے توقف سے دروازے پر آہٹ پا کر اس نے نظریں اٹھا کر دیکھا۔

امی شاید ناشتے کے لیے اسے بلانے آئی تھیں۔ اس کی حالت محسوس کرتے وہ ہراساں سی اس کے پاس چلی آئیں۔

''کیا ہوا شہریار! ایسے کیوں بیٹھے ہو؟''

وہ جواب دینے کے بجائے آنکھوں میں آگ لیے انہیں دیکھتا رہا۔

''کچھ نہیں۔ بس آپ کی دیرینہ خواہش پوری ہو گئی۔ خوشیاں منائیے۔'' ایک جھٹکے سے ان کے ہاتھ جھٹکتے وہ طوفانی انداز میں اٹھ کھڑا ہوا۔ وہ دنگ رہ گئیں۔

''شہریار...... شہریار...... میری بات سنو...... کیا ہوا ہے؟'' اسے نکلتے دیکھ کر وہ چلاتے ہوئے اس کے پیچھے لپکیں۔

وہ ان سنی کرتے ہوئے اندھا دھند باہر نکلا تھا اور گاڑی میں بیٹھتے ہی وہ اپنے اندرونی طوفان کا رخ ڈرائیونگ کی طرف موڑتا انہیں پیچھے چلاتا چھوڑ گیا تھا۔

اور اب اسے یہاں بیٹھے کتنی دیر ہو گئی تھی۔ مگر دل تھا کہ سنبھلنے میں ہی نہیں آ رہا تھا۔ بالآخر ایک فیصلے پر پہنچتے ہوئے اس نے گاڑی پھر سے اسٹارٹ کر دی۔ اب اس کا رخ ایئرپورٹ کی جانب تھا۔

☆☆☆

آج دوسرا دن تھا۔ گھر کی فضا بوجھل اور ماتمی تھی۔ ہال کو تعزیت کے لیے آنے والوں کے لیے مخصوص کر دیا تھا۔ جب حمنہ نے دھیرے سے اسے بتایا۔

''شہریار بھائی آ گئے ہیں۔''

وہ ذرا چونکی اور پھر آنکھوں میں ٹھہرا ہوا پانی رخسار تر کر گیا۔

''اب کیا فائدہ...... دادی تو چلی گئیں انہیں یاد کرتے کرتے۔'' اس کا بھیگا تلخ لہجہ بلند ہوا۔

حمنہ نے گھبرا کر اس کے بازو پر ہاتھ رکھا۔

''بس کرو نوال!''

اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے آنسوؤں کا پھندا نگلا۔ پھر اس کا ہاتھ بازو سے ہٹاتے ہوئے اپنے کمرے میں چلی آئی تھی۔ تکیے میں منہ دیے وہ کھل کر رونے لگی، یہاں تک کہ سر اور آنکھیں درد کرنے لگیں۔

''دادی...... کہاں ہیں آپ...... آ کر دیکھیے ناں شہریار آ گیا ہے۔'' بھیگا تکیہ ایک طرف رکھتے ہوئے اس نے بکھرے بال سمیٹے۔ ہاتھ کی پشت سے

چہرہ صاف کیا۔

''حمنہ ٹھیک کہتی ہے۔ میں واقعی احمق ہوں جو انسان مرتی ہوئی دادی کو دیکھنے نہ آسکے، وہ میرے لیے کیا آئے گا۔ اب بھی ماں سے پوچھ کر ہی آیا ہوگا۔'' دل میں درد پھیلتا جارہا تھا۔ بار بار نظروں کے سامنے دادی کا چہرہ آجاتا۔

''نوال...... کمرے میں بند ہونے کا ٹائم نہیں ہے۔ باہر آؤ۔'' حمنہ کی بےزار سی آواز آئی تھی۔ اس نے دروازے کی طرف دیکھا پھر منہ ہاتھ دھونے کی غرض سے واش روم کی طرف بڑھ گئی۔

☆☆☆☆

وہ جب ایرپورٹ پر تھا امی کی کالز مسلسل آرہی تھیں۔ تنگ آکر اس نے سیل ہی آف کردیا اور تب ہی آن کیا جب کراچی پہنچ کر گھر کے اندر قدم رکھا۔

کسک ایک درد کی صورت دل سے ہوتی پورے وجود کو سن کرگئی تھی۔ چچا جی کتنی ہی دیر اس کے گلے لگے رہے۔ ماں کی موت کا غم منانے کے لیے بھتیجے کی صورت میں گویا بھائی ان کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ لب بھینچے ضبط سے ان کے شانے تھپکتا رہا۔

رات اس نے دادی کے کمرے میں بسر کی تھی۔ فجر کی اذان کے ساتھ ہی اس نے بستر چھوڑ کر مسجد کی راہ لی تھی۔ گھر آنے کے بعد اس نے اپنا موبائل دیکھا تو امی کی لاتعداد مس کالز تھیں۔

دانت پر دانت جمائے اس نے انہیں کال ملائی تھی۔ وہ شاید موبائل ہاتھ میں ہی پکڑے بیٹھی تھیں۔ دوسری بیل پر کال ریسیو کرتے ہوئے ان کی لرزیدہ آواز اس کے کانوں میں گونجی۔

''کہاں ہو شہریار...... پوری رات جاگتی رہی ہوں۔ سو بار کہا ہے...... خدا کے لیے ایسا مت کیا کرو میرے ساتھ......'' وہ پھٹ پڑی تھیں۔

''کراچی میں ہوں امی! اور اب...... دادی کے سوئم کے بعد ہی آؤں گا۔'' اس کا دل کرلایا تھا دادی کے لیے یہ الفاظ استعمال کرتے ہوئے۔ کتنی سفاک ہوتی ہے موت اور اس کی حقیقت۔ دوسری طرف خاموشی چھا گئی۔

''آپ فضول کا اسٹریس مت لیجیے۔ میں زیادہ بات نہیں کرسکتا۔ کچھ دیر میں تعزیت کے لیے لوگ آنا شروع ہوجائیں گے۔ میرا ان کے بیچ موجود رہنا ضروری ہے۔ ان کے جنازے کو کاندھا نہیں دے پایا۔ کم از کم اتنا تو کر ہی سکتا ہوں۔ آخر پوتا ہوں ان کا۔'' ان کی خاموشی سے فائدہ اٹھاتے ہوئے اس نے ایک ہی سانس میں ساری بات کہہ ڈالی۔

''اپنا خیال رکھیے گا، اللہ حافظ۔'' دھیمے سے کہتے ہوئے اس نے رابطہ منقطع کردیا تھا۔

☆☆☆

سوئم ہوچکا تھا اور اس کے جانے کا وقت بھی۔ اگلے ہی دن وہ رخصتی کے لیے چچا جی کے سامنے بیٹھا تھا۔ ان دو تین دنوں میں گھر کے کسی بھی فرد سے ٹھیک سے بات کرنے کی فرصت نہیں ملی تھی اور نوال کو تو اس نے ٹھیک سے دیکھا بھی نہیں تھا۔ شاید وہ خود ہی اس کے سامنے آنے سے گریزاں تھی مگر جو بھی تھا شہریار کو بےقرار کرنے کے لیے کافی تھا۔

''تو تم جارہے ہو؟'' دھیرے سے پوچھتے ہوئے وہ اضطراری انداز میں کرسی کے ہتھے پر ہاتھ پھیر رہے تھے۔

''جی چچا جی۔'' وہ نظریں جھکائے اپنی ہتھیلیاں دیکھ رہا تھا۔

''کب...... آج؟'' انہوں نے پوچھا۔

''میں جانے سے پہلے کچھ کہنا چاہتا ہوں آپ سے۔'' کہتے کہتے اس نے لب بھینچے۔ انہوں نے استفہامی نظریں اس کے چہرے پر جمائیں۔

''کیا بات ہے بیٹا!''

''چچا جی۔'' ملتجی نظریں ان کی جانب اٹھائے وہ یک دم اپنی جگہ سے اٹھ کر ان کے قدموں میں آبیٹھا۔ وہ حیران رہ گئے۔

''آپ مجھے اپنا بیٹا مانتے ہیں ناں؟'' وہ عجیب سے انداز میں سوال کررہا تھا۔ چچا جی حیران و پریشان اسے دیکھنے لگے۔

''ہاں شہریار! تمہیں اس میں کوئی شبہ ہے۔''
''اگر میں آپ سے کچھ مانگوں تو دیں گے؟''
وہ لحہ بہ لحہ ان کی الجھن بڑھا رہا تھا۔ انہوں نے اپنے گھٹنوں پر دھرے اس کے ہاتھ تھامے۔
''میرا سب کچھ تمہارا ہے بیٹا۔ تمہیں مانگنے کی کوئی ضرورت نہیں۔'' کسی قدر ناراضی سے کہتے ہوئے انہوں نے اس کی آنکھوں کی بے قراری و بے چینی کو پڑھنے کی کوشش کی، جہاں گہرا اضطراب کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔
''ہے ناں چچا جی۔'' بے بسی سے کہتا وہ پیچھے ہٹا۔ ''میں کسی کو اپنا حمایتی، اپنا سفارشی بنا کر نہیں لاسکتا۔ اگر...... آج دادی ہوتیں تو وہ آپ سے یہ بات کرتیں مگر......'' اس کی آواز دھیمی پڑ گئی۔ وہ کسی انجانے احساس کے زیر اثر یک ٹک اسے دیکھ رہے تھے۔
''مجھے...... نوال کا ہاتھ دے دیں چچا جی!'' اس کا دھیما لہجہ جیسے کسی بچھو کی طرح انہیں ڈنک مار گیا تھا۔ وہ اچھل پڑے۔
''دیں گے نا چچا جی؟'' وہ ان کی کیفیت محسوس کرسکتا تھا مگر اس وقت اسے صرف اپنی غرض یاد تھی مگر وہ بول ہی کب رہے تھے۔ بے یقینی سے بڑھ کر کچھ تھا جس نے انہیں گنگ کردیا تھا۔
''آج اگر دادی ہوتیں تو ان کی بھی یہی خواہش ہوتی۔ میں جانتا ہوں۔ یہ وقت مناسب نہیں ہے ان باتوں کے لیے۔ مگر میری مجبوری ہے چچا جی۔ اس بار چلا گیا تو پھر واپس آنا بہت مشکل ہوگا میرے لیے۔'' اس کے لیے چچا جی کی خاموشی سمجھنا مشکل تھی۔
''چچا جی......'' آس و نراس کی کیفیت میں اس نے دوبارہ پکارا۔
''یہ ناممکن ہے شہریار!'' سر ہلاتے ہوئے ان کا انداز یک دم قطعی تھا۔ ''بھابھی کو ساتھ لے کے آؤ گے ان کی رضامندی سے، تو یہ رشتہ ہوسکتا ہے مگر یوں ان کو بتائے بنا، چوری چھپے یہ کام کرنے کا سوچ بھی نہیں سکتا۔''
''مگر چچا جی......'' ان کی بات ختم ہوتے ہی وہ بول اٹھا۔
''اس میں کسی اگر مگر کی کوئی گنجائش نہیں شہریار! یہ ٹھیک ہے کہ میں تمہیں اپنا بیٹا مانتا ہوں مگر ثمینہ تمہاری ماں ہے۔ اس کا تم پر مجھ سے کہیں زیادہ حق ہے۔ جب اماں کے مرنے پر وہ تمہارے یہاں آنے کے حق میں نہیں تھیں تو اس گھر سے رشتہ جوڑنے کے لیے خود یہاں کیسے آسکتی ہیں؟'' وہ بے وقوف نہیں تھے سارے حالات ان کے سامنے تھے۔
''تو آپ انکار کررہے ہیں۔'' اس کی بھوری آنکھوں میں مایوسی اتر آئی۔ ''آپ ثمینہ جہانزیب کا بیٹا ہونے کی وجہ سے مجھے انکار کررہے ہیں۔ آپ حیات عزیز کا بیٹا سمجھ کر میری بات نہیں مان سکتے۔''
''تم تو اچھے خاصے سمجھ دار ہو شہریار! سمجھنے کی کوشش کرو۔'' اس کے شانے پر ہاتھ رکھتے ہوئے ان کا لہجہ نرم پڑا۔ ''میں بیٹی کا باپ ہوں۔ اس کی زندگی کا ہر فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کرنا ہے۔ ایسے کیسے غیر یقینی صورت حال کے حوالے کردوں جبکہ میں جانتا ہوں بھابھی کبھی اس رشتے پر رضامند نہیں ہوں گی اور پھر میں انکار نہیں کررہا۔ اگر تم انہیں منا کر ساتھ لے آؤ تو میرے لیے تم سے بڑھ کر اور کوئی نہیں ہے۔'' وہ سمجھاتے ہوئے کہہ رہے تھے۔
''ٹھیک ہے۔'' اس نے ایک گہری سانس لیتے ہوئے سر ہلایا۔ ''ایک وعدہ تو آپ کر ہی سکتے ہیں ناں۔'' وہ سوالیہ نظروں سے اسے دیکھنے لگے۔
''آپ کہتے ہیں تو ٹھیک ہے۔ میں امی کو منالوں گا مگر نوال! میرا مطلب ہے...... تب تک آپ انتظار کریں گے ناں؟'' وہ پوچھ رہا تھا۔ انہوں نے چند لمحے خاموشی کی نذر کردیے۔
''میں زیادہ وقت نہیں لوں گا۔'' ان کی خاموشی پر وہ جلدی سے بول اٹھا۔
''سال بھر تک کا وقت ہے تمہارے پاس۔ اس کے بعد اگر کوئی اچھا رشتہ آیا تو میں دیر نہیں کروں گا۔'' انہوں نے ہامی بھرلی تھی۔

اس کے وجیہہ چہرے پر قدرے طمانیت پھیلی۔

"شکریہ چچا جی۔" ان کے ہاتھ ہلکے سے تھام کر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ انہوں نے بے اختیار صدق دل سے اس کے کامیاب ہونے کی دعا مانگی۔

☆☆☆

"نوال!"

وہ جانے سے پہلے ایک بار اس سے مل کر جانا چاہتا تھا۔ اسے خود بتانا چاہتا تھا کہ وہ اپنے وعدے کا سچا ہے۔ وہ اس کا انتظار رائیگاں جانے نہیں دے گا۔ حمنہ سے پوچھتے ہوئے وہ اسے ڈھونڈتے ہوئے لان کے اس حصے کی طرف چلا آیا تھا۔

اپنے نام کی پکار پر وہ چونکی ضرور مگر اسے دیکھنے سے گریز برتتے ہوئے وہ رخ پھیرے کھڑی رہی۔ ان تین دنوں میں وہ ایک بار بھی اسے دیکھ نہیں پایا تھا اور اب بھی وہ اس کا ضبط آزمانے کے درپے تھی۔ شہریار کے گمان میں بھی نہیں تھا کہ کبھی ایک کول سا چہرہ۔ ایک نازک سا وجود اس کے لیے اس حد تک ضروری ہو جائے گا کہ اس کے سامنے اس کی ساری مضبوطی، بے اختیاری، کمزوری میں ڈھل جائے گی۔

"میری طرف دیکھو نوال!" ڈھلتے سورج کی نارنجی کرنیں اس کے چہرے پر پڑتی اس کی رنگت کو دمکا رہی تھیں۔ اس کا چہرہ آنکھوں میں جذب کرتے شہریار کی آنکھوں جلنے لگیں۔

"تم جانتی ہو ناں میری بے بسی اور مجبوری۔"

"ہاں۔" اس کے لب ہلے۔ "اب بہت اچھی طرح سے جان گئی ہوں کہ آپ کتنے بے بس اور مجبور ہیں۔" سر جھکائے اپنی کلائی میں پڑے بریسلٹ سے کھیلتے ہوئے اس کے لہجے میں عجیب سی چبھن تھی۔ "اسی لیے...... خود کو سمجھا لیا کیونکہ میں نہیں ہوں بے بس اور مجبور۔ میں جو چاہوں وہ کر سکتی ہوں۔" اس نے اچانک ہی سر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالی تھیں۔

شہریار کتنی ہی دیر اس کی سرمئی آنکھوں میں تیرتے گلابی ڈورے دیکھتا رہا۔

"اور تم کیا چاہتی ہو؟"

"کمال ہے۔ وہ آپ کو ان تین دنوں میں سمجھ میں نہیں آیا؟" پوچھتے ہوئے اس کی آنکھوں میں استہزا ابھرا تھا۔ شہریار کی کشادہ پیشانی پر کئی سلوٹیں پڑیں۔ لب بے اختیار بھنچ گئے۔

"نوال......!"

"آپ واپس جائیے۔" نوال نے سننے کی بھی کوشش نہیں کی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔

"اپنی زندگی میں مگن ہو جائیے۔ وہی کیجیے جس سے آپ کو کوئی مشکل نہ ہو۔ جسے کرنے سے آپ کی راہ میں کوئی مجبوری...... کوئی بے بسی حائل نہ ہو۔"

"تمہیں کتنی فکر ہے میری مشکلات کی...... ہے ناں؟" آنکھوں میں تناؤ لیے وہ چیخ کر بولا۔

"تمہیں پہلے سے پتا نہیں تھا کہ میں کن حالات میں آیا ہوں یہاں۔ مجھے یہ سب فیس کرنا ہے۔ میری مشکلات' میری پریشانیوں کی اتنی فکر تھی تو پہلے بتا دیا ہوتا، میں بھی سنبھالیتا خود کو۔" یہ کہتے ہوئے اسے اپنے تند لہجے اور بلند آواز کا احساس ہوا تو یک لخت اس نے خود پر قابو پایا۔

"میں نے تم سے کہا تھا ناں کہ میں تمہارے لیے آؤں گا۔" اس کا بازو اپنی گرفت میں جکڑتے اس نے اپنی جلتی نگاہیں اس کے چہرے پر گاڑیں۔ نوال ساکت سی اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا میرے الفاظ کی کوئی وقعت نہیں؟ میں دادی کے لیے نہیں آ پایا۔ مجھے زندگی بھر اذیت میں رکھنے کے لیے یہ ایک ملال کافی ہے۔ تم مت کرو میرے ساتھ ایسا۔"

اس کے دہکتے لہجے میں بیک وقت غصہ بھی تھا، دکھ بھی تھا اور التجا بھی۔ "میں انگاروں پر چلوں، میں دار پر لٹکوں...... تم تک پہنچنے کے لیے ہر رستہ خوشی خوشی اپناؤں گا۔ تم یقین کرو نہ کرو۔ تم مانو یا نہ مانو...... مگر یہی سچ ہے۔" ایک جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑتے ہوئے وہ پیچھے ہٹا تھا۔ گم صم سی کھڑی نوال لڑکھڑا کر رہ

گئی۔ وہ بہت غصے میں وہاں سے گیا تھا۔ نوال متضاد کیفیات میں اسے روک تک نہ سکی۔

☆☆☆

''کیوں رو رہی ہو اب۔ کہہ دیا ناں اسے جو کہنا تھا۔ نکال لی دل کی بھڑاس۔ اب اس طرح رونے سے کیا ہوگا۔'' وہ سر پکڑے بیٹھی تھی۔ اندرونی ندامت وانتشار مسلسل کچوکے لگاتا اس کے آنسوؤں میں اضافہ کر رہا تھا۔

''میں نے اسے ناراض کر دیا۔ وہ بھی اس کے جانے کے دن۔ میں نے سننے کی کوشش بھی نہیں کی کہ وہ کیا کہنا چاہ رہا تھا۔ اس نے بابا سے بات بھی کر لی تھی اور...... اور میں نے کیا کیا؟'' سرخ آنکھیں حمنہ کی سمت اٹھائے وہ سلگ رہی تھی۔ ''اسے پچھتاوا ہو رہا ہوگا کہ اس نے بابا سے بات ہی کیوں کی۔'' حمنہ جو تاسف سے اسے دیکھ رہی تھی، چڑ گئی۔

''تم پھر سے انہیں غلط سمجھ رہی ہو۔ وہ بچے ہیں کیا جو تم سے لڑ کر اپنے کیے گئے کسی فیصلے سے مکر یں گے یا پچھتائیں گے اور اتنی ہی فکر ہو رہی ہے تو فون کر کے منالو انہیں۔''

''کس منہ سے مناؤں؟'' اسے اپنا لہجہ یاد آیا تھا۔ شرمندگی سے وہ پھر رو دی۔

''اسی منہ سے...... جس منہ سے ان پر لفظوں کے نشتر برسائے تھے۔'' حمنہ بھی آج اسے ذلیل کرنے کے موڈ میں تھی۔

''اسے لگے گا۔ مجھے اب پتا چل گیا ہے، اس لیے منا رہی ہوں۔ مطلبی ہوں۔'' وہ کشمکش میں گھری تھی۔

''سو تو لگے گا۔'' حمنہ نے کندھے اچکائے۔ ''کس نے کہا تھا طرم خان بننے کو۔''

''تم ہی نے کہا تھا کوئی امید نہ رکھوں۔'' نوال کو اس پر غصہ آنے لگا۔

''میں نے یہ نہیں کہا تھا کہ یہ بات جا کر ان کے منہ پر مار بھی دو۔ وہ بھی تب جب وہ بابا سے تمہارا رشتہ مانگ چکے ہوں۔'' حمنہ تپی۔

''تو مجھے کیا پتا تھا......'' وہ تاسف سے ہاتھ مل رہی تھی۔

''اچھا چھوڑو۔ شہریار بھائی اتنے بھی امیچور نہیں ہیں کہ اتنی چھوٹی سی بات کو دل کی پھانس بنا لیں گے۔ ایک بار یہ رشتہ طے ہو جانے دو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔'' حمنہ نے اس کی حالت دیکھ کر تسلی دینے کی کوشش کی۔

''تمہیں لگتا ہے، سب ٹھیک ہوگا۔'' اس کا دل لرز اٹھا۔ لہجے میں آس واندیشے لیے پوچھنے لگی۔

''جتنے یقین سے انہوں نے اپنی ماں کو منانے کے لیے بابا سے وقت مانگا ہے، ہونا تو چاہیے۔'' حمنہ پرسوچ لہجے میں بولی۔ نوال کو اس کے آخری الفاظ یاد آئے تھے۔

ڈوبتا دل یکا یک ہی شانت ہوا۔ لمحہ بھر میں کتنے ہی خوش کن خیالات دامن پکڑ کر بیٹھ گئے۔

''اتنی شدتیں اور بے چینیاں وہ میرے لیے ہی تو سنبھالے بیٹھا ہے اور میں ہوں کہ فالتو کے خدشوں میں گھل رہی ہوں۔''

''کیا ہوا؟'' حمنہ نے اس کی بدلتی کیفیت نوٹ کی۔

''میں سوچ رہی تھی بابا...... انہوں نے تو کہہ دیا کہ وہ صرف سال بھر انتظار کر سکتے ہیں مگر......''

''مگر تم اتنا بھی نہیں کر سکتیں۔'' حمنہ نے اس کا ذہن پڑھنے کی کوشش کی۔

''پاگل ہو۔'' اس نے تھرک کر اس کے ہاتھ پر ہاتھ مارا۔ ''میں نہیں کروں گی اس کے علاوہ کسی سے بھی شادی...... میں...... میں اس کا انتظار کروں گی۔ چاہے اسے آنے میں ایک سال لگے یا ایک صدی۔ میں اس کے علاوہ کسی اور کا تصور بھی نہیں کر سکتی حمنہ۔'' اس کی آنکھوں میں شدتیں چھلکی تھیں۔ لہجہ دھیما پڑا۔

حمنہ نے بے اختیار دونوں ہاتھوں میں اس کا چہرہ تھاما۔

''تمہیں اس کے بغیر جینا نہیں پڑے گا میری

بہن۔ وہ تمہارا نصیب بنے گا۔ یقین رکھو۔"
اتنی دیر میں پہلی بار اس کے چہرے پر آسودہ سی مسکراہٹ ابھری۔

"ان شاء اللہ۔"

"ان شاء اللہ۔" حمنہ نے زیرلب دہرایا تھا۔

☆☆☆

جس دن وہ واپس آیا، امی نے کوئی ہنگامہ کھڑا نہیں کیا۔ جو اس کے لیے کافی حیرت کی بات تھی کیونکہ وہ ذہنی طور پر تیار ہو کر آیا تھا یا پھر شاید دادی کی موت نے ان کے سخت دل کو کسی قدر موم کر ہی دیا تھا۔ وہ انتظار میں تھا کہ وہ بات چھیڑیں تو اسے بھی اپنی بات کہنے کا موقع ملے مگر ان کی طرف سے کوئی ردعمل نہ پا کر اس نے خود ہی رات کے کھانے کے بعد بات چھیڑی۔

"امی! آپ کو ایک بات بتانی تھی بہت ضروری۔"

وہ جو چائے کا کپ اس کے سامنے رکھ رہی تھیں، ٹھٹک کر اسے دیکھنے لگیں۔ چہرے پر ایک لمحے میں کتنے ہی رنگ آ کر گزر گئے۔

"بات تو مجھے بھی کرنی ہے تم سے، مگر چلو خیر...... پہلے تم بتاؤ، کیا بات ہے؟" اس کے برابر میں بیٹھتے ہوئے انہوں نے لہجہ نارمل رکھنے کی کوشش کی۔

"آپ کو کیا بات کرنی ہے؟" وہ چونکا۔

"اصل میں اس اتوار کو میں جا رہی ہوں بھائی کے گھر، تمہاری منگنی کی رسم ادا کرنے۔ بھابھی نے جیا کو منا لیا ہے۔ تم نے کہا تھا ناں جیا مان گئی تو تمہیں کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔" ان کا لہجہ خوشی سے بھرپور تھا۔ مگر اس خوشی کے پیچھے ایک عدم تحفظ کا احساس ایک خدشہ تھا جو انہیں اتنی جلدی شہریار کے سامنے لب کھولنے پر مجبور کر گیا۔ وہ شہریار کی بات سنے بنا ہی اس کی پیش بندی کر رہی تھیں۔

"دیٹس گریٹ۔" وہ سپاٹ لہجے میں بولا۔ "اب آپ میری بات سننا پسند کریں گی۔"

"سناؤ۔" وہ مصنوعی بے نیازی سے بولی۔

شہریار کا عجیب سا انداز انہیں کسی انجانے خطرے سے خبردار کر رہا تھا۔

"تو بات یہ ہے امی! کہ میں...... نوال سے نکاح کر کے آیا ہوں۔" اس نے اپنی بات کہہ دی تھی اور اس بات کے پیچھے اس کی کئی گھنٹوں کی پلاننگ اور سوچ بچار شامل تھی۔ وہ اس کے مضمرات سے بھی آگاہ تھا۔ پھر بھی اس وقت ان کی پھیکی آنکھیں، چہرے پر چھائی زردی اور دل پر رکھا ہاتھ اسے گہرے تاسف میں مبتلا کر گیا تھا۔ وہ نظریں چراتا اٹھ کھڑا ہوا۔

"شہریار!" وہ چیخی تھیں۔ اس چیخ میں کیا کچھ نہیں تھا۔ بے یقینی، مایوسی، کرب اور درد...... وہ بے اختیار ان کی طرف پلٹا۔

"امی......"

"دور......" ان کے منہ سے الفاظ نہیں نکل رہے تھے۔ "دور ہو جاؤ مجھ سے...... تم...... چلے جاؤ......" ان کی رنگت سرخ ہو گئی تھی۔ یہ حالت ان کی اکثر ہو جایا کرتی تھی۔ اسے علم تھا کہ آج بھی یہی ہوگا۔ اسی لیے فوراً ہی ان کے سامنے سے ہٹتے ہوئے اس نے پہلے ڈاکٹر اور پھر ماموں کو فون کیا تھا۔

آدھے گھنٹے بعد وہ ادویات کے زیر اثر غنودگی میں چلی گئی تھیں اور ماموں لگاتار اس پر برس رہے تھے کیونکہ ان کے آتے ہی وہ انہیں پوری رام کہانی سنا چکا تھا۔ ویسے بھی جو بات اس نے کی تھی اس سے پیچھے ہٹنا اب اس کے لیے ناممکن تھا۔

"میں جانتا ہوں ماموں! امی اب میری صورت دیکھنا بھی گوارا نہیں کریں گی۔ اسی لیے میں......" اس سے پہلے کہ وہ اپنی بات پوری کرتا اندر سے امی کی آواز آئی تھی۔

"میں لٹ گئی رخشندہ...... میری عمر بھر کی کمائی لٹ گئی۔ اسی دن سے ڈرا کرتی تھی میں...... اسی دن سے......" وہ ممانی سے اپنے پھٹتے دل کی حالت بیان کر رہی تھیں، اس کے دل کو کچھ ہوا تھا۔

"میں یہ گھر چھوڑ کر جا رہا ہوں۔"

''کیا......'' ماموں نے اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔ ''جو کیا اس سے جی نہیں بھرا۔ اب اس حال میں ماں کو اکیلا چھوڑ کر جاؤ گے۔''

''آپ دیکھ ہی رہے ہیں ان کی حالت۔ وہ میری صورت بھی نہیں دیکھنا نہیں چاہتیں اور اب تو میں انہیں خود بھی دکھانا نہیں چاہتا کیونکہ میں نہیں چاہتا مجھے دیکھ دیکھ کر وہ اپنی حالت مزید خراب کرلیں۔'' وہ کہتے کہتے رکا۔ ''میں جانتا ہوں آپ سنبھال لیں گے۔ عارضی طور پر میرا کچھ دنوں کے لیے گھر سے چلے جانا ہی ٹھیک ہے۔''

''اور یہ مسئلہ کیسے حل ہوگا؟'' ماموں شاید سمجھ گئے تھے، جب ہی سوال کرتے ہوئے ان کی نظریں کمرے کی سمت اٹھی تھیں۔

''اسے کہو رخشندہ! مجھے اب کبھی اپنی صورت نہ دکھائے۔ میرے قریب بھی نہ آئے...... اس نے میری ساری محبت...... میری قربانیاں مٹی میں ملادیں۔ اولاد ایسی ہوتی ہے؟''

''آپ حل کریں گے...... سمجھائیں گے ان کو......'' وہ ان کی آنکھوں میں دیکھ کر کہنے لگا۔ ''یہ بات تو طے ہے کہ میں اسے نہیں چھوڑوں گا، ہاں مگر جب تک امی نہ چاہیں میں اسے اس گھر میں نہیں لاؤں گا۔ اب امی مانیں گی، اسے بہو بنانے اس کے گھر تک جائیں گی، تب ہی آؤں گا۔'' اس نے اپنا قطعی فیصلہ سنایا۔ وہ اس لمحے کمزور نہیں پڑسکتا تھا۔ ورنہ عمر بھر پچھتاتا۔

''ثمینہ کبھی نہیں مانے گی...... میں اسے تم سے بہتر جانتا ہوں۔'' قدرے توقف سے ہنکارا بھرتے ہوئے انہوں نے سر ہلایا۔ ''میں حیران اس بات پر ہوں کہ انہوں نے ایسے کیسے اپنی بیٹی کا نکاح تم سے پڑھوادیا۔ اب سمجھ میں آرہا ہے، ثمینہ جوان سے اتنی خائف رہتی تھی، اپنی جگہ ٹھیک تھی۔ ایسے لوگ جو کسی اصول اور ضابطے سے واقف ہی نہ ہوں، ان سے ہر بات بعید کی جاسکتی ہے۔''

''ماموں پلیز......'' وہ بے اختیار ناگواری سے انہیں ٹوک بیٹھا۔ اپنے جھوٹ کی وجہ سے وہ ان پر کوئی حرف برداشت نہیں کرسکتا تھا۔ ''بنا کسی کو جانے ایسی رائے قائم کرلینا کسی طور درست نہیں۔''

''بہت اچھے طریقے سے جان لیا بھانجے! اب بھی کچھ جاننا باقی ہے؟'' وہ استہزائیہ انداز میں پوچھ رہے تھے۔

''میں جارہا ہوں۔ امی کا خیال رکھیے گا۔'' دھیرے سے کہتے ہوئے اپنے کمرے کی سمت آیا تھا، اپنا کچھ ضروری سامان سمیٹنے کے لیے۔

عجیب سی شرمندگی اور اذیت کے حصار میں تھا وہ۔ مگر امی نے اس کے لیے کوئی اور راستہ چھوڑا بھی کہاں تھا۔ یہ کوئی ایک دو دن کا لاوا نہیں تھا جو اس کے اندر پھٹ پڑا تھا۔ برسوں پرانی ان گنت محرومیاں تھیں۔ کیسے انہوں نے برسوں اسے اس کے اپنوں، اس کے اپنے سگے باپ تک سے دور کیے رکھا۔ کیسے ان کے خلاف اس کے دل میں زہر، تلخیاں اور نفرتیں انڈیلتی رہیں۔ اگر وہ ان سے نہ ملتا تو اب تک یہی سمجھتا کہ وہ درحقیقت اتنے ہی ظالم لوگ تھے جنہوں نے اس کی ماں کو بے آسرا کرنے کے بعد کبھی پلٹ کر ان کی خبر تک نہ لی تھی۔ وہ کیسے اب تک غلط فہمیوں کے اندھے تاریک غار میں جیتا رہا تھا۔ وہ سوچتا بھی تو اسے حیرت ہونے لگتی۔ اسی وقت اس کا سیل بجا تھا۔ اس نے اسکرین پر نگاہ کی اور گہری سانس بھر کر رہ گیا۔

''سوری نوال...... اس وقت بات کرنے کی پوزیشن میں بالکل نہیں ہوں۔'' زیر لب بڑبڑاتے اس نے کال کٹ کردی اور عجلت میں وہاں سے نکل آیا تھا۔

☆☆☆

''یہ آپ نے اچھا نہیں کیا۔''

امی سبزی اٹھائے لاؤنج میں ہی آگئی تھیں۔ مخاطب اخبار پڑھتے بابا تھے۔ مگر ان کے علاوہ نوال اور حمنہ دونوں نے چونک کر دیکھا اور لازمی بات تھی، کان بھی کھڑے ہوئے۔ مگر بابا ہنوز اخبار پڑھنے میں

مگن تھے۔
"بابا...... امی کچھ کہہ رہی ہیں۔" ان کے سامنے چائے رکھتی حمنہ نے ان کے انہماک میں خلل ڈالا۔
"کیا کہہ رہی ہیں؟" انہوں نے چونک کر عینک کی اوٹ سے پہلے اسے پھر امی کو دیکھا۔
"جانوال! جا کر مسالا تیار کردے۔ یہ کریلے میں چھیل لوں گی۔" امی نے بات دہرانے کے بجائے نوال کو وہاں سے کھسکانا چاہا۔ وہ ٹھنک گئی۔
"کیا امی...... چھیل تو رہی ہوں۔"
جواباً امی نے بجائے کچھ کہنے کے ایک گھوری ڈالی۔ وہ شرافت سے چپ چاپ اٹھ گئی مگر جاتے ہوئے حمنہ کو اشارہ کرنا نہیں بھولی۔ حمنہ نے آنکھوں ہی آنکھوں میں اسے تسلی دی۔
"فکر مت کرو۔ میں سن رہی ہوں۔"
"ارے اب بتاؤ گی بھی، بڑی اہم خبر پڑھ رہا تھا۔" بابا جھنجلا گئے جواب نہ پا کر۔
"بابا! یہ نیوز آن لائن دیکھا کریں۔ اب کہاں ہے اخبار کا زمانہ۔"
"تمہاری ماں اخبار تو سکون سے پڑھنے دیتی نہیں۔ آن لائن نیوز کیا خاک پڑھنے دے گی۔" اپنے ڈسٹرب کیے جانے پر بابا چڑے ہوئے تھے۔
"میں کہہ رہی ہوں۔ آپ نے شہریار کو ایک سال کا ٹائم دے کر اچھا نہیں کیا۔" امی نے ان کی بات ان سنی کر کے اپنی کہی۔
"تو کیا پانچ سال کا ٹائم دیتا۔" وہ حیران ہو کر پوچھنے لگے۔
"حد کرتے ہیں آپ بھی۔" انہیں غصہ آ گیا۔
"نوال کوئی چھوٹی بچی نہیں رہی اب۔ چوبیسویں میں لگنے والی ہے اور ایک سال کیا شہریار کو آپ ایک ہزار سال بھی دیں گے تو وہ اپنی ماں کو منانے میں ناکام ہی رہے گا۔ اس دوران اگر نوال کا اچھا رشتہ آ گیا تو کیا کریں گے آپ۔ اس بارے میں سوچا آپ نے؟"
"دیکھو خالدہ! جو نوال کے نصیب میں لکھا ہے، وہ اسے ضرور ملے گا۔ چاہے اس ایک سال کے اندر ہو یا ایک سال بعد۔" انہوں نے عینک اتارتے ہوئے سنجیدگی سے کہا۔ "شہریار نے مجھ سے کہا تو میں انکار نہیں کر سکا اور سچ کہوں تو کرنا چاہتا بھی نہیں تھا۔ کیونکہ میرے لیے شہریار سے بڑھ کر کوئی نہیں ہے۔ اس لیے نہیں کہ وہ میرے مرحوم بھائی کا بیٹا ہے بلکہ اس لیے کہ اس جیسے ذمہ دار، حساس اور وضع دار نوجوان آج کل خال خال ہی دیکھنے کو ملتے ہیں۔ میں اس کے لیے دعا گو ہوں کہ وہ ضرور کامیاب ہو اور اگر نہیں بھی ہوتا تو میں اپنی بات سے پیچھے نہیں ہٹوں گا، جو زبان میں نے دی ہے، ایک سال بعد بعد دیکھیں گے، جو اللہ کو منظور۔" اپنی بات دوٹوک انداز میں ختم کر کے انہوں نے پھر سے اخبار پھیلا لیا تھا۔
امی کا غصہ کریلوں پر اترنے لگا۔ حمنہ مسکراتی ہوئی کچن میں چلی آئی۔
"چلو میری بہن! وظیفے شروع کر دو۔"
"کیا کہا امی نے؟" وہ پیاز کاٹ رہی تھی۔ چونکی ضرور مگر اس کی طرف دیکھا نہیں۔
"کہہ رہی ہیں، شہریار بھائی تائی کو نہیں منا پائیں گے۔" حمنہ نے بتاتے ہوئے سلیب سے ٹیک لگائی۔
"ہمم......" وہ بس اتنا کہہ سکی۔ پیاز کی کڑواہٹ آنکھوں کے ساتھ ساتھ حلق بھی جلانے لگی تھی۔ وہ سنک کے پاس آ کر ہاتھ دھونے لگی۔
"کیا ہمم...... تمہیں کیا ہوا ہے؟" حمنہ کو اس کا انداز اچنبھے میں مبتلا کر گیا۔
"کچھ نہیں...... میں کچھ نہیں کہہ سکتی۔ اس نے کل رات میری کال کاٹ دی تھی۔" کل رات سے ضبط کیے آنسو اس وقت حمنہ کے سامنے بے اختیار ہو کر بہہ نکلے تھے۔
"اوہ...... ناراض ہیں یعنی۔"
"تم نے کہا تھا وہ اتنے امیچور نہیں ہیں کہ اتنی سی بات پر ناراض ہو جائیں۔" اس کی آواز بھیگی تھی۔

بے قرار ہوتا دل تسلی کا متلاشی تھا۔
"غلط، میں نے کہا تھا، وہ اس بات کو زیادہ عرصے دل میں نہیں رکھیں گے۔" حمنہ نے تصحیح کرتے ہوئے جتایا۔ "اب وہ بھی انسان ہیں۔ جتنا تم نے انہیں سنایا، اتنا ری ایکشن تو دکھائیں گے ہی۔"
"میں کیا کروں۔ کیسے ٹھیک کروں اپنی یہ بے وقوفی۔" ہونٹ کاٹتے ہوئے وہ بے بسی کی انتہا پر تھی۔
"دوبارہ انہیں کال......" حمنہ کی بات اس کے منہ میں ہی رہ گئی کیونکہ اسی وقت ایک طرف پڑا نوال کا سیل بج اٹھا تھا۔ حمنہ قریب تھی۔ ہاتھ بڑھا کر اٹھایا اور اسکرین پر نظر پڑتے ہی خوشی سے چہکی۔
"ارے واہ۔ بڑی لمبی عمر پائی ہے انہوں نے۔"
اس کا دل جیسے آنکھوں میں دھڑکا تھا۔ کال ریسیو کرتے وہ کچن سے نکل آئی۔
"آپ مجھ سے ناراض ہیں؟" اس نے چھوٹتے ہی یہ پوچھا۔ دل پر کسی غبار کی طرح چھایا اضطراب اس کے لہجے سے عیاں تھا۔
"نہیں تو...... میں کیوں ناراض ہونے لگا۔" اس کی بھاری حیرت زدہ آواز ابھری۔
"تو پھر آپ نے کل میری کال کیوں کاٹ دی تھی اور دوبارہ فون بھی نہیں کیا۔" بے اختیار شکوہ کرتے ہوئے اس کا لہجہ نم ہوا تھا۔
"ایک مسئلے میں الجھا ہوا تھا نوال! صبح سے اتنا وقت ہی نہیں ملا۔" ایک گہری سانس لیتے ہوئے اس نے بتایا۔
"کیسا مسئلہ؟" وہ کچھ اور کہنا چاہتی تھی مگر اس بات پر چونک کر یہ سوال کر بیٹھی۔
وہ چند لمحے خاموش رہا۔ جیسے بولنے کے لیے لفظ تول رہا ہو۔
"امی سے بات کرلی ہے میں نے۔" کچھ دیر کے وقفے سے وہ گویا ہوا۔ نوال کے رگ وپے میں ہیجان سا دوڑا۔
"پھر کیا کہا انہوں نے؟"
"پہلے میری سن لو۔ میں نے ان سے کیا کہا۔" وہ اس کی جلد بازی پر ٹوک گیا۔ وہ لب کاٹتی خاموش ہوئی۔
"میں نے ان سے کہا...... میں نوال سے نکاح کر کے آیا ہوں۔" اس نے پوری بات بتائی تھی۔ نوال کے بے چین ہوتے اعصاب اسے بے اختیار کھڑا ہونے پر مجبور کر گئے۔
"آپ...... آپ نے یہ کہا؟" بے یقینی سے اس کی آواز بلند ہوئی۔
"میرے پاس اور کوئی راستہ نہیں تھا نوال! اور میری توقع کے عین مطابق امی نے شدید ہنگامہ کیا۔ ان کی طبیعت بھی خراب ہوئی۔ میں اسی وقت گھر چھوڑ آیا تھا۔" اس نے اگلا انکشاف کیا۔ سیل دوسرے ہاتھ میں منتقل کرتے ہوئے وہ بے چینی سے ٹہلنے لگی۔
"کیا مطلب گھر چھوڑ آیا ہوں؟"
"میں نے امی کے غصے اور خراب طبیعت کے پیش نظر ان کے سامنے سے ہٹ جانا ہی بہتر سمجھا۔ اس وقت ایک دوست کی طرف ہوں۔"
"اور اب آپ کا اگلا قدم کیا ہوگا؟" اسے شہریار سے اتنے بڑے جھوٹ کی توقع نہیں تھی۔ پیشانی پر بے شمار شکنیں لیے وہ پوچھنے لگی۔
"میں نے ماموں سے بات کی ہے۔ ماموں انہیں سمجھائیں گے، مجھے یقین ہے۔" وہ پر امید تھا۔
"اگر وہ پھر بھی نہیں مانیں تو......؟" اس نے پوچھا۔
"انہیں سب سے بڑا ڈر مجھے کھونے کا تھا۔ میں وہی ڈر ان کے سامنے لے آیا۔ وہ تقریباً مجھے کھو چکی ہیں۔ اب دوبارہ مجھے پانے کے لیے وہ یہ بات ضرور سمجھیں گی اور مانیں گی بھی۔" ٹھہر ٹھہر کر کہتے ہوئے اس کے گمبھیر لہجے میں بلا کی سنجیدگی اور مضبوطی تھی۔
"شہریار......" اس کا نام لیتے ہوئے اس کا لہجہ دھیما پڑا۔ "وہ آپ کی ماں ہیں۔ آپ کو انہیں اس حد تک ناراض کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ اگر وہ نہیں

مان رہی تھیں تو آپ کر لیتے وہاں شادی جہاں وہ کہہ رہی تھیں۔'' دھڑکنیں کچھ اور کہہ رہی تھیں، زبان پر کچھ اور تھا۔

''نوال......! میں یہ سب صرف اس لیے نہیں کر رہا کہ مجھے تم پسند ہو۔'' اس نے کیا بات کہی تھی، نوال ساکت ہوئی۔

''مجھے کبھی باپ کا پیار نہیں ملا۔ نہ کبھی ددھیالی رشتوں کی محبت نصیب ہوئی۔ میں ہمیشہ اپنے ذہن میں ان کے لیے یک طرفہ خاکہ بنا کر ان میں بدگمانیوں، نفرتوں اور عداوتوں کے سارے رنگ بھر کر اپنی ایک خیالی دنیا جیتا رہا۔ قریبی رشتوں کے نام پر میں نے اپنے نانا اور ماموں کے سوا کسی کو نہیں پایا۔

اپنی زندگی کا بڑا حصہ میں نے رشتوں کے ہوتے ہوئے بھی اکیلے گزارا ہے اور اتنے عرصے بعد جب میں تم لوگوں سے ملا، حقیقت آشکار ہوئی۔ تو میں ایک نئی اذیت میں گھر گیا۔ تم ٹھیک کہتی ہو، وہ میری ماں ہیں۔ مجھے انہیں اس حد تک ناراض نہیں کرنا چاہیے تھا۔ مجھے اس بات پر بھی شرمندگی ہے کہ میں نے ان سے اتنا بڑا جھوٹ بولا۔ اس وقت اگر کوئی سب سے زیادہ اذیت میں ہے تو وہ میں ہوں لیکن...... اگر...... میں نے یہ جھوٹ نہیں بولا ہوتا یا میں ان کی پسند کی لڑکی سے شادی کر لیتا تو...... میں کبھی بھی تم لوگوں سے وہ تعلق نہیں رکھ پاتا جو میں اب رکھنا چاہتا ہوں اور امی یہی چاہتی ہیں نوال! کہ میں تم لوگوں سے کوئی تعلق نہ رکھوں۔'' وہ نوال کے سامنے اپنے خول میں نہیں رہ پاتا تھا، اس وقت بھی اندرونی دل گرفتی اس کے لہجے سے چھلک ہی گئی تھی۔

نوال کا بے اختیار جی چاہا، وہ اس کا حوصلہ بڑھائے۔ اس کے شانے پر ہاتھ رکھے۔ اس کے لہجے کی تھکن، اس کے درد سے بوجھل ہوتے دل کا بار اپنے شانوں پہ لے لے۔

''اچھا...... جب وہ یہاں آئیں گی تب...... انہیں پتا چل جائے گا ناں آپ کے جھوٹ کا...... پھر کیا ہوگا؟''

''کچھ نہیں ہوگا۔ تب یہ معاملہ ان کے ہاتھ سے نکل چکا ہوگا۔ وہ کچھ نہیں کریں گی۔ تم تسلی رکھو۔ بس ایک بار انہیں وہاں آنے تو دو۔ چچا جی کی یہی شرط ہے ناں۔'' اپنے اس موقف میں وہ بے حد اٹل تھا۔ اس وقت بھی اس نے کسی بھی قسم کی لرزش اور کمزوری سے عاری لہجے میں اس کی تسلی کرائی تھی۔

نوال کو اپنی خوش بختی پر ناز سا ہوا۔ اپنے فیصلوں، اپنے ارادوں میں کسی چٹان کی طرح مضبوط یہ شخص اس کا ہے...... صرف اس کا۔

☆☆☆

وہ دروازے میں کھڑی دھندلائی نظروں سے اس صاف ستھرے، سمٹے سمٹائے کمرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔ بستر بے شکن پڑا تھا۔ پردے ایک جانب سمٹے ہوئے تھے۔ بک شیلف کی کتابیں قرینے سے قطار در قطار رکھی تھیں۔ چھوٹے سے اسٹائلش ڈریسنگ ٹیبل پر اس کے پرفیومز، باڈی اسپرے، جیل اور ہیئر برشز تک میں کہیں کوئی بے ترتیبی نہیں تھی۔ اس کا کمرا اس کی نفیس شخصیت کا بہترین عکاس تھا۔ مگر اس وقت وہ کمرا اس کے وجود سے خالی تھا۔ صرف اس کی خوشبو تھی اور...... یا پھر اعصاب پر ٹھہرتی ایک جامد خاموشی۔ اپنے آنسو اپنے اندر اتارتی وہ دھیرے دھیرے چلتیں بیڈ کے پاس آئی تھیں۔ کانپتے ہاتھوں سے اس کا تکیہ اٹھاتے ہوئے انہوں نے اسے چہرے سے لگایا۔

''میں کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی شہریار! تم ایک لڑکی کے لیے اپنی ماں کو یوں چھوڑ جاؤ گے۔ وہ بھی اس لڑکی کے لیے جو دنیا کی آخری لڑکی بھی ہوتی تو میرے لیے کبھی قابل قبول نہیں ہوتی۔'' دل ہی دل میں اسے مخاطب کرتے ہوئے ان کے آنسو بہہ رہے تھے۔

''تم چاہتے ہو میں گھٹنے ٹیک دوں کیونکہ میری کمزوری جانتے ہو۔ جن لوگوں سے میں نے اتنا عرصہ تمہیں دور کیے رکھا جن کا سایہ بھی میں تم پر نہیں پڑنے دینا چاہتی تھی۔ تم ان ہی کے لیے ماں کو ٹھوکر

مار کر چلے گئے۔ مجھ سے کہاں غلطی ہوئی۔ میں نے کہاں کوتاہی کی۔" وہ جیسے خود سے سوال کر رہی تھیں اور تب انہیں اپنی سب سے بڑی غلطی یاد آئی۔

حیات سے شادی کرنے سے بھی بڑی غلطی...... جب حیات کی بیماری کے آخری دنوں میں ان کی آخری خواہش پر انہوں نے شہریار کو وہاں جانے کی اجازت دی۔ ویسے بھی انہیں پورا یقین تھا، برسوں سے لے کر اب تک وہ جو زہر قطرہ قطرہ شہریار کے اندر اتار چکی تھیں۔ وہ اتنی جلدی شہریار کو ان کا نہیں بننے دے گا۔ شہریار باپ کو اپنی صورت دکھائے گا اور واپس لوٹ آئے گا مگر...... ان کے سارے اندازے دھرے کے دھرے رہ گئے۔ باپ کی موت کے باعث شہریار کے وہاں قیام کا دورانیہ بڑھ گیا اور جب وہ واپس آیا تو انہیں احساس ہوا کہ بازی پلٹ چکی ہے۔ وہ تلخی، وہ زہر ان کی چند دن کی رفاقت نے ہی اس کے اندر سے نکال پھینکا تھا۔ ان کے ذکر پر ہمیشہ کی طرح اس کی آنکھوں میں اترنے والا پتھریلا تاثر نرمی میں ڈھل گیا تھا۔ اس کی زبان ان کے حق میں دفاعی وضاحتیں دینے پر اتر آئی تھی۔

وہ یکا یک ہی سرد، منجمد اور خشک شہریار سے سرگرم، متحرک اور پرجوش شہریار میں بدل گیا تھا اور وہ بے یقینی اور حیرت سے دیکھتی رہ گئی تھیں۔ انہیں شدید خطرے کا احساس ہوا تھا مگر اس سے پہلے کہ وہ کچھ کر پاتیں، انہیں شہریار کی طرف سے ایک اور جھٹکا ملا اور اب یہ جھٹکا، جو ان کے نہ صرف اعصاب بلکہ پورے وجود کو ملیامیٹ کرنے کے درپے تھا۔ اتنا شدید تھا کہ وہ خود کو سنبھال تک نہیں پا رہی تھیں۔ ہلکان ہو گئی تھی، وہ نیم جان ہو رہی تھیں، یہ سوچ کر ہی کہ جلد یا بدیر ہار انہیں ہی ماننی ہے۔

دروازے پر ہلکی سی آہٹ ہوئی تھی۔ ان کا ہر ایک عضو تن گیا۔ مگر دروازے میں کھڑے بھائی پر نظر پڑتے ہی مایوسی کی تاریکی ان کے چہرے پر چھائی تھی۔ ساتھ ہی بے بسی کے احساس سے آنکھوں میں بھرتے آنسو......

وہ بھانپ گئے تھے ان کی حالت۔ دھیرے سے چلتے ہوئے وہ ان کے پاس آ کر بیٹھے۔ نظریں سامنے لگی پینٹنگ پر جمائیں۔

"ثمینہ......" چند لمحوں کی بوجھل خاموشی کے بعد انہوں نے انہیں مخاطب کیا۔ "کیا تم شہریار کو واپس اس گھر میں دیکھنا چاہتی ہو؟" انہوں نے سوال کیا۔

وہ بے اختیار حیران ہو کر ان کا چہرہ دیکھنے پر مجبور ہوئیں۔

"یہ کیسا سوال ہے بھائی؟"

"جو پوچھا ہے اس کا جواب دو۔" ان کی نظریں ہنوز پینٹنگ پر تھیں۔

"آپ سے بہتر بھلا کون جانتا ہو گا کہ شہریار میرے لیے کیا ہے۔" ان کی آواز بھرانے لگی۔

"ہاں جانتا ہوں۔" انہوں نے سر ہلایا پھر اچانک ہی نظریں ان کے چہرے پر گاڑ دیں۔ "اسی لیے آج...... میں تم سے یہ کہنے آیا ہوں کہ اسے واپس لے آؤ۔"

ان کی آنکھیں پھر سے بھیگنے لگیں۔

"وہ جوان ہو گیا ہے ثمینہ! بچہ نہیں رہا۔ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ وہ جب جس سے چاہے شادی کر سکتا ہے۔ تمہاری تمام نفرت اپنی جگہ مگر...... اولاد جب جوان ہو جاتی ہے تو اس پر اپنے فیصلے نہیں تھوپے جاتے۔ تم نے بھی اپنی زندگی کا فیصلہ خود کیا تھا تو پھر اس سے یہ حق کیسے چھین سکتی ہو۔" انہوں نے جتایا نہیں تھا، بس یاد دلایا تھا۔ ان کے چہرے پر زلزلے کے سے آثار نمودار ہوئے۔ "جن لوگوں سے تعلق استوار کرنے کے لیے تم نے ساری دنیا کو چھوڑا تھا، آج ان ہی لوگوں سے وہی تعلق نبھانے پر تم اسے خود سے علیحدہ کیسے کر سکتی ہو۔" بھائی شاید طے کر کے آئے تھے، کوئی لگی لپٹی نہیں رکھنی۔ "اور اگر...... تم یہ کرو گی تو...... خود اپنے ہاتھوں سے شہریار کو ان ہی لوگوں کو سونپ دو گی۔"

"اس کی بات مان کر بھی وہی کروں گی

بھائی۔'' سر جھکائے کہتے ہوئے ان کا لہجہ بے حد پست تھا۔

''وہ نکاح کر کے آیا ہے ثمینہ! اور یہ کوئی ایسی بات نہیں ہے کہ پیچھے ہٹ جائے، مکر جائے۔ راستہ بدل لے اور یہ بھی ناممکن سا لگتا ہے کہ...... اپنی شرعی بیوی کو چھوڑ دے۔ بغیر کسی مضبوط عذر کے......'' وہ ان کے جھکے سر کو بغور دیکھتے ہوئے کہہ رہے تھے۔

''اس کی ماں کی رضامندی شامل نہیں، اس کی ماں اس نکاح سے خوش نہیں۔ کیا یہ مضبوط عذر نہیں؟'' آنکھوں میں کرب واضطراب کی کیفیت لیے وہ انہیں دیکھنے لگیں۔

''ثمینہ!'' انہوں نے بے اختیار پیشانی ملی۔ ''نکاح کے لیے لڑکے اور لڑکی کی رضامندی اولین شرط ہے۔ تمہیں سمجھ میں کیوں نہیں آتا۔ تم اس طرح کرو گی تو شہریار......'' انہوں نے بات ادھوری چھوڑ دی۔

''شہریار......'' وہ ہراساں سی ہو گئیں۔

''چلا جائے گا اپنے باپ کے گھر۔ آج وہ لاکھ کہے کہ وہ تمہاری رضامندی کے بغیر اس لڑکی کو اس گھر میں نہیں لائے گا مگر آخر کب تک...... ایک وقت آئے گا جب وہ تھک جائے گا۔ اسے انتخاب کرنا ہوگا، کوئی اس راہ چننی ہوگی اور کیا بچے گا تمہارے پاس...... اگر اس نے اس لڑکی کو چن لیا تو......؟'' انہیں ایک بھیانک حقیقت سے روشناس کرواتے ہوئے بھائی نے بڑا چبھتا ہوا سوال کیا تھا۔ وہ چند لمحے تو کچھ بول ہی نہ سکیں۔

''ضد چھوڑ دو ثمینہ! شہریار کے لیے، اپنے بیٹے کے لیے۔ جہاں اتنی قربانیاں دی ہیں، وہاں ایک قربانی اور دے لو۔ وقتی طور پر بھول جاؤ اپنی نفرت۔ بھول جاؤ کہ وہ کون ہے۔ بھول جاؤ کہ اسے اپنانے کے لیے تمہیں اس گھر میں جانا پڑے گا جن کے مکینوں سے تمہارا صرف نفرت کا رشتہ ہے۔''

''مگر بھائی...... میں کس دل سے وہاں جاؤں گی؟'' ٹوٹے ہوئے لہجے میں کہتے ہوئے ان کا یہ سوال ان کی نیم رضامندی کا مظہر تھا۔

''اسی دل سے...... دل مضبوط کرو ثمینہ! ہمیشہ کے لیے بیٹا کھونے سے یہی بہتر ہے۔'' ان کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے وہ ان کی تکلیف اپنے دل میں محسوس کرنے لگے تھے۔

وہ دونوں ہاتھوں میں چہرہ چھپائے سسک اٹھیں۔

''میں شہریار سے بات کرتا ہوں۔'' وہ اٹھ کھڑے ہوئے تھے۔ انہوں نے روکنے کی کوشش نہیں کی۔

☆☆☆

گھر بھر میں حیرت کی لہر دوڑ گئی، جب شہریار نے فون کر کے بتایا کہ وہ اپنی ماں اور ماموں کے ساتھ آ رہا ہے۔

''یہ کیسے ہو گیا...... ثمینہ مان کیسے گئی؟''

''اچھی بات ہے ناں خالدہ! آپ کو تو خوش ہونا چاہیے۔'' تائی تو حقیقتاً خوش تھیں یہ خبر سن کر۔

''خوشی سے زیادہ الجھی ہوئی ہوں۔ ثمینہ کو تم جانتی نہیں ہو رخسانہ!'' خوشی سے زیادہ عجیب سا دھڑکا لگ گیا تھا ان کے جی کو۔

''مان گئی میں شہریار بھائی کو۔'' حمنہ خوشی سے نوال سے لپٹ گئی تھی۔ پھر اچانک ہی اس کے ساکت ہونے کا احساس ہوا۔ ''نوال!'' اس سے الگ ہوتے ہوئے حمنہ نے بغور اس کی صورت دیکھی۔ ''کیا ہوا...... خوش نہیں ہو؟''

''خوش ہوں۔'' وہ بمشکل چہرے پر ایک بھنچی ہوئی مسکراہٹ لائی۔

''نہیں۔ مجھے لگ رہا ہے کہ تم خوش نہیں ہو۔'' اس کا انداز نہ ماننے والا تھا۔ ''کیا تمہیں بھی امی کی طرح ان کا اچانک سے اور اتنی جلدی مان جانا ہضم نہیں ہو پا رہا۔'' وہ سوال کرنے لگی۔

نوال ہچکچائی۔

''ہاں، کچھ ایسی ہی بات ہے۔'' اب اسے کیا بتاتی، اصل خدشہ ان کے یہاں آنے کے بعد اس

جھوٹ کے کھلنے کا تھا جو شہریار نے ان سے کہا تھا۔
"افوہ...... نکالو ذہن سے یہ فضول سوچیں۔ مجھے اب شہریار بھائی پر پورا بھروسا ہو چکا ہے۔ انہوں نے سب سنبھال لیا ہوگا۔" اس نے نوال کا رخسار تھپک کر اسے تسلی دی تھی۔ "چلو...... اب تیاری کریں۔ وہ لوگ کل آنے والے ہیں۔ امی اور تائی سے مینیو ڈسکس کر لیں۔ شہریار بھائی نے کہا ہے۔ وہ صرف ایک دن کے لیے آرہے ہیں تو ہمیں ان کی خاطر داری کرنی ہے۔"
حمنہ بہت پر جوش ہو رہی تھی۔ اس نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلا دیا۔

☆☆☆

شہریار کے ساتھ آئے ان کے گریس فل ماموں اور خوب صورت سی ثمینہ تائی کا رویہ کافی جھجک آمیز تھا۔ بلکہ ثمینہ تائی کافی حد تک اکھڑی اکھڑی تھیں۔ چہرے پر عجیب سے ناقابل فہم تاثرات لیے۔ چاروں طرف نگاہ دوڑاتے ہوئے وہ اس گھر کا جائزہ لے رہی تھیں۔ جسے اتنے سالوں پہلے چھوڑ کر گئی تھیں۔ خالدہ سے رسمی سا ملیں۔ تائی کو دیکھتے ہی ان کی آنکھوں میں عجیب سا احساس آ ٹھہرا تھا۔ وہ چند لمحے یوں ہی دیکھتی رہی تھیں۔ یہ پہلا موقع تھا اپنی سوکن کو یوں روبرو دیکھنے کا۔ ان کا دل ایک گہری دھند میں لپٹا ان لمحات کی اثر انگیزی سے بے نیاز تھا۔ ان لوگوں کو دیکھ کر مل کر بھی وہ کچھ محسوس نہیں کر پا رہی تھیں۔ نہ نفرت، نہ غصہ، نہ بے زاری، نہ اکتاہٹ۔ بس ایک جامد سرد مہری بھری تھی ان کے اندر۔
تھوڑی دیر میں فریش ہونے کے بعد ماموں تو بابا کے ساتھ ہنسنے بولنے لگے مگر وہ ہنوز خاموشی سے چائے کی چسکیاں لیتی رہیں۔
شہریار بظاہر تو ان کے ساتھ باتوں میں مگن تھا مگر تمام تر حسیات صرف اور صرف ماں کی جانب متوجہ تھیں اور ان کی یہ خاموشی دیکھ دیکھ کر نوال کا دل بھی ہولتا جا رہا تھا۔ انہوں نے ایک بار بھی نوال کو خصوصی توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہیں کی تھی۔ تعارف کے بعد بھی چونکی تک نہیں تھیں۔
میزبانی کے تمام تر فرائض حمنہ اور تائی سر انجام دے رہی تھیں۔ پہلو بدلتی امی کی بے چینی بھی نوال سے چھپی نہیں تھی۔ ایسے وقت میں اگر کوئی مطمئن اور پرسکون دکھائی دے رہا تھا تو وہ تھے بابا اور شہریار کے ماموں۔ چائے پیتے ہی انہوں نے تھکاوٹ ظاہر کی تو امی کے اشارے پر نوال انہیں لیے اس بیڈ روم میں چلی آئی۔
"تو تم نوال ہو۔" بیڈ پر بیٹھتے ہوئے انہوں نے عجیب سی نظروں سے اسے دیکھتے ہوئے سوال کیا تھا۔
"جی......" اس نے سر ہلایا۔ "بالآخر آپ کو خیال آ ہی گیا پوچھنے کا۔" وہ سوچ کر رہ گئی۔ وہ مزید کچھ کہنے لگی تھیں کہ اس کے عقب میں نگاہ ڈالتے ہی خاموش ہو گئیں۔
اس نے پلٹ کر دیکھا تو شہریار کھڑا تھا۔ وہ مزید رکے بغیر وہاں سے نکل آئی۔
پتا نہیں وہ کیا کہنے والی تھیں کہ شہریار کو دیکھ کر بات ادھوری چھوڑ دی۔ اس کے ذہن میں یہی خیال آیا تھا۔

☆☆☆

انہوں نے ڈنر کے بعد رشتے کی بات چھیڑی تھی اور نوال کی حیرت کی انتہا نہ رہی، جب ایسا کچھ نہ ہوا۔ جیسا سوچ سوچ کر اس نے دو دن سے اپنا خون جلایا ہوا تھا۔ نکاح کی بات ابھی تک نہیں۔ انہوں نے سادہ اور باقاعدہ طریقے سے رشتہ مانگا تھا۔ وہ چونکی جب اس کا نام پکارا گیا۔ جھجک کر ان کے پاس بیٹھتے ہوئے اسے اپنی دھڑکن کانوں میں دھڑکتی محسوس ہوئی۔
"ویسے تو میں کچھ اور سوچ کر آئی تھی لیکن...... ابھی ہم یہ رسم کیے لیتے ہیں۔ آپ رخصتی کی تاریخ دیں گے تو اگلی بار بارات لے کر آئیں گے ان شاء اللہ۔"
نوال نے پہلی بار ان کے چہرے پر ہلکی سی

مسکراہٹ کی جھلک دیکھی۔ اپنی انگلی سے انگوٹھی اتار کر انہوں نے اسے پہنائی تھی۔ یہ انگوٹھی اس کی مرمریں مخروطی انگلی میں ڈھیلی تھی۔ یقیناً یہ اس کے ناپ کی نہیں تھی۔ رنگ انگلی میں گھماتے ہوئے اس کی الجھی ہوئی نظر شہریار کی جانب اٹھی۔ جو ٹانگ پر ٹانگ رکھے بڑی دلچسپی سے اسے دیکھ رہا تھا۔ اس سے نظر ملتے ہی وہ مسکرا دیا۔ اس نے سٹپٹا کر سر جھکا لیا۔

شہریار اس کی الجھن سمجھ رہا تھا۔

''امی! مجھے آپ سے کچھ بات کرنی ہے۔'' وہ نوال کے کمرے سے نکلتے ہی بولا۔

''اب کیا بات کرنی ہے، کچھ اور بھی ایسا ہے جو تم نے مجھے نہ بتایا ہو۔'' ان کے لہجے میں استہزا تھا۔

''بالکل ہے۔'' سر ہلاتے ہوئے وہ ان کے قریب آیا اور ان کے دونوں ہاتھ تھام کے بیٹھ گیا۔ وہ ناسمجھی اور حیرت میں گھری اسے دیکھنے لگیں۔

''جانتا ہوں۔ بہت غصہ ہیں آپ مجھ سے۔'' دھیمے لہجے میں کہتے ہوئے اس کی گہری آنکھوں میں بے قراری کروٹ لینے لگی۔ ''لیکن......'' وہ کہتے کہتے رکا۔ ''اب جو میں آپ سے کہنے جا رہا ہوں، اسے آرام سے سنیں۔''

''ایسی کیا بات ہے شہریار......!'' اس کے انداز انہیں ہولا گئے۔

''پریشان مت ہوں۔ میں بس آپ سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ...... کہ...... میں نے نوال سے نکاح نہیں کیا۔'' وہ یہ انکشاف کر کے شانت ہوا تھا۔ ایک گہری سانس لی۔ گویا دل سے بھاری بوجھ سرکا ہو اور امی بت بنی یک ٹک اسے دیکھ رہی تھیں۔

''تم...... تم نے مجھ سے اتنا بڑا جھوٹ بولا شہریار!'' وہ سکتے سے نکل کر بھی بے یقین تھیں۔

''آپ کو یہاں آنے اور راضی کرنے کے لیے۔'' وہ بولا۔ ''میں جانتا تھا آپ کسی صورت راضی نہیں ہوں گی۔ پھر آپ جیا سے میری شادی کروانے پر تل گئی تھیں۔ میرے پاس کوئی چارہ نہیں تھا امی! آپ اپنے بیٹے کی خوشی نہیں صرف اپنی انا، اپنی ضد دیکھ رہی تھیں اس لیے مجھے یہ جھوٹ بولنا پڑا۔'' اس کا رنج بھرا لہجہ شرمندگی میں ڈھلا تھا۔ ''ورنہ میں نے کبھی ایک لمحے کے لیے بھی نہیں سوچا کہ میں نکاح جیسا بڑا اقدم آپ کے بغیر اٹھاؤں گا۔''

وہ آنکھوں میں آنسو لیے اسے دیکھ رہی تھیں۔ ہونٹوں پر چپ کا قفل ڈالے۔

''ہاں، میں نے چچا جی سے نوال کا ہاتھ مانگا ضرور تھا مگر چچا جی نے صاف کہہ دیا۔ آپ کی رضا مندی کے بغیر وہ یہ کام کبھی نہیں کریں گے۔ وہ اتنے بھی برے نہیں ہیں امی! جتنا آپ انہیں سمجھتی ہیں کہ یوں بنا کچھ سوچے سمجھے مجھ جیسے انسان سے اپنی بیٹی کا نکاح پڑھوا دیں گے، جس کی ماں تک اس سے راضی نہ ہو۔''

وہ ایک بار پھر ان کے لیے دفاعی لہجے میں وضاحتیں پیش کر رہا تھا۔ مگر اس بار ان کے اندر طیش کی، ناراضی کی کوئی بپھری ہوئی لہر نہیں اٹھی۔ وہ ہتھیار ڈال چکی تھیں۔

''میں جانتا ہوں، میرا طریقہ غلط تھا۔ مگر مجھے یقین ہے آپ مجھے معاف کر دیں گی۔'' وہ آنکھوں میں امید و بیم کی کیفیت لیے ان کے چہرے کی سمت دیکھنے لگا۔ جو آنسوؤں میں بھیگا تھا۔

''میں تم سے بہت پیار کرتی ہوں شہریار!'' ان کا دھیما لہجہ لرزا۔

''جانتا ہوں۔'' ان کا ہاتھ لبوں سے لگاتے ہوئے اس نے اپنی پوروں سے ان کے آنسو پونچھے۔

''میں یہاں صرف تمہارے لیے آئی ہوں۔ میں نے نوال کو صرف تمہاری خوشی کے لیے قبول کیا اور اب جب آ گئی ہوں...... جب ہار گئی ہوں تو اس بات سے کوئی فرق نہیں پڑتا کہ تم نے مجھ سے کیا کیا جھوٹ بولا۔ میں نوال کو اپنی بہو بنا کر ہی جاؤں گی۔'' آنسوؤں کا نمکین گولا نگلتے ہوئے انہوں نے لہجہ مضبوط کیا۔

''امی!'' شہریار نے بے اختیار ان کے شانوں کے گرد باز و حمائل کیے۔

"ہاں مگر...... میں اسے اپنے دل میں جگہ نہیں دے پاؤں گی اور...... تم مجھے اس کے لیے مجبور نہیں کرو گے۔" انگلی اٹھا کر کہتے ہوئے ان کا انداز سخت ہوا تھا۔

"نہیں کروں گا امی! بالکل نہیں کروں گا۔ وہ اتنی اچھی ہے کہ خود ہی آپ کے دل میں جگہ بنا لے گی۔ آج نہیں تو کل یہ ضرور ہوگا۔" سکون اور آسودگی یکایک ہی اس کے رگ و پے میں سرایت کر گئے تھے۔ وہ کھل کر مسکرایا تھا۔

☆☆☆

"آپ نے مجھ سے جھوٹ بولا۔"

وہ اس کی الجھن رفع کرنے کو اس کے پیچھے چلا آیا تھا۔ وہ اس وقت برآمدے کے ستون سے ٹیک لگائے کھڑی تھی۔ پلٹ کر ناراضی سے دریافت کرنے لگی۔

اس نے قدرے ٹھٹک کر دلچسپی سے اس کے تیکھے چتون دیکھے پھر چہرے پر ایک بے اختیاری مسکراہٹ دوڑ گئی۔

"نہیں۔ میں نے تم سے کوئی جھوٹ نہیں بولا۔"

"پھر تائی جی اتنی پرسکون کیسے ہیں۔ انہوں نے نکاح والی بات کیوں نہیں کی۔" وہ سوچ سوچ کر پاگل ہو رہی تھی۔

"وہ اس لیے کہ میں انہیں پہلے ہی سچائی بتا چکا تھا۔" شہریار نے اس کی حیرت سے مزا لیا۔ وہ بھونچکی ہو کر اسے دیکھنے لگی۔

"کب؟"

"شام میں۔" اس نے تفصیل بتائی۔

"اوہ......" اس کے سینے سے اطمینان بھری سانس خارج ہوئی۔

"اب ہو گئی تسلی؟" وہ مسکراہٹ دبائے پوچھنے لگا۔

"ہاں، ہو گئی۔" وہ شرمیلی سی ہنسی ہنس دی۔ شہریار محویت سے اسے دیکھتا رہ گیا۔ اس کا چہرہ دہکنے لگا۔

"نوال......" شہریار نے اس کا نرم و گداز ہاتھ تھاما تو وہ چونک کر اس کے مضبوط ہاتھوں میں دبے اپنے ہاتھ کو دیکھنے لگی۔ اس نے پہلی بار یوں ہاتھ تھاما تھا۔ اسے اپنی وجود میں خفیف سی لرزش محسوس ہوئی۔

"امی یہاں آ گئی ہیں۔ انہوں نے تمہیں قبول بھی کر لیا ہے مگر...... شاید وہ دل سے تمہیں اتنی جلدی قبول نہ کر پائیں۔ شاید ان کا رویہ بھی ویسا نہ ہو جیسا کسی ساس کا اپنی من چاہی بہو کے ساتھ ہو سکتا ہے۔ شاید وہ تمہیں کچھ کہیں بھی، سنائیں بھی...... تمہیں خاموشی سے سننا ہوگا۔ صبر سے سب برداشت کرنا ہوگا۔ میری خاطر کرو گی ناں؟" وہ اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈالے پوچھ رہا تھا۔ وہ چند لمحے اس کی خوب صورت بھوری آنکھوں میں دیکھتی رہی پھر خود بخود سر اثبات میں ہلا تھا۔

"ہاں کروں گی، آپ کی خاطر سب برداشت کروں گی۔ ان کی سخت نظریں، کسی نرم مہربان پھوار کی مانند۔ ان کے تلخ لہجے کو پھول برساتی بہار سمجھوں گی۔ ان کی نفرت کے کانٹے اپنی پلکوں سے چنوں گی۔ ان کی عداوت و بے رخی کو اپنے لیے محبت میں بدل لوں گی۔ آپ کی محبت میں اگر اتنا بھی نہیں کر پائی تو پھر محبت کا دعوا کیسا۔"

"نوال! تم میری زندگی میں میری خوش بختی بن کر آئی ہو۔" اس کا من موہنا روپ آنکھوں سے دل میں اتارتے اس نے پہلی بار واشگاف اظہار کیا تھا۔

نوال کے چہرے پر دھنک اتری۔ پلکیں جھک گئی تھیں۔ وہ جان گئی آگے کے راستے کتنے بھی کٹھن کیوں نہ ہوں، وہ شہریار کی ہمراہی میں ہر پل صراط پار کر لے گی۔

قرۃ العین خرم ہاشمی

''السلام علیکم!''

دروازے کی گھنٹی بجانے کے تقریباً پانچ منٹ کے بعد ایک درمیانی عمر کی بدحال عورت نے تھوڑا سا دروازہ کھول کر باہر جھانکا۔

ہما اور حرا ٹرے ہاتھ میں پکڑے بے چین نگاہوں سے دروازے کی طرف دیکھ رہی تھیں۔ عورت کی جھجک دیکھ کر ہما نے جلدی سے سلام کیا۔ عورت ان کے پرجوش انداز پر مزید گڑبڑا گئی۔ اس کا

ابتر حلیہ ہرگز اس قابل نہیں تھا کہ وہ نئے محلے میں لوگوں سے اس طرح ملے۔ اس لیے وہ جھجک کر ادھ کھلے دروازے کے پیچھے ہی کھڑی رہی۔ مگر ان دونوں کو منتظر دیکھ کر وہ عورت تھوڑا سا دروازہ کھول کر مزید باہر نکلی مگر ابھی بھی وہ اپنے گھر کی دہلیز کے اندر کھڑی تھی جیسے بہت مجبوری میں ان دونوں سے بات کر رہی ہو۔

''آنٹی! ہم سامنے والے گھر سے آئے ہیں۔ امی نے آپ لوگوں کے لیے کھانا بھیجا ہے۔''

ہما نے زبردستی مسکراہٹ چہرے پر سجاتے ہوئے کہا۔

ورنہ عورت کے تاثرات اور خشک رویہ دیکھ کر تو اس کا دل چاہ رہا تھا کہ ہاتھ میں پکڑی ٹرے سمیت واپس چلی جائے مگر مروت کے مارے کھڑی رہی۔

''کون سا گھر؟''

عورت اس محلے میں نئی آئی تھی، اس لیے سامنے بنے گھروں کو دیکھتے ہوئے سوالیہ انداز میں پوچھنے لگی تو ہما سے چھوٹی حرا نے اشارہ کر کے اپنے گیٹ کے بارے میں بتایا۔

''امی کہہ رہی تھیں کہ کسی چیز کی ضرورت ہو تو بتا دیجیے گا۔''

حرا نے جلدی سے کہا تو عورت نے سر ہلاتے ہوئے ٹرے تھامی اور انھیں وہاں انتظار کرنے کا کہہ کر اندر چلی گئی۔ ہما اور حرا ایک دوسرے کا منہ دیکھتی رہ گئیں۔ تھوڑی دیر کے بعد عورت واپس آئی اور شکریے کے ساتھ خالی برتن واپس کر کے دروازہ بند کر دیا۔ ہما اور حرا گھر واپس آئیں تو بہت غصے میں تھیں۔

''کیا ہوا؟''

لاؤنج میں چائے سے لطف اندوز ہوتی ریحانہ نے بیٹیوں کے چہروں کی طرف دیکھا تو حیرت سے سوال کیا۔ دونوں سامنے والے صوفے پر بیٹھ گئیں اور نئے آنے والے پڑوسیوں کی بداخلاقی کا قصہ سنانے لگیں۔

''امی! آپ کو شوق ہے پڑوسیوں سے اچھے تعلقات رکھنے کا۔ آج کل تو لوگ ایک دوسرے سے ملنا تو دور، بات کرنا بھی پسند نہیں کرتے۔''

ہما نے منہ بنا کر کہا۔ وہ ایف ایس سی پری میڈیکل پارٹ ٹو کی طالبہ تھی جبکہ حرا میٹرک میں زیر تعلیم تھی۔

''بھئی مجھے کیا کہہ رہی ہو۔ تمہارے باپ نے کہا تھا کہ محلے میں نئے لوگ آئے ہیں تو کھانا ضرور بھیج دینا۔ ورنہ مجھے یہ چونچلے کرنے کا کوئی شوق نہیں ہے۔''

ریحانہ نے کندھے اچکا کر کہا۔

''بابا آئیں گے تو میں انھیں بتاؤں گی کہ نئے محلے دار کتنے عجیب سے ہیں۔''

حرا نے نخریلے انداز میں کہا۔ وہ چھوٹی ہونے کی وجہ سے باپ کے زیادہ قریب تھی۔

''عجیب ہیں یا نہیں ہم نے کون سا ان سے زیادہ ملنا جلنا ہے۔ نظرانداز کر دو۔''

ریحانہ نے لاپروائی سے کہا تو دونوں نے سر ہلایا اور ایل ای ڈی آن کر کے شام کے پروگرام دیکھتے ہوئے باتیں کرنے لگیں۔ رات کو وقار آئے تو حرا نے باپ کو دن بھر کی روداد سناتے ہوئے جب اس عورت کے خشک رویے کے بارے میں بتایا تو وقار ہنس پڑے۔

''ابھی انہیں آئے ایک دن تو ہوا ہے۔ لازمی سی بات ہے گھر سیٹ کرنے میں کافی دن لگتے ہیں۔ اب اس حال میں تو وہ آپ لوگوں کو گھر کے اندر نہیں بلا سکتی تھیں۔'' وقار نے نرمی سے سمجھایا تو وہ سر ہلا کر رہ گئیں۔

☆☆☆

''ریحانہ! شمع باجی کی بیٹی بیمار ہے۔ کسی دن اس کی عیادت کرنے چلتے ہیں۔''

وقار نے شام کی چائے پیتے ہوئے اپنی بیوی

سے کہا تو ریحانہ کے کچھ کہنے سے پہلے فریش جوس پیتی ہما باپ سے ہم کلام ہوئی۔
''بابا! آپ کی کزن شمع باجی بہت عجیب سی ہیں؟'' ہما نے منہ بنا کر کہا۔
''تم انہیں پھوپھو بھی کہہ سکتی ہو۔'' وقار نے نرم لفظوں میں سمجھایا۔
''میری دو پھوپھو ہی کافی ہیں مزید کی گنجائش نہیں۔'' ہما نے شرارت سے کہا اور پھر معافی کے لیے دونوں کانوں کو ہاتھ لگا کر ہنس پڑی۔
''بابا سیریس! جب ہم آخری بار شمع پھوپھو کے گھر گئے تھے تب بھی ان کا رویہ بہت عجیب لگا تھا۔ بہت فارمل سا۔''
ہما نے جلدی سے کہا۔
''وہ کیسے؟'' وقار نے نرمی سے سوال کیا۔
''میں بتاتی ہوں۔'' ریحانہ بیٹیوں کی طرف داری کرتے ہوئے میدان میں اتریں۔
''شمع باجی کچن میں چائے کا انتظام کر رہی تھیں۔ میں نے سوچا کہ ان کی مدد کروا دوں مگر جب ہم تینوں کچن کے پاس پہنچے تو ہمیں دور سے دیکھ کر ہی وہ گڑبڑا سی گئیں۔ جلدی سے دروازے کے پاس پہنچ کر پوچھنے لگیں کہ کچھ چاہیے۔ ہم نے کہا کہ آپ کی مدد کروانے آئے ہیں تو وہ ہنستے ہوئے ہمیں واپس لاؤنج میں لے آئیں۔ سچ پوچھیں تو مجھے بہت برا لگا۔ عجیب وہمی سی عورت ہیں۔''
ریحانہ نے منہ بنا کر کہا تو حرا اور ہما نے بھی اثبات میں سر ہلا کر ماں کی باتوں کی تائید کی۔ اس طرح کی ملتی جلتی اور بھی کئی مثالیں ماضی سے کھنگال کر پیش کی گئیں۔
''بدگمانی سے بچنا چاہیے۔ اگر کوئی ملنے میں ایک فاصلہ یا حد مقرر کرتا ہے تو یہ بری بات نہیں ہے۔''
ہمیشہ کی طرح وقار نے ان تینوں کو سمجھاتے ہوئے کہا مگر تینوں کے چہروں سے صاف لگ رہا تھا کہ وہ ان کی باتوں سے ہرگز متفق نہیں ہیں۔

☆☆☆

''بابا! کچھ دنوں کے بعد میری دوست عظمیٰ کی سالگرہ آ رہی ہے۔''
ہما نے پرجوش انداز میں باپ سے کہا۔ وقار رات کا خبرنامہ دیکھ کر فارغ ہوئے تھے۔ ریحانہ پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ ہما اور حرا ایک ساتھ لاؤنج میں داخل ہوئیں تو وقار سمجھ گئے کہ ضرور انہوں نے کوئی فرمائش کرنی ہے۔
''یہ عظمیٰ وہی نئی لڑکی ہے ناں جس کا کچھ عرصہ پہلے تمہاری اکیڈمی میں داخلہ ہوا ہے۔''
وقار نے ذہن پر زور دیتے ہوئے پوچھا۔ تو ہما نے فوراً اثبات میں سر ہلایا۔
''جی اور وہ میری بہت اچھی دوست بن گئی ہے۔'' ہما نے خوشی سے کہا۔
''ہما بیٹی! اتنی جلدی لوگوں پر اعتبار نہیں کرتے ہیں۔ آرام اور تحمل کے ساتھ دوستی جیسے رشتے کو مضبوط بنانا چاہیے۔''
ہمیشہ کی طرح وقار نے سمجھایا۔
''اف وقار! آپ بھی ہر بات میں بچیوں کو نصیحت کرتے ہیں۔ خوشی کا موقع ہے۔''
ریحانہ نے ہمیشہ کی طرح بیٹیوں کی بے جا طرف داری کی تھی۔
''میں خوشی منانے سے منع تو نہیں کر رہا۔''
وقار نے گہری سانس لی اور پھر دونوں بیٹیوں کے پریشان چہرے دیکھ کر جلدی سے کہنے لگے۔
''اچھا بتاؤ، تم نے کیا سوچا ہے؟ کیسے وش کرو گی؟''
وقار نے مسکراتے ہوئے کہا تو دونوں باپ کے اطراف میں بیٹھ کر سرپرائز برتھ ڈے وش کرنے کا پلان بنانے لگیں۔ حرا ہر کام میں ہما کے ساتھ ہوتی تھی۔ ریحانہ مطمئن انداز میں مسکراتے ہوئے انھیں دیکھ رہی تھیں۔

بلاشبہ وقار بہترین شوہر، بہترین باپ تھے۔
وقار نے اپنی دونوں بیٹیوں کو بہت پیار اور لاڈ سے پالا تھا۔ حالانکہ خاندان میں بہت سے لوگ ہمدردی میں کہہ دیتے کہ وقار کا کوئی بیٹا نہیں ہے مگر وقار نے کبھی اس بات کا اظہار نہیں کیا۔ وہ اپنے رب کی تقسیم پر راضی تھے کہ جس نے انہیں صاحب اولاد بنایا۔ اگر اس کے پاس یہ رحمت بھی نہ ہوتی تو وہ کیا کر لیتے؟

ہما اور حرا اس لیے باپ کے بہت قریب تھیں کیونکہ وقار نے ان سے دوستی اور اعتماد کا رشتہ قائم کیا ہوا تھا۔ وہ اپنی بچیوں کی تربیت کے ہر پہلو، ہر انداز پر گہری نظر رکھتے تھے۔ ریحانہ ماں تھیں اس لیے اکثر اپنی اندھی محبت کا مظاہرہ کر جاتیں، ان کی غلط طرف داری کر کے مگر وقار ہمیشہ متوازن انداز میں چلتے تھے اس وجہ سے دونوں بیٹیاں بھی باپ کی ہر بات پر اندھا یقین رکھتی تھیں۔

☆☆☆

وقار کو تین دن کے لیے کسی ضروری کام کی وجہ سے شہر سے باہر جانا پڑ گیا۔ تین دن کے بعد جب وہ تھکے ہارے گھر واپس آئے تو ریحانہ نے بہت بجھے انداز میں اس کا استقبال کیا۔

''ہما کہاں ہے؟'' تین دن کے بعد رات کو وہ اپنی فیملی کے ساتھ کھانا کھا رہے تھے۔ ہما کی کرسی خالی دیکھ کر حیرت سے سوال کیا۔

''اس کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' ریحانہ نے سالن کا ڈونگا وقار کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا تو وقار کرسی پیچھے کر کے کھڑے ہو گئے۔

''میں اسے دیکھ کر آتا ہوں۔'' وقار نے فکرمندی سے کہا تو ریحانہ، حرا کی طرف دیکھ کر رہ گئے۔

''بابا! ہما بہت دکھی ہے۔'' اچانک حرا نے کہا تو وقار چونک کر پلٹے۔

''کیوں؟ کیا کسی نے کچھ کہا ہے؟'' وقار نے فکرمندی سے سوال کیا۔

''بابا! ہما کی ساری اکیڈمی کے سامنے بہت بے عزتی ہوئی ہے۔'' حرا نے جلدی سے کہا کیونکہ ریحانہ اسے گھور رہی تھیں۔

''مجھے ساری بات بتاؤ۔'' وقار نے سنجیدگی سے سوال کیا۔

''میں بتاتی ہوں۔'' ریحانہ نے آہستہ سے کہا تو وقار سوالیہ نظروں سے ان کی طرف دیکھنے لگے۔

''پرسوں ہما کی دوست عظمیٰ کی سالگرہ تھی۔ ہما نے عظمیٰ کو سرپرائز دینے کے لیے کیک، گفٹ لیا اور......''

ریحانہ کہتے ہوئے رک گئیں۔

''اور جب عظمیٰ کلاس کا دروازہ کھول کر اندر داخل ہوئی تو ساری کلاس نے اونچی آواز میں سالگرہ کی مبارک باد دی۔''

حرا آنکھوں دیکھا حال بتانے لگی۔

''اچھا پھر؟'' وقار نے الجھے ہوئے انداز میں سوال کیا۔

''پھر ہما نے پارٹی فوم اسپرے ساری کلاس میں کرنا شروع کر دیا۔ (فوم اسپرے یہ ایک طرح کی سفید جھاگ ہوتی ہے جو سالگرہ وغیرہ کے موقع پر منہ پر اسپرے کیا جاتا ہے۔)

ہما نے جب اسپرے عظمیٰ کی طرف کیا تو وہ غصے میں آ گئی کیونکہ اسپرے میں موجود کیمیکل سے عظمیٰ کو الرجی تھی۔ اسے شدید چھینکیں آنے لگیں۔ آنکھوں اور ناک سے پانی بہنے لگا۔ سب سالگرہ کو بھول گئے اور عظمیٰ کی فکر لاحق ہو گئی۔ عظمیٰ نے سب کے سامنے ہما کو بہت باتیں سنائی اور وہاں سے چلی گئی۔ اس دن سے ہما اکیڈمی نہیں گئی کہ سب کے سامنے اس کی انسلٹ ہوئی ہے۔''

حرا نے جلدی جلدی ساری بات بتائی۔ وقار گہری سانس لے کر رہ گئے۔ وہ اسی وجہ سے ہما کے جذباتی پن سے ڈرتے تھے۔ وہ لوگوں کو اسپیس دینا

نہیں جانتی تھی۔ وقار اس دن تو ہما کو سمجھا بجھا کر کھانے کی میز پر لے آیا مگر اب وہ سنجیدگی سے سوچ رہے تھے کہ ہما کو کیسے سمجھایا جائے کہ لوگوں سے ملتے وقت ایک مخصوص فاصلہ رکھنا رشتے کی خوبصورتی ہوتی ہے۔

☆☆☆

اس واقعہ کے بعد سے ہما اور عظمیٰ کی دوستی مزید گہری ہونے کے بجائے، ان میں دشمنی گہری ہوتی گئی۔ عظمیٰ ہر جگہ بیٹھ کر ہما کا مذاق اڑاتی اور ہما ہر جگہ بیٹھ کر عظمیٰ کے غلط رویئے کو نشانہ بناتی۔ اب اکثر ہما کی زبان پر عظمیٰ کے لیے برائی ہوتی۔ وقار جوان دنوں اپنے کام کی وجہ سے بہت مصروف تھے وہ چاہتے ہوئے بھی ہما کو اس بارے میں سمجھا نہیں پا رہے تھے۔ ہما نے جس بات کو انا کا مسئلہ بنا کر اپنے سر پر سوار کر لیا تھا اسے تھوڑی سی سمجھ داری اور برداشت کے ساتھ نظر انداز کر دینا بہتر تھا۔

اس واقعہ میں ہما کی غلطی اس کا جذباتی پن تھا۔ عظمیٰ سے چند دنوں کی دوستی میں زیادہ کی توقع رکھنا بے وقوفی تھا۔ اگر ہما، سمجھ داری اور مناسب طریقے سے عظمیٰ کو سالگرہ کی مبارک باد دے دیتی تو بات الگ تھی۔ ہما نے مذاق کے طور پر فوم اسپرے کا استعمال کیا جو اکثر لوگوں کو ناگوار گزرتا ہے۔ عظمیٰ کو اس سے الرجی بھی تھی دوسرا سب کے سامنے فوم اسپرے کا نشانہ بننا بھی اسے اچھا نہیں لگا تھا۔ اس لیے عظمیٰ کا رویہ کافی سخت ہو گیا۔ ہما اس پہلو کو نظر انداز کیے مسلسل عظمیٰ کے برے رویے کو نشانہ بنا رہی تھی۔

ہما کی ساری توجہ پڑھائی سے زیادہ اکیڈمی میں ہونے والی سازشوں اور لڑائیوں کی طرف تھی۔ اس لیے اکیڈمی میں ہونے والے ٹیسٹ کا نتیجہ حسب توقع نکلا اور ہما ہر ٹیسٹ میں بمشکل پاس ہوئی۔

ٹیسٹ کی رپورٹس دیکھ کر وقار اور ریحانہ سر پکڑ کر بیٹھ گئے۔ وہ ہما کو ڈاکٹر بنانا چاہتے تھے۔ ہما کی بھی یہ خواہش تھی مگر ایسے نمبروں کے ساتھ تو یہ ممکن ہی نہیں تھا حالانکہ ہما پڑھنے والی اور ذہین طالبہ تھی مگر توجہ کی کمی اور غیر ضروری سرگرمیوں نے اس کی پڑھائی پر برا اثر ڈالا تھا۔

☆☆☆

''بابا یہ کیا ہے؟'' شام کو وقار گھر آئے تو انہوں نے ہاتھ میں ایک بڑا سا ڈبہ پکڑا ہوا تھا جو خوب صورتی سے پیک تھا۔

''تم دونوں کے لیے تحفہ۔'' وقار نے مسکراتے ہوئے کہا اور ہاتھ میں پکڑا گفٹ زمین پر رکھ دیا۔

''مگر ہماری سالگرہ تو نہیں ہے؟'' دونوں نے حیرانی سے باپ کی طرف دیکھا۔

''تحفہ دینے کے لیے کسی خاص دن کی کوئی قید نہیں ہوتی۔'' وقار نے مطمئن انداز میں کہا۔

''ہم اسے کھول لیں۔'' ہما نے بے تابی سے سوال کیا تو وقار نے مسکراتے ہوئے اثبات میں سر ہلایا۔

''کبھی مجھے بھی سرپرائز گفٹ دے دیں۔'' ریحانہ نے چائے کا کپ پکڑاتے ہوئے شرارت سے کہا تو وقار ہنس پڑے۔

''اگلی بار تمہاری باری۔''

وقار نے بھی شرارت سے جواب دیا۔ ریحانہ وقار کے پاس بیٹھ کر دونوں بیٹیوں کو گفٹ ریپر کھولتے ہوئے دیکھنے لگی۔

''ارے یہ کیا ہے؟'' دونوں نے گفٹ ریپر اتارا اور ڈبے کو دیکھ کر حیرت سے باپ کی طرف دیکھا اور پھر کھلکھلا کر ہنس پڑیں۔

''بابا! ہم دونوں کی عمر نہیں ہے اس سے کھیلنے والی۔'' ہما اور حرا نے ہنستے ہوئے کہا۔

''ڈول ہاؤس۔ (گڑیا کا گھر۔)'' ریحانہ نے بھی حیرت سے دیکھا۔

''یہ آپ کو کیا سوجھی؟'' ریحانہ نے حیرت سے سوال کیا۔

''آج میرا دل کر رہا تھا کہ میں اپنی بیٹیوں کے ساتھ گڑیا کا گھر بناؤں۔ ان کے ساتھ کھیلوں۔''

وقار نے آستین فولڈ کی اور نیچے قالین پر بیٹھ کر ڈول ہاؤس کھولنے لگے۔ ہما اور حرا دلچسپ نظروں سے باپ کو دیکھ رہی تھیں۔ کچھ دیر کے بعد وہ بھی باپ کے ساتھ مل کر ڈول ہاؤس کو سجانے لگیں۔ ریحانہ مسکراتے ہوئے موبائل کیمرے سے ویڈیو بنانے لگی۔

''ایک کہانی سناؤں؟'' ڈول ہاؤس کو سجاتے ہوئے وقار نے سوال کیا تو دونوں نے اثبات میں سر ہلایا۔

وقار گڑیا کے بڑے سے گھر کو دیکھتے ہوئے ماضی میں کھو گئے۔ اس گڑیا کے گھر کی جگہ مٹی سے بنا ایک گھر نظر آنے لگا تھا۔

☆☆☆

''ہر والدین کی طرح ہمارے والدین نے بھی اولاد کی تربیت ان ہی طریقوں پر کی جس پر سب کرتے ہیں۔ یہ ٹھیک ہے، وہ غلط ہے، جھوٹ نہیں بولنا، سچ بولنے پر انعام وغیرہ مگر ہر گھر کی طرح ہمارے گھر میں بھی تربیت کے ایک خاص پہلو پر ضرور توجہ دی جاتی تھی۔''

وقار مدھم لہجے میں بول رہے تھے۔ تینوں اسے ہمہ تن گوش سن رہی تھیں۔

''میری بے بے بہت سادہ مزاج کی نیک عورت تھیں۔ وہ اپنی اولاد سے محبت بھی اسی انداز میں کرتی تھیں۔ بے بے نے اپنے تین بیٹوں اور دو بیٹیوں میں کبھی فرق نہیں کیا۔ اگر وہ بیٹیوں کے ساتھ گڑیا گڈے کا کھیل کھیلتی تو اکثر بیٹوں کے ساتھ بھی کرکٹ یا فٹ بال کھیلنے کی کوشش کرتیں۔ مگر اس کے علاوہ بے بے ایک کھیل اپنے پانچوں بچوں کے ساتھ مشترکہ طور پر کھیلتی تھیں۔''

وقار کھوئے ہوئے انداز میں کہہ رہے تھے۔

''کون سا کھیل؟'' حرا نے جلدی سے سوال کیا۔

''بے بے نے جب دیکھا کہ ان کے بچے شعور کی دہلیز پر قدم رکھ رہے ہیں تو وہ ہر روز دوپہر کو کچی مٹی کے پاس بیٹھ جاتیں۔ ہم سب بھی بے بے کے اردگرد جمع ہو جاتے۔ بے بے ہنستے ہوئے اپنی زبان میں گیت گاتیں اور بہت نرمی اور پیار سے مٹی کو گوندھتیں۔ اس گیلی مٹی سے ایک گھر بناتیں۔ ہم سب بہت اشتیاق سے مٹی کے بنے گھر کو دیکھتے۔ اس گھر کا نقشہ ہم سب کی مرضی کا ہوتا اس لیے عجیب سا بنتا۔

اس گھر میں کمروں سے لے کر برآمدے، کھڑکیاں، دروازے، صحن ہر چیز سب کی مرضی سے پوچھ کر بنائی جاتی۔ کبھی کسی کو تین کمروں پر اعتراض ہوتا کبھی کوئی گھر کی لمبائی پر سوال اٹھاتا کبھی کوئی چوڑائی پر۔ بے بے سب دیکھتیں، سنتی اور ہنستیں۔ بے بے نے کبھی ہمیں نہیں ٹوکا، منع نہیں کیا۔

اپنی مرضی نہیں چلائی، نصیحت نہیں کی۔ بے بے کا ماننا تھا کہ جہاں کھیلنا چاہیے وہاں کھیلو، جہاں ہنسنا چاہیے، وہاں بے فکری سے ہنسو، جہاں نصیحت کرنی چاہیے صرف وہاں نصیحت کرو۔

نہیں تو نصیحت بوجھ بن جاتی ہے، کانوں کے پردے سن کر برداشت کر بھی لیں تو ذہن اور دل اس کا بوجھ اٹھانے سے انکار کر دیتے ہیں۔''

وقار کی باتوں نے سب کو مسحور کر دیا تھا۔

''بابا! دادی اماں وہ گھر کیوں بناتی تھیں؟'' ہما نے جلدی سے سوال کیا۔

''بے بے نے اپنے سب بچوں کو وہ گھر بنانا سکھایا۔ بے بے نے اس مٹی کے عام سے گھر کا بہت خاص نام رکھا ہوا تھا۔''

وقار نے ہلکی مسکراہٹ کے ساتھ کہا۔

''وہ کیا؟'' حرا نے سوال کیا۔

''بے بے اسے تعلق کا گھر کہتی تھیں۔'' وقار نے کہا تو وہ تینوں حیرانی سے دیکھنے لگیں۔

''تعلق کا گھر؟'' ہما نے دہرایا۔

''ہاں! بے بے ہماری مرضی سے ایک گھر بناتیں پھر وہ کہتیں کہ اس میں اپنے جاننے والوں کو

باری باری اندر لاؤ اور بتاؤ کہ کہاں بٹھاؤ گے؟"
ہم سب تصور کرتے کہ بڑی پھوپھو اگر آئیں گی تو انھیں لاؤنج میں بٹھائیں گے۔ چھوٹے چچا بہت اچھے ہیں تو انہیں اپنے کمرے تک لے جائیں گے۔ تائی اماں بہت غصے والی ہیں اس لیے انھیں گھر کے صحن میں جگہ دیتے۔ اس طرح ہم سب اپنے جاننے والوں کو گھر کے مختلف حصوں میں ان کے اچھے اخلاق اور ہماری زندگی میں ان کے مقام کے مطابق جگہ دیتے جاتے۔ بے بے مسکرا کر سب سنتیں اور پھر آخر میں ایک بات کہتیں کہ......
"میں نے گھر بنانے اور تم لوگوں کے من پسند مہمان بٹھانے وغیرہ یا تم لوگوں کی کسی بات پر اعتراض نہیں کیا۔ تم سب نے اپنے من پسند لوگ، اپنی پسند کے مطابق جہاں چاہے وہاں بٹھائے ہیں۔
بالکل اسی طرح دوسرے لوگ بھی سوچتے ہیں۔ جب بھی زندگی میں لوگوں سے ملو، تو یہ یاد رکھنا کہ سب لوگ تعلق کا ایک گھر بناتے ہیں۔
بعض کو ڈرائنگ روم تک جگہ ملتی ہے، بعض کو دروازے تک، کسی سے بہت قریبی تعلق ہو تو اسے گھر کے کمرے تک بھی لے جاتے ہیں۔ یعنی ہر تعلق کا ایک مقام ہوتا ہے۔ لوگ آپ کو جہاں تک رسائی دیں، اس سے آگے جانے کی تمنا یا توقع بھی مت رکھنا۔ تعلق کا گھر اسی طرح مضبوط بنتا ہے اگر آپ کسی کی قائم کردہ حد سے آگے بڑھنے کی کوشش کریں گے تو وہ شخص آپ کو اپنے گھر سے نکال بھی سکتا ہے۔ اس لیے چاہے میرے بیٹے ہوں یا بیٹیاں! میں چاہتی ہوں کہ تم سب اپنی اپنی زندگیوں میں تعلق کا گھر بنانا ضرور سیکھو۔"
بے بے مٹی کے گھر کو محبت سے دیکھتے ہوئے آخر میں ہم سب کو نصیحت کرتی تھیں۔ پہلے پہل ہمیں یہ باتیں نہیں سمجھ میں آتیں مگر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بے بے کا بنایا مٹی کا گھر ہمیں ہر قدم پر یاد آیا۔ بے بے کے مٹی کے بنائے گھر سے ہم نے اصل زندگی میں سیکھا کہ تعلق کے گھر کیسے بناتے ہیں کیسے لوگوں کی دی گنجائش فاصلے کا احساس کرتی ہے۔"
وقار نے بات ختم کی تو وہ سب حقیقت کی دنیا میں لوٹ آئیں۔
"بابا آپ چاہتے ہیں کہ ہم بھی تعلق کا گھر بنانا سیکھیں؟" ہما نے سنجیدگی سے سوال کیا تو وقار نے اثبات میں سر ہلایا۔
"ہاں! لوگوں سے بدگمان ہونے یا غلط امیدیں وابستہ کرنے کے بجائے یہ ضروری ہے کہ ہم یہ ہنر سیکھ لیں۔"
وقار نے نرمی سے کہا۔
"تو ٹھیک ہے۔ آج سے پریکٹس شروع کرتے ہیں۔" ہما نے پرجوش انداز میں کہا تو وقار ہنس پڑے۔
"سب سے پہلے تو میں سیکھوں گی۔" ریحانہ نے نم آنکھوں کے ساتھ کہا اور موبائل آف کر کے ایک طرف رکھا اور نیچے زمین پر ان کے پاس بیٹھ گئی۔
"ایک ماں ہونے کے ناتے مجھ پر زیادہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ میں اپنی بچیوں کو تعلق کا گھر بنانا سکھاؤں۔ انھیں یہ بتاؤں کہ زندگی میں ملنے والا ہر شخص اپنے کمفرٹ زون کے مطابق ملتا ہے۔ تعلق بناتا ہے۔ اسے ویسے ہی قبول کرنا سیکھنا چاہیے۔ بانسبت لوگوں کے بارے میں منفی سوچ اور منفی رویہ رکھنے کے۔"
ریحانہ نے کہا تو وقار نے گہری سانس لے کر اپنی شریک حیات کی طرف دیکھا۔
ریحانہ دونوں بیٹیوں کے ساتھ باتیں کرتے ہوئے تعلق کا گھر گھر کھیل رہی تھی۔ وقار مطمئن انداز میں انہیں دیکھ رہے تھے۔ زندگی کی خوب صورتی منفی سے مثبت کی طرف آنے میں ہوتی ہے۔ نہ تو کوئی ہمیشہ منفی رہ سکتا ہے اور نہ کوئی ہمیشہ مثبت۔ اصل چیز کوشش ہے۔ اپنی طرف سے بہترین کوشش، اچھی نیت کے ساتھ کرنا۔
اور آج وقار نے اپنی بے بے کے پڑھائے ایک عام سے سبق کو دہراتے ہوئے یہ ہی کوشش کی تھی جو ان کے گھر والوں کو زندگی گزارنے کا بہتر راستہ دکھا سکتی تھی۔
☆

خواب دیکھتے ہوئے جنت کی آنکھ کھلتی ہے۔ اپنا حلیہ دیکھ کر اسے یاد آتا ہے کہ اس کی شادی ہوگئی ہے۔ فارس کہتا ہے کہ ان کی شادی کاغذی رشتہ ہے جو اس نے اپنی ماں کی خاطر بنایا ہے۔ جب تک ماں زندہ ہیں، یہ رشتہ رہے گا۔ نکاح رخصتی سادگی سے ہوئی ہے لیکن ولیمہ بہت دھوم دھام سے ہوا تھا۔ مسز شیرازی فارس کی والدہ اچھی عورت ہیں۔ سائرہ خالہ اس کی شادی فارس سے کروائی ہیں۔ ان کا بیٹا عمار اس شادی پر ناراض ہے۔

مسز شیرازی چلنے پھرنے سے معذور ہیں، وہ آرٹسٹ ہیں۔ ان کی پینٹنگ عسر یسرا پر دونوں بات چیت کرتی ہیں مسز شیرازی اسے ان الفاظ کے معنی تلاش کرنے کو کہتی ہیں۔

آئمہ فارس کی منہ بولی بہن اس کو ایک پارٹی میں لے جاتی ہے جہاں سب اس کا مذاق اڑاتی ہیں۔

فارس اس سے پوچھتا ہے کہ وہ اتنے جتن کس لیے کر رہی ہے۔

۲ دوسری قسط

"جن کی کشتیاں جلا دی جائیں انہیں زیادہ تحمل، زیادہ صبر کا مظاہرہ کرنا ہوتا ہے۔" مدھم سی سرسراہٹیں پیدا کرتی خنک ہوائیں اس کے وجود پر کپکپی سی طاری کر گئیں۔

فارس بہت آگے نکل چکا تھا۔ اس نے ایک بار بھی مڑ کر جنت کی طرف دیکھنے کی کوشش نہیں کی تھی۔

☆☆☆

مکمل ناول

جاگنگ کے بعد اس نے شاور لیا تھا اور کپڑے
بدل کر جب نیچے آیا تھا تو جنت کمال گلاس وال کے
اس پار اسے مالی سے الجھتی اور پھولوں کو توڑتی نظر
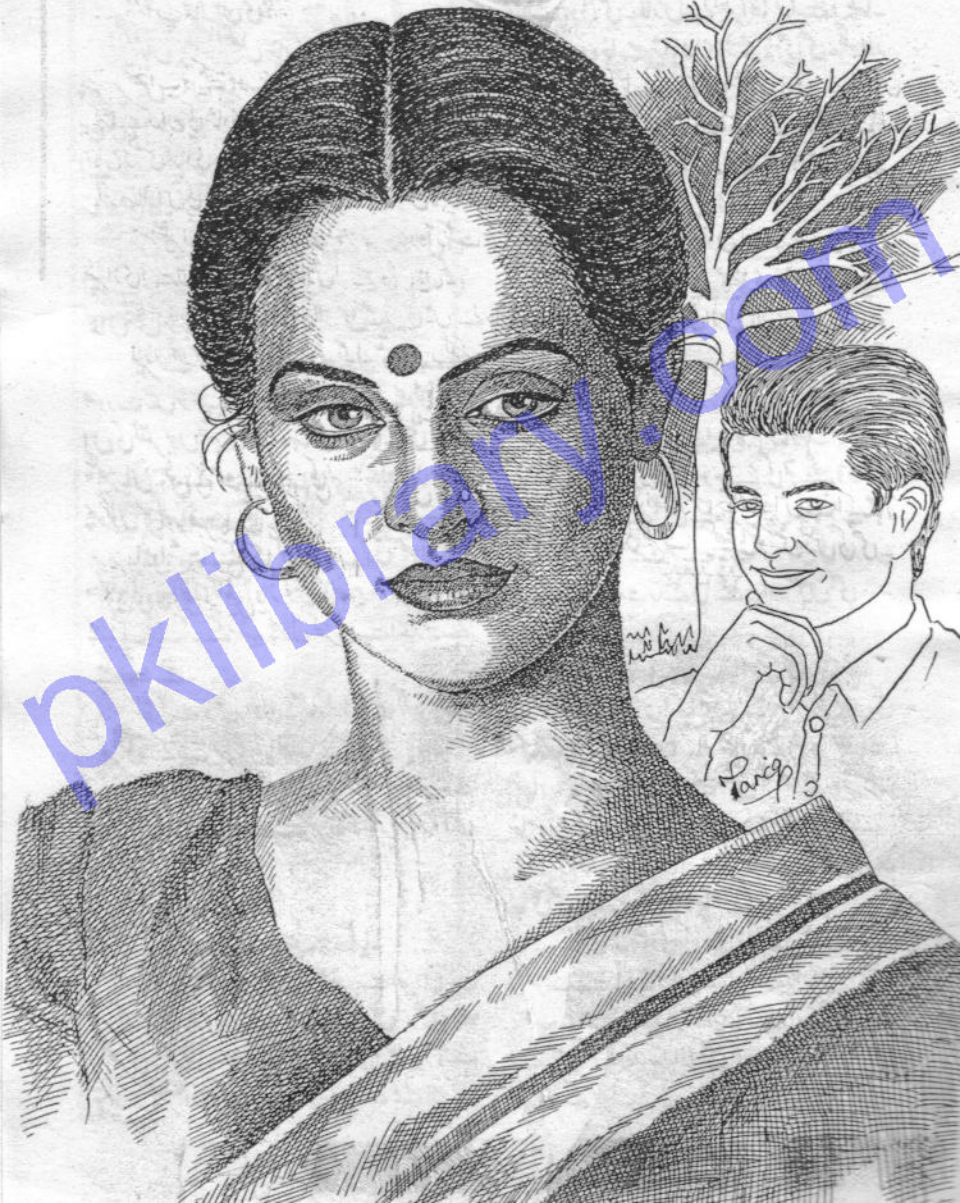
آئی تھی۔ اس کی آنکھوں میں ناگواری ابھر آئی۔ ایک معمول سا بنا لیا تھا اس لڑکی نے کہ ہر روز کمرے کو تازہ پھولوں سے معطر کرنا ہے۔

سر جھٹک کر رسٹ واچ پہنتے ہوئے وہ مسز شیرازی کے کمرے میں آ گیا تھا۔

"آپ تیار ہیں ممی؟"

"ہاں بیٹا۔" مکمل تیاری کے ساتھ وہ وہیل چیئر پر تھیں۔ بس ہیڈ اسکارف لے رہی تھیں۔ آج ان کی ڈاکٹر کے یہاں اپائنمنٹ تھی۔ ویکلی چیک اپ کے لیے جایا تھا انہیں۔ پٹھانی بھی ان کے ساتھ ہی جایا کرتی تھی۔

موبائل پر کسی کا نمبر ڈائل کرتے ہوئے اس کی نگاہ بے ساختہ ہی دیوار گیر کھڑکیوں کے سامنے رکھی گلاس ٹیبل پر جا پڑی۔ وہ ٹھٹک کر رک گیا۔

میز کے کناروں کے ساتھ گول دائرے کی صورت میں ترتیب سے رکھے گلاب کے پھولوں پر اس کی نظر یوں ٹھہری کہ وہ ہٹا ہی نہ سکا۔ مسلی ہوئی پنکھڑیاں۔ ٹوٹے ہوئے پتوں کی لہر...... اور سلامت پھولوں کا گھیراؤ......

یادداشت کے کسی کونے میں کوئی بھولا بسرا منظر تازہ ہوا تھا۔ کوئی آواز گونجی تھی۔ پردہ لہرایا تھا اور پھر ایک ایک کر کے سفید پھول کھڑکی سے اندر گرتے چلے گئے تھے۔

"گیٹ ویل سون۔" مارکرز سے لکھا پیغام کھڑکی کے شیشے پر ابھر آیا تھا۔

"فارس۔" مسز شیرازی کی آواز پر اس نے چونک کر اپنے خیالات سے سر نکالا پھر مڑ کر انہیں دیکھا۔

"آئم ریڈی بیٹا۔"

سر ہلا کر وہ ان کی جانب بڑھ گیا۔

مگر وہ پھولوں کی اس ترتیب سے، لہروں میں رکھے ان پتوں سے، اور وسط میں رکھی کچھ بکھری، کچھ ٹوٹی، اور کچھ مسلی ہوئی ان پنکھڑیوں سے پیچھا نہ چھڑا سکا جنہوں نے کچھ دیر کے لیے ہی سہی اسے ماضی کے حوالے کر دیا تھا۔

☆☆☆

"ہماری اس کاغذی شادی کو پورے دو ماہ ہونے کو ہیں۔" وہ بیڈ پر نیم دراز لیپ ٹاپ پر کام کر رہا تھا جب ہاتھوں پر لوشن لگاتے ہوئے وہ اس سے مخاطب ہوئی تھی۔ فارس نے نظر اٹھا کر اسے دیکھا۔ صوفے پر وہ خاصے شاہانہ انداز میں بیٹھی تھی۔ فکر اور اندیشوں سے پرے......

"کیا تمہارا نہیں خیال اب ہمیں دوستی کر لینی چاہیے؟" جاگنگ ٹریک پر ہونے والی گفتگو کے بعد اس نے اب خاموشی کا قفل توڑا تھا یعنی پورے پندرہ گھنٹوں کے بعد۔

"ٹھیک ہے مان لیا یہ کاغذی رشتہ ہے، ایک مخصوص مدت تک رہے گا، اس کے بعد سب ختم ہو جائے گا، لیکن اس مخصوص مدت تک کیا تم آنکھوں سے تیر، نیزے، تلواریں مارنا بند نہیں کر سکتے؟"

وہ اسے نظر انداز کیے اپنا کام کرتا رہا۔

"اگر ہماری دوستی ہو جائے گی تو مجھے ذرا ذرا سی فرمائش کے لیے آنٹی کے پاس نہیں جانا پڑے گا، یعنی کہ میں ڈائریکٹ تم سے بات کر سکوں گی اور اس طرح بہت سہولت رہے گی مجھے.. اور تمہیں بھی...... کیا خیال ہے؟"

وہ خاموش رہا۔ وہ اب خاموش ہی رہتا تھا۔

"ویسے فارس! کیا تم جانتے ہو ان لڑکیوں کی کہانیوں میں کیا ہوتا ہے جن کے شوہر حضرات تمہارے جیسا رویہ رکھتے ہیں؟" کچھ دیر تک خاموش رہ کر، کچھ سوچ کر اس نے استفسار کیا تھا۔

وہ نہیں جانتا تھا اور نہ ہی جاننا چاہتا تھا۔ جنت جانتی تھی اور اسے بھی بتانا چاہتی تھی۔

"یعنی کہ شادی کی پہلی رات نئی نویلی دلہن کو کمرے سے باہر نکال دینا۔ پھر اسے دھمکانا۔ اس پر رعب جمانا اور اپنے معاملات سے دور رہنے کی سختی سے تلقین کرنا اور یہ باور بھی کروانا کہ شادی سراسر مرضی کے خلاف کی گئی ہے یا پھر انتقام لینے کے لیے

شادی کرنا پڑی ہے۔ وغیرہ وغیرہ! پہلے مجھے لگتا تھا ایسا صرف کہانیوں میں ہوتا ہے۔ اب مجھے لگتا ہے حقیقی زندگی میں بھی ایسا ہو سکتا ہے۔" ایک لمحے کو رک کر اس نے کچھ سوچا، پھر اپنے ٹریک پر واپس آ گئی۔

"اس کے بعد ہوتا یہ ہے کہ بے چاری سی، معصوم سی روتی سسکتی ہیروئن اپنے سڑے ہوئے کھڑوس شوہر کی خدمت داریوں میں جُت جاتی ہے۔ وہ خود کو حالات کے حوالے کر کے اس کی سختیاں جھیلتی رہتی ہے یہاں تک کہ شوہر کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔"

فارس نے اسکرین سے نگاہیں ہٹا کر سوالیہ نگاہوں سے اسے دیکھا۔

اوہ شکر! وہ سن رہا ہے۔ لبوں پر ابھرتی مسکراہٹ کو جنت نے بمشکل روکا۔

"ہلکا پھلکا سا ایکسیڈنٹ ہوتا ہے فارس! کچھ زیادہ سیریس نہیں۔" انداز تسلی دینے والا تھا۔

"شوہر چند ایک ہڈیاں تڑوا کر بستر سے لگ جاتا ہے۔ اس کے دوست احباب، سوشل سڑی گرل فرینڈز وغیرہ وغیرہ۔ سب اسے چھوڑ دیتی ہیں مگر ظلموں کی ماری وہ دکھی، بے چاری اور معصوم سی ہیروئن اسے نہیں چھوڑتی۔ آخر وہ اس کا شوہر ہے بھئی کوئی مذاق تھوڑی ہے۔ حالانکہ ہیروئن کو چاہیے وہ اس بندے کی چند ہڈیاں مزید توڑ دے، کچھ اور نہ سہی ایک عدد تھپڑ ہی جڑ دے مگر نہیں۔ خیر، یہ ہمارا مسئلہ نہیں۔ اب ہماری ہیروئن کرتی یہ ہے کہ اس کی خدمت میں لگ جاتی ہے۔ اس کا خیال رکھتی ہے۔ اپنے ہاتھوں سے کھانا کھلاتی ہے۔ شوہر اس کا ظرف دیکھ کر شرمندہ ہو جاتا ہے۔ پچھتاووں میں گھر جاتا ہے۔ افسوس کرتا رہتا ہے کہ اتنی اچھی لڑکی کی وہ اتنا عرصہ بے قدری کرتا رہا...... اسے رلاتا رہا۔" اس نے رک کر فارس کو دیکھا۔ وہ اب اسے نہیں دیکھ رہا تھا۔ کی بورڈ پر اس کی انگلیاں تیزی سے متحرک تھیں۔

"پچھتاوا انسیت کو جگہ دیتا ہے۔ انسیت رحم

دل بناتی ہے۔ اور شاید رحم سے ہی محبت جنم لیتی ہے۔ پھر وہ اپنے رویے کی معافی مانگتا ہے۔ اور ہماری پیاری، دکھی، معصوم اور نرم دل، فرشتہ صفت ہیروئن اسے فوراً سے معاف کر دیتی ہے اور دونوں ہنسی خوشی رہنے لگتے ہیں......"

فارس نے لیپ ٹاپ زور سے بند کر دیا۔ اس کا غارت شدہ موڈ مزید غارت ہو چکا تھا۔ غالباً اسے ہپی اینڈنگ نہیں طلاق چاہیے تھی......

"اب مجھے سمجھ میں نہیں آ رہا کہ تمہارے دل اور ارادوں کو بدلنے کے لیے مجھے کیا کرنا چاہیے؟ ان ہیروئنز کی طرح تمہاری چند ایک ہڈیاں ٹوٹنے کا انتظار کرنا چاہیے یا پھر مجھے اپنی زندگی کی کہانی کو کسی اور رخ ڈال دینا چاہیے؟ کیونکہ یہ تو کنفرم ہے خدمت داریوں سے تمہارا دل پگھلنے والا نہیں......

سو۔" اس نے پرسوچ نگاہوں سے فارس کو دیکھا۔

"تم کیا مشورہ دو گے مجھے کیا کرنا چاہیے؟" خاصی سوچ بچار کے بعد اس نے پوچھا تھا۔

"زہر کھا کر مر جانا چاہیے۔"

"ہے نا! میں نے بھی یہی سوچا تھا کہ شاید اس طرح تمہارے ارادوں پر کوئی فرق آئے مگر اس طرح ہو گا یہ کہ تمہاری دلی مراد پوری ہو جائے گی اور میں خالی خولی قبر میں اُتر جاؤں گی۔ جبکہ مجھے اپنی لائف اسٹوری میں کچھ مختلف چاہیے۔ کچھ ایسا جس سے ہم دونوں کی خواہش پوری ہو جائے۔ یعنی تم مجھے چھوڑنا چاہتے ہو...... اور میں تمہارے ساتھ رہنا چاہتی ہوں! دونوں کی خواہش۔ ایک ہی وقت میں......ایک ساتھ پوری ہو جائے۔"

فارس نے اچنبھے سے اس لڑکی کو دیکھا۔ ہوش و حواس میں تو تھی وہ!؟ بھلا ایک ہی وقت میں دونوں کی متضاد خواہشات کیسے پوری ہو سکتی تھیں؟

"بتاؤ بھی۔"

"مر جاؤ۔" اس کی برداشت اب ختم ہو رہی تھی۔

"پھر بدروح بن کر تمہارے آگے پیچھے پھروں یہی؟" وہ پُرجوش سی ہوئی۔

"اب اگر دوبارہ تمہاری آواز آئی تو میں تمہیں کمرے سے نکال دوں گا۔" اسے وارننگ دے کر وہ لحاف تانے سونے کے لیے لیٹ گیا تھا۔

"جانور کے ساتھ بھی انسان کچھ وقت بتائے تو اس سے اُنسیت ہو جاتی ہے، میں تو پھر انسان ہوں، میرے ساتھ رہ کر تمہارا دل بھی نرم ہو جائے گا۔"

"بھول ہے تمہاری۔"

"بھول میری نہیں تمہاری ہے فارس وجدان۔"

اس نے اٹھ کر لائٹس آف کر دیں۔ مگر جب صوفے پر بیٹھی تو کسی خیال کے تحت اس کی آنکھیں چمک رہی تھیں۔ وہ آنے والے کل کو سوچ رہی تھی... اور کل اس نے کیا کرنا تھا وہ پروگرام ترتیب دے چکی تھی۔

☆☆☆

اگلے دن ٹھیک گیارہ بجے وہ شیرازی انٹرپرائزز میں اس کے آفس کے باہر کھڑی تھی۔ شاندار عمارت کی بارھویں منزل تک پہنچنے سے پہلے وہ مختلف فلورز پر، مختلف اسٹاف ممبرز سے اپنا تعارف کرواتی ہوئی آئی تھی۔

وہ جنت بنت کمال تھی۔ شیرازی انٹرپرائزز کے نوجوان چیئرمین اور سی ای او کی زوجہ محترمہ! جو بھی اس سے ملا۔ حیران ہو کر ملا۔ خاص کر خواتین اسٹاف تو کچھ زیادہ ہی صدمے میں تھیں۔

"آپ نے فارس کو بتایا تو نہیں کہ میں یہاں آئی ہوں۔" اس نے صدیقی صاحب سے کہا تھا۔

"نہیں فی الحال انہیں علم نہیں، اس وقت وہ میٹنگ میں مصروف ہیں۔" فنانس منیجر صدیقی صاحب اسے جانتے تھے، انہوں نے نکاح اور ولیمہ میں شرکت کی تھی۔ اس وقت بھی وہی اس کے ہمراہ تھے۔

"اچھی بات ہے، میں انہیں سرپرائز دینا چاہتی ہوں۔"

صدیقی صاحب بدقت مسکرائے۔ جانتے تھے ان کے باس کو سرپرائز کتنے برے لگتے تھے۔
چوتھے فلور پر وہ یونہی ٹہلنے لگی.... اس نے صدیقی صاحب سے بھی کہہ دیا کہ وہ فارس کے آفس تک خود ہی چلی جائے گی۔
دیوار گیر کھڑکیوں سے شہر کا خوبصورت نظارا کرتی وہ آگے بڑھتی گئی...... پندرہ بیس منٹ تک ٹہلتی رہی اور جب صدیقی صاحب کی طرف سے اسے میٹنگ ختم ہونے کا میسج ملا تو وہ چند لڑکیوں کے ساتھ لفٹ پر سوار ہوگئی۔
"سنا ہے فارس وجدان کی مسز آئی ہوئی ہیں۔"
"میں نے بھی یہی سنا ہے۔"
"کمپنی کی فی میل اسٹاف کے ساتھ ہمارے باس اتنے روڈ ہیں! خدا جانے بیوی کے ساتھ کیسا رویہ ہوگا۔"
"بیوی پر تو جان چھڑکتے ہوں گے۔" دوسری نے لقمہ دیا۔
ان کے عقب میں کھڑی جنت بے ساختہ ہنس دی۔ تینوں نے مڑ کر اسے دیکھا۔ غلطی کا احساس ہوتے ہی وہ مصروفیت بھرے انداز میں موبائل اسکرین پر جھک گئی۔
کچھ ہی دیر میں وہ بارہویں منزل پر وجدان فارس کے آفس کے سامنے کھڑی تھی۔ سیکرٹری نے فون پر اطلاع پہنچا دی تھی اور اس کی توقع کے برعکس اسے فوراً ہی طلب کرلیا گیا تھا۔
اجازت ملتے ہی وہ دروازہ کھول کر اس کے آفس میں داخل ہوئی اور حیران رہ گئی۔
سفید رنگ کی تھیم میں سجا اس کا آفس انتہائی شاندار تھا۔ مگر آفس سے بھی زیادہ شاندار تو اس کے شوہر کا غصہ تھا۔
شرٹس کی آستین کہنیوں تک موڑے، پیشانی پر ڈھیر سارے بل ڈالے وہ غصے میں تھا، آنکھوں میں سرخی تھی، جبڑے بھنچے ہوئے تھے۔ تاثرات پتھر کی طرح سخت پتھریلے سے۔
"تم کیا کر رہی ہو یہاں؟" سر پر پہنچ کر وہ دبی آواز میں دھاڑا تھا۔
"اپنے کاغذی شوہر کا آفس دیکھنے آئی تھی، اس میں کوئی گناہ ہے کیا۔" فارس کو جواب دے کر اس نے اشتیاق کے عالم میں چاروں اور نگاہ دوڑائی۔ فارس نے مٹھیاں بھینچ لیں۔
آفس ٹیبل پر دھرے کچھ ڈیکوریشن پیسز کو چھیڑتے ہوئے اس نے نیم پلیٹ کو بغور دیکھا۔ وال پر لگی سفید براق گھوڑے کی پینٹنگ کو سراہا۔ شیلف میں ترتیب سے رکھی فائلز کا جائزہ لیا۔ پھر آرام سے ٹانگ پر ٹانگ جمائے کاؤچ پر بیٹھ گئی۔
"کہتے ہیں سفید رنگ امن اور محبت کی علامت ہوتا ہے۔ تمہیں کیا لگتا ہے؟"
وہ سرد نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔
"اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ جو لوگ اس رنگ کو پسند کرتے ہیں ان کے مزاج میں دھیما پن ہوتا ہے، وہ صلح جو اور بردبار ہوتے ہیں۔ کیا ایسا ہی ہے؟"
"کیوں آئی ہو یہاں؟" فارس نے اس کے سوالات نظر انداز کردیئے۔
"چائے یا کافی کا نہیں پوچھو گے تم؟" جنت نے پلکیں جھپکائیں۔
"نہیں۔"
"حالانکہ آنٹی کہہ رہی تھیں تم خاصے مہمان نواز ہو۔"
"ابھی اور اسی وقت دفع ہوجاؤ یہاں سے۔"
"اب دفع تو میں تمہارے ساتھ ہی ہوسکتی ہوں، ڈرائیور مجھے ڈراپ کر کے جا چکا ہے، آنٹی سے میں کہہ آئی ہوں کہ تم نے ہی مجھے اپنے آفس کال کر کے بلایا ہے اور آج ہم دونوں کسی اچھے ریسٹورینٹ میں لنچ کریں گے۔"
فارس نے خود پر بمشکل ضبط کے پہرے بٹھائے تھے۔
"کتنی رقم چاہیے تمہیں؟" آفس کی کرسی پر بیٹھ کر اس نے بے حد تحمل سے پوچھا تھا۔

''کس لیے؟'' وہ حیران ہوئی تھی۔
''اس ڈراما کو ختم کرنے کے لیے۔''
''تمہیں لگ رہا ہے میں ایکٹنگ کر رہی ہوں؟'' جنت کو برا لگا۔
''تم یہ جو کچھ بھی کر رہی ہو اسے ختم کرنے کے لیے کیا لوگی؟''
''ایک کپ چائے۔ اٹالین ریسٹورینٹ میں تمہارے ساتھ لنچ۔''
فارس نے بمشکل خود پر قابو پایا۔
''ویسے تم نے ابھی تک کسی کو بتایا نہیں کہ تم میریڈ ہو؟ سب یوں حیران ہوتے ہیں جیسے کسی بھوت کو دیکھ لیا ہو۔''
فارس نے اپنی کرسی چھوڑ دی تھی۔ ''اٹھو اب۔''
''مگر میں نے تو ابھی چائے نہیں پی......'' وہ سختی سے بازو میں انگلیاں گاڑے، اسے کھینچ کر اٹھاتے ہوئے دروازے پر لے آیا۔
''ہاؤ روڈ۔'' جنت نے اپنا آپ چھڑا کر اسے تند ہی سے دیکھا۔
''میں بہت مصروف ہوں، تمہاری ان جھوٹ موٹ کی اداکاری اور دو نمبری فرمائشوں کی تکمیل کے لیے وقت نہیں ہے میرے پاس! ڈرائیور کو کال کرو اور یہاں سے چلتی بنو۔'' دبی آواز میں جھاڑ کر اس نے دروازہ کھول دیا۔ سیکرٹری نے بے اختیار سر اٹھایا تھا۔
''ڈارلنگ۔'' سیکرٹری کے سامنے جنت کا رویہ خاصا رومانٹک ہو گیا۔ ''میں یہیں بیٹھ کر آپ کا انتظار کروں گی، بھلے سے سارا دن بیٹھی رہوں، مجھے کوئی مسئلہ نہیں۔''
اور فارس کا بس نہیں چل رہا تھا وہ اس لڑکی کو شیرازی انٹرپرائزز کی بارھویں منزل سے نیچے پھینک دے۔
لب بھینچ کر اس نے آفس کا دروازہ بند کر دیا تھا...... کچھ زیادہ ہی قوت سے۔

''میں دیکھتی ہوں کب تک مجھے باہر بٹھاتا ہے۔'' سینے پر بازو باندھے وہ سیکرٹری کے آفس میں بیٹھ گئی تھی۔
اب سیکرٹری اور وہ...... دونوں ہی ایک دوسرے کا جائزہ لے رہی تھیں۔
اور تب ہی کال موصول ہوئی تھی۔ کچھ سن کر سیکرٹری نے فارس وجدان سے رابطہ کیا تھا۔
''سر شاہ گروپ کے لائیر برہان لغاری کی کال آئی ہے، ایک گھنٹے بعد آپ کی ان کے ساتھ میٹنگ ہے۔''
جنت کے چہرے کے تاثرات بدل گئے۔ اس کی سوچ، اس کے خیال جامد ہوئے۔ وہ یہاں کیوں کس لیے آئی ہے سب بھول بھال گئی۔
حلق میں ابھرتی گلٹی کو بمشکل نیچے اتارتے ہوئے اس نے گال پر پھسلتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑسا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں اس کا سکون درہم برہم ہوا تھا۔
''میم! آپ چائے لیں گی یا کافی؟'' سیکرٹری اب اس سے پوچھ رہی تھی۔ شدت سے دھڑکتے دل کے ساتھ اس نے اسے دیکھا اور اٹھ کھڑی ہوئی۔
''کچھ نہیں۔'' وہ جو شام تک فارس کے آفس میں بیٹھنے کے ارادے سے آئی تھی، بیگ کی اسٹرپس پر ہاتھ جمائے اسی وقت وہاں سے چلی گئی تھی۔

☆☆☆

وہ نام جسے وہ لبوں پر لانے سے گھبراتی تھی، جب سماعت میں پڑا تھا تو کتنی وحشت ہوئی تھی اسے...... اور یہی وحشت آج پھر اس کی نیند حرام کرنے میں کامیاب ہو گئی تھی۔ اول تو اسے نیند آ ہی نہیں رہی تھی اور جب آئی تھی تو حقیقت نے خواب کا روپ دھار کر اسے فوراً سے جگا دیا تھا۔
پسینے سے شرابور وجود کے ساتھ وہ سر تھامے کتنی ہی دیر تک بیٹھی رہی تھی۔
ایسا نہیں تھا کہ وہ خوابوں سے پیچھا چھڑانے میں کامیاب ہو گئی تھی مگر جب سے اس نے فارس

کے معاملات میں دلچسپی لینا شروع کی تھی۔ تب سے خواب کسی حد تک کم ہو گئے تھے۔
مگر آج پھر۔
ہتھیلی کی پشت سے آنسو صاف کرتے ہوئے اس نے۔ بے ساختہ سر اٹھا کر فارس کو دیکھا تھا۔ صد شکر کہ وہ گہری نیند میں تھا۔ صد شکر کہ وہ اس کی وجہ سے بے آرام نہیں ہوا تھا۔
گہری سانس لے کر، خود کو کمپوز کر کے وہ نیچے آ گئی تھی۔
پورے گھر میں خاموشی کا راج تھا۔ لائٹس آن کر کے وہ نماز والے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔ زرکار روشنیوں میں کمرہ خاموشی میں ڈوبا تھا۔ آواز اس کے پھولی سانس کی تھی یا اس دھڑکن کی جو اسے کان میں گونجتی ہوئی محسوس ہو رہی تھی۔
دن بھر خود کو مضبوط ظاہر کر کے...... تنہائی میں وہ ہر نقاب چہرے سے اتار دیا کرتی تھی۔
جو وقت اس آیت کے ساتھ گزرتا تھا، وہ حقیقتاً اسے اندر اور باہر سے ایک ہی کر دیتا تھا۔
وہ اب ذہن کو ماضی سے بھٹکانے کے لیے...... اپنا فوکس اس آیت پر جما رہی تھی اور غور کر رہی تھی ان سوالوں پر جو اس کے اندر سر اٹھا رہے تھے۔
پچھلے ایک ماہ سے اس کی یہی روٹین تھی......
پچھلے ایک ماہ سے وہ اپنے اندر بڑھتے ہوئے اس شور سے پیچھا چھڑانے کے لیے یہی کر رہی تھی۔ پہلے وہ نصیب، قسمت، زندگی، مصائب، آزمائش اور محرومیوں کی بھول بھلیوں میں گم رہا کرتی تھی۔
اب سکون کی تلاش میں، وہ خود کو ان نشانیوں کے سپرد کرنے لگی تھی جو کچھ دیر کے لیے ہی سہی...... اسے دکھ و آلام کا دوسرا رخ دکھانے لگتے تھے۔
وہ راز جو حروف میں چھپا تھا۔ وہ ابھی اس پر عیاں نہیں ہوا تھا۔ وہ معانی جو سمندر کی طرح گہرے تھے۔ ان میں وہ غرق نہ ہوئی تھی۔

سب کچھ مبہم تھا...... غیر واضح...... چھپا ہوا......
مگر اس رات ایک سوال اس پر عیاں ہوا تھا۔
بغیر جواب کے بھی وہ دن کے اجالے کی طرح یوں واضح ہوا تھا کہ کتنی ہی دیر تک وہ اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔
''سوال تمہیں اس آیت تک لائے گا جنت! سوال ہی تمہیں اس کے معانی سمجھائے گا۔''
الف پر نظر جمائے وہ اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔
''آزمائش کی وادیوں میں بھٹکتے ہر انسان کو اس آیت پر غور کرنا چاہیے، ہر مریض کو، ہر سقیم کو، ہر علیل کو، ہر اثیم کو۔''
مسز شیرازی کی آواز جیسے پلٹ پلٹ کر آنے لگی۔
''اس آیت کا صرف وہ مطلب نہیں ہے جو ہم اکثر پڑھتے یا سمجھتے ہیں، اس کا ایک اور مطلب اس کے حروف میں کہیں چھپا ہے۔''
اور وہ حروف پر نظر جمائے کھڑی رہ گئی تھی۔
☆☆☆
''بے شک ہر مشکل کے ساتھ آسانی ہے۔''
کمرے کی دیوار گیر کھڑکیوں پر سے پردے ہٹا کر اس نے مسز شیرازی کو دیکھا جو سامنے ہی وہیل چیئر پر براجمان کوئی کتاب ہاتھ میں لیے بیٹھی تھیں۔ سر اٹھائے اب وہ جنت کو دیکھنے لگیں جو سنگل صوفہ پر ان کے سامنے بیٹھ گئی تھی۔
''میں نے کل بہت سوچا اس بارے میں......''
وہ کپ میں چائے انڈیلنے لگی۔ ''اور کل رات ہی میرے ذہن میں خیال آیا حالانکہ میں نے اس آیت کو بارہا سنا ہے۔ بارہا پڑھا ہے اور اس کے ذریعے اپنے ناتواں دل کو بارہا تسلی بھی دی ہے۔ مگر میں کل پہلی بار اس پر حیران ہوئی ہوں۔'' اس نے چائے کا کپ مسز شیرازی کو پیش کیا تھا۔ وہ بہت توجہ اور یکسوئی سے سنتے ہوئے اس کی آنکھوں میں دیکھ رہی تھیں۔ جنت کہاں تک پہنچ گئی ہے۔ شاید وہ بھی جاننا

چاہتی تھیں۔
"آیت میں مشکل کے لیے لفظ "عسر" استعمال ہوا ہے۔ جس کا مطلب ہے ایک مشکل...... اس حساب سے دیکھا جائے تو آسانی کے لیے بھی یہاں لفظ "یسر" استعمال ہونا چاہیے تھا۔ مگر اللہ نے لفظ "یسرا" استعمال کیا ہے! الف کے ساتھ!" اب وہ اپنے کپ میں چائے نکال رہی تھی۔ "پہلے مجھے لگا کہ شاید یسرا یسر کی ہی جمع ہوگا۔ مگر جب میں نے اس کے جمع مفردات وغیرہ دیکھے تو معلوم ہوا یہ وہ بھی نہیں ہے۔ یسر...... ایک آسانی...... یسرین...... دو آسانیاں۔ ایسار دو سے زائد آسانیاں۔ تو پھر یسرا کیا ہے؟" اس نے سر اٹھا کر مسز شیرازی کو دیکھا۔ "یہ میرا پہلا سوال ہے۔ اگلی بار میں اس سوال کا جواب دوں گی آپ کو۔"
اب کے وہ بھی مسکرائی۔ مسز شیرازی نے محبت سے اس کے گال پر ہاتھ رکھا۔
"مجھے لگا شاید تم کافی وقت لوگی۔"
"مجھے بھی یہی لگا تھا۔ مگر کل رات جب میں بار بار اسے پڑھ رہی تھی۔ بار بار اسے کھوج رہی تھی تو اس وقت مجھے احساس ہوا آیات کے مفہوم بھی جیسے پرتوں میں چھپے ہوتے ہیں۔ گہرا مطلب سمجھنے کے لیے گہرائی میں اترنا پڑتا ہے۔ آپ نے ٹھیک کہا تھا۔ تدبر پانے کے لیے آیات کو ان کا وقت دینا پڑتا ہے۔"
"مجھے یقین ہے تم اس کا جواب بھی پالوگی۔"
"ہاں میں ایسا ضرور کرلوں گی، مگر آپ سے ایک شرط پر ہی شیئر کروں گی۔"
"اور وہ شرط کیا ہے؟" انہوں نے دلچسپی سے پوچھا۔
کچھ سوچ کر، اس نے مسز شیرازی کی طرف دیکھا۔ نچلا لب دانتوں تلے رگڑتے ہوئے، گہرا سانس لے کر خود کو جیسے آنے والے لمحے کے لیے تیار کیا۔ کچھ ہمت مجتمع کی۔
"میں آپ کے پوتے سے ملنا چاہتی ہوں۔"
اس نے اتنا اچانک کہا کہ مسز شیرازی اپنی جگہ ساکت بیٹھی رہ گئیں۔ انہوں نے جنت کو بے یقینی سے دیکھا۔
"میں نے غلطی سے آپ کی اور فارس کی گفتگو سن لی تھی۔" جھکی نگاہوں سے اس نے اپنے جرم کا اعتراف کیا۔
"میں منتظر رہی کہ شاید آپ خود اس سلسلے میں مجھ سے بات کریں گی مگر......"
مسز شیرازی خاموش ہوگئیں۔
"میں آپ کے پوتے سے ملنا چاہتی ہوں آنٹی، میں آپ کے لیے......" انہوں نے سر اٹھا کر جن نگاہوں سے جنت کو دیکھا وہ چپ ہوگئی۔ کتنا درد تھا ان آنکھوں میں۔
"فارس کو برا لگے گا، وہ تم سے ناراض ہوجائے گا۔" اور جنت انہیں بتا نہ سکی کہ فارس تو روزِ اول سے خفا ہے۔
"میں اسے خبر نہیں ہونے دوں گی۔" اس نے یقین دہانی کرائی۔
"اسے پھر بھی خبر ہوجائے گی! وہ یہ بات برداشت نہیں کرپائے گا کہ اس کی بیوی حماد کے بیٹے سے ملے۔"
"ایسا کچھ نہیں ہوگا آپ فکر نہ کریں، میں سب سنبھال لوں گی، آپ مجھے ایڈریس بتائیں میں خود......"
"نہیں...... جنت میرے بچے...... نہیں۔" انہوں نے اسے ٹوک دیا۔ "جانے دو اسے۔" وہ جیسے اس ٹاپک پر مزید کوئی بات نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ کوئی وضاحت نہیں دینا چاہتی تھیں۔ کچھ بتانا بھی نہیں چاہتی تھیں۔
ایک حکایت ان کی بھی تو تھی۔ فارس کی بھی۔ اس کے بھائی... اور بچے کی بھی......
"آنٹی۔"
"فارس کو بہت برا لگے گا۔ تمہیں اپنے شوہر کے احساسات کا خیال ہونا چاہیے۔"
جنت انہیں ہمدردی سے دیکھ کر رہ گئی۔ آخر کوئی انسان اپنے یتیم بھتیجے کے لیے اتنا سنگدل کیسے ہوسکتا

ہے؟
''نہیں وہ سنگدل نہیں ہے...... اسے سنگدل مت کہو۔'' مسز شیرازی نے جیسے اس کی سوچ پڑھ لی تھی۔ جنت حیرت سے انہیں دیکھ کر رہ گئی۔
''بہت حساس تھا وہ...... جب پتھر ہوا تو پوری طرح سے ہوا۔ بے حس ہوا تو ہر کسی کے لیے ہوا۔ اسے الزام مت دو جنت! میں بھی نہیں دیتی۔''
انہوں نے چہرے کا رخ موڑ لیا تھا۔ جنت اپنی جگہ سُن بیٹھی رہ گئی تھی۔

☆☆☆

''میں بلی پالنے کا سوچ رہی ہوں۔''
کف لنکس اتار کر ڈریسنگ ٹیبل پر رکھتے ہوئے فارس وجدان نے اسے سرد نظروں سے دیکھا۔ وہ ابھی ابھی ضروری میٹنگ اٹینڈ کر کے گھر لوٹا تھا۔ اور ہمیشہ کی طرح جنت کمال اس کے سر پر سوار ہو چکی تھی۔
''کوئی ضرورت نہیں۔'' جنت نے دیکھا۔ اس کی نم آنکھیں بے تحاشا سرخ ہو رہی تھیں۔
''تمہاری ضرورت کی نہیں اپنی ضرورت کی بات کر رہی ہوں۔''
''اس گھر میں کوئی جانور نہیں آ سکتا۔'' فارس کا لہجہ حتمی تھا۔ انکار پتھر پر لکیر جیسا۔
روز ہی وہ کوئی نہ کوئی فرمائش کرتی تھی۔ روز ہی وہ بے رحمی سے رد کر دیتا تھا۔
''کیوں نہیں آ سکتا؟'' وہ بحث کے موڈ میں آ گئی۔
''کیونکہ میں نہیں چاہتا۔''
''اور تم کیوں نہیں چاہتے؟''
''میں جواب دینے کا پابند نہیں۔''
''میں جواب دینے کا پابند نہیں۔'' جنت نے ہو بہو اس کے انداز میں نقل اتاری۔ فارس وجدان نے رک کر اسے کڑے تیوروں سے گھورا۔ یہ لڑکی اب اپنی حد سے بڑھ رہی تھی۔
''ساری پابندیاں تو صرف میرے لیے ہی ہیں نا۔'' رک کر اس نے تاسف سے سر ہلایا۔ ''مجھے لگتا تھا تم میرے لیے ہی بے رحم ہو، یہاں تو بے چارے جانور بھی تمہاری نفرت سے محفوظ نہیں ہیں۔''
وہ ضبط کیے خاموش رہا۔ جنت کو یہ خاموشی نہیں چاہیے تھی۔
''تو اب میں یہ سمجھوں کہ تم بھی ان دس پرسنٹ لوگوں میں شامل ہو جنہیں بلیاں اچھی نہیں لگتیں؟'' اس نے بات بڑھائی۔
''ہاں! ہوں! کوئی اعتراض؟'' وہ جھنجھلاہٹ کا شکار ہوا تھا۔
''بخدا کوئی اللہ کی اتنی پیاری تخلیق کو ناپسند کیسے کر سکتا ہے؟ یقیناً تم نے بلیوں کو ہاتھ بھی نہیں لگایا ہوگا، انہیں قریب سے دیکھا بھی نہیں ہوگا؟'' وہ وارڈ روب سے کپڑے نکالے واش روم میں گھس گیا تھا۔ جنت دروازے کے پاس آ کر کھڑی ہو گئی تھی۔ ''تم بلیوں کے ساتھ تھوڑا سا وقت گزار کر تو دیکھو، بہت اچھا محسوس کرو گے۔''
اندر شرٹ اتارتے ہوئے فارس وجدان زیر لب بڑبڑایا۔ ''ہاں! بہت اچھا محسوس کروں گا۔'' انداز میں جھلاہٹ نمایاں تھی۔
''میں جانتی ہوں تمہیں میرے احساسات کی کوئی قدر نہیں۔ لیکن بلی والی بات پر مجھے تمہارا اعتراض کچھ ٹھیک نہیں لگ رہا! ٹھیک ہے یہ گھر تمہارا ہے۔ لیکن میں بھی تو تمہاری بیوی ہی ہوں۔ کاغذی ہی سہی۔ اتنا تو حق رکھتی ہی ہوں کہ......'' وہ رک گئی۔ ''تم سن بھی رہے ہو میں کیا کہہ رہی ہوں۔''
دروازہ کھل گیا تھا۔
سیاہ جینز پر سیاہ شرٹ میں ملبوس وہ باہر آ گیا۔ وارڈ روب کھولے اس نے سفید رنگ کا جمپر نکالا۔
''میں کہہ رہی ہوں کہ ایک چھوٹی سی بلی۔''
''یہ کیا بلی بلی لگا رکھی ہے تم نے، جب منع کر دیا ہے کہ نہیں آ سکتی تو نہیں آ سکتی! اور یہ تمہارا گھر نہیں ہے جہاں تم اپنی مرضی چلا سکو۔'' بگڑے تیوروں کے ساتھ اسے ڈانٹ کر وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔ جنت ضبط کیے کھڑی رہ گئی۔ پھر دماغ نے ٹہوکا دیا تو

تن فن کرتی اس کے پیچھے باہر آگئی۔
"جب میں تمہاری بیوی ہوں ہی نہیں تو یہ شوہروں والا رعب کیوں دکھاتے ہو مجھے؟"
سیڑھیاں اترتے فارس وجدان کے قدموں کی حرکت تھمی۔ رک کر، سر اٹھا کر اس نے غصیلی نظروں سے جنت کمال کو دیکھا۔
"میرا مطلب ہے۔" اس کے کڑے تیوروں سے کچھ خائف ہو کر اس نے فوراً بات سنبھالی۔ "مہمان ہوں میں چند دنوں کی۔ اس وجہ سے ہی لحاظ کر لیا کرو۔" لہجے میں مٹھاس بھر کر، اس نے پلکیں جھپکائیں۔ "میرے نانا کے گھر میرے پاس تین بلیاں تھیں۔ بہت وقت گزارا ہے میں نے ان کے ساتھ۔ یقین کرو شور نہیں کرتی ہیں، گند بھی نہیں مچاتیں۔ پیار دیتی بھی ہیں۔ لیتی بھی ہیں۔ بہت اچھا وقت گزرتا ہے ان کے ساتھ۔"
"تم بلیوں کے ساتھ وقت گزارتی ہو؟" فارس کی آواز میں اب کے ہلکا سا صدمہ تھا۔
"نہیں گزارا تو نہیں ہے۔" اس نے صفائی سے جھوٹ بولا۔ "لیکن گزارنا چاہتی ہوں۔ مسز یزدانی کی پرشین کیٹ کے چھوٹے چھوٹے بلونگڑے......"
"بس۔" فارس نے ہاتھ اٹھا کر اسے روک دیا۔ "آج کے بعد تم مسز یزدانی کے گھر نہیں جاؤ گی۔"
جنت کا منہ صدمے سے کھلا۔ "مگر کیوں۔" وہ احتجاجاً چلائی۔
"میں نے کہا نہیں جاؤ گی تو بس نہیں جاؤ گی۔" اس کا لہجہ کافی سے زیادہ سخت ہوا تھا۔
"تم تو ایسے ری ایکٹ کر رہے ہو جیسے میں بلی تمہارے سر پر لا بٹھاؤں گی۔ اتنا بڑا گھر ہے تمہارا۔ اور دل۔ بخدا تمہارا دل چیونٹی جتنا بھی نہیں ہے۔"
"میں بتا رہا ہوں اگر تم نے گھر میں pet لانے کی کوشش کی تو مجھ سے برا کوئی نہیں ہوگا۔"
"تم سے برا ویسے کوئی ہو بھی نہیں سکتا۔" اس کے منہ سے نکل گیا۔
قدم اٹھاتے فارس وجدان نے لب بھینچ کر اسے دیکھا۔ وہ ریلنگ پر جھکی ہوئی تھی۔ "میں بلی کا نام فریسہ رکھوں گی۔ فارس کی مؤنث فریسہ ہوئی نا۔ یا فارسہ؟" اس کی آنکھوں میں شرارت تھی، لبوں پر مسکراہٹ۔ گویا عزائم واضح تھے، وہ فارس کے حکم کو کسی خاطر میں نہیں لا رہی تھی۔
وہ رک گیا۔ گہری سانس لے کر جیسے اپنے مشتعل اعصاب پر قابو پانے کی کوشش کی۔ جنت تیزی سے سیڑھیاں اتر کر اس کے پاس آگئی۔
"میں جان گئی ہوں تم ایسے نہیں مانو گے۔ اب میں آنٹی سے ہی بات کروں گی۔" اترا کر کہتے ہوئے وہ سیڑھیاں اترنے ہی لگی تھی کہ فارس نے اسے بازو سے پکڑ کر ایک جھٹکے سے روکا۔ اس کا پورا وجود ہل کر رہ گیا۔
"کیا چاہتی ہو تم؟" دانت پیس کر خطرناک تیوروں کے ساتھ، ذرا سا اس کی طرف جھکا۔ "بلی کے علاوہ۔"
جنت کے لبوں پر فاتحانہ مسکراہٹ بکھر گئی۔
"مم......" اس نے خلا میں یوں نگاہ دوڑائی جیسے کچھ سوچ رہی ہو۔ "مجھے کیا چاہیے؟ مجھے کیا چاہیے؟" شہادت کی انگلی ٹھوڑی پر متحرک تھی۔ "اوہ ہاں۔ میں چاہتی ہوں آج تم مجھے ڈنر پر لے جاؤ۔ خود سے لے جاؤ! مجھے آنٹی سے نہ کہنا پڑے۔"
چند لمحوں تک اسے گھورتے رہنے کے بعد وہ اسے جھٹکے سے چھوڑ کر سیڑھیاں اتر گیا۔
"تو کیا میں اسے ہاں سمجھوں؟" وہ عقب میں چلائی۔ "آج کی رات! میں نو بجے تیار رہوں گی فارس۔"
اور فارس عجلت میں قدم اٹھاتا صدر دروازہ عبور کر گیا تھا۔

☆☆☆

سیاہ رنگ کا ہلکے کام والا فراک اس پر کافی جچ رہا تھا۔ شہد بالوں کو جوڑے کی شکل دیئے، لائٹ سا میک اپ کیے، وہ خوشگوار تاثرات کے ساتھ فارس وجدان کے سامنے اٹالین ریسٹورینٹ میں موجود

تھی۔ کھانا سرو کیا جا چکا تھا۔
بلیک ٹو پیس سوٹ میں ملبوس وہ پتھریلے تاثرات کے ساتھ ہمیشہ کی طرح خاموش بیٹھا تھا۔ جنت کھانا مزے لے لے کر کھا بھی رہی تھی اور باتیں بھی کر رہی تھی۔
''آنٹی نے ہنی مون کی بات کی تھی، تم نے کہا تھا تم سوچو گے، کچھ پلان کرو گے، اب جب تک میں یہاں ہوں تب تک کچھ پلان کر دو یار! تھوڑا میں بھی انجوائے کرلوں گی، آؤٹنگ ہو جائے گی میری بھی۔''
فارس کا سر دکھنے لگا۔ کوئی آدھے گھنٹے سے وہ اس کی باتیں سن رہا تھا۔ مجال ہے جو وہ ایک لمحے کے لیے بھی خاموش ہوئی ہو۔
کچھ سوچ کر جنت نے بیگ سے موبائل نکال کر، فارس کے سامنے اسکرین لہرائی۔ ''گیس کرو میں نے تمہارا کانٹیکٹ نمبر کس نام سے سیو کیا ہے؟''
بند مٹھی پر ٹھوڑی جمائے وہ سرد نظروں سے اسے دیکھتا رہا۔ دوسرے ہاتھ کی انگلیاں میز پر متحرک تھیں۔ گویا وہ منتظر تھا کہ کب محترمہ کھانا ختم کریں اور وہ واپسی کی راہ لے۔
''تم نے غلط گیس کیا۔'' خود ہی جواب دے کر جنت نے اسکرین پر کانٹیکٹ لسٹ کھول کر سامنے کی۔
بے شمار نیلے پیلے دلوں کے درمیان لکھا تھا۔
''مائی کاغذی ہزبینڈ۔''
وہ ہنس دی۔ فارس لب بھینچ کر رہ گیا۔
''تم نے کس نام سے سیو کیا ہے میرا نمبر؟''
اب وہ اس سے پوچھ رہی تھی۔
''میں فضول لوگوں کے نمبر سیو نہیں کرتا۔'' وہ سیدھا ہو بیٹھا۔
''میں تو کرتی ہوں۔''
جبڑے بھینچے وہ کھڑکی سے باہر دیکھنے لگا۔ آسمان پر بادل پھیل رہے تھے۔
''ہر جگہ سے مجھے بلاک کیا ہوا ہے تم نے، فائدہ نمبر دینے کا؟''
نیپکن سے ہاتھ صاف کرتے ہوئے وہ بس چند لمحوں کے لیے خاموش ہوئی تھی، پھر بولی۔
''دوستی کرو گے مجھ سے؟ بہت اچھی لڑکی ہوں میں، آخری دم تک ساتھ نبھاؤں گی۔''
فارس نے ایک لمحے کے لیے اسے دیکھا پھر میز پر کہنیاں جماتے ہوئے آگے ہوا۔
''اور یہ دوستی کی آفر تم کتنے لوگوں کو کر چکی ہو؟''
جنت کے لبوں سے مسکراہٹ اڑنچھو ہو گئی۔
''ایسے ہی خیال آیا تو سوچا پوچھ لوں۔'' اس کی کیفیت سے محظوظ ہوتے ہوئے اس نے اپنی بات جاری رکھی۔ ''کہیں تمہارے ایکس ہزبینڈ نے اسی وجہ سے تو تمہیں ڈیورس نہیں دے دی؟''
''تم اب اپنی حد کراس کر رہے ہو فارس۔''
جنت کا چہرہ جذبات کی شدت سے سرخ ہو چکا تھا۔
''حد کراس نہیں کر رہا، تمہیں حد میں لانے کی کوشش کر رہا ہوں۔'' کاٹ دار لہجے میں کہتے ہوئے اس نے جنت کی طرف دیکھا۔
''طلاق اس نے دی تھی یا تم نے لی تھی؟''
جنت کو یوں محسوس ہوا جیسے اس کی گردن پر پاؤں رکھ کر مسلا جا رہا ہو۔ فارس کا ہر سوال ایسا ہی تھا۔ اذیت کی دو دھاری تلوار کی طرح.......
''تمہاری چھ بہنیں ہیں۔ ان میں سے کوئی ایک بھی تمہاری شادی میں شریک نہیں ہوئی۔ جہاں تک مجھے علم ہے، خاصا بڑا خاندان ہے تمہارا... مگر کوئی ایک رشتہ دار بھی تمہاری شادی پر نہیں تھا ماسوائے سائرہ آنٹی کے۔''
مٹھیاں بھینچے، لب باہم پیوست کیے......وہ ضبط کے کڑے مراحل سے گزر رہی تھی۔ اتنے اچھے موڈ کے ساتھ اسے ڈنر پر لا کر وہ اس طرح کی باتیں کرے گا، اگر اسے علم ہوتا تو یقیناً وہ نہ آتی۔
''میرے کردار پر مت آؤ فارس! میں تمہیں وارن کر رہی ہوں۔'' اس نے اسے باز رکھنے کی کوشش کی تھی۔
''ورنہ کیا کرو گی؟'' لبوں پر استہزائیہ مسکان لیے اس نے بھنویں اچکا کر اسے للکارا۔

غصہ...... غم...... بے بسی...... جنت نے حلق میں ابھرتے آنسوؤں کے پھندے کو بمشکل نیچے اتارا۔ باہر ہلکی ہلکی بوندا باندی شروع ہو چکی تھی۔

''تمہاری معلومات نکلوانا میرے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے، لیکن میں تم میں اتنی سی بھی دلچسپی نہیں رکھتا کہ اپنے آدمیوں کو تمہارے حوالے سے آرڈر دیتا پھروں۔ لیکن جس روز ایسا کروں گا اس روز تم کسی کو منہ دکھانے کے قابل نہیں رہو گی۔ اس لیے آخری وارننگ دے رہا ہوں میں تمہیں! میرے گھر میں رہنا ہے تو اپنی حدود میں رہو! یہ آخری وارننگ ہے۔''

ویٹر کو بلا کر، پے منٹ ادا کر کے وہ جانے کے لیے اٹھ گیا تھا اور جنت کمال اپنی جگہ بیٹھی رہ گئی تھی۔

گال پر پھسلتی لٹ کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے اس نے آنسو پینے کی ناکام کوشش کی تھی۔ وہ فارس کے ساتھ آئی تھی مگر وہ فارس کے ساتھ واپس نہیں گئی تھی۔ وہ ریسٹورینٹ میں اپنی جگہ بالکل خاموش بیٹھی بار بار ٹشو سے آنکھیں پونچھ رہی تھی۔ پیشانی پر بکھرتے بالوں کو سمیٹ رہی تھی۔ خشک لبوں کو کاٹتی اور کھڑکی سے باہر شدت سے برستی بارش کو یوں دیکھ رہی تھی جیسے وہ یہاں آئی ہی اس لیے تھی...... تن تنہا...... اسی بارش کو انجوائے کرنے...... جو اس پر اب وحشت سی طاری کر رہی تھی۔

بالآخر اپنا ہینڈ بیگ کندھے پر ڈالتے ہوئے وہ ضبط کر کے اٹھ گئی تھی۔ سیڑھیاں اتر کر اس نے مین روڈ کی جانب قدم بڑھا دیے۔

پارکنگ ایریا کی طرف اس نے جانے کی کوئی کوشش نہیں کی تھی کہ وہ جانتی تھی فارس اب تک جا چکا ہو گا۔ اگر نہ بھی گیا ہوتا تو وہ تب بھی اس کے ساتھ جانے کے لیے فی الوقت آمادہ نہیں تھی۔

کوئی آپ کے مشکل سے ٹھیک ہوتے زخموں کو ایک ہی لمحے میں ادھیڑ کر رکھ دے تو آپ یہی کرتے ہیں۔ وہ بھی یہی کر رہی تھی۔

رونا بھی بہت آ رہا تھا اور وہ رونا بھی نہیں چاہتی تھی۔ گھر جانے کی بھی جلدی تھی اور گھر پہنچنا بھی نہ چاہتی تھی۔

وہ فٹ پاتھ پر قدم اٹھاتی آگے بڑھنے لگی۔ موبائل بیگ میں تھا۔ وہ ڈرائیور کو کال کر سکتی تھی۔ مگر ڈرائیور بھی تو فارس کا تھا۔

ہوا ذرا تیز ہوئی تو اس نے بھی رفتار بڑھا لی۔

''اللہ اس کی تمہیں وہ سزا دے گا جنت جو تم تاعمر یاد رکھو گی۔''

سڑک کنارے، اس کے قریب ہی فارس کی گاڑی رک گئی تھی۔ وہ جھکے سر کے ساتھ خاموشی سے قدم اٹھاتی رہی۔

بیچ راستے میں جب فارس نے اسے بازو سے پکڑ کر روکا تو اس نے درشتی سے اپنا آپ چھڑایا تھا۔

''آدھے گھنٹے سے گاڑی میں تمہارا انتظار کر رہا ہوں اور تم۔'' اس کا پارہ چڑھا ہوا تھا۔

غصہ، ناراضی، خفگی سب بھلا کر جنت صدمے سے فارس وجدان کو دیکھ کر رہ گئی۔

آدھے گھنٹے سے وہ اس کا ''انتظار'' کر رہا تھا۔ آدھے گھنٹے سے!!

یہ معجزہ کب، کیسے کیوں کر رونما ہوا؟

''میں نے سوچ لیا تھا کہ اب تم سے طلاق لے کر یہاں سے چلی جاؤں گی۔'' کھڑے کھڑے بڑے آرام سے اس نے ہاتھ کی پشت سے آنسو صاف کیے۔ ''لیکن اب ارادہ ملتوی کر دیا ہے۔ تم انتظار کر رہے تھے میرا۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے۔ صدیقی انکل نے کہا تھا تم انتظار کسی کا نہیں کرتے۔'' ایک استحقاق سے اس نے گاڑی کا دروازہ کھولا۔ ایک ادا سے بیٹھ بھی گئی۔

فارس کی ساری دھمکیاں دھری کی دھری رہ گئیں۔ وہ ہکا بکا اپنی جگہ کھڑا رہ گیا۔

''کیا ہوا؟ گھر نہیں جانا کیا؟'' اب کے گاڑی کا شیشہ نیچے کر کے جنت نے اپنا سر باہر نکالا۔

لب بھینچ کر اس نے جنت کو دیکھا۔

''تمہاری وجہ سے جتنے آنسو میرے ضائع ہوئے ہیں ان کے بدلے ایک آئس کریم تو لازمی بنتی

ہے۔'' وہ کہہ رہی تھی۔
خود پر ضبط کے پہرے بٹھاتے ہوئے وہ گاڑی میں بیٹھ گیا۔ دروازہ قدرے زور سے بند ہوا۔
اپنا بیگ کھنگالتے ہوئے جنت نے یک دم ہی زچ ہو کر اسے دیکھا۔
''بخش دو ان دروازوں کو! اللہ کے لیے۔''
''تم اپنا منہ بند رکھو۔''
''ہاں تو میں نے کچھ کہا؟ آنٹی ہی کہتی ہیں تم بے جان چیزوں کا بہت خیال رکھتے ہو۔ ایک خراش تک نہیں آنے دیتے اپنی گاڑی کو...... مگر یہ دروازہ کیا سوتیلا ہے؟''
وہ لب بھینچے گاڑی ڈرائیو کرنے لگا۔ جنت بھی خاموشی سے باہر دیکھتی رہی تھی۔
☆☆☆
صبح کے سات بجے اس کی آنکھ اپنے موبائل کی آواز پر کھلی تھی جو گلاس ٹیبل پر پڑا مسلسل بج رہا تھا۔ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے ایک طائرانہ نگاہ کمرے میں دوڑائی۔ فارس ابھی تک سو رہا تھا۔ غالباً آج اس کا آف تھا۔
اس نے نیم وا آنکھوں سے اسکرین پر جگمگ کرتے نمبر کو دیکھا۔ پھر کال ریسیو کر لی۔
''السلام علیکم جنت! کیسی ہو؟''
''وعلیکم السلام خالہ۔'' الجھے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر وہ اٹھ بیٹھی۔ آواز نیند سے بھاری تھی۔
''میں ٹھیک ہوں آپ کیسی ہیں۔'' صوفے کی پشت سے کمر ٹکا کر اس نے انگڑائی لی۔
''تمہاری آواز کو کیا ہوا ہے، طبیعت ٹھیک ہے تمہاری؟''
''طبیعت کو کچھ نہیں ہوا، ابھی سو کر اٹھی ہوں۔''
''میں ایسے ہی پریشان ہو گئی۔'' سائرہ خالہ کو تسلی سی ہوئی۔ ''گھر میں سب ٹھیک ہے نا؟ فارس کیسا ہے؟''
''اچھا ہے۔'' کن اکھیوں سے فارس کو دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ ''خیریت ہے خالہ اتنی صبح صبح کال کی آپ نے۔''
فارس نے تکیہ اپنے منہ پر رکھ لیا۔
وہ اٹھ کر بالکنی میں آ گئی۔
''اگلے ہفتے سدرہ کی شادی ہے جنت! کیا تم بھول گئیں؟'' انہوں نے یاد دلایا۔
جنت منجمد ہوئی۔ خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے اس نے حلق میں ابھرتی گلٹی کو بمشکل نیچے اتارا۔
''میرا خیال تھا تم ایک دو ہفتے پہلے ہی آ جاؤ گی مگر یہاں تو مجھے ہی تمہیں یاد دلانا پڑ رہا ہے۔''
''مجھے یاد تھا خالہ۔'' داہنا ہاتھ ریلنگ پر ٹھہر گیا۔ اس کے وہم و گمان میں بھی نہیں تھا خالہ اسے سدرہ کی شادی پر انوائٹ کریں گی۔ اور صرف انوائٹ ہی نہیں کریں گی، بلکہ یہ امید بھی رکھیں گی کہ وہ شرکت بھی کرے گی۔
''تو پھر کب آ رہی ہو تم؟''
جواباً وہ کچھ کہہ نہ سکی...... سائرہ خالہ کے بہت احسان تھے اس پر...... اور اب جب ان کی اکلوتی بیٹی کی خوشی کا موقع تھا تو......
''وہاں وہ سب بھی تو ہوں گے خالہ۔'' اس کا رخ اب گلاس ڈور کی طرف تھا۔ وہ اندر نہیں دیکھ سکتی تھی مگر اندر جو موجود تھا وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا۔
بے قراری سے نچلا لب دانتوں تلے دبائے، مضطرب نگاہوں سے یہاں وہاں دیکھتے، بائیں ہاتھ سے سویٹر کے بٹن کو چھیڑتے وہ اس لمحے بہت پریشان لگ رہی تھی۔
''بلاشبہ ہوں گے مگر اس سے تمہیں کیا لینا دینا؟ تم اپنے شوہر کے ساتھ اپنی کزن کی شادی اٹینڈ کرنے آ رہی ہو۔ اکیلی نہیں ہو کہ کوئی......''
کاش وہ سدرہ خالہ کو بتا سکتی کہ وہ اب بھی اکیلی ہی ہے...... وہ ان سب کا سامنا آج بھی نہیں کر سکتی۔
''میرے لیے...... یہ بہت مشکل ہے۔''
''تم آنا نہیں چاہتیں؟'' سدرہ خالہ کے لہجے میں اب خفگی تھی۔
''آنا چاہتی ہوں خالہ مگر...... آپ تو جانتی ہیں

سب......"اس نے مٹھیاں بھینچ کر جیسے اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کی تھی۔
"میری اکلوتی بیٹی کی شادی میں شرکت نہیں کرو گی تم۔" سائرہ خالہ مغموم ہو گئیں۔ "جنت وہ تمہاری شادی میں تمہارا سایہ بنی رہی، تمہارا ہر کام اس نے کیا، اور جب اس کی باری آئی ہے تو تم.... تم منہ موڑ رہی ہو؟"
جنت کی آنکھوں کی نمی کچھ اور گہری ہوئی...... اتنی گہری کہ ہر منظر دھندلا گیا۔
"میں...... میں آؤں گی...... میں فارس سے بات کر کے آپ کو بتاتی ہوں۔"
اس نے بات سمیٹنے کی کوشش کی۔
"ٹھیک ہے۔" چند لمحوں کی خاموشی کے بعد انہوں نے فون بند کر دیا۔
جنت کتنی ہی دیر تک وہاں کھڑی رہی۔ پلکیں جھپکا کر آنسوؤں کا ہر اثر مٹاتی جب کمرے میں داخل ہوئی تو فارس کو دیکھ کر رک گئی۔
ٹراؤزر کی جیبوں میں ہاتھ ڈالے، نیند سے بیداری کے مراحل طے کر چکی آنکھوں کے ساتھ وہ اسے ہی دیکھ رہا تھا مگر جس چیز نے جنت کو چونکایا تھا وہ اس کے لبوں پر داہنے گال کی جانب اٹھی ہوئی مسکراہٹ تھی۔
اور اس کی یہ مسکراہٹ جتنی بھی خوبصورت تھی، جنت کمال کو گھبراہٹ میں مبتلا کر گئی۔
ایک اچٹتی نگاہ اس پر ڈالے وہ کمرے سے نکل گیا تھا۔
اس کی طنزیہ نگاہیں...... اور مسکراہٹ کا کیا مطلب؟
طرح طرح کے سر اٹھاتے اندیشوں کو جھٹلاتے ہوئے وہ خالہ کے بارے میں سوچنے لگی۔
وہ شادی میں شریک بھی نہ ہونا چاہتی تھی اور خالہ کو ناراض بھی نہ کرنا چاہتی تھی۔ بے قراری سے انگلیاں مروڑتے ہوئے وہ ٹہلنے لگی۔ کیا کرے وہ اب؟

اس مسئلے کا ایک حل تھا مگر وہ حل فارس کو چیلنج کرنے کے مترادف تھا۔ گزشتہ شب ہونے والی تلخ کلامی کے بعد اس نے فیصلہ کیا تھا وہ اس کے معاملات میں مداخلت نہیں کرے گی مگر اب......
اس کی دھمکیاں اور چبھتے سوال وہ بھولی نہیں تھی مگر پھر......

☆☆☆

وہ پندرہ دنوں کے لیے کاروباری دورے پر لندن جا رہا تھا۔ کچھ ضروری میٹنگز اٹینڈ کرنی تھیں اور اپنی کمپنی کی لندن برانچ کے معاملات کو بھی دیکھنا تھا۔ ٹکٹ کنفرم ہوئی تو اس نے جانے سے دو روز پہلے رات کے کھانے پر مسز شیرازی کو اپنے شیڈول سے آگاہ کیا۔
"اکیلے کیوں جا رہے ہو، جنت کو بھی ساتھ لے جاؤ۔"
انہوں نے اتنا اچانک کہا کہ فارس نے یک دم سر اٹھا کر جنت کو دیکھا۔ وہ اطراف سے یکسر بے نیاز پلیٹ میں چاولوں سے کھیلنے لگی۔
"یہ کیا کرے گی ممی۔" وہ گڑبڑایا تھا۔
"اس کی بھی آؤٹنگ ہو جائے گی، کام میں تم اتنے مصروف ہو کہ ہنی مون بھی پلان نہیں کر سکے، کیوں جنت! ٹھیک کہہ رہی ہوں نا میں؟"
"جی جی بالکل ٹھیک کہہ رہی ہیں آپ......"
اس نے فوراً تائید کی۔
فارس اسے دیکھ کر رہ گیا۔ گزشتہ شب واضح وارننگ کے باوجود اس لڑکی میں اتنی ہمت تھی کہ وہ ایک بار پھر اس کی ماں کے ذریعے اپنا مطلب نکلوا رہی تھی!!! فارس کی آنکھوں میں خون اتر آیا۔
"ممی میں وہاں بھی مصروف ہوں گا! فرصت سے پھر کبھی پروگرام بنا لیں گے۔" اس نے مسز شیرازی کو قائل کرنا چاہا، ساتھ ہی اس نے جنت کمال کو خطرناک تیوروں کے ساتھ گھورا تھا۔ آنکھوں میں غیض و غضب کی لہر تھی۔ دھمکی بھی تھی۔
"میرے خیال سے۔" وہ اس کے تاثرات سے خائف ہو کر بول پڑی۔ "میرے خیال سے

فارس ٹھیک کہہ رہا ہے آنٹی!"

"خاک ٹھیک کہہ رہا ہے۔" مسز شیرازی خفگی سے بولیں، "تم اسے نہیں جانتیں، میں جانتی ہوں، کام کا بہانا یہ بار بار کرے گا، اور ہر بار حیلے بہانوں سے ٹالتا رہے گا۔" اب کے انہوں نے اپنے بیٹے کو خاصے کڑے تیوروں سے گھورا تھا۔

"جنت تمہارے ساتھ لندن جا رہی ہے اور یہ میرا آخری فیصلہ ہے۔"

"آپ کو یہاں اکیلا کیسے چھوڑ جائیں آنٹی۔"

فارس کے تاثرات اب اس کی ریڑھ کی ہڈی میں سنسناہٹ دوڑا رہے تھے۔ آج اس کی خیر نہیں!!

"نوکروں کی فوج کے ساتھ میں اکیلی نہیں ہوں۔" انہوں نے جیسے حتمی فیصلہ سنایا۔ "جنت! اپنی تیاری کرو، اور تم۔" انہوں نے فارس کی طرف دیکھا۔ "جنت کی ٹکٹ بک کرواؤ۔" لہجہ تحکمانہ تھا۔

فارس نے نہ اثبات میں سر ہلایا نہ نفی میں...... چند نوالے زہر مار کیے اور اٹھ کر چلا گیا۔

اس رات جنت کافی تاخیر سے کمرے میں آئی تھی یہ سوچ کر کہ اب تک وہ سو چکا ہو گا مگر نہ صرف وہ جاگ رہا تھا بلکہ آتش فشاں بنا اس کے انتظار میں ٹہل بھی رہا تھا۔ اب کے وہ صحیح معنوں میں خائف ہوئی تھی۔

"وہ...... میں نے نہیں کہا۔ آنٹی نے خود ہی......"

"جھوٹ مت بولو۔" فارس نے درشتی سے اس کی بات کاٹ دی۔ "تمہارے ان اوچھے ہتھکنڈوں کو اچھی طرح سے سمجھتا ہوں میں۔ پچھلے دو ماہ سے تم یہی تو کر رہی ہو۔"

جنت چپ ہو گئی۔

"میں نے تمہیں وارن کیا تھا مجھ سے فاصلے پر رہو۔" وہ زہر خند لہجے میں بولا۔ "وہ آخری وارننگ تھی جنت کمال! آخری وارننگ۔"

حلق میں ابھرتی گلٹی کو نیچے اتارتے ہوئے جنت نے جیسے خود کو پیش آنے والی ہر سچویشن کے لیے تیار کر لیا۔ زیادہ سے زیادہ کیا کرے گا وہ؟ غصہ دکھائے گا، جھگڑا کرے گا، کمرے سے نکال دے گا؟ طلاق وہ دے نہیں سکتا۔ گھر سے وہ نکال نہیں سکتا۔ اس کے بھاگتے دوڑتے ذہن کو اس لمحے جھٹکا لگا جب فارس نے اس کے سامنے اپنے منیجر کو فون کر کے اپنی ٹکٹ کینسل کروانے کا کہا۔ دوسری طرف سے غالباً وجہ پوچھی گئی تھی، دلیلیں بھی دی گئی تھیں۔ کیونکہ جس کام کے لیے وہ لندن جا رہا تھا وہ کام بے حد اہم تھا۔

"میری وائف کی کزن کی شادی ہے۔ ہمیں وہ شادی اٹینڈ کرنی ہے۔" جنت کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے اس نے جیسے دھماکہ کیا تھا۔ وہ اپنی جگہ ساکت کھڑی رہ گئی تھی۔

"تو مس جنت! امید ہے تمہارے ساتھ تمہاری طرح کھیل کر مجھے مزا آئے گا۔"

وہ تلخی سے مسکرایا تھا۔

اور جنت کمال اگلے کئی لمحوں تک پلکیں تک نہ جھپکا سکی تھی۔

☆☆☆

بہترین انتظامات کے ساتھ خوبصورتی سے ڈیکوریٹ کیے گئے شادی ہال کے صدر دروازے پر، مہمانوں کا خوش اخلاقی سے استقبال کرتی سائرہ خالہ کی نظر جنت پر پڑی تو وہ حیران رہ گئیں۔ ایک لمحے کے لیے تو جیسے انہیں یقین ہی نہ آیا، اگلے ہی لمحے انہوں نے آگے بڑھ کر اسے گلے لگا لیا تھا۔

فارس وجدان نے موبائل کی اسکرین سے نگاہ اٹھا کر سائرہ خالہ کو دیکھا۔ لبوں پر داہنے گال کی جانب اٹھتی مدھم مسکان کے ساتھ وہ جنت کے خالو سے اور ان کے بیٹوں سے ملا۔ عمار کے علاوہ سائرہ خالہ کے تینوں بیٹے خوش اخلاقی سے ملے۔

نیوی بلیو پینٹ کوٹ میں فارس کا دراز قد نمایاں ہو رہا تھا۔ اپنی شخصیت میں شاندار تو وہ تھا ہی مگر وجاہت کے باعث ہر کسی کی نظروں میں بھی آ رہا تھا۔

سفید اور گلابی رنگ کے امتزاج کے کامدار لہنگا چولی میں ملبوس، جنت بنت کمال سب کچھ لگ رہی

تھی مگر خوش نہیں۔ زبردستی کی مسکراہٹ بھی اس کے ہونٹوں پر نہیں تھی۔ آنکھیں، سرخ متورم.. جیسے وہ سارا راستہ روتی رہی ہو۔ وہ جتنی اپ سیٹ تھی۔ فارس وجدان اتنا ہی خوش اور مطمئن!

''تم اندر جاؤ میں ضروری کال اٹینڈ کر کے آتا ہوں۔'' جنت نے متوحش نگاہوں سے اسے دیکھا۔ اب اندر بھی وہ اکیلی جائے؟

پھر اس نے خالہ کو دیکھا جو دوسرے مہمانوں سے مل رہی تھیں۔ عمار قدرے فاصلے پر ہی بگڑے تیوروں کے ساتھ کھڑا تھا۔

''میں...... میں تمہارا یہیں انتظار کر لیتی ہوں۔''

''کوئی ضرورت نہیں۔'' آنکھوں میں سختی سے دیکھتے ہوئے اس نے کہا۔ پھر قدرے فاصلے پر، شادی کے ہنگامے، شور شرابے اور میوزک کی تیز آواز سے پرے وہ فون کان سے لگائے کسی سے بات کرنے لگا۔ مٹھیاں بھینچ کر جنت نے جیسے اپنی گھبراہٹ پر قابو پایا پھر ہمت مجتمع کر کے ہال میں داخل ہوگئی۔

شادی کا شور شرابہ، ہنگامہ سب جیسے ختم ہوا تھا۔ یا شاید اس کی سماعت نے ہی کام چھوڑ دیا تھا کہ آہستگی سے قدم اٹھاتے ہوئے اسے یوں لگا تھا جیسے ہر طرف مہیب سناٹا چھا گیا ہو۔ کئی نگاہیں اس کی طرف اٹھی تھیں، کئی لوگوں نے آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو اشارے کیے تھے۔

آتے جاتے لوگوں کی مرکز نگاہ بنی، اذیت کی دودھاری تلوار پر قدم جمائے وہ شادی ہال کے سب سے الگ تھلگ حصے میں جا کر بیٹھ گئی تھی۔

جن لوگوں کے سامنے وہ مر کر بھی نہیں آنا چاہتی تھی وہ اب نظر بھر کر اسے دیکھ رہے تھے۔ اسے جانچ رہے تھے۔ اسے پرکھ رہے تھے۔

بدنصیبی کا اگر کوئی روپ ہے تو وہ جنت کمال کو دان کر دیا گیا ہے۔ بدبختی اگر کوئی مقام ہے تو وہ جنت کمال کو انعام کر دیا گیا ہے۔

اس کا سر اٹھا ہوا تھا مگر نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ وہ کسی کو دیکھنا نہ چاہتی تھی مگر پھر بھی سب اسے نظر آ رہے تھے۔ بہنوں کو وہ نظر انداز نہیں کر سکی تھی۔ خصوصاً حفصہ آپی کو...... وہ انہیں اٹھتے بیٹھتے، آتے جاتے دیکھ رہی تھی اور وہ تھیں کہ اسے مکمل طور پر نظر انداز کیے ہوئے تھیں۔

اس کی بھانجیاں اور بھانجے دوسرے بچوں کے ساتھ کھیلتے کودتے پھر رہے تھے۔ مبشر تو اس کے پاس سے گزر کر گیا تھا۔ یقیناً بہنوں نے ہی منع کر رکھا تھا تبھی وہ اس کے پاس نہیں آئے تھے۔

چھوٹے چچا اور پھپھو کی فیملی بھی وہاں موجود تھی۔ ہر چہرے پر اسے دیکھتے ہی ناگواری ابھر آئی تھی۔ کچھ تو حیران بھی ہو رہے تھے کہ وہ یہاں کیسے آ گئی تھی؟

''تم یہاں کیوں آ گئی ہو؟'' جنت نے چونک کر سر اٹھایا تھا۔ عمار شدید غصے میں لگ رہا تھا۔ ''اپنا تماشا بنوانے کا بہت شوق ہے تمہیں۔''

جنت اسے دیکھ کر رہ گئی۔ زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہ وہاں سے چلا گیا۔ وہ جانتی تھی عمار یہ بات کس وجہ سے کہہ کر گیا تھا۔ اس کی بھی مجبوری تھی۔ وہ کون سا اپنی مرضی سے یہاں آئی تھی۔

فارس کچھ تاخیر سے آیا تھا۔ کرسی کھینچ کر اس کے ہمراہ بیٹھا تو ایک بار پھر وہ نظروں میں آ گئی تھی۔

تو یہ تھا جنت کمال کا شوہر!

سب نے آج دیکھا تھا۔ سب نے آج جانا تھا۔ اپنے حیران ہوئے تھے۔ ان کا حیران ہونا بنتا بھی تھا۔

بھلا کوئی جنت جیسی لڑکی سے شادی کے لیے رضامند کیسے ہوا تھا؟ اس کے لیے تو زمان جیسے مرد ہی جچتے تھے۔

ناقص! نامکمل! ایسی ہی تصویر تھی اس کی۔ کچھ رنگ مفقود کیا ہوئے۔ وہ دل سے جو گری سو گری، نظروں میں بھی نہ رہی تھی......

داہنے ہاتھ سے بائیں ہاتھ کی کلائی مضبوطی سے پکڑے، ٹانگ پر ٹانگ رکھے وہ بظاہر مضبوط نظر آ رہی تھی مگر اس کے اندر جو توڑ پھوڑ ہو رہی تھی اس کا

عکس اس کی جھلمل کرتی آنکھوں میں لہرا رہا تھا۔
کچھ اگر باقی بھی ہے تو آج ختم ہو جائے گا!!
اندر ایک ہنگامہ برپا تھا۔
دلہن دولہا کو اسٹیج پر بٹھایا گیا تو ان کے آس پاس اپنی بہنوں کو دیکھ کر ایک بار پھر دل کو کچھ ہوا۔ اتنی محبت و اہتمام سے وہ سدرہ کے آگے پیچھے تھیں، اس کے عروسی جوڑے کا دامن سیٹ کر رہی تھیں۔ اور خود وہ اپنی شادی پر کتنی تنہا، کتنی نامکمل تھی ان کے بغیر۔
"میں تمہیں ڈھونڈتی پھر رہی ہوں اور تم یہاں بیٹھی ہو جنت۔" جانے کہاں سے خالہ آئیں اور زبردستی اٹھا کر اپنے ساتھ لے گئیں. عمار کے چہرے پر ایک بار پھر ناگواری در آئی تھی۔ وہ اپنی ماں کو کچھ خفگی سے دیکھ رہا تھا۔
بھاری دل کے ساتھ وہ اسٹیج پر چڑھی تھی۔ بہنیں ایک ایک کر کے وہاں سے ہٹ گئیں۔ کزنز بھی دور ہو گئیں۔ جو موجود تھے وہ اس کی آمد پر ناگواری کا اظہار کرنے لگے تھے۔
فارس وجدان سینے پر بازو باندھے جنت کے تاثرات سے کافی محظوظ ہو رہا تھا۔

☆☆☆

اسٹیج پر دلہن کے ہمراہ بیٹھی پرکشش نقوش کی حامل اس لڑکی پر ساجدہ بیگم کی نظر یوں ٹھہری کہ وہ باوجود کوشش کے ہٹا نہ سکیں۔
انہوں نے عینک لگا کر اس کا ہر طرح سے جائزہ لیا پھر دل ہی دل میں اسے اپنے بیٹے کے لیے پسند کر لیا۔
"مجھے اپنے فرحان کے لیے وہ سفید کپڑوں والی لڑکی بڑی پسند آئی ہے۔ وہ جو دلہن کے پاس بیٹھی ہے! وہی......" انہوں نے اپنی پڑوسن کی بیٹی شائستہ کی توجہ اسٹیج پر بیٹھی لڑکی کی طرف مبذول کروانا چاہی تھی مگر وہ میز کے برابر میں بیٹھے فارس وجدان کو بھی متوجہ کر بیٹھی تھیں جس نے موبائل اسکرین پر سے نگاہ اٹھا کر اسی لڑکی کو دیکھا جو دلہن کے پہلو میں بیٹھی تھی۔
"ارے یہ تو جنت ہے! یہ شادی شدہ ہے بوا!" شائستہ نے کہا۔
"ہیں......" ساجدہ بیگم کو ایک دھچکا سا لگا۔ "شادی شدہ؟ میں سمجھی کالج کی اسٹوڈنٹ ہو گی۔"
"سنا ہے شوہر سے علیحدگی ہو چکی ہے اس کی۔"
ساجدہ بیگم تو دھک سے رہ گئیں۔ اتنی مشکلوں سے انہیں کوئی لڑکی پسند آئی تھی۔ جو نہ صرف شادی شدہ تھی بلکہ اب طلاق یافتہ بھی ثابت ہو رہی تھی۔
"علیحدگی کیوں ہو گئی؟" صدمہ کچھ کم ہوا تو انہوں نے کریدا۔
"شوہر نے دوسری شادی جو کر لی تھی۔"
"انٹرسٹنگ۔" کرسی کی پشت گاہ سے کمر ٹکاتے ہوئے فارس سیدھا ہو بیٹھا۔ نگاہیں جنت پر ٹھہری تھیں۔ وہ دلہن کا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے کر، اس کے کان میں سرگوشی کرنے لگی تھی۔ جواباً دلہن نے نہ جانے اس سے کیا کہا تھا کہ اس کی نگاہ بے اختیار فارس کی طرف اٹھ گئی تھی۔ شادی ہال کے جس الگ تھلگ کونے میں وہ بیٹھا تھا یہاں سے ہر طرف نگاہ دوڑانا قدرے آسان تھا۔
"اتنی خوب صورت بیوی کے ہوتے ہوئے بھی دوسری شادی کر لی؟" ساجدہ بیگم کو یقین نہ آیا۔
"عورت ماں نہ بن سکے تو کہاں کی خوب صورتی!"
فارس اپنی جگہ سن بیٹھا رہ گیا۔
"برہان اس کے بڑے تایا کا جو اکلوتا بیٹا ہے، اس سے شادی ہوئی تھی اس کی، بچپن کی منگنی تھی، شادی محبت کی......" ان خواتین میں جو کم عمر تھی وہ بہت کچھ جانتی تھی۔ "جب انکشاف ہوا جنت بانجھ ہے تو ماں کے مجبور کرنے پر چچا کی بیٹی سے دوسری شادی کر لی۔"
جنت اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔ چہرے پر خوف، گھبراہٹ، پریشانی کا تاثر لیے وہ اب اسٹیج سے اتر کر اسی طرف آ رہی تھی۔
"تو پھر اسے طلاق کیوں ہوئی؟"
ساجدہ بیگم ہمہ تن گوش تھیں۔
"ارے خالہ اس نے برہان کی دوسری بیوی کا

بچہ ضائع کرنے کی کوشش کی تھی۔"
شادی کا ہنگامہ، شور شرابہ...... اور فارس کی ساکت نگاہیں جنت کمال کے چہرے پر ٹھہر گئیں۔
"خدا کی پناہ شکل سے تو ایسی بالکل بھی نہیں لگتی۔" ساجدہ بیگم ڈر سی گئیں۔
"خالہ اعمال شکلوں پر تھوڑی نظر آتے ہیں۔" ہما نے لقمہ دیا تھا۔
"بچپن سے ہی یہ آفت قسم کی لڑکی ہے بوا، خدا معاف کرے نہ چھوٹوں کی تمیز نہ بڑوں کا لحاظ...... بہت بدمزاج اور مغرور سی! اس کی وجہ سے ہی تو اس کی امی کا انتقال ہوا تھا۔"
"پھر تو اس کے ساتھ جو ہوا ٹھیک ہوا۔" جانے کس نے کہا تھا۔
"صرف اتنا ہی نہیں...... پتا نہیں کہاں کہاں افیئرز چلا رکھے تھے اس نے۔ مجھے اس کی نند نے بتایا تھا۔ سارا دن فون پر کالز آتی رہتی تھیں، کئی بار تو اس نے خود جنت کو چھپ چھپ کر فون پر باتیں کرتے دیکھا تھا......"
"میں نے سنا ہے اس کی حرکتوں کی وجہ سے اس کے خاندان والوں نے اس کی دوسری شادی کے بعد اس سے قطع تعلق کر لیا تھا۔"
ساجدہ بیگم نے سر اٹھا کر ایک بار پھر اسے دیکھا تھا۔
"خالہ اسے دیکھیں......وہ......"
ہما نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے متوجہ کیا۔ وہ سر اٹھائے اس طرف دیکھنے لگیں جس طرف ہما اشارہ کر رہی تھی۔
"وہ برہان ہے...... جنت کا پہلا شوہر!"
بلیک ٹو پیس سوٹ میں ملبوس ایک ہینڈسم سا نوجوان ہنستے مسکراتے ہوئے کسی لڑکی کے ہمراہ اندر داخل ہو رہا تھا۔

☆☆☆

وہ میز پر واپس آئی تو فارس وہاں کہیں نہیں تھا۔ اس نے فکرمندی سے چاروں اور نگاہ دوڑائی پھر تیز تیز قدم اٹھاتی شادی ہال سے باہر آ گئی۔ سرسبز لان سے بیرونی دروازے کی طرف جاتے ہوئے وہ مسلسل اس کا نمبر ٹرائی کر رہی تھی۔ موبائل بند بھی نہیں تھا۔ کال ریسیو بھی نہیں ہو رہی تھی۔
پارکنگ ایریا میں اسے گاڑی کے پاس کھڑا دیکھ کر اس کی اٹکی ہوئی سانسیں ایک لمحے میں بحال ہوئی تھیں۔
یہ خیال کہ وہ اسے چھوڑ کر نہیں گیا، کتنا تسلی بخش تھا اور یہی خیال جن اندیشوں کو جنم دے رہا تھا وہ کتنے اذیت ناک تھے۔
وہ خود کو کمپوز کر کے اس کے پاس آ گئی تھی۔
جیبوں میں ہاتھ ڈالے، گاڑی سے ٹیک لگائے نیوی بلیو پینٹ کوٹ میں ملبوس وہ اپنی تمام تر وجاہتوں کے ساتھ اسے تاریک رات کا ہی حصہ لگا۔
"جتنے لوگ ہیں، اتنی ہی کہانیاں ہیں، اور ہر کہانی ایک سے بڑھ کر انٹرسٹنگ ہے۔" وہ براہ راست اس کی آنکھوں میں دیکھنے لگا......لبوں پر مسکراہٹ تھی۔ آنکھوں میں تضحیک۔ جنت کا چہرہ دھواں دھواں ہو گیا۔
"تو برہان واصف تمہارے تایا کا بیٹا تھا، محبت کی شادی تھی، جو محض پانچ سال تک رہی.. پھر اس نے تمہیں چھوڑ دیا۔"
وہ اپنی جگہ منجمد اسے پلکیں جھپکائے بنا دیکھے گئی۔
"تم نے اس کے بچے کو مارنے کی کوشش کی۔" فارس کے لہجے میں صدمہ تھا۔ لیکن بے یقینی ہرگز نہیں تھی۔ "مجھے حیرت ہے اس نے تم پر پولیس کیس نہیں ہونے دیا! بہت محبت کرتا ہوگا۔ ورنہ کون اس قدر سنگین غلطی کو نظرانداز کرتا ہے؟"
اس کی آنکھوں کی نمی یک دم گہری ہوئی تھی۔ لب کپکپائے تھے۔
"تم جیسی لڑکیوں کے لیے بھلا طلاق بھی کوئی سزا ہوتی ہے؟"
جنت کا سانس جیسے حلق میں اٹکا تھا۔ آنکھوں میں وحشت اتری تھی۔ الفاظ گویا سلگتے ہوئے

انگارے تھے۔ سماعت میں پڑتے تھے اور وجود کو راکھ کر دیتے تھے۔

''ویسے طلاق کا سبب تمہارا وہی کارنامہ تھا یا پھر کوئی اور وجہ تھی؟'' جیبوں سے ہاتھ نکالتے ہوئے وہ سیدھا ہوا تھا۔ جنت بمشکل ہی اس کے کندھوں تک پہنچتی تھی۔ اور اب تو جیسے قدموں میں ہی تھی۔ راکھ۔ خاک۔ دھول۔ مٹی۔

آگے کو جھک کر وہ محظوظ ہوتی نگاہوں سے اسے دیکھنے لگا۔

مکمل طور بھیگی ہوئی آنکھیں۔ سرخ چہرہ۔ کپکپاتا وجود۔ نچلا لب بیدردی سے رگڑتے ہوئے وہ سر جھکائے کھڑی تھی۔

''حیرت ہے! آج تمہاری زبان نہیں چل رہی۔'' اسے تعجب ہوا تھا۔ نہ وضاحت۔ نہ صفائی۔ نہ معافی کی طلب۔ نہ پچھتاوے کا احساس۔

''سنا ہے کافی افیئرز تھے تمہارے! سنا ہے رانگ کالز آتی تھیں! سنا ہے......''

اس نے سر گرا دیا۔ جھکا دیا۔ ہار مان لی۔ مگر وہ ''فارس'' تھا۔ حملے سے باز پھر بھی نہ آیا۔

''جو کچھ سن چکا ہوں وہ سب ممی کو بتاؤں گا تو وہ کیا سوچیں گی؟ ایک ایسی لڑکی کو بہو بنا بیٹھی ہیں جو infertile ہے۔ جس نے اپنی سوتن کے بچے کی جان لینے کی کوشش کی ہے۔ جس کے خاندان کے لوگ اسے اچھوت کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ اور جو اپنی ماں کی موت کا سبب بنی ہے۔''

سانس روکے، لب بھینچے اس نے سر اٹھا کر فارس کو دیکھا، وہ بھی اسے ہی دیکھ رہا تھا۔ سرد پتھریلی نگاہوں سے...... کچھ نفرت۔ کچھ حقارت سے۔ کچھ بے رحمی۔ کچھ بیزاریت سے۔

''جس کے اپنے پیروں تلے زمین نہیں تھی، وہ میرے سر سے آسمان کھینچنے چلی تھی۔''

جنت کی آنکھیں چھلک پڑیں۔

''اعمال اگر شکلوں پر ثبت ہوتے تو خوب صورت چہرے کتنے بھیانک لگتے۔'' فارس نے چابی نکال کر بٹن دبایا۔ گاڑی کا لاک کھل گیا۔

ہاں بھیانک لگتے۔ بہت بھیانک لگتے۔

''میں کل شام کی فلائٹ سے لندن جا رہا ہوں، ممی کو فون پر کہہ دینا تم یہاں اپنی مرضی سے رک گئی ہو، جب تک میں واپس نہیں آؤں گا تم اپنی خالہ کے پاس ہی رہو گی! اور ہاں۔'' اس نے رک کر تنبیہی نگاہوں سے جنت کو دیکھا پھر انگلی اٹھا کر زہر خند لہجے میں دھمکی دی۔ ''اب اگر تم نے من مانی کی تو مجھ سے برا واقعی میں کوئی نہیں ہوگا۔''

گاڑی اسٹارٹ ہو چکی تھی۔ کچھ ہی دیر میں وہ وہاں سے جا چکا تھا۔

اور جنت بنت کمال اپنی جگہ ساکت و صامت کھڑی رہ گئی تھی۔

وہ ناقص تھی...... مکمل ہونا چاہتی تھی......

اور جنہیں تقدیر ناقص کر دے...... وہ مکمل کیسے ہوں؟

''کسی روز تمہیں تمہاری یہ خوش فہمیاں لے ڈوبیں گی۔'' وہ اب پھولے تنفس کے ساتھ اندھیرے میں دیکھ رہی تھی۔

''میں بہت اچھی تیراک ہوں فارس۔'' اسے لگا زمین اب قدموں تلے نہ رہی ہو۔

''بہترین تیراک بھی شارک کی خوراک بن جایا کرتے ہیں۔''

''شاید اس لیے کہ وہ بروقت ساحل پر نہیں پہنچ پاتے۔'' وہ لڑکھڑائی۔

''تم پہنچ جاؤ گی ساحل پر؟''

''ساحل پر ہی تو کھڑی ہوں میں۔''

اور یہ تھا اس کا ساحل' اس کا کنارہ!!

وہ اپنے اس کنارے سے۔ خوش گمانی کے اس ساحل سے دبے قدم پیچھے ہٹی۔

ایسے کنارے سے سمندر بھلا!

ایسی سطح سے اعماق (گہرائیاں) بہتر!

☆☆

دل میں ہے وفا کی طلب، لب پہ سوال بھی نہیں
ہم ہیں حصار درد میں، اس کو خیال ہی نہیں۔
اتنا ہے اس سے رابطہ، چھاؤں سے جتنا دھوپ کا
گر یہ نہیں ہے ہجر تو پھر یہ وصال بھی نہیں
وہ جو انا پرست ہے، میں بھی وفا پرست ہوں
اس کی بھی مثال نہیں، میری مثال بھی نہیں
تم کو زبان دے چکے، دل کا جہان دے چکے
عہد وفا کو توڑ دیں، اپنی مجال بھی نہیں

ٹائی کی ناٹ ڈھیلی کرتے ہوئے اس نے اوپن کچن کے سامنے رک کر راہداری میں نگاہ دوڑائی تھی۔ ملگجی سی روشنی تھی جو پورے گھر میں پھیلی تھی۔ عجیب سا سناٹا تھا جو ہر طرف چھایا ہوا تھا۔ وہ پندرہ دن بعد لندن سے لوٹا تھا اور گھر پر چھائی ہوئی یہ ویرانی اسے عجیب سی کیفیت سے دوچار کر گئی تھی۔

مسز شیرازی کے بیڈ روم کا دروازہ بند تھا۔ وہ یقیناً اب تک سو چکی ہوں گی۔ وہ ان کے آرام میں مخل نہیں ہونا چاہتا تھا ورنہ ایسا کبھی نہیں ہوا تھا کہ وہ بیرون ملک دورے سے واپس آیا ہو اور فی الفور ان سے نہ ملا ہو۔

وہ سیڑھیوں کا رخ کرنے ہی لگا تھا جب نگاہ راہداری کے اختتام پر اسٹوڈیو کے ادھ کھلے دروازے پر پڑ گئی۔ دروازے کی درز سے جھانکتی زرکار روشنی ٹائلز پر بکھری ہوئی تھی۔ آہستہ سے قدم اٹھاتے ہوئے وہ اسٹوڈیو روم میں آ گیا۔

تمام بتیاں روشن تھیں۔ دیوار گیر کھڑکیوں کے پردے ڈوریوں میں بندھے ہوئے تھے۔ باہر کا اندھیرا کھڑکیوں سے اندر جھانک رہا تھا۔ رم جھم بارش کی مدھم سی آواز۔ سرسرا کر گزرتی ٹھنڈی نم ہواؤں کا شور۔ اس نے ایک طائرانہ نگاہ ہال میں دوڑائی پھر آگے بڑھتے ہوئے مشرقی دیوار کے پاس رکھے کارٹن پر جھک گیا۔

مرجھائے ہوئے پھول۔ گیٹ ویل سون کا ڈرائنگ پیپر۔ رزلٹ کارڈز۔ ٹرافیز۔ کھلونے۔ تصاویر کے البم۔ ایک ایک چیز کا سرسری سے انداز میں جائزہ لیتے ہوئے اس کے ہاتھ میں اپنا پرانا والٹ آ گیا۔ والٹ خالی تھا۔ اس میں کوئی ایسی چیز نہ تھی جو اسے متوجہ کرتی ماسوائے اس کی چین کے جس کے دوسرے سرے پر شاندار سی تلوار لٹک رہی تھی۔ تلوار کے بلیڈ کے وسط میں ایک میگنیٹک چپ تھی جس پر انگلی پھیرتے ہوئے اسے یاد آیا تھا کہ اس کے ساتھ جڑی ہوئی ایک اور تلوار بھی تھی۔

''تم آ گئے بیٹا۔'' مسز شیرازی کی آواز پر اس نے چونک کر عقب میں دیکھا تھا۔

وہیل چیئر پر براجمان۔ سیاہ شال میں اپنا آپ چھپائے وہ منسلک کمرے سے اندر آ گئی تھیں۔

''میں سمجھا، آپ سو رہی ہوں گی۔'' کی چین ہاتھ میں لیے وہ اٹھ کر ان کے پاس آ گیا۔ جھک کر ان کی پیشانی کا بوسہ لیا پھر ہاتھ پکڑ کر ہی ان کے پاس سائڈ ٹیبل پر بیٹھ گیا تھا۔

''طارق کے اکاؤنٹ میں اماؤنٹ ٹرانسفر کر دیا ہے میں نے۔'' وہ جانتا تھا مسز شیرازی اب اس سے کیا پوچھنے والی تھیں۔ مگر سوال سے پہلے ہی وہ انہیں جواب دے چکا تھا۔

مسز شیرازی نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ ایک کرب سا ان کی آنکھوں میں ٹھہر گیا۔

ہر مہینے کی یکم تاریخ کو وہ یہی اور یہی سننے کی متمنی رہتیں اور ہر بار فارس وجدان کا یہ جملہ انہیں اذیت میں مبتلا کر دیتا۔ ہر ماہ رقم ٹرانسفر کرنے والا محبت ٹرانسفر نہیں کرتا تھا۔

''تمہیں لگتا ہے، اس ننھے سے یتیم بچے کو تمہارے پیسوں کی ضرورت ہے؟'' محتاط انداز میں انہوں نے کچھ اذیت سے پوچھا تھا۔

کی چین کی تلوار فارس کی انگلیوں میں متحرک تھی۔ سر جھکا ہوا تھا۔ چہرہ ہنوز تاثرات سے عاری۔

''اسے تمہاری ضرورت ہے فارس۔'' انہوں نے جیسے اسے آگاہی دی تھی۔ ایک بار پھر احساس دلانے کی سعی کی تھی۔

وہ خاموش رہا تھا۔ مشتعل نہیں ہوا تھا۔
''اسے سزا مت دو۔ اس کا کوئی قصور نہیں ہے۔''
''میں کسی کو سزا نہیں دے رہا ہوں۔'' بہت آہستگی سے اس نے کہا۔ ''میں صرف جینے کی کوشش کر رہا ہوں ممی!''
مسز شیرازی نے اس کی آنکھوں میں آگ دیکھی۔ درد دیکھا۔ اذیت دیکھی۔ اور پھر جیسے ان کی ہر ہمت دم توڑ گئی۔ یہ ظلم ہے۔ انہیں احساس ہوا۔ وہ اس کے ساتھ زیادتی کر رہی ہیں۔ ان کا دل بیٹھا۔
شال کے پلو سے اپنے آنسو پونچھے پھر مدھم سی مسکراہٹ لبوں پر بکھیرتے ہوئے انہوں موضوع ہی بدل دیا۔
''ٹور کیسا رہا تمہارا؟ سفر میں کوئی مشکل تو نہیں ہوئی؟! اور جنت کو کب لاؤ گے فارس؟ اس کے بغیر تو اس گھر میں خاموشی سی در آئی ہے۔''
اس نے مسز شیرازی کے تینوں سوال ٹھیک ٹھاک سنے مگر جواب صرف ایک کا دیا۔
''سفر ٹھیک رہا۔ بہت بھوک لگ رہی ہے ممی۔ میں کچھ کھانا چاہتا ہوں۔'' وہ جانے کے لیے اٹھا تھا۔
''مجھے پہلے ہی شک تھا۔'' ان کی آنکھوں میں اب بھی نمی ٹھہری تھی مگر لہجے میں خوشگواریت لوٹ آئی تھی جیسے کچھ دیر پہلے تک ان کے مابین ایسی کوئی بات ہی نہ ہوئی ہو جس نے انہیں ہزار ہا ٹکڑوں میں منقسم کر دیا ہو۔
''کیسا شک؟'' دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے اس نے رک کر پوچھا تھا۔
''یہی کہ تم دونوں کی لڑائی ہوئی ہے۔'' مسز شیرازی نے اطمینان سے آگاہ کیا۔ ''تم اسے لاہور چھوڑ آئے صرف اس لیے کہ وہ تمہارے ساتھ لندن نہ جا سکے۔'' انہوں نے مشکوک نگاہوں سے دیکھتے ہوئے کریدا۔
''ایسا تو نہیں ہوا تھا۔'' وہ ٹپٹا گیا۔ ''وہ تو اپنی مرضی سے۔''
''اسے شادی اٹینڈ کرنے سے زیادہ تمہارے ساتھ لندن جانے کا شوق تھا۔ ایک دو گھنٹوں میں اس نے میرے ساتھ بیٹھ کر جانے کتنے پروگرام ترتیب دے ڈالے تھے۔ میں مان ہی نہیں سکتی وہ اپنی مرضی سے رک گئی ہو گی۔'' ان کا انداز قطعیت بھرا تھا۔
متحرک وہیل چیئر کے برابر قدم اٹھاتے ہوئے فارس لب بھینچ کر رہ گیا۔
''سچ سچ بتاؤ، لڑائی ہوئی ہے تم دونوں کی؟''
مسز شیرازی اس کے پیچھے کچن میں آ گئی تھیں۔
سنی ان سنی کیے وہ فریزر کھول کر کھانے کے لیے کچھ دیکھنے لگا۔
''میں کچھ پوچھ رہی ہوں فارس!''
''یہ سوال آپ نے اپنی لاڈلی سے پوچھ لیا ہوتا۔'' وہ جیسے جل کر بولا تھا۔ مسز شیرازی نے لبوں پر ابھرتی مسکراہٹ کو بمشکل روکا۔
''اس سے بھی پوچھا تھا۔ کہنے لگی اپنی مرضی سے رک گئی ہوں۔ لیکن اصل مسئلہ تو وہیں کا وہیں ہے۔ جب اس نے تمہارے ساتھ لندن جانا تھا تو پھر شادی اٹینڈ کر کے وہ واپس کیوں نہیں آئی؟''
''اب میں کیا کہہ سکتا ہوں۔'' مائکروویو اوون میں پیزا گرم کرتے ہوئے وہ الجھ کر بولا۔
''اس کا مطلب ہے تم دونوں کی لڑائی ہوئی ہے۔'' انہوں نے کچھ سوچ کر کہا۔
''لڑائی؟'' ٹائمر کی آواز کچن میں گونجی تھی۔
''کیسی لڑائی؟'' فارس کی بھنویں سکڑ گئیں۔ جبڑے بھینچ گئے۔ ''جنت بنت کمال اب بھی باز نہ آئی اپنی حرکتوں سے؟'' اس کا پارہ چڑھا۔
''ہزبینڈ وائف میں کیا لڑائی بھی نہیں ہو سکتی؟''
''ہماری نہیں ہوتی۔'' (اگر جنت سن لیتی تو غش کھا کر گر جاتی)
مسز شیرازی نے اچنبھے سے اسے دیکھا۔

"اب آپ کیا چاہتی ہیں؟" وہ زچ ہوا تھا۔
"کچھ نہیں۔ تم پیزا کھاؤ۔" مسز شیرازی نے مسکراہٹ دبائی۔
وہ ان کا حصہ نکالنے لگا تو انہوں نے منع کر دیا۔
میز پر کہنی ٹکائے۔ بند مٹھی پر ٹھوڑی جمائے۔ وہ اسے بہت غور سے اور محبت سے دیکھنے لگیں۔ وہ کچھ تذبذب کا شکار ہوا تھا۔ کہ کھلی کتاب تو نہ تھا وہ مگر مسز شیرازی اسے پڑھ ہی لیا کرتی تھیں۔
"جنت ٹھیک ہی کہتی ہے۔" چند لمحوں کے بعد انہوں نے کہا۔
اس نے چھری سے پیس کاٹ کر منہ میں ڈالتے ہوئے انہیں دیکھا۔ آنکھوں میں سوال تھا۔
"یعنی کیا؟ کیا کہتی ہے جنت؟"
"یہی کہ جب تم کنفیوژن کا شکار ہوتے ہو تو زیادہ دلچسپ لگتے ہو۔"
نوالہ فارس کے حلق میں اٹک گیا۔ وہ بے اختیار کھانسنے لگا۔
مسز شیرازی نے فوراً گلاس میں پانی انڈیل کر اسے دیا۔
اس نے چند ایک گھونٹ بھرے۔ تنفس بحال کیا۔ پھر سر اٹھا کر مسز شیرازی کو دیکھا۔
وہ مسکرا رہی تھیں۔ اور ان کی مسکراہٹ زندگی سے بھرپور تھی۔

☆☆☆

لاہور کی صبح بارش کا لبادہ اوڑھ کر اتری تھی۔ آسمان کی اجلی، نیلی رنگت پر کچھ دیر پہلے تک سمٹ جانے والے بادل ایک بار پھر پھیل رہے تھے۔
کچھ ایسی ہی گومگوسی کیفیت اس کی بھی ہوئی تھی جب سائرہ خالہ نے اسے جنت کی غیر موجودگی کے بارے میں آگاہ کیا تھا
"یہاں نہیں ہے؟" نہ لہجے میں فکر تھی۔ نہ گھبراہٹ۔ بس ایک الجھن کہ اب اسے انتظار میں رکنا پڑے گا جب کہ وہ جلد از جلد واپس اسلام آباد جانا چاہتا تھا۔
"کب تک آئے گی؟"
"جنت نے تمہیں نہیں بتایا؟" خالہ کچھ متفکر نظر آئیں۔ اس نے نفی میں سر ہلا دیا۔
"وہ اپنی آپا کے گھر ہے۔"
"آپ مجھے ایڈریس بتا دیں، میں اسے وہیں سے پک کر لیتا ہوں۔" موبائل نکالتے ہوئے اس نے بے حد فارمل لہجے میں کہا تھا۔
سائرہ خالہ نے کچھ حیرت اور الجھن سے اسے دیکھا تھا۔ کیا ان پندرہ دنوں میں اس کی ایک بار بھی جنت سے بات نہیں ہوئی ہے؟ یا پھر جنت نے ہی اسے لاعلم رکھا ہے؟
کچھ ہی دیر میں وہ آپا کا ایڈریس لے کر گھر سے نکل گیا تھا۔ لاہور کی سڑکوں پر گاڑی دوڑاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر جنت کا نمبر ٹرائی کیا تھا۔ اس کا موبائل آف جا رہا تھا۔
آسمان پر رم جھم برستی بارش نے یک دم ہی شدت اختیار کر لی۔ اس نے وائپر متحرک کر دیے۔
پندرہ بیس منٹ کی ڈرائیو کے بعد وہ مطلوبہ ایڈریس پر پہنچ چکا تھا۔
ذیلی سڑک سے گاڑی اندر وہ لے تو گیا تھا مگر تنگ گلیوں کی بنا پر اب مزید جانا ممکن نہ تھا۔ چنار کے درخت تلے گاڑی روک کر اس نے سامنے دیکھا۔ سائرہ خالہ نے تیسری گلی میں سیاہ گیٹ کی نشاندہی کی تھی۔ دروازہ کھول کر باہر نکلتے ہوئے اس نے رین کوٹ کا ہڈ اپنے سر پر چڑھا لیا۔
بادل یک دم شدت سے گرجے تھے۔ آواز ایسی تھی جیسے آسمان ٹوٹ پڑا ہو۔ موسلا دھار بارش میں دائیں موڑ مڑتے ہی وہ گلی میں سیاہ رنگ کے تیسرے گیٹ کے سامنے رک گیا تھا۔ آم کے گھنے درخت کی شاخیں صحن سے باہر گیٹ کے اوپر باہر کی طرف پھیلی ہوئی تھیں۔ بارش کا پانی پتوں سے رس رس کر نیچے گر رہا تھا۔ اس نے دروازہ بجاتے ہوئے اپنے سیاہ جوتوں کو دیکھا جو کیچڑ سے لت پت

ہو چکے تھے۔
تقریباً پانچ منٹ تک تو وہ گیٹ ہی دھڑ دھڑاتا رہا۔ تب کہیں جا کر گیٹ کھلا تھا۔
سادہ سی سفید شلوار قمیص میں ملبوس۔ سیاہ شال اپنے گرد اچھی طرح سے اوڑھے، سر پر چھاتا تانے جنت کمال سامنے کھڑی تھی۔ کچھ ساکت اور متحیر سی۔ رنگت زرد۔ ہونٹ بے رنگ اور خشک۔ آنکھیں سرخ و متورم تھیں۔ داہنے گال کے اوپر۔ آنکھ کے بائیں طرف نیل کا گہرا نشان۔ کچھ سوجن بھی تھی شاید۔
فارس کی آنکھوں کی سرد مہری یک دم بڑھی۔ چہرے کے تاثرات سرد ہو گئے۔ اپنی یہ حالت بنا کر وہ دنیا کے سامنے کیا ثابت کرنا چاہ رہی تھی؟ یہی کہ اس پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑے جا رہے ہیں؟ یہ ڈرامے بازلڑکی اسے زہر لگی تھی اس لمحے۔
جنت کمال کچھ حیرت سے اسے دیکھ رہی تھی۔ پیشانی پر بکھر کر گال پر پھسلتی لٹوں کو آج وہ سمیٹ کر پیچھے نہیں ہٹا رہی تھی۔ رت جگے کی گواہی دیتی آنکھیں بے طرح سے سرخ ضرور تھیں مگر نم نہیں۔ چہرے پر کسی قسم کا تاثر نہیں تھا۔ مگر آنکھوں میں ایک بے نام سی خفگی لہرا رہی تھی، غصہ بھی تھا شاید۔
"لینے آئے ہو؟" اس نے یوں پوچھا جیسے وہ کسی اور وجہ سے بھی آ سکتا ہو۔ لہجہ بے تاثر مگر آواز کچھ بوجھل سی تھی۔
"مجبوری ہے۔" دانت پیس کر انتہائی برودت سے جواب دیتے ہوئے فارس نے غصیلی نگاہوں سے اسے دیکھا۔
اور اسے لگ رہا تھا شاید مجبوری ختم ہو چکی ہے، اب وہ اسے ہمیشہ کے لیے خیر باد کہنے آیا ہے۔
"وقت نہیں ہے میرے پاس! دو منٹ میں پہنچو۔" اکھڑ لہجے میں حکم دیے کر وہ جانے کے لیے مڑ گیا تھا۔ بڑبڑاہٹ جاری تھی۔ جھنجلاہٹ میں قدم اٹھاتا وہ شدید غصے میں لگ رہا تھا۔
گاڑی کے قریب پہنچ کر اس نے مڑ کر پیچھے دیکھا تو جنت چھتری کے سائے میں احتیاط سے قدم اٹھاتی نظر آئی۔ بیگ کندھے سے لٹک رہا تھا۔ سر جھکا ہوا تھا، اور شانوں پر بکھرے سیدھے گرتے لمبے بال چہرے کو دونوں اطراف سے گھیرے ہوئے تھے۔ کچھ اب بھی ہاتھ میں ہی تھا جیسے وہ عجلت میں اپنا سب کچھ سمیٹ کر فوراً ہی باہر آ گئی ہو۔
وہ قریب پہنچی تو فارس نے درشتی سے جنت کا بازو پکڑ کر اس کا رخ اپنی طرف موڑا۔ تکلیف دہ تاثر چھپاتے ہوئے جنت نے بازو چھڑانے کی کوشش کی تھی مگر اس سے تکلیف میں اور اضافہ ہی ہوا تھا۔
"اپنی یہ حالت بنا کر۔ آخر کیا ثابت کرنا چاہتی ہو تم؟ تم پر ظلم و ستم کے پہاڑ توڑ رہا ہوں میں؟ جی جان لگا کر ان پندرہ دنوں میں اپنی یہ حالت بنائی ہے تاکہ ممی کے سامنے میرا تماشا بنا سکو؟ اب اس حالت میں تمہیں لے کر جاؤں میں؟ اس حالت میں؟" وہ دبی آواز میں دھاڑا تھا۔
وہ دم سادھے کچھ صدمے سے اس کی آنکھوں میں دیکھ کر رہ گئی۔ بازو کی تکلیف جیسے ایک لمحے میں غائب ہو گئی تھی۔
"چاہتی کیا ہو تم؟" وہ دبی آواز میں غرایا۔ قہر برساتی آنکھوں میں جیسے خون اترا ہوا تھا۔
جنت کے لب بھنچ گئے۔ آنکھوں میں سرخی پھیلی۔ مگر اس نے جواباً کچھ نہ کہا۔
"پتا نہیں کس گناہ کی پاداش میں تم میرے گلے پڑ گئی ہو۔" جھٹکے سے اس کا بازو چھوڑتے ہوئے اس نے اپنی سائیڈ کا دروازہ کھولا تھا۔
بڑبڑاتے ہوئے کچھ جھنجلا کے عالم میں اس نے گاڑی اسٹارٹ کی تھی۔ یکا یک ہی اسے اپنی انگلیوں پر چپچپاہٹ کا احساس ہوا تھا۔ یونہی داہنا ہاتھ سامنے کیا تو وہ خون سے سرخ لگا۔ وہ اپنی جگہ ٹھٹک کر رک گیا۔
دروازہ کھول کر جنت برابر میں بیٹھی تو اس نے بے ساختہ گردن موڑ کر اسے دیکھا۔
چھتری ٹانگوں میں رکھنے کے بعد اب وہ اپنے

بالوں کو سمیٹ کر کیچر میں جکڑ رہی تھی۔ بہت احتیاط اور آہستہ سے۔

ایک لمحے کے لیے فارس کی سوچ اور خیال منتشر ہوئے تھے۔ ایک لمحے کے لیے کسی بے معنی سے اندیشے نے سر اٹھایا تھا۔

جب وہ اپنے بالوں کو سمیٹ چکی تو اسے لگا شاید وہ اب فرصت سے۔ ہمیشہ کی طرح کوئی وضاحتی جواب دے گی۔ کوئی انوکھا بیان دے گی مگر وہ چپ تھی۔ گویا منہ میں زبان ہی نہ ہو۔ کھڑکی کی طرف منہ موڑے اس نے اپنی صورت بھی گم کر لی تھی۔

فارس کی نگاہ ایک لمحے کے لیے اس کے داہنے بازو کے اس مقام پر رکی تھی جسے اس نے انتہائی سختی سے پکڑا تھا۔ پھر اس نے گاڑی اسٹارٹ کر دی تھی۔

سفر خاموشی سے کٹنے لگا تھا۔

ونڈ اسکرین پر متحرک وائپرز۔ کہر میں لپٹا روڈ۔ بارش کی آواز۔ شدید سردی۔ اور شال میں اپنا آپ چھپائے۔ کھڑکی کی طرف رخ کیے۔ آنکھیں موندے وہ بیٹھی تھی۔ ذرا دیر کے لیے ہی اس پر غنودگی چھائی تھی۔ پھر اس کی آنکھ کھل گئی تھی۔ بخار کی حدت سے تپتا وجود سردی کی شدت سے کپکپا رہا تھا۔

چہرے کا رخ اب بھی کھڑکی کی طرف تھا۔ وہ بھولے سے بھی نہ رخ بدل رہی تھی۔ اور نہ ہی اسے دیکھنے کی غلطی کر رہی تھی۔ وہ بھی خاموشی سے گاڑی ڈرائیو کر رہا تھا۔ حیرت انگیز طور پر اس نے دوبارہ کوئی بات نہیں کی تھی۔ نہ غصہ دکھایا تھا۔ نہ جھڑکیاں پلائی تھیں۔ نہ ہی ان گناہوں کا حوالہ دیا تھا جن کی پاداش میں وہ اس کے گلے پڑ گئی تھی۔ خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے اس نے گہرا سانس لیا۔

فارس نے گاڑی پیٹرول پمپ کے سامنے سڑک کے عین کنارے پر روک دی تھی۔ آگے پیٹرول ڈلواتی گاڑیوں کا رش تھا۔

وہ رین کوٹ کا ہڈ سر پر چڑھائے گاڑی سے نکل گیا۔ جنت سامنے دیکھنے لگی۔ دھند میں ملفوف درخت بس چند قدموں کے فاصلے تک ہی واضح تھے۔

اس نے پانی کے چند مزید گھونٹ بھرے۔ پھر داہنے ہاتھ کی انگلیوں سے کنپٹی دبانے لگی۔

☆☆☆

وہ کھانا آرڈر پر پیک کروا کر پلٹ ہی رہا تھا جب اس نے آواز سنی تھی۔ مسلسل بجتا ہارن۔ ٹائر کی چرچراہٹ۔ اور پھر تصادم۔ اس نے پیٹرول پمپ پر موجود لوگوں کو دائیں سمت بھاگتے دیکھا۔ بارش کچھ زیادہ ہی تیز ہو گئی تھی۔ ہر منظر دھندلا تھا۔ مبہم تھا۔ غیر واضح۔

''ایکسیڈنٹ ہو گیا۔'' کوئی کہہ رہا تھا۔ بارش کے شور میں اب لوگوں کی تیز آوازیں بھی شامل ہو گئی تھیں۔

کسی احساس۔ کسی اندیشے۔ کسی خیال کے تحت اس نے عجلت میں قدم اٹھاتے ہوئے وہاں دیکھا جہاں اس کی گاڑی کھڑی تھی۔

اگلے ہی لمحے۔ اس کا دل رکا۔ سانسیں تھم گئیں۔ پارسل ہاتھوں سے چھوٹ گیا۔ شاید زمین چکرائی تھی۔ یا پھر آسمان سر پر گرا تھا۔ وہ تصادم۔ وہ کوئی عام تصادم تو نہ تھا۔

بے قابو ہوتی گاڑی اس کی گاڑی سے ہی آ کر ٹکرائی تھی جس کی وجہ سے اس کی گاڑی گھومتی ہوئی بلندی سے نیچے جا گری تھی۔

''جنت!'' اس کا سانس رکا۔

بے اختیار ہو کر وہ اسی طرف بڑھا جس طرف لوگوں کا ہجوم تھا۔ کنارے پر اس کے پہنچنے سے بھی پہلے گاڑی ایک زوردار دھماکے سے آگ کی لپیٹ میں آئی تھی۔

وہ پتھر ہوا تو چند لمحوں تک پتھر ہی رہا۔ ساکت۔ صامت۔ جامد۔

صدمے سے قوت ملی۔ قدم بے ساختہ ہی اس طرف اٹھے۔ بیچ راستے میں ہی کچھ لوگوں نے آگے بڑھنے سے روک لیا۔

حواس شل ہو رہے تھے۔ وہ گہرے صدمے

میں تھا۔ اپنا آپ چھڑاتے ہوئے آگے بڑھنا چاہ رہا تھا۔ مگر لوگ اسے آگے بڑھنے نہیں دے رہے تھے۔

''فارس!''

آن کی آن میں یہ کیا ہوا تھا؟ کیوں ہوا تھا؟ اس نے یہ تو نہیں سوچا تھا۔ اس نے یہ تو نہیں چاہا تھا۔

''فارس!'' اب کے آواز بلند تھی۔ کپکپاتی ہوئی اور درشت تھی۔ جیسے کسی نے پوری جان لگا کر اسے پکارا ہو۔

بے جان ہوتی ٹانگوں کے ساتھ اس نے ایک جھٹکے سے مڑ کر پیچھے دیکھا۔

سر پر چھاتا تانے۔ سردی کی شدت سے کپکپاتی۔ کچھ کمزور اور نڈھال سی جنت آنکھوں میں الجھن لیے اس کے سامنے ہی کھڑی تھی۔ کچھ ہی فاصلے پر۔

صدمے سے فارس کی نگاہ ڈگمگائی۔ وہ تھم گیا۔ رک گیا۔ ٹھہر گیا۔ لمحے بھر کے لیے اسے اپنی آنکھوں پر یقین نہیں آیا تھا۔ آ بھی کیسے سکتا تھا؟ وہ مجسم حقیقت بنی اس کے سامنے کیسے کھڑی تھی؟ وہ تو گاڑی میں۔

آنکھوں میں بے یقینی اور الجھن لیے، اپنے آپ کو لوگوں کی گرفت سے آزاد کرتے ہوئے وہ اس کی جانب بڑھا۔

جنت ناسمجھی کے عالم میں اسے دیکھنے لگی۔۔ اس کی طبیعت ٹھیک نہیں تھی۔ سر درد سے پھٹا جا رہا تھا۔ سردی اذیت بڑھا رہی تھی۔ مگر فارس کی آنکھیں۔ اس کے تاثرات۔ اس کا خوف اور گھبراہٹ اس پر روشن دن کی طرح عیاں تھا۔

''میرے سر میں درد تھا تو میں۔ ٹیبلٹ لینے کے لیے۔'' اس نے خواہ مخواہ وضاحت دی۔

آسمان پر بجلی چمکی۔ پھر گھن گرج کی آواز ہر سمت گونجی۔

وہ اس پر نگاہ جمائے اپنی جگہ کھڑا رہا۔

اب کے جنت نے اس کے عقب میں دیکھا۔ شاید وہ ایکسیڈنٹ کی نوعیت اور نقصان کے بارے میں جاننا چاہ رہی تھی۔ اگلے ہی پل اس کا حلق خشک ہوا تھا۔ زمین نے قدم جکڑ لیے تھے۔ نگاہیں شعلوں پر جم کر رہ گئیں۔

سیاہ پراڈو جوان کی گاڑی سے ٹکرائی تھی۔ اس گاڑی میں ایک ہی نوجوان تھا۔ زخمی تھا اور اسے گاڑی میں ڈالے چند مقامی لوگ اسی وقت ہاسپٹل کے لیے روانہ ہو گئے تھے۔ لیکن ان کی گاڑی جو بلندی سے گری تھی۔ اس میں تو کوئی بھی نہیں تھا۔ مگر پھر بھی دونوں کی حالت ایسی تھی جیسے ان کا نقصان ہو گیا ہو۔ جیسے وہ شعلوں کی لپیٹ میں گاڑی کے اندر ہی رہ گئے ہوں۔

اس نے پھر فارس کو دیکھا۔ وہ کمزور اعصاب کا شخص نہیں تھا۔ اور ایسا بھی نہیں کہ گاڑی کا نقصان اسے پریشانی میں مبتلا کر دے۔ تو پھر وہ اتنا متفکر کیوں لگ رہا تھا؟ اتنا بے چین اور بے قرار کیوں دکھ رہا تھا؟ اس کی آنکھوں کی سرخی۔ درد کی عکاسی کیوں کر رہی تھی؟ چہرے کے تاثرات مخمصے میں کیوں ڈال رہے تھے؟

کیا اس لیے کہ وہ بچ گئی تھی؟ کیا اس لیے کہ اس کے غیر ضروری وجود سے جان چھڑانے کا ایک موقع ہاتھ سے نکل گیا تھا؟ اسے صدمہ ہوا۔

ہاں شاید۔ یہی وجہ ہے! یقیناً یہی وجہ ہے۔

لب بھینچ کر وہ سخت تاثرات کے ساتھ اسی وقت جانے کے لیے مڑ گئی تھی۔ سامنے ہی اسٹور کے شیڈ تلے رکتے ہوئے اس نے غصے سے سرخ پڑتے چہرے کے ساتھ فارس وجدان کو دیکھا جو اس کے برابر میں آن کھڑا ہوا تھا۔

اس کے تاثرات اب بھی نارمل نہیں تھے۔

''اندر آجاؤ صاب!'' تیرہ چودہ برس کا لڑکا اسٹور کے کاؤنٹر سے چلایا تھا۔

ایک لمحے کا توقف کیے بغیر جنت فوراً ہی سیڑھی چڑھ کر اندر چلی گئی۔ کرسی کھینچ کر بیٹھتے ہوئے اس نے سرد نظروں سے فارس کو دیکھا۔ برساتی کا ہڈ

اتارتے ہوئے اس نے گردن تک چڑھی ہوئی زپ کھینچ کر سینے پر ٹھہرالی تھی۔ ایک ہاتھ مسلسل حرکت میں تھا جیسے اسے گھٹن ہو رہی ہو اور وہ شرٹ کے اوپری بٹن کھول لینا چاہتا ہو۔ سختی سے دانت پر دانت جمائے جنت نے چہرے کا رخ پھیرلیا۔

موت!

بددعا!

بدنصیبی!

سزا!

تنبیہہ!

یا......

اس نے آنکھیں موند لیں۔ وہ اپنی کیفیت پر قابو پانے کی کوشش کر رہی تھی۔ مگر یہ آسان نہیں تھا۔ ہرگز آسان نہیں تھا۔

اگر وہ گاڑی میں ہوتی تو اس وقت...... اس کا دم گھٹا۔ اسے لگا اگر اس نے فی الوقت خود کو نہ سنبھالا تو اسے کچھ ہو جائے گا۔ پندرہ دن پہلے بھی اس پر ایسی ہی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ لیکن تب اس نے خود کو سنبھال لیا تھا۔ اب سنبھالنا کچھ مشکل لگ رہا تھا۔

''پانی دینا۔'' لڑکا بھاگ کر منرل واٹر کی بوتل نکال لیا۔ چند گھونٹ بھر کر اس نے بسکٹ بھی اٹھا لیے تھے۔ جوس بھی لے لیا۔

اپنے ایسوسی ایٹ عدیل احمد سے فون پر بات کرتے فارس کی نظر یکا یک اس پر پڑی اور وہ رک گیا۔ کیا کہہ رہا تھا یہ بھی بھول گیا۔

جوس کے ساتھ بسکٹ کھاتے ہوئے وہ چیزیں اٹھا اٹھا کر دیکھ رہی تھی۔ ان کی قیمت پوچھ رہی تھی۔ اپنی رائے عامہ سے بھی آگاہی دے رہی تھی۔ تیرہ چودہ سال کا پٹھان لڑکا بڑھ چڑھ کر اس کی خدمت داریوں میں لگا ہوا تھا۔

فارس کی رگیں تن گئیں۔ جبڑے بھنچ گئے۔

''کیا اس بے حس لڑکی کو ذرا سا بھی احساس ہے کہ موت اسے قریب سے سلام دعا کر کے گئی ہے؟''

''باجی اور کچھ چاہیے آپ کو؟'' پٹھان لڑکا بہت خوش تھا۔ مستعدی سے اپنا ہر کام سرانجام دے رہا تھا۔

''ہاں ذرا وہ لیز کی چپس بھی لے آو۔ اور یہ چلی ملی یہ نئی آئی ہیں کیا؟ پہلے تو کبھی نہیں دیکھیں۔ اور اس کا فلیور کیسا ہے؟'' اب وہ کچھ اور اٹھا کر پوچھ رہی تھی۔

''یہ بچہ لوگ کھاتا ہے باجی۔ ام کو نئی مالوم (معلوم)۔''

''اور یہ کتنے کا ہے۔''

''دس روپے باجی!''

''دس روپے؟ پانچ کی دو گے تو لوں گی۔''

''سر آپ کچھ کہہ رہے تھے۔'' عدیل احمد کی آواز پر وہ سر جھٹک کر فون کی طرف متوجہ ہوا۔

''باجی ابھی تم بولا تمہارا سر میں درد ہے۔ ہمارا اماں بولتا ہے سر درد ہو تو کھٹی چیز نئی کھانی چاہیے۔''

عدیل احمد کو ضروری ہدایات دے کر وہ مڑا تو زرد رنگت اور سرخ پڑتی آنکھوں کے ساتھ جنت کمال تیسرا چپس کا پیکٹ کھول رہی تھی۔

''یہ تمہارا اسٹور ہے خان؟''

''نئی باجی، یہ گل خان کا اسٹور اے۔ ام پکوڑے بیچتا اے۔'' پکوڑے بیچنے سے ہی اسے کچھ یاد آیا تو فٹ سے بولا۔

''آج تم بھی بچ گیا۔ ام بھی بچ گیا۔''

جنت نے کچھ حیران ہو کر اسے دیکھا تھا۔

''وہ جہاں تمہارا گاڑی کھڑا تھا نا۔ ام ادھر روز پکوڑے بیچتا اے۔ لیکن آج بارش تھا اس لیے آج ہم نئی بیچا۔ اگر بارش نہ ہوتا تو ام ادر کھڑا ہوتا۔ اور پھر ہمارا اماں رو رہا ہوتا۔''

سانس روکے جنت اسے دیکھ کر رہ گئی۔

''شکر ہے، تمہارا گاڑی بھی خالی تھا۔ شکر اے۔ ام بھی وہاں نہیں تھا۔'' اس نے سر ہلا ہلا کر خوشی کا اظہار کیا تھا۔

''تمہیں لگتا ہے، اللہ نے ہمیں بچایا ہے؟''

بہت محتاط ہو کر، اور خاصی سوچ و بچار کے بعد اس نے بظاہر پست آواز میں پوچھا تھا۔ مگر آواز اتنی بھی پست نہ تھی کہ فارس وجدان کی سماعتوں سے نہ ٹکراتی۔

''ہاں۔ اللہ کا بوت بوت شکر باجی!''

''ایسا بھی تو ممکن ہے کہ یہ ایک وارننگ ہو۔ میرے لیے۔ تمھارے لیے۔ یا شاید کسی اور کے لیے۔''

لڑکے نے اچنبھے سے جنت کو دیکھا۔

''وارننگ...... کیسا وارننگ...... واللہ ام بوت اچھے پکوڑے بناتا ہے، صفائی کا بھی بوت خیال رکھتا ہے۔ کسی دن کھا کر دیکو (دیکھو)۔''

فارس وجدان نے عین اس وقت اس کے اور لڑکے کے مابین حائل اس چھوٹی سی میز پر جوس پٹخا تھا۔ ''کتنے کا ہے؟'' دانت پیس کر قیمت پوچھی جا رہی تھی۔

لڑکے نے سر اٹھا کر فارس کو دیکھا۔ اس گاہک کو تو وہ یکسر فراموش ہی کر بیٹھا تھا۔

جنت نے گردن سیدھی کی۔ ناگواری سے اسے دیکھا پھر رخ بدل گئی۔

پٹھان لڑکا اب فارس کی خدمت داریوں میں لگ گیا تھا۔

وہ پچھلے ڈیڑھ گھنٹے سے میز پر ہیڈ ڈاؤن کیے بیٹھی تھی۔ نہ نیند آ رہی تھی۔ نہ سکون مل رہا تھا۔ سلگتی ہوئی متورم آنکھیں بھی اب تکلیف پہنچانے لگی تھیں۔

پٹھان لڑکا اس کے لیے چائے لے آیا تھا۔ ٹیبلٹ وہ لے چکی تھی مگر اس کی طبیعت تھی کہ کسی بھی صورت سنبھلنے میں نہیں آ رہی تھی۔ جسم میں اب مروڑ اٹھ رہے تھے۔ کوئی ایسا انتظام بھی نہ تھا کہ وہ دراز ہو کر سو جاتی۔

''صاب تمارا آدمی کب آئے گا۔'' پٹھان لڑکا صرف ان کی ہی وجہ سے اسٹور بند نہیں کر رہا تھا۔

فارس نے کلائی موڑ کر وقت دیکھا۔ اس کے اندازے کے مطابق عدیل کو اب تک پہنچ جانا چاہیے تھا۔ کچھ سوچ کر اس نے موبائل نکالا۔ اور اس سے قبل کہ وہ کال کرتا، سیاہ مرسڈیز اسٹور کے سامنے آ رکی تھی۔ ہیڈ لائٹس کی تیز روشنی گلاس ڈور پر پڑی۔ ہارن بھی بجا۔ اور موبائل پر کال بھی آنے لگی۔

جنت نے بے ساختہ سر اٹھاتے ہوئے باہر دیکھا۔ سامنے دو گاڑیاں تھیں۔ ایک میں عدیل اور دوسری گاڑی میں اس کے گارڈ سوار تھے۔

''ازایوری تھنگ آل رائٹ سر۔'' عدیل اندر آ گیا تھا۔ اسے ایکسیڈنٹ کی تفصیلات سے آگاہ کرتے ہوئے وہ دروازے میں ہی کھڑا رہا تھا۔ عدیل ہدایات لے کر پلٹ گیا تو اس نے سرسری نگاہوں سے جنت کو دیکھا جو اپنی جگہ سے اٹھ کر اسی طرف آ رہی تھی۔

فارس کے قریب سے گزرتے ہوئے، اسے یک دم اپنا سر گھومتا ہوا محسوس ہوا، اس سے قبل کہ وہ لڑکھڑا کر گرتی فارس نے بروقت اسے بازو سے پکڑ کر سنبھال لیا۔

فارس کی یہ حرکت اتنی غیر متوقع اور اچانک تھی کہ جنت کو سنبھلنے میں۔ اور پھر سنبھل کر سمجھنے میں چند لمحے لگے۔ اگلے ہی لمحے اس نے شدید غصے کے عالم میں بدک کر اپنا بازو یوں چھڑایا جیسے اسے سانپ نے پکڑ لیا ہو۔

دیوار کا سہارا لے کر۔ اپنا توازن برقرار رکھتے ہوئے اس نے سخت پتھریلی نگاہوں سے اسے دیکھا۔

''میرا ہاتھ کیوں پکڑا تم نے؟'' اب کے اس کا سوال، رویہ اور تاثرات فارس وجدان کے لیے غیر متوقع تھے۔ وہ اس پوزیشن میں ہرگز نہیں تھی کہ اس سے بحث مباحثہ کر سکتی۔ بخار کی شدت سے جسم تپ رہا تھا۔ آنکھیں دھندلا ہو رہی تھیں۔ سر گھوم رہا تھا۔ اور تب بھی وہ سمجھ رہی تھی کہ اگر کوئی بے وقوف اسے گرنے سے بچا رہا ہے تو اس کے حق میں غلطی کر رہا ہے۔

فارس کے جبڑے بھنچ گئے۔ عدیل احمد اور

گارڈز کے سامنے جس طرح وہ اس کے ساتھ پیش آئی تھی، وہ بمشکل ضبط کیے کھڑا تھا ورنہ دل چاہ رہا تھا ایک تھپڑ تو لازمی جڑ دے اسے۔۔

''باجی! یہ لڑائی وڑائی ختم کرو۔ تمارا طبیعت خراب ہے۔ تم گر جائے گا۔'' پٹھان لڑکے نے ہی اسے کام ڈاؤن کرنے کی کوشش کی تھی۔ ان دو گھنٹوں میں ان کے لیے دیے رویے سے وہ اتنا تو جان ہی چکا تھا کہ کوئی اعلا اور غیر معمولی قسم کی دشمنی ہے جو ان دونوں میں جانے کب سے چلی آ رہی ہے۔

''مجھے اب گرنے سے ڈر نہیں لگتا خان۔'' فارس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے وہ درشتی سے بولی۔ ''میں پندرہ دن پہلے پارکنگ ایریا میں گری تھی۔ پھر خود اٹھ کر۔ اور خود چل کر بھی گئی تھی۔ اب بھی گروں گی تو خود اٹھ کر جانے کی ہمت ہے مجھ میں۔''

''میں بھی کوئی مرا نہیں جا رہا تھا تمہارا ہاتھ پکڑنے کے لیے۔'' فارس نے دبی آواز میں جھڑک کر کہا۔

بگڑے تیوروں کے ساتھ جنت نے فٹ سے چھتری کھول دی۔ اگر فارس بروقت اپنا سر پیچھے نہ ہٹاتا تو نوک اس کے سر میں ضرور لگتی۔۔

وہ پھولے نتھنوں اور بگڑے تیوروں کے ساتھ سنبھل کر قدم اٹھاتی باہر نکل گئی۔ گاڑی تک پہنچنے سے پہلے اس کا پاؤں پھسلا تھا (حالانکہ وہ کتنے احتیاط سے قدم اٹھا رہی تھی)

اور وہ ایک بار پھر نیچے گری تھی۔ بہت بری طرح سے۔ دبی دبی کراہ اس کے حلق سے خارج ہوئی۔ اوپر سے بارش کی بوچھاڑ جس نے چند سیکنڈ میں ہی اسے مکمل بھگو دیا تھا۔ چھتری جانے کہاں غائب ہوئی تھی۔

پٹھان لڑکے نے بے ساختہ پیشانی کو چھوا۔ جیبوں میں ہاتھ ڈالے سیڑھیوں پر کھڑا فارس وجدان اب کے اس کی مدد کو نہیں آیا تھا۔ اس کے چہرے پر مکمل اطمینان تھا۔

''کھڑوس سے میری ہمت برداشت نہیں ہوئی نظر لگا دی۔''

وہ اپنی کہنی سہلاتے ہوئے مسلسل رو رہی تھی۔ جانے کیا سوچ کر۔ جانے کیا سمجھ کر۔ اور جانے اور کتنی تکلیفوں پر۔ حالانکہ اسے فارس وجدان کے سامنے نہ کبھی رونا تھا۔ نہ کمزور پڑنا تھا۔ لیکن یہ غم کہ وہ گری۔ آخر وہ فارس وجدان کے سامنے ہی کیوں گری؟ کیوں؟

اور تب ہی اس نے فارس کو زینہ اتر کر اپنی طرف آتے دیکھا۔ لبوں پر طنزیہ مسکراہٹ تھی۔ جنت کا چہرہ خفت سے سرخ پڑ گیا۔

اس کے سر پر پہنچ کر فارس نے اپنا ہاتھ بڑھایا۔ خیرات کی طرح۔۔ کہ لو۔ خود سے پکڑو تا کہ تمہیں اس پچویشن سے نکالا جا سکے۔

وہ بھی جنت کمال تھی۔ تنفر سے اس کا ہاتھ جھٹک کر بغیر کسی مدد، بغیر کسی سہارے کے خود سے ہی اٹھ کھڑی ہوئی۔

کوئی ہڈی وڈی نہیں ٹوٹی تھی کہ اسے اب بھی کسی سہارے کی ضرورت پڑتی۔ چوٹیں ہی تو آئی تھیں۔ اور چوٹیں تو اسے ہمیشہ آتی رہتی تھیں۔ اس سے بھی تو مشکل ترین وقت دیکھا ہوا تھا اس نے۔ تو پھر ایسے کیسے کمزور پڑ جائے۔

کیچڑ سے لت پت کپڑوں کے ساتھ مکمل طور پر بھیگی ہوئی اب وہ اپنے قدموں پر کھڑی تھی۔ دل چاہا اب تو چیخ کر رو پڑے۔ لیکن اس نے صبر کا مظاہرہ کیا اور گاڑی کا دروازہ کھول کر دھپ سے اندر بیٹھ گئی۔ دروازہ اس نے زور سے بند کیا تھا۔

پٹھان لڑکے نے سکھ بھرا سانس لے کر گلاس ڈور بند کیے، شٹر گرایا اور یہ جا وہ جا۔

عقبی نشست کا دروازہ کھول کر فارس اس کے برابر میں بیٹھا تو اس نے دانستہ اپنے چہرے کا رخ کھڑکی کی طرف موڑ لیا۔ اس کی شکل ایسی ہو رہی تھی جیسے وہ خوب دل کھول کر رونا چاہتی ہو مگر کسی وجہ سے رو نہ پا رہی ہو۔

"جی سب ٹھیک ہے ممی۔ آپ پریشان مت ہوں۔" فارس نے رک کر فون پر کچھ سنا۔۔
"کچھ لوگ بارش میں کرتب دکھانا چاہ رہے تھے تو بس وہی دیکھتے دیر ہوگئی۔"
جنت نے ضبط کر کے مٹھیاں بھینچ لیں۔
فارس نے کلائی موڑ کر وقت کا حساب لگایا۔
"ہم بس ڈیڑھ دو گھنٹے تک پہنچ جائیں گے۔"
پھر اس نے اللہ حافظ کہتے ہوئے کال کاٹ دی تھی۔
جنت کی رنگت سفید ہو رہی تھی۔ ہونٹ نیلے پڑ گئے تھے۔ ٹھنڈک کا احساس ہڈیوں میں گھستا محسوس ہو رہا تھا۔ لیکن وہ سر اٹھائے یوں بیٹھی تھی جیسے بس شوقیہ ہی کپکپا رہی ہو۔
عدیل احمد نے گاڑی اسٹارٹ کر دی۔ مین روڈ پر گاڑی ڈالنے تک سب ٹھیک تھا۔ پھر جب گاڑی نے سرعت پکڑی تب بھی وہ گردن اٹھائے شیشوں پر پھسلتی بارش کو بڑے سکون کے ساتھ دیکھ رہی تھی۔ اس کے بعد جانے کیا ہوا اس کی آنکھیں بند ہونے لگیں۔ سر ڈھلک کر شیشے سے جا لگا۔ ہاتھ بے جان ہو کر پہلو میں گرے۔ اور اسے اپنے آس پاس کا کوئی ہوش نہ رہا۔

☆☆☆

پکے صحن کی مضبوط سیڑھیوں کا منظر تھا۔ سفید ٹائلز پر ڈھیر ہوتے کسی وجود کی کراہ کی۔ صدمہ۔ وحشت۔ بے یقینی۔ اور پھر وہی آواز جو اس کے حواس مختل کر دیا کرتی تھی۔ ایک چھماکے سے کانچ ٹوٹا تھا۔ شیشے کے ٹکڑے بکھرے تھے۔ چیخیں ابھری تھیں۔
"جنت نہیں۔ جنت پلیز۔ خدا کے لیے۔ جنت میرا بچہ!"
اسے سانس لینے میں دشواری ہو رہی تھی۔ بخار کی حدت سے تپتا وجود درد کی لپیٹ میں تھا۔ تکلیف کی شدت سے کراہتے ہوئے اس نے بے چینی سے کروٹ بدلی۔ پھر زیر لب بڑبڑاتے ہوئے رونے لگی۔ ذہن ایک بار پھر غنودگی میں ڈوب گیا تھا۔
دوبارہ جب اسے ہوش آیا تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اسے بھوک کا شدت سے احساس ہوا۔ منہ کا ذائقہ زہریلا سا ہو رہا تھا۔ اس نے اطراف میں نگاہ دوڑائی۔
کمرے کی کھڑکیوں پر دبیز پردے گرے ہوئے تھے، لائٹس آف تھیں صرف نیلگوں بلب جل رہا تھا۔ ہیٹر آن تھا تب ہی کمرے میں سردی کا احساس نہیں ہو رہا تھا۔ گہرا تنفس لیتے ہوئے وہ کسی قدر کوشش سے اٹھ کر بیٹھ گئی تھی۔ آخری منظر جو ذہن میں محفوظ تھا وہ گاڑی کا تھا۔
مدھم سی نیلگوں روشنی میں فارس اسے سامنے کاؤچ پر نیم دراز دکھائی دیا۔ آنکھیں بند تھیں۔ تنفس ہموار۔ یقیناً گہری نیند میں تھا۔
جنت نے داہنے ہاتھ پر نگاہ دوڑائی۔ کینولا موجود تھا۔ ڈرپ اتر چکی تھی۔
اس نے بیڈ سائڈ پر رکھی دواؤں کو دیکھا۔ پھر الجھے بکھرے بالوں کو سمیٹ کر فرش پر قدم جماتے ہوئے اٹھ کھڑی ہوئی۔ لمحے بھر کے لیے لڑکھڑائی پھر سنبھل گئی۔
اس کا رخ واش روم کی طرف تھا۔ واش بیسن کے سامنے رک کر اس نے خود کو آئینے میں دیکھا۔ چہرے کی زرد جلد کو چھوا۔ سرخ ڈوروں والی بھیگی ہوئی آنکھوں کو دیکھا۔ بے ساختہ کسی خیال کے تحت سفید لبادے کی کھلی ڈھیلی آستین کو اوپر کیا۔
بازو پر موجود زخم کی بینڈیج کی گئی تھی۔ اس نے بینڈیج ہٹا کر دیکھا۔ چار ٹانکے لگے تھے۔ وہ ایک بار پھر اپنے عکس کی طرف متوجہ ہوئی۔ پیشانی پر نیل کا نشان کچھ گہرا لگنے لگا۔ اسے فکر ہوئی۔ مسز شیرازی سے چھپانا اشد ضروری تھا۔ ورنہ وہ دیکھ کر سوال کریں گی۔ سوال اذیت سے دوچار کرے گا۔ اذیت حکایتوں میں ڈھل کر آنکھوں میں عیاں ہوگی اور پھر اس کا کوئی بھی جھوٹ انہیں مطمئن نہیں کر پائے گا۔
منہ دھو کر وہ کمرے میں واپس آ گئی۔ گرم شال

کندھوں پر ڈالتی بے حد احتیاط سے باہر نکل گئی۔ سیڑھیاں اتر کر اس نے کچن کا رخ کیا تھا۔ کچھ ہی دیر میں فریزر کھولے سرخ و متورم آنکھوں سے کھانے کے لیے کچھ دیکھ رہی تھی۔

چکن کڑھائی، فرائیڈ فرائیڈ فش۔ اس نے مائیکروویو میں کھانا گرم کیا اور ابھی کرسی کھینچ کر کھانے کے لیے بیٹھی ہی تھی کہ قدموں کی آہٹ سماعت سے ٹکرائی۔ نوالہ توڑ کر سالن میں ڈبوتے ہوئے وہ دیکھے بنا ہی جان گئی تھی کہ رات کے اس پہر سیڑھیاں اتر کر نیچے کون آرہا تھا۔

پہلے فریزر کھولا گیا۔ دودھ نکالا گیا۔ کیبنٹ کھول کر پتی اور چینی کے جار تلاشے گئے۔ برنر جلایا گیا۔

اور اس دوران وہ اطراف سے یکسر بے نیاز خاموشی سے کھانا کھاتی رہی۔

چائے کپ میں ڈالے وہ سیدھا لاؤنج میں جا کر بیٹھ گیا تھا۔ اوپن کچن سے وہ با آسانی دیکھ سکتی تھی۔ ٹی وی آن کیے۔ چینل سرفنگ کرتے وہ گھونٹ گھونٹ چائے اپنے اندر اتار رہا تھا۔

جنت نے بس ایک لمحے کے لیے اس کی پشت کو دیکھا پھر سپاٹ تاثرات کے ساتھ سینک میں استعمال شدہ پلیٹیں رکھ کر اپنے کمرے میں آگئی۔

بیڈ سائڈ ٹیبل پر دواؤں کے ساتھ اوقات کی نشاندہی کرتے نوٹ چسپاں تھے۔ کون سی ٹیبلٹ کس وقت لینی ہے اور دن میں کتنی بار لینی ہے سب درج تھا۔

لب بھینچ کر وہ گلاس میں پانی انڈیلنے لگی۔

دوا لینے کے بعد اس نے اپنا لحاف اور تکیہ اٹھایا اور ایک بار پھر اپنی سابقہ جگہ۔ یعنی صوفے پر جا کر لیٹ گئی۔ پھر جانے کب اس کی آنکھ لگ گئی تھی۔

اور کھلی تب تھی جب کسی نے کندھا ہلاتے ہوئے پکارا تھا۔ آواز غیر مانوس تھی۔ آنکھیں کھول کر اس نے خود پر جھکے چہرے کو دیکھا۔ کچھ دھندلا سا تھا۔

''کیا بات ہے؟'' آواز بھاری تھی۔

''اب کیسی طبیعت ہے آپ کی؟''

جنت نے اس لڑکی کو دیکھا جو گرم کپڑوں پر سیاہ رنگ کے سویٹر میں ملبوس، دوپٹا سلیقے سے جمائے چمکتی روشن آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی۔

''کون ہو تم؟''

''میں...... اقصیٰ ہوں جی!''

''اقصیٰ کون؟'' حواس کچھ بیدار ہوئے تو وہ اٹھ کر بیٹھ گئی۔

''عبدالغفور کی بیٹی۔''

عبدالغفور ان کے مالی تھے۔ خود شہر میں کام کرتے تھے مگر فیملی گاؤں میں رہتی تھی۔

اقصیٰ اب کچھ متفکر نگاہوں سے اسے دیکھنے لگی۔ ''آپ ٹھیک ہیں جی؟''

''ہاں۔'' چہرے پر دونوں اطراف سے پھسلتے بالوں کو کان کے پیچھے اڑستے ہوئے اس نے کہا پھر سر اٹھا کر کھڑکیوں کی طرف دیکھا۔ دبیز پردے ڈوریوں میں بندھے ہوئے تھے۔ سورج کی تیز روشنی چھن چھن اندر آرہی تھی۔ کتنے دنوں بعد سورج نکلا تھا۔

''آپ کے لیے کچھ کھانے کے لیے لاؤں؟ چکن سوپ بنایا ہے جی، میٹھے میں کھیر بھی بنائی ہے۔''

جنت نے بے ساختہ داہنے ہاتھ کی پشت پر نگاہ دوڑائی۔ کینولا اتر چکا تھا۔ سنی پلاسٹ لگا تھا۔

''میں یہاں کب آئی تھی؟''

''پرسوں شام میں آپ کو صاحب لائے تھے۔''

''صاحب لائے تھے؟'' پھانس کی طرح کوئی شے جنت کے حلق میں اٹکی۔ ''کیسے لائے تھے؟''

''اٹھا کر لائے تھے جی۔ اور کیسے لاتے؟'' وہ حیران ہو کر جنت کو دیکھنے لگی۔ جنت کا رنگ اڑا۔

''آپ کی اتنی طبیعت خراب تھی۔ جسم مانو آگ میں جل رہا تھا۔'' اقصیٰ نے بات جاری رکھی۔ ''میں ساری رات بیٹھ کر ٹھنڈے پانی کی پٹیاں ہی

کرتی رہی۔ پھر فارس صاحب نے ڈاکٹر کو بلایا۔ تب جا کر آپ کا بخار کم ہوا۔" بڑے سنسنی خیز انداز میں چہرے کے تاثرات کے اتار چڑھاؤ کے ساتھ اپنی بات مکمل کر کے اس نے جنت کو دیکھا۔

وہ حیرت سے اقصیٰ کو دیکھ کر رہ گئی۔ گزشتہ چوبیس گھنٹوں کا تو اس کے پاس کوئی حساب ہی نہ تھا۔ نہ ہی اسے کچھ یاد تھا۔ وہ چند لمحوں تک خالی الذہنی کیفیت میں بیٹھی رہی پھر اس نے اٹھ کر شاور لیا۔

کپڑے بدل کر اس نے معمول کی طرح برش سے بالوں کو سلجھا کر کیچر میں جکڑا۔ سویٹر پہنا۔ شال اوڑھی۔

پھر اقصیٰ کے ہمراہ نیچے آ گئی۔

ہمت مجتمع کرتے ہوئے اس نے مسز شیرازی کے کمرے کا رخ کیا تھا۔ دستک دے کر دروازہ کھولا تو وہ سامنے ہی بیڈ پر بیٹھی دکھائی دیں۔ آنکھوں پر گلاسز لگائے کوئی کتاب پڑھ رہی تھیں، جنت پر نظر پڑتے ہی انہیں خوش گوار حیرت نے گھیر لیا۔

"جنت۔ بیٹا! باہر کیوں کھڑی ہو، اندر آؤ۔" لہجے میں کتنا پیار تھا اور آنکھوں میں کتنی فکر تھی۔ بھاری قدم اٹھاتی وہ بے حد خاموشی سے ان کی بانہوں میں سما گئی تھی۔

"جو کچھ سن چکا ہوں وہ سب ممی کو بتاؤں گا تو وہ کیا سوچیں گی؟ ایک ایسی لڑکی کو بہو بنا بیٹھی ہیں جو infertile (بانجھ) ہے۔ جس نے اپنی سوتن کے بچے کی جان لینے کی کوشش کی ہے۔ جس کے خاندان کے لوگ اسے اچھوت کی طرح ٹریٹ کرتے ہیں۔ اور جو اپنی ماں کی موت کا سبب بنی ہے۔"

کتنی ہی دیر تک وہ ان کے سینے سے لگی رہی تھی۔ اور پھر کتنی ہی دیر تک ان کی آنکھوں سے جھلکتی اس محبت کو بھی دیکھتی رہی جو وقتی انعام اور ادھورے خواب جیسی تھی۔

"اب کیسی طبیعت ہے؟" انہوں نے اس کا سر، اس کا ماتھا چوما تھا۔

اس نے پلکیں جھپکا جھپکا کر آنکھوں میں ابھرتی نمی کو روک لیا۔ "بہتر ہے۔"

انہوں نے مزید کچھ نہ پوچھا، کوئی بات نہ کہی، کوئی سوال نہ دہرایا، بس اسے بازو کے حصار میں لیے جانے کیا کچھ پڑھ کر اس پر پھونکتی رہیں۔

"نظر لگ گئی ہوگی۔ اس دن میری بیٹی پیاری بھی تو بہت لگ رہی تھی۔"

"جو بددعاؤں کے زیر اثر رہتے ہوں۔ انہیں نظر نہیں لگا کرتی۔" مگر وہ یہ بات مسز شیرازی کو نہیں بتا سکتی تھی۔

کچھ وقت ان کے پاس خاموشی سے بتا کر وہ آرام کی غرض سے کمرے میں آ گئی تھی۔

ایک بار پھر اس نے پرسکون رہنے کی کوشش کی تھی۔ اور ایک بار پھر بند آنکھوں نے اس کی ہر کوشش ناکام بنا دی تھی۔ اور وہ پھوٹ پھوٹ کر رو دی تھی۔ وہ مسز شیرازی کو کسی بھی صورت پریشان نہیں کرنا چاہتی تھی۔ انہیں کسی گہری اذیت یا صدمے سے دوچار نہیں کرنا چاہتی تھی۔ وہ ان کی آنکھوں میں اپنے لیے نفرت، ناگواری جیسے تاثرات نہیں دیکھ سکتی تھی اور نہ ہی ان کی دعاؤں، محبت اور شفقت کے سائے محروم ہونا چاہتی تھی۔

وہ جانتی تھی فارس نے انہیں کچھ بھی نہیں بتایا ہوگا۔ وہ اپنی ماں سے بے پناہ محبت کرتا تھا۔ اور جب یہ طے تھا کہ کسی ڈیل کی طرح طے کیے گئے اس رشتہ نے بھی ختم ہو ہی جانا ہے تو وہ گھر میں خواہ مخواہ کی ٹینشن پیدا نہیں کرنا چاہے گا۔ وہ اب بھی اس پر کوئی دباؤ نہیں ڈالے گا۔ اس پر سختی نہیں کرے گا۔ روزمرہ معمولات کو ویسے ہی چلنے دے گا جیسے وہ پہلے سے چل رہے تھے۔ پچھلے تین ماہ کی روٹین قائم رہے گی۔ سخت ناگواری، ناپسندیدگی اور غصے کے باوجود وہ اب بھی اس پر کوئی رعب نہیں جمائے گا۔ وہ اب بھی اپنی ماں کی خاطر اسے اتنا مارجن دیے رہے گا کہ وہ اس گھر میں اپنی مرضی و منشا سے ویسے ہی زندگی گزار سکے جیسی وہ پہلے گزار رہی تھی تا کہ ان کے مابین تعلق

کی نوعیت کی انہیں خبر نہ ہو۔
مگر کیا اب وہ پہلے کی طرح وجدان ہاؤس میں رہ پائے گی؟ یہ ایک مشکل سوال تھا۔ اس کی ساری کوششیں اس رشتے کو برقرار رکھنے کے لیے تھیں۔ مگر اب اسے یہ ناممکن لگ رہا تھا۔ مستقبل کے حوالے سے اس نے بہت کچھ سوچ رکھا تھا۔ مگر اب اسے اندھیروں کے سوا کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔
وہ ناقص۔ ادھوری۔ نامکمل...... وہ کسی کی زندگی کا حصہ نہیں بن سکتی تھی۔ محبتوں پر اس کا حق نہیں تھا۔ قدرت اس پر مہربان نہیں تھی۔
زندگی گزارنے کے لیے امید چاہیے۔ اور امید کو بھی تو۔ ایک امید چاہیے۔
مگر اس کے پاس اب کچھ بھی باقی نہیں رہا تھا۔ وہ خالی ہاتھ ہی دامن تھی۔ اب مستقبل کا کوئی منظر، کوئی خواب، کوئی خیال اسے قدم اٹھانے پر مجبور نہیں کر رہا تھا۔ وہ ایک ہی مقام پر رک گئی تھی۔ تھم گئی تھی۔ ٹھہر گئی تھی۔ اور جمود کا یہ احساس اسے اندر ہی اندر سے ختم کرتا جا رہا تھا۔

☆☆☆

رات کا نہ جانے کون سا پہر تھا جب اس کی آنکھ دروازے کی آواز سے کھل گئی تھی۔ کہنی کے بل اوپر ہوتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھا کر لیمپ آن کر دیا تھا۔ جنت کمرے میں نہیں تھی۔ اس نے پھر ٹیبل کلاک پر وقت دیکھا جو رات کے ڈھائی بجا رہی تھی۔ وہ اسی وقت اٹھ کر کمرے سے باہر آ گیا۔ راہداری سے لاؤنج کا جائزہ لینے کے بعد اس نے اسٹڈی روم کا دروازہ کھول دیا۔ پھر سیڑھیاں اتر کر نیچے آ گیا۔
ایک بار اطراف کا جائزہ لیتے اس نے کچن کا رخ کیا، لائبریری، اسٹوڈیو۔ ڈائننگ ہال۔ سٹنگ روم۔ اس نے ہر جگہ دیکھ لیا مگر جنت کہیں نہیں تھی۔ جھنجلاہٹ کے عالم میں وہ صدر دروازہ کھولے باہر آ گیا تھا۔
سامنے ہی وہ شدید سردی میں لحاف اوڑھے سیڑھیوں پر بیٹھی دکھائی دے گئی تھی۔
فارس وجدان کے جبڑے بھنچ گئے تھے، آنکھوں میں ناگواری کے ساتھ ساتھ سختی اتر آئی تھی۔ غصے سے قدم اٹھاتے ہوئے وہ اس کے پاس آیا تھا۔ اور پھر اسی غصے اور بے دردی سے اسے بازو سے پکڑ کر کھینچتے ہوئے اندر لے آیا تھا۔
دروازہ بند کر کے وہ اس کی طرف مڑا تو وہ سر جھکائے خالی خالی نظروں سے فرش کو تک رہی تھی۔۔
''اب کیا چاہتی ہو تم؟'' سانپ کی طرح پھنکار کر اس نے پوچھا تھا۔ ''اب کون سا نقصان ہے جو کرنا باقی ہے؟ یہی چاہتی ہو ممی تمہاری وجہ سے بیمار پڑ جائیں؟'' بازو سے پکڑ کر اس نے بے دردی سے جھنجھوڑا تھا۔ جنت کا سر تب بھی جھکا رہا تھا۔ لبوں پر قفل تھا۔ آنکھوں میں ویرانی ہی ویرانی تھی۔
فارس کا بس نہیں چل رہا تھا، وہ اسے تھپڑ لگا دے۔
مسز شیرازی اس کی غیر معمولی خاموشی کو، اس کی آنکھوں کی ویرانی کو، اور چہرے کے مسخ شدہ تاثرات کو طبیعت خرابی پہ محمول کر رہی تھیں۔ لیکن فارس جانتا تھا وہ ٹھیک تھی۔ جان بوجھ کر اور صرف توجہ لینے کے لیے یہ سب کر رہی تھی۔ ڈرامے باز تھی۔ سچویشن کو اپنی مرضی سے استعمال کرنا اسے آتا تھا۔ وہ مسز شیرازی کو اس معاملے میں انوالو کرنا چاہ رہی تھی۔ جانے کیسی لڑکی تھی؟ کیسی سوچ رکھتی تھی؟
''میں اگر خاموش ہوں تو صرف اس لیے کہ میں ممی کو ٹینشن نہیں دینا چاہتا۔'' اس نے شدید غصے کے عالم میں اس پر واضح کیا تھا۔ ''تمہیں ان کا ذرا سا بھی احساس ہے؟''
وہ خاموش رہی تھی۔
''میری جگہ کوئی اور ہوتا تو ایک لمحے کے لیے بھی تمہیں اس گھر میں برداشت نہ کرتا۔'' اس نے جھٹکے سے بازو چھوڑ کر دبی آواز میں کہا۔
''آخری بار کہہ رہا ہوں، اپنا یہ حلیہ اور رویہ درست کرو ورنہ میں خود ممی کو تمہاری اصلیت بتا کر

اس گھر سے فارغ کر دوں گا! کم از کم روز روز کی ٹینشن سے تو جان چھوٹے گی۔" زیر لب بڑبڑاتے ہوئے وہ سیڑھیاں چڑھنے لگا تھا۔ جنت نے سر اٹھا کر اسے جاتا دیکھا۔

آنکھوں میں یک دم نمی تیرنے لگی۔

☆☆☆

فارس کی دھمکی کا اثر تھا یا مسز شیرازی کی فکر۔ اس نے خود سے لڑ کر، خود کو کسی حد تک سنبھال لیا تھا۔ وہ ہشاش بشاش اور کچھ حد تک فریش نظر آنے لگی تھی۔ ویسے ہی انہیں وقت دینے لگی تھی جیسے لاہور جانے سے پہلے وہ گزشتہ تین ماہ سے دیتی آ رہی تھی۔ لان میں گھومنا، کتابیں پڑھنا، اکٹھے نماز پڑھنا، آیات کو ڈسکس کرنا، دنیاوی خبروں پر تبصرے کرنا۔ لیکن در پردہ بہت سے کام ایسے بھی تھے جو اس نے چھوڑ دیے تھے۔

اس نے فارس کے معاملات میں مداخلت حتمی طور پر بند کر دی تھی۔ اور اب اس کا سامنا بھی وہ کم سے کم کرنے لگی تھی۔ کمرے میں تب ہی آتی جب وہ سو چکا ہوتا۔ صبح اس کے بیدار ہونے سے پہلے ہی اٹھ جاتی۔ آمنا سامنا صرف ناشتے کی ٹیبل پر یا رات کے کھانے پر ہوتا اور اس دوران وہ بھولے سے بھی نظر اٹھا کر اسے نہ دیکھتی۔ اب فارس کے بیڈ روم میں نہ تازہ پھول سجتے تھے نہ معطر خوشبو بکھرتی تھی۔ نہ کمرے کی سیٹنگ بدلتی تھی نہ اس کی اشیا کو ہاتھ لگایا جاتا تھا۔ آہستہ آہستہ اس نے ڈریسنگ ٹیبل سے اپنا میک اپ کا سامان بھی ہٹا دیا تھا۔ دیواروں کو بھی پینٹنگز سے محروم کیا تھا۔ بیڈ شیٹس، کھڑکیوں کے پردے بھی اس نے بدلوا دیے تھے۔ ایک ایک کر کے اس نے اپنی ہر نشانی اس کمرے سے مٹائی تھی۔ ایک ایک کر کے اس نے اپنی ہر چیز وہاں سے ہٹائی تھی۔ اب اسے فارس کے کمرے میں اپنی پسند اور مرضی کی کوئی چیز چاہیے بھی نہیں تھی۔

اب جب قدم لہولہان ہوئے تھے تو وہ اپنے ہاتھوں سے ہی ہر زنجیر توڑ کر، خود کو آزاد کرنا چاہ رہی تھی۔ مگر یہ آزادی۔ آہ یہ آزادی۔

سوچ اور خیالات میں غلطاں۔ وہ کب کیسے چلتی ہوئی نماز والے کمرے میں آ گئی تھی اسے نہیں پتا تھا۔

سر بسجود کتنی ہی دیر تک وہ سسکیاں لے لے کر روتی رہی تھی، اسے اندازہ نہیں تھا۔ اور جب سر اٹھاتے ہوئے سیدھی ہوئی تھی تو نم آنکھوں کے ساتھ اپنی جگہ تھم کر رہ گئی تھی۔ دروازے میں ہی مسز شیرازی موجود تھیں۔ انہوں نے اس کا آنسوؤں سے تر چہرہ دیکھا۔ آنکھوں میں لہراتا کرب دیکھا۔

جنت اپنی جگہ منجمد ہوئی بیٹھی تھی۔ آنسو آنکھوں میں ٹھہرے تھے۔ دل جیسے رکا ہوا تھا۔ شاید وہ اب پوچھ لیں کہ جب سے لاہور سے آئی ہو، اتنی خاموش کیوں ہو؟ زندگی سے خفا کیوں ہو؟ کیا ہو گیا ہے تمہیں؟ کیوں بدل گئی ہو جنت؟ اگر انہوں نے پوچھ لیا تو وہ کیا بتائے گی؟ کیا جواب دے گی؟

"دعا مانگ لی بچے! کافی کی طلب ہو رہی ہے اگر تمہارے ہاتھوں سے بنی مل جائے تو......" مسکراتے ہوئے انہوں نے ایک دم سے یوں کہا جیسے انہیں اس کے آنسو نظر ہی نہ آئے ہوں۔ وہ آنسو اللہ کے سامنے بہائے گئے تھے۔ وہ اللہ کے لیے ہی تھے۔

جنت نے خشک لبوں کو تر کرتے ہوئے انہیں دیکھا۔ پھر اثبات میں بمشکل اپنے سر کو جنبش دی۔

حالانکہ اس نے دعا نہیں مانگی تھی۔ اس نے بس پیشانی ٹکائی تھی اور رونا شروع کر دیا تھا۔ بھلا وہ اسے کیا بتاتی جسے سب علم تھا۔ جو اس کی رگ رگ سے واقف تھا۔

"میں کچن میں ہوں۔" انہوں نے وہیل چیئر کا رخ موڑ دیا تھا۔

آنکھیں آستین سے پونچھتے ہوئے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ نگاہ عسر یسرا کی آیت پر جا ٹھہری۔ بس ایک لمحے کے لیے۔ پھر گالوں پر سے آنسوؤں کا نشان مٹاتی وہ کچن میں آ گئی تھی۔

اس نے مسز شیرازی کو دیکھا۔ گود میں دھری ڈائری انہوں نے کاؤنٹر ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ اور ہاتھ بڑھا کر کچھ لکھ رہی تھیں۔

"تمھارا کیا خیال ہے جنت! محرومیوں پر صبر کیسے آتا ہے؟" کافی بنا کر وہ ان کے پاس آئی تو اپنا مگ اٹھاتے ہوئے انہوں نے قلم رکھ کر پوچھا تھا۔

اس نے انہیں دیکھا۔ فوری طور پر کوئی جواب اس کے ذہن میں نہ آسکا۔

"کیسے آتا ہے؟" کچھ دیر کے بعد اس نے گھونٹ بھرتے ہوئے پوچھا۔ وہ جانتی تھی مسز شیرازی اس ٹاپک پر کچھ لکھ رہی ہوں گی۔ جواب ان کے پاس ہوگا۔ یقیناً ہوگا۔ سوالوں پر غور کرنے والوں کو جواب مل ہی جایا کرتے ہیں۔

"سکون "شکر" سے آتا ہے، شکر "صبر" سے ہوتا ہے، صبر اللہ کی "رضا" میں راضی ہونے کا نام ہے. اور رضا اللہ کی "حکمت" پر بھروسا کرنے سے آتی ہے۔ بھروسا "ایمان" سے اور ایمان "یقین" سے ہوتا ہے۔"

گھونٹ گھونٹ کافی اپنے اندر اتارتے ہوئے وہ انہیں خاموشی سے دیکھنے لگی۔

"ایک محرومی کے ساتھ ڈھیر ساری عطائیں بھی تو ہوتی ہیں، اب مجھے دیکھ لو۔" وہ مسکرائیں۔ "اپاہج ہوگئی ہوں لیکن اللہ نے مجھے بولنے سننے اور دیکھنے کی صلاحیتوں سے محروم نہیں رکھا۔ وہ ایک محرومی بہت بھاری ہے۔ مگر اس کے ساتھ بھی اتنی عطائیں ہیں کہ میں شمار نہیں کر سکتی۔" انہوں نے ایک لمحے کا توقف کیا۔

"جب میں "عطا" پر غور کرتی ہوں تو میرے اندر "شکر" کا جذبہ سر اٹھاتا ہے۔ یہی جذبہ مجھے میری "محرومیوں" پر صبر سکھا دیتا ہے۔ صبر اللہ کی رضا سے جڑا ہے۔ رضاء اللہ کی حکمت پر، اس کی رحمت پر بھروسا کرنا سکھاتی ہے۔ اور میں سوچنے لگتی ہوں کہ یقیناً اس میں میرے لیے بھلائی ہوگی۔ یقیناً اللہ نے مجھے کسی بڑی مصیبت سے بچانے کے لیے اس آزمائش میں ڈالا ہوگا۔ یا مجھے وہ ان حالات سے اسی لیے گزار رہا ہوگا تاکہ وہ بدلے میں مجھے کچھ اچھا اور بہترین عطا کر سکے۔"

مگ پر گرفت مضبوط کیے جنت خاموش بیٹھی تھی۔

"یقین سے ابتدا کرتی ہوں تو "شکر" پا لیتی ہوں، شکر سے آغاز کرتی ہوں تو یقین مل جاتا ہے۔"

کافی کا خالی مگ کاؤنٹر پر رکھ کر انہوں نے ڈائری اٹھالی۔

جنت بھی اپنی جگہ سے اٹھ کھڑی ہوئی تھی۔

"آنٹی!" وہیل چیئر کا رخ موڑتے ہوئے انہوں نے رک کر اسے دیکھا۔

"جی بیٹا!"

"اللہ کی زمین بہت بڑی ہے۔ جو اس کا ہو جائے اس کے لیے کم نہیں پڑتی۔۔ وہ اسے پھر بے گھر نہیں ہونے دیتا، ہے نا؟"

سیڑھیاں اترتے فارس وجدان کے قدموں کی حرکت یک لخت تھمی تھی۔ کچن کاؤنٹر کے اس طرف وہ مسز شیرازی سے مخاطب تھی۔۔

"بے شک۔" انہوں نے وہیل چیئر کا رخ موڑا پھر کچھ سوچ کر رک گئیں۔

"سجدوں میں گرنے والوں کو اللہ کبھی گرنے نہیں دیتا جنت۔"

جنت کی آنکھوں میں نمی ٹھہر گئی۔ بدقت مسکراتے ہوئے اس نے انہیں دیکھا۔

وہ مسز شیرازی کو کیوں فراموش کر بیٹھی؟

اس نے وعدہ کیا تھا وہ انہیں ان کے پوتے سے ملوائے گی۔ اس نے خود سے عہد کیا تھا وہ ان کا ہر لحاظ سے خیال رکھے گی۔ تو پھر اب کیوں ہمت چھوڑ بیٹھی تھی وہ۔

نکاح۔ ایک کانٹریکٹ...... جب تک وہ ہے۔ ہاں تب تک...... تب تک...... اسے مسز شیرازی کے ساتھ ان کی دعاؤں کے سائے تلے رہنا ہے۔

محبتیں ایسی بھی ہوتی ہیں۔ ایسے بھی ملتی ہیں۔

اللہ کے پیاروں سے۔

وہ سرشاری کے عالم میں سوچے جارہی تھی۔

فارس انہیں کبھی بھی اس کے ماضی سے آگاہ نہیں کرے گا۔ ان کی محبت اس کے لیے دائم و قائم ہی رہے گی۔ آنکھوں میں نفرت کا تاثر نہیں ابھرے گا۔ لب دعا سے خالی نہیں ہوں گے۔ وہ اس کے لیے اللہ سے مانگتی ہوں گی۔ وہ ان کے پوتے کے لیے ان کے ساتھ کھڑی رہے گی۔

عقب میں صدر دروازہ کھول کر فارس وجدان باہر چلا گیا تھا۔ جنت کمال اب بھی مسز شیرازی کو ہی دیکھ رہی تھی۔

☆☆☆

اس کی آنکھ کھلی تو رات کا ڈیڑھ بج رہا تھا۔ اٹھ کر بیٹھتے ہوئے اس نے سینے پر دھری کتاب کافی ٹیبل پر رکھ دی تھی۔ لاہور سے واپسی کے بعد اکثر ایسا ہونے لگا تھا کہ وہ سٹنگ ایریا میں ہی سو جایا کرتی تھی۔ اور اب جب شدید سردی کا احساس ہوا تھا تو وہ اٹھ کر کمرے میں آگئی تھی۔

کمرے کے اندر داخل ہوتے ہوئے اسے یکا یک ہی غیر معمولی پن کا احساس ہوا تھا۔ زرکار فانوس اور لیمپ روشن تھے۔ بیڈ پر بے ترتیبی سے کشن یہاں وہاں بکھرے تھے۔ اس کی نگاہیں بے اختیار واش روم کی جانب اٹھ گئی تھیں۔ ادھ کھلے دروازے سے وہ فارس کو واش بیسن پر جھکا دیکھ سکتی تھی۔ وہ کھانستے ہوئے الٹی کررہا تھا۔

نچلا لب یونہی بے خیالی میں دانتوں تلے دباتے ہوئے وہ صوفے پر جا بیٹھی۔ کچھ ہی دیر بعد باہر آیا تھا۔ مدھم سی روشنی میں اس کا چہرہ واضح تھا۔ مضمحل وجود نڈھال لگ رہا تھا۔ رنگت اڑی ہوئی۔ ہونٹ خشک بے رنگ۔ نم آنکھیں بے تحاشا سرخ اور کچھ سوجی ہوئی تھیں۔ کپڑے شکن آلود۔ حلیہ بکھرا ہوا سا۔ وہ قدم اٹھا رہا تھا تو اس کی چال میں واضح لڑکھڑاہٹ تھی۔ پھر وہ کھانستے ہوئے بیڈ پر ڈھے گیا تھا۔

ٹانگوں پر کمفرٹر پھیلاتے ہوئے جنت اسے بیڈ پر بے قراری سے کروٹ بدلتے اور بے طرح کھانستا دیکھ کر کچھ بے چین ہوئی۔

پہلا خیال یہی آیا کہ وہ اس کے معاملے میں نہ ہی پڑے تو ہی بہتر ہے۔ جیسا کہ وہ لاہور سے واپسی کے بعد سے ارادہ کیے ہوئے تھی اور دوسرا خیال یہ تھا کہ اسے اٹھ کر اس کی طبیعت سے متعلق استفسار کرنا چاہیے۔ مگر چاہتے ہوئے بھی اس کی ہمت نہیں ہوئی تھی۔

وہ ایک بار پھر اٹھ کر واش روم میں گیا تھا۔ ایک بار پھر واش بیسن پر جھکا ہوا تھا۔

جنت نے اضطرابی کیفیت میں وال کلاک پر نگاہ دوڑائی۔ کیا ساری رات اس کی یہی حالت رہی ہے؟ وہ باہر آیا تو جنت اس کے سامنے تھی۔ کچھ متفکر اور متامل سی۔

''از ایوری تھنگ آل رائٹ؟'' اس نے ہمت کر کے پوچھا تھا۔

ایک ہاتھ سے دیوار کا سہارا لیتے ہوئے اس نے دروازے کی ناب کو تھامے رکھا۔ بار بار وہ پلکیں یوں جھپک رہا تھا جیسے آنکھوں پر چھائی ہوئی دھند ہٹانے کی کوشش کررہا ہو۔ منظر کچھ واضح ہوا تو جنت کو درشتی سے ہٹاتے ہوئے وہ آگے بڑھا۔ اگلے ہی لمحے اس کا توازن بگڑ گیا۔ اس سے قبل کہ جنت اسے سنبھال پاتی، وہ پورے قد سمیت فرش پر آرہا۔

''فارس!'' گھٹی گھٹی چیخ کے ساتھ وہ اس پر جھک گئی۔

گال تھپتھپاتے ہوئے، آوازیں دیتے ہوئے اسے ہوش میں لانے کی سعی کرنے لگی۔ محض چند لمحوں کے لیے پاس آؤٹ ہونے کے بعد اس نے جھٹ سے آنکھیں کھول دی تھیں۔ اگلے ہی پل اسے کھانسی کا شدید دورہ پڑا۔ اس کے چہرے اور گردن پر سرخ دھبے ابھرے ہوئے تھے۔ سرخ آنکھوں سے پانی بہہ رہا تھا۔

الرجی ری ایکشن! پریشانی کے عالم میں جنت کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا۔ پھر اس نے تیزی سے اٹھ کر سائڈ ٹیبل پر رکھی ٹیبلٹس کا جائزہ لیا۔ پانی کا آدھا گلاس بھی رکھا تھا۔ گویا وہ الرجی کے لیے میڈیسن لے چکا تھا مگر اسے ابھی تک افاقہ کیوں نہیں ہوا تھا؟ اگر بروقت افاقہ نہیں ہوا تھا تو......

یک دم اس کے اندر خطرے کی گھنٹی بجی۔ سائڈ ٹیبل سے اس نے فارس کا موبائل اٹھالیا۔ اس کے داہنے ہاتھ کی فنگر پرنٹس سے لاک کھول کر ڈاکٹر بخاری کا نمبر کانٹیکٹس سے نکالا۔

بمشکل سانس لیتے فارس بری طرح سے کھانسے جارہا تھا۔

وہ اب ڈاکٹر بخاری سے مخاطب تھی۔ انہیں اس کی صورت حال سے آگاہی دے رہی تھی جبکہ متلی کے شدید احساس کے ساتھ ہی فارس کو یک دم سے ابکائی آئی۔

وہ اٹھنا چاہتا تھا مگر بروقت ایسا نہ کرسکا۔ مجبوراً اسے فرش پر ہی جھکنا پڑا۔

ڈاکٹر بخاری سے بات کر کے وہ ایک بار پھر اس کی طرف متوجہ ہوئی تھی۔ ''اٹس او کے۔ پریشان مت ہو۔ ریلیکس رہو۔'' وہ اس کی پشت تھپتھپاتے ہوئے کہہ رہی تھی۔

''دور رہو۔'' کچھ غصے، کچھ جھنجلاہٹ اور کچھ بے بسی کے عالم میں اس نے بائیں ہاتھ سے جنت کو پرے دھکیلا۔ انداز اور رویے سے نفرت اور جھلاہٹ نمایاں تھی۔

جنت دکھ اور صدمے سے اسے دیکھ کر رہ گئی۔

بہت کوشش سے وہ دیوار کے قریب ہوا تا کہ سہارا لے کر بیٹھ سکے۔ داہنا ہاتھ گردن پر تھا۔ وہ اپنے سویٹر اور شرٹ کے بٹن کھولنا چاہتا تھا مگر کھول نہیں پارہا تھا۔

یہ کام بھی جنت نے سرانجام دینا چاہا تھا اور اس نے ایک بار پھر۔ شدید غصے اور چڑچڑے پن سے اسے پرے دھکیلا تھا۔

''مسلیٹ۔ آوے۔ فرام۔ می۔''

جنت کا دماغ گھوم گیا۔ اگلے ہی لمحے اس نے فارس کے ہاتھ جکڑ کر پکڑے تھے۔

''اس حالت میں بھی، تمہیں اپنا ایٹی ٹیوڈ دکھانے کی پڑی ہوئی ہے۔ اس حالت میں بھی؟'' وہ اس پر پھٹ پڑی۔

سرخ پڑتی آنکھوں میں صدمہ لیے فارس وجدان اسے دیکھ کر رہ گیا۔ محض ایک لمحے کے لیے اسے سکتہ ہوا تھا۔ اس کے بعد جو کھانسی کا دورہ پڑا تو وہ حال سے بے حال ہوگیا۔

جنت نے تیزی سے اس کے سویٹر اور شرٹ کے اوپری بٹن کھول دیئے۔ گردن سے نیچے۔ سینے پر بھی سرخ نشان تھے۔

''میں نے ڈاکٹر بخاری سے بات کی ہے۔ وہ ابھی آتے ہوں گے۔'' وہ اس سے کہہ رہی تھی۔ ''کیا تم کوئی اور دوا لیتے ہو، سیویر ری ایکشن۔''

فارس کا سر جھک گیا، نیم کھلی آنکھوں میں ایک خالی پن تھا۔ چہرہ سفید۔ کھانس کھانس کر اس کی حالت ابتر ہوچکی تھی۔

''فارس؟'' اس کا سر اٹھاتے ہوئے، گال تھپتھپاتے ہوئے اس نے ایک بار پھر اسے متوجہ کیا تھا۔ مگر وہ متوجہ نہیں ہوا تھا۔ کوئی جواب بھی نہیں دے رہا تھا۔

''فارس! میری طرف دیکھو، میری بات سنو۔''

یکا یک ہی اس کی گردن ڈھلک گئی۔ وجود بے جان سا ہوگیا۔

''ف...... فارس؟'' جنت کے حلق سے گھٹی گھٹی چیخ نکلی۔ آنکھوں میں خوف و ہراس پھیل گیا۔ داہنا ہاتھ منہ پر جمائے وہ متوحش ہو کر پیچھے ہٹ گئی تھی۔

فارس سانس نہیں لے رہا تھا۔ اس کے وجود میں اب کوئی حرکت نہیں رہی تھی۔

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

جیسے ہی فرح نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز زور سے بند کی اس کا ہینڈل فرح کے ہاتھ میں تھا۔

"یا اللہ! یہ کیا ہوا؟" وہ پریشانی کے عالم میں کبھی ہاتھ میں پکڑے ہینڈل کو دیکھتی اور کبھی ڈریسنگ ٹیبل کو، اف کل ہی تو ڈیوائڈر کا شیشہ نکل گیا تھا۔

اور آج......

"جی نہیں، مجھے استعمال کرنی ہیں چیزیں، تو سب میری پسند کی ہوں گی۔" فرح کے کانوں میں اپنی ہی آواز گونجتی چلی گئی۔

"مگر بیٹا چیز پائیدار تو ہو۔"

"اور صرف خوب صورتی ہی معیار نہیں ہونا چاہیے۔" امی اور ابو دونوں ہی نے سمجھانے کی کوشش کی تھی لیکن......

اس کے حلق میں گولا سا اٹکنے لگا۔ آنسوؤں کو بمشکل پیتے ہوئے اس نے ڈریسنگ ٹیبل کی دراز دوبارہ سے جوڑنے کی ناکام کوشش کی۔

"فرح بیگم، اگر تمہارے ماں باپ کو عقل ہوتی نا تو ایسا پھسپھسا اور گھٹیا فرنیچر نہ دیتے۔" عاقل نے طنز کے تیر چلائے تو ساس نے بھی مزید شہہ دی۔

"چار پیسے زیادہ ہی خرچ کر لیتے، مگر چیز تو

مریم شہزاد

پائیدار ہوتی۔" وہ کہتی ہوئی کمرے سے نکل گئیں۔

"دو چار پیسے زیادہ......" اس کے دل میں پھانس سی چبھ گئی۔

"مجھے بس یہ ہی فرنیچر منگوا دیں۔" فرح نے موبائل میں انتہائی خوب صورت فرنیچر دیکھ کر کہا۔

"مگر یہ بہت نازک ہے، تم ہمارے ساتھ چلو اور اپنی پسند کا ہی لے لو۔"

"آن لائن چھوٹی موٹی خریداری کی حد تک اچھا ہے، کوئی پورا جہیز تھوڑا ہی آن لائن لیا جا سکتا ہے۔"

"اور پھر یہ ڈبل قیمت مانگ رہے ہیں، گارنٹی بھی کوئی نہیں، کیسے ہم رسک لے سکتے ہیں۔"

امی ابو مستقل سمجھانے کی کوشش پر وہ ساتھ چلنے پر راضی ہو گئی مگر وہاں بھی اس نے اپنی ہی چلائی امی نے کتنا کہا کہ صرف خوبصورتی پر نہ جاؤ، مگر وہ

فرح ہی کیا جو مان جائے اس پر تو آن لائن شاپنگ کا اور اپنی پسند کا بھوت سوار تھا۔

"تو ہمارے پاس کوئی کمی تو نہیں ہے، مہنگا ہے تو کیا ہوا۔"

"بات مہنگے سستے کی نہیں ہے، لیکن یہ چیزیں بار بار نہیں لی جاتی، ضروری نہیں تمہاری پسند معیاری بھی ہو۔" امی نے پھر کہا۔

"آپ کو تو عاقل بھی مشکل ہی سے سمجھ آیا ہے، حالانکہ کتنا ہینڈسم اور گڈ لکنگ ہے سب سہیلیوں کے منگیتر نہیں دیکھے نا آپ نے، کیسے کالے، موٹے گنجے ہیں۔" فرح تمسخر سے بولی۔

"توبہ کرو فرح! اللہ سے ڈرو جو منہ میں آتا ہے بولے جا رہی ہو۔" امی نے کہا۔

تو ابو نے ان کو اشارہ کیا اب امی کیا کہتیں کہ شکل صورت کی وجہ سے نہیں بلکہ ماحول کے فرق کی وجہ سے وہ منع کرنا چاہ رہی تھی مگر نجانے فرح کی عقل گھاس چرنے چلی گئی تھی یا وہ واقعی کچھ سمجھنا ہی نہیں چاہ رہی تھی۔

"ٹھیک ہے سب کچھ تمہاری مرضی کے مطابق ہی ہوگا مگر بعد میں ہم کو یہ نہیں سننا، کہ آپ نے مجھے سمجھایا کیوں نہیں۔" ابو نے اس کو اپنی ضد پر قائم دیکھا تو ان کو اندازہ ہو گیا کہ اب سمجھانا فضول ہے اور پھر سب اس کی مرضی کے مطابق ہوتا چلا گیا۔

کپڑے، فرنیچر، زیورات، کراکری سب اس کی پسند کے تھے انتہائی حسین اور نازک، سب ہی اس کی پسند کی داد دیتے جب وہ بتاتی کہ اس کی چوائس ہے اور وہ فخر سے اترا جاتی، کبھی لیپ ٹاپ تو کبھی موبائل، ایک سے بڑھ کر ایک چیز سلیکٹ کرتی، زیادہ تر آن لائن ہی شاپنگ کی، اکلوتی تھی سارے ناز اٹھائے گئے اور آخر وہ پیا دیس سدھار گئی، وہاں بھی اس کی پسند کو بھرپور سراہا گیا مگر پھر آہستہ آہستہ چیزیں اپنی نزاکت دکھانے لگیں، عاقل یوں تو بہت اچھا اور خیال کرنے والا تھا مگر اس کی اپنی کوئی سوچ، اپنی کوئی رائے نہیں ہوتی تھی سب کی، اور خصوصاً ماں کی ہاں میں ہاں ملانا اس کا فرض تھا اور کبھی وہ اس بات کا گلہ کرتی تو وہ بہت ہی حیرت سے کہتا۔

"ہائیں! یہ کب ہوا یا تمہارا وہم ہے ایسا تو کچھ نہیں، اور تمہاری سب سنتا تو ہوں۔" مگر اس کی یہ عادت فرح کو اکثر تکلیف دے جاتی۔ ادھر کبھی گھر سے نکلتے نکلتے پرس کی چین ٹوٹ جاتی تو کبھی سینڈل کی ہیل، اس کا منہ چڑا رہی ہوتی۔

"عاقل کی خالہ کی بیٹی کا مایوں ہے، تمہارے پاس تو کوئی ڈھنگ کا جوڑا ہی نہیں ہے۔" ساس نے اس کی الماری میں کپڑے الٹ پلٹ کرتے ہوئے کہا تو اس نے بڑے مان سے ہلکے سے کام والا اسٹائلش سا سوٹ نکال کر دکھایا۔

"یہ ہے نا، امی جان۔"

"باؤلی ہوئی ہو، پہلی شادی ہے تمہاری شادی کے بعد، یہ اتنے ہلکے کپڑے پہنوگی، کوئی بھاری کام والا جوڑا نہیں ہے تمہارے پاس؟"

"وہ مجھے چبھتے ہیں کام والے کپڑے۔"

"یہ تو کوئی بات ہی نہ ہوئی، اب میں سب کو یہ بتاتی پھروں گی شادی میں کہ بہو کے کپڑے چبھتے ہیں اس لیے وہ ایسے کپڑے پہنتی ہیں، حد ہوتی ہے، وداع ولیمے میں تو شادی کے جوڑے ہی پہننا اور کل ماں کے ہاں جاؤ تو لے کر آنا بھاری جوڑا بلکہ ایسا کرو بری کے جوڑوں میں سے وہ پیلا والا جوڑا نکال کر سلوا لو، تمہاری ماں نے تو حد ہی کر دی ایک بھی جوڑا ڈھنگ کا نہیں، اور ہاں تھوڑا ڈھیلا سلوانا کہیں دو ماہ بعد ہی پھنسنے لگے۔" ساس آڈر جاری کر کے چلتی بنیں۔

"اف وہ پیلا والا......" اس کا خیال ہی اس کے لیے روح فرسا تھا بڑی مشکل سے اس نے اپنے آپ کو اس سوٹ کو پہننے کے لیے آمادہ کیا۔

☆☆☆

خالا کی بیٹی کی شادی سے دو دن پہلے دلہن کا جہیز دیکھنے جانے کے لیے اس نے سلور کام والا ہلکا سا سوٹ پہنا اس کے ساتھ پہننے کے لیے سلور سیٹ کا ڈبہ نکالا جو اس نے بہت چاؤ سے لیا تھا مگر ڈبہ کھولتے

ہی وہ دھک سے رہ گئی، سیٹ بالکل کالا ہو چکا تھا اور سلور کے بجائے لے سٹیک لگ رہا تھا اس نے ابھی صرف ایک ہی دفعہ تو پہنا تھا۔

"اللہ! ایسا کیسے ہو گیا، اتنا پیارا تھا یہ تو، ہائے۔" اس کی آنکھوں میں آنسو آ گئے۔

"اب کیا پہنوں؟" اس نے خود سے سوال کیا اور دراز دوبارہ کھولی تو اس کی نظر ایک اور سیٹ پر گئی۔

"یہ سیٹ بھی رکھ لو، کبھی ضرورت پڑ سکتی ہے۔" امی نے اس کو دیتے ہوئے کہا تھا اور اس نے بہت احسان جتانے والے انداز میں رکھ لیا تھا نم آنکھوں کے ساتھ اس نے وہ سیٹ نکال کر پہنا۔

"آئی لو یو مما۔" بے اختیار اس کے منہ سے نکلا۔

"چلو بہو! دیر ہو رہی ہے۔" باہر سے ساس نے آواز دی تو اس نے جلدی سے زور سے دراز بند کی اور اس کا ہینڈل فرح کے ہاتھ میں تھا اس نے ایک نظر اس کو دیکھا اور واپس ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دیا اور سوچا آکر دیکھوں گی اور جلدی سے تیار ہو کر کمرے سے نکل گئی۔

اور اب جو واپس آکر اس نے ہینڈل لگانے کی کوشش کی تو دراز ہی دغا دے گئی۔ جس پر آج پھر اس کو ماں باپ کی بے عقلی کا طعنہ سننا پڑا تھا۔

اس کی ضد کی سزا اس کو تو مل ہی رہی تھی مگر ماں باپ کے خلاف سننا اس کے لیے بہت تکلیف دہ تھا۔

☆☆☆

کچھ ہی عرصے میں وہ ایک پیاری سی بیٹی رانیہ کی ماں بن گئی اور اس کے کام میں بھی اضافہ ہو گیا اب اس کو جلدی جلدی سب کام کرنے ہوتے نزاکت کہیں دور چلی گئی تھی اور اس تیزی کے چکر میں اس کی کتنی ہی چیزیں ٹوٹ پھوٹ کا شکار ہو گئی تھیں جس کی وجہ سے اس کو اکثر ہی باتیں سننی پڑتیں۔

جب امی چھٹی کی تیاری کر رہی تھیں تب اس نے امی ابو سے رو رو کر معافی مانگی اور کہا۔

"اب آپ اپنی مرضی سے ہی سامان لیجیے گا اچھا اور معیاری، میں نے اپنی مرضی کی سزا بھگت لی۔"

"اللہ نہ کرے بیٹا کہ سزا ملے، شکر ہے عاقل پھر بھی بہت اچھا ہے، اکثر لڑکیاں یہ بے وقوفی کر جاتی ہیں۔" امی نے اس کو گلے لگاتے ہوئے کہا۔

"ان کو نہیں معلوم ہوتا کہ کیا اچھا ہے اور کیا برا۔" رانیہ کے بعد عالیان کی آمد بھی جلد ہی ہو گئی اور فرح خود بھی آہستہ آہستہ سمجھدار ہوتی چلی گئی۔ وقت جیسے پر لگا کر اڑا جا رہا تھا، دیکھتے ہی دیکھتے رانیہ پانچویں کلاس میں آگئی اور دوسرے بچوں کی طرح وہ بھی موبائل کا استعمال اچھی طرح سے جانتی تھی۔

"مما دیکھیے گا یہ ڈریس کتنا زبردست ہے اور آن لائن ایک سوٹ کے ساتھ پرس بھی فری ہے، منگوالوں؟"

فرح جو آنکھیں موندے لیٹی نہ جانے کیا سوچ رہی تھی ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی۔

"نہیں رانیہ بالکل نہیں۔"

"مگر کیوں مما؟ اتنا بیوٹی فل تو ہے۔"

"ہاں شہزادی بہت پیارا ہے مگر مما جو چیز آپ کے لیے لائیں گی وہ بھی بہت اچھی ہو گی، لیکن اس کی کوالٹی بھی اچھی ہی ہو گی، ابھی آپ بہت چھوٹی ہو، صحیح خریداری نہیں کر سکتیں۔"

"بٹ مام میری سب فرینڈز کرتی ہیں۔"

"اوکے لیکن میری رانیہ تو سب سے اچھی ہے نا، وہ سب سے زیادہ مما کی بات مانتی ہے، اس لیے تھوڑی سی بڑی اور ہو جاؤ پھر آپ بھی کر لینا۔" اور رانیہ کی سمجھ میں بات آگئی۔ کاش میں نے بھی یہ بات جلد ہی سمجھ لی ہوتی۔ اس نے دل میں سوچا۔

بچے کتنے ہی بڑے کیوں نہ ہو جائیں، زندگی کے بڑے بڑے فیصلے ماں باپ ہی کریں تو اچھا ہوتا ہے، عقل وقت کے ساتھ ساتھ ہی آتی ہے اور یہ بات فرح کو اب اچھی طرح سمجھ میں آگئی تھی۔

رخسانہ نگار عدنان

کشف اپنے پرانے طرز کے گھر سے شدید بے زار ہے اور وہ اپنی آنی سے ہزار بار کہہ چکی ہے کہ وہ اس گھر سے جان چھڑا لیں لیکن وہ ہر بار اس کی بات ہنس کر ٹال دیتی ہیں۔ کشف گلیوں سے گزرتے خوانچا فروشوں سے بھی سخت بے زار رہتی ہے اور انہیں حسب توفیق بددعاؤں سے نوازتی رہتی ہے۔

طاہرہ بیگم کا اپنے گھر پر کافی ہولڈ ہے۔ ان کی بہو سونیا اور بیٹا آزر دونوں ہی ان کے فرماں بردار ہیں۔ وہ چاہتی ہیں کہ ان کی پوتی کا رشتہ ان کی مرضی سے طے ہو۔

جبکہ ردا اپنے آفس میں کام کرنے والے جبران سے محبت کرتی ہے اور اسے کہتی ہے کہ وہ اس کا رشتہ لے کر آئے۔

دوسری جانب کشف کا پڑوسی اسے چھیڑتا ہے اور وہ اس کے پاؤں پر اینٹ دے مارتی ہے۔ بعد میں اسی لڑکے کی ماں سے بھی خوب جھگڑا کرتی ہے۔

زینب شاعری کرتی ہے اور ساتھ ہی ایک اسکول میں بھی پڑھاتی ہے وہ اپنا مسودہ حیدر کے پاس لے کر جاتی ہے تا کہ وہ سرفراز سے بات کر کے اسے چھپوا سکیں۔

آفس سے واپسی پر اس کی طبیعت خراب ہو جاتی ہے اور وہیں تیز برستی بارش میں اس کا ایکسیڈنٹ ہو جاتا ہے۔

آڈیٹوریم لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہے جہاں ڈاکٹر موحد ... بڑی بیماریوں کو کنٹرول کرنے کے حوالے سے لیکچر

دے رہے ہیں۔ اور ہال میں تمام لوگ ساکت ہو کر سن رہے ہیں۔
کشف، ناہید کو دیکھ کر اس سے بے اختیار لپٹ جاتی ہے۔ ناہید کو زینب کی فکر ستاتی ہے اور وہ بارش سے بھی خوف زدہ ہیں۔ کشف انہیں کہتی ہے کہ زینب فون نہیں اٹھا رہی۔ ناہید اس سے بتول خالہ سے کیے گئے جھگڑے کے بارے میں پوچھتی ہیں اور اسے سمجھاتی ہیں۔
میر و خزاں کے موسم میں اپنی گاڑی میں موجود ہے اور کسی کی یاد ہے جو اسے گھیرے ہوئی ہے۔ وہ اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے اگر کبھی ناراض ہوئی تو میر و اسے منالے۔ وہ ان سوچوں میں الجھا چلتا چلا جاتا ہے۔
موحد راستے میں رش دیکھ کر اترتا ہے اور سامنے بے ہوش پڑی زینب کو دیکھ کر اسے ہاسپٹل لے جاتا ہے۔
آذر کو ایک فون کال آتی ہے اور وہ عجلت میں آفس سے باہر نکلتا ہے۔ زینب کے بارے میں کوئی بھی معلومات نہ پا کر کشف شدید پریشان ہو جاتی ہے۔ سہیل اپنے طور پر پتا کروالیتا ہے اور اسکول بھی چکر لگا آتا ہے۔ لیکن وہ وہاں بھی موجود نہیں ہوتی۔ وہ حیدر کو فون کرتی ہے وہ بھی پریشان ہو جاتا ہے۔ کچھ دیر بعد اس کے فون پر موحد کی کال آتی ہے۔ اور وہ اسے زینب کے بارے میں بتاتا ہے۔
دوسری طرف زینب کو ہوش آتا ہے اور موحد اسے جانا پہچانا لگتا ہے۔ وہ اس کا شکریہ ادا کرتی ہے اور گھر جانے کا کہتی ہے۔ اور موحد سے اس کے باپ کا نام بھی پوچھ لیتی ہے۔ موحد اسے اس کے گھر چھوڑ کر آتا ہے۔ جہاں کشف کے ساتھ بلال بھی موجود ہوتا ہے۔ باتوں کے دوران بتول خالہ آجاتی ہیں اور ماں بیٹی کے کردار پر الزام تراشیاں کرتی بکتی جھکتی بلال کے ڈرانے پر گھر سے نکل جاتی ہیں۔
آذر، ردا کو لے کر گھر پہنچتا ہے جہاں پورا گھر ردا کی غیر حاضری کے باعث پریشان ہے۔ ردا اپنے کمرے میں جاتی ہے جہاں رمشا اس سے بات کرنے کی کوشش کرتی ہے لیکن وہ اسے ڈانٹ کر بھگا دیتی ہے۔ سونیا اس کے کمرے میں آتی ہیں اور اس سے پوچھتی ہے کہ کیا ہوا ہے اور کمرے کا دروازہ بند کر دیتی ہے۔ ردا حیران رہ جاتی ہے۔
میر و دیوار میں کیل ٹھونک رہا ہوتا ہے جب وہ عورت چیختے ہوئے آتی ہے اور اس سے جھگڑتی ہے۔ اس حسین عورت کی طرف میر و شرمندگی سے دیکھتا اس کی بدزبانی سنتا ہے۔ تبھی ان کی بیٹی آتی ہے اور اس کا سرخ لباس دیکھ کر وہ عورت پھر سے چیخنا چلانا اور آخر میں رونا شروع کر دیتی ہے۔
وہ نوجوان لڑکی ماں کی اس حالت سے شدید الرجک ہے اور کہتی ہے کہ اسے پاگل خانے بھیج دیا جائے۔ جبکہ وہ عورت چلاتے چلاتے میر و کے گریبان میں چہرہ چھپا لیتی ہے اور اس سے کہتی ہے کہ وہ اس سے دور نہ جائے۔
دادی، شائستہ کو فون کر کے کہتی ہیں کہ آذر اور سونیا کو اس رشتے پر اعتراض نہیں۔ وہ بیس دن بعد نکاح رخصتی کی تاریخ رکھ لیتی ہیں جبکہ دروازے میں کھڑا آذر یہ سن کر ساکت رہ جاتا ہے۔
آذر اپنی ماں سے کہتا ہے کہ انہیں رشتہ طے کرنے سے پہلے کم از کم ردا کی مرضی ضرور معلوم کرنی چاہیے۔ لیکن وہ بات کو یوں گھماتی ہیں کہ آذر چپ رہ جاتا ہے۔
کشف آپی سے اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے۔ وہ اسے ساری تفصیل بتاتی ہے۔ میر منصور باہر گیا اور وہاں جا کر دوسری شادی کر لی۔ کشف ضدی لہجے میں کہتی ہے کہ وہ ان سے ضرور ملے گی۔
سونیا، ردا سے پوچھتی ہے کہ برسات میں کیا ہوا تھا۔ وہ کہتی ہے کہ کچھ نہیں ہوا۔ پھر وہ اسے بتاتی ہے کہ وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے اور جبران سے ہی شادی کرے گی۔ سونیا اسے زوردار تھپڑ مارتی ہے۔ سونیا، آذر کو ڈھکے چھپے لفظوں میں بتاتی ہے کہ اس کی بیٹی شادی کے لیے راضی نہیں۔
حیدر، زینب سے ملتا ہے تو وہ اسے کشف کے رویے کے بارے میں بتاتی ہے۔
کشف خیالوں میں گم بس میں بیٹھی رہ جاتی ہے۔ اڈے پر پہنچ کر وہ چونکتی ہے اور گھبرا کر رہائشی علاقے کی طرف آجاتی ہے۔ جہاں حمزہ اسے سونیا کے گھر ڈراپ کر دیتا ہے۔ کشف کی موجودگی سے آذر بے سکون ہوتا ہے۔
میر منصور، ایما کو سمجھانے کی کوشش کرتا ہے لیکن وہ بدتمیزی کرتی ہے جواباً وہ اسے تھپڑ مار دیتا ہے۔ ایما پولیس بلا لیتی ہے۔ گھر پر اس کی ماں ایک پرتکلف ڈنر تیار کر کے اس کا انتظار کرتی ہے۔ ایما ماں کو خوشی خوشی بتاتی ہے کہ اس نے باپ کو

پولیس کے حوالے کر دیا ہے۔
کشف سونیا سے بھی اپنے باپ کے بارے میں پوچھتی ہے اور اس کے سامنے اس عزم کا اظہار کرتی ہے کہ وہ ضرور امریکہ جائے گی۔
زینب، بتول خالہ سے معافی مانگنے جاتی ہے جہاں وہ اسے کشف کی شادی کا مشورہ دیتی ہیں۔
ڈاکٹر موحد گاؤں میں ہونے والی ایک فوتگی پر جاتے ہیں اور وہاں نہ صرف جنازے میں شریک ہوتے ہیں بلکہ قبر کھودنے میں بھی مدد کرتے ہیں جس پر گاؤں کے لوگ حیران رہ جاتے ہیں۔
سونیا زینب کو فون پر کشف کی وجہ سے بہت سناتی ہیں۔ زینب کشف سے اس بارے میں پوچھتی ہے تو وہ کہتی ہے کہ ہاں وہ سونیا کے پاس اپنے باپ کی معلومات لینے گئی تھی۔ اسے سونیا کا عجیب رویہ یاد آتا ہے۔
آزر جبران سے ملتا ہے اور اسے بے عزت کرتا ہے، ردا غصے سے باہر نکل جاتی ہے۔
کشف کچن میں ردا کو دیکھ کر ایک کپ کافی کا کہتی ہے۔ باتوں باتوں میں وہ ردا سے کہتی ہے کہ وہ اس شادی سے خوش نہیں کیا وہ کسی اور کو پسند کرتی ہے۔ ردا یہ سن کر چراغ پا ہو جاتی ہے۔ سونیا ردا کو آ کر تھپڑ مارتی ہے۔ اور کہتی ہے کہ اس کی ماں کی وجہ سے آج تم اس گھر میں ہو اور آج ہماری عزت رہ گئی ہے۔
ہاسپٹل سے میر منصور زینب کا ہاتھ پکڑ کر باہر لاتا ہے اور اسے زینی کے نام سے بلاتا ہے۔ زینب کہتی ہے کہ اس کا نام زینی نہیں زینب ہے۔ وہ کہتا ہے کہ تم جس سے محبت کرتی ہو وہ میں تھا یا کوئی اس کی خاطر میری بات سن لو۔ زینب کہتی ہے کہ اس کی زندگی میں کوئی اور کبھی نہیں تھا۔ میر منصور اس بات پر یقین نہیں کرتا۔ موحد کے پہنچنے پر زرین بہت خوش ہوتی ہے۔ زرین کو برے حالوں میں دیکھ کر موحد کو محسوس ہوتا ہے کہ یہ ایما کی وجہ سے اس حال میں ہیں، میں ان کا کچھ نہیں۔
میر منصور کی یہ بات سن کر زینب حیران رہ جاتی ہے کہ زینب نے بے وفائی میں پہل کر کے شادی کر لی۔ دونوں ایک دوسرے کو موردِ الزام ٹھہراتے ہیں۔ منصور یہ سن کر پریشان ہو جاتا ہے کہ تئیس سال سے اکیلی رہ رہی ہے۔
کشف زینب سے فون پر کہتی ہے کہ وہ اپنے گھر جانا چاہتی ہے زینب منع کر دیتی ہے۔
کشف کی آنکھ ایک ڈراؤنے خواب سے کھلتی ہے۔ وہ ہلکی سی چیخ مار کر اٹھتی ہے ٹائم دیکھتی ہے۔ ابھی تو بارہ بھی نہیں بجے تھے۔ پانی پی کر وہ خالی گلاس لے کر باہر جاتی ہے۔ کچن میں اندھیرا ہوتا ہے۔ وہ ڈسپنسر سے پانی لینے آگے بڑھتی ہے۔ کہ اس کے ہاتھ سے گلاس گر کر ٹوٹ جاتا ہے۔ کسی نے اس کو بری طرح اپنے بازوؤں میں لے کر جھنجھوڑا تھا۔ اس نے چیخنا چاہا تو کسی نے اس کے منہ کو پوری قوت سے بھینچ دیا۔
کشف پر حملہ کرنے والا کوئی اور نہیں آزر تھا۔ سونیا آزر سے پوچھتی ہے۔ اس کی چیخ و پکار سن کر رمشا، ردا اور طاہرہ بیگم بھی آ جاتے ہیں۔ آزر ڈھٹائی سے کہتا ہے کہ میں نے صرف اپنے بیٹے کو اس سے بچانے کی خاطر یہ قدم اٹھایا ہے اسے کوئی نقصان نہیں پہنچایا۔ حمزہ یہ سن لیتا ہے۔ وہ یہ برداشت نہیں کر پاتا۔ طاہرہ بیگم آزر کی حمایت کرتی ہیں۔
حیدر کشف کو سمجھاتا ہے کہ وہ گھر کے اندر آ جائے۔ بلال ثمینہ کو اس کے کمرے میں لے جاتا ہے۔ ماں کو کمرے میں چھوڑ کر بلال کشف کو اندر صالحہ کے کمرے میں لے آتا ہے لیکن کشف وہاں رکنے پر تیار نہیں ہوتی صالحہ اسے کہتی ہیں کہ صبح وہ خود اس کے ساتھ اس کے گھر چلیں گی۔
ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے کہ اسے طلاق چاہیے۔ بلال سمجھاتا ہے تو وہ کہتی کہ بلال اپنے باپ کی حمایت کرتا ہے۔ وہ اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے۔
موحد ایما سے ملنے ہاسپٹل آتا ہے جہاں زریں اسے کہتی ہے کہ وہ منصور کو چھوڑ دے گی بس موحد اس کے پاس آ جائے۔ منصور کو یہ سن کر احساس زیاں ہوتا ہے وہ زینب کے پاس جانے کا ارادہ کر لیتا ہے۔ کشف صالحہ بیگم کے ساتھ اپنے گھر آ جاتی ہے۔
موحد کے پاکستان واپس جانے کا سن کر زریں بہت دکھی ہوتی ہے۔ دپتی اپنے بچے کے ساتھ جو رات جنگل میں گزارتی ہے اس سے اس میں اتنی ہمت آ جاتی ہے کہ وہ اپنے بچے کے لیے تنہا جینے کا فیصلہ کر لیتی ہے۔ زینب اس کی کہانی سے بہت متاثر ہوتی ہے۔
آزر ماں اور بیوٹی کے ساتھ رمشا کو بھی لے کر ایئرپورٹ جاتا ہے گھر میں ردا اکیلی ہے۔ اچانک وہاں وہ ایک جانی

پہچانی آواز سنتی ہے۔ زینب سے ملنے کے لیے منصور ہوٹل آتا ہے۔ وہیں اس کی ملاقات موحد سے ہوتی ہے۔ وہ اس غیر متوقع صورت حال پر حیرانی سے اسے دیکھتا ہے۔

ردا گھر میں اکیلی ہوتی ہے فرحان آکر اسے اکساتا ہے کہ وہ اس کے ساتھ بھاگ چلے ردا کے انکار پر اسے غصہ آجاتا ہے اور وہ بدنیتی پر اتر آتا ہے۔ ردا اپنے آپ کو زخمی کر لیتی ہے فرحان بھاگ جاتا ہے۔ حمزہ آکر اسے ڈاکٹر کے پاس لے جاتا ہے۔

منصور زینب سے ملنے آتا ہے تو وہاں موحد بھی پہنچ جاتا ہے موحد حیران ہوتا ہے کہ زینب سے منصور کا کیا تعلق ہے منصور بتاتا ہے کہ وہ اس کی فرسٹ کزن ہے۔

زینب کا شاپنگ پر جانا تھا منصور اسے اس کے والد کا واسطہ دے کر کہا ہے کہ وہ اس کے ساتھ شاپنگ پر چلے۔ اسے سونیا اور اس کی بیٹیوں کے لیے شاپنگ کرنی تھی۔ منصور اس کے لیے ایک ساڑھی گفٹ لیتا ہے۔ زینب کو ماضی یاد آتا ہے کہ وہ سونیا کی شادی میں اس کے لیے ساڑھی لایا تھا۔ وہ اس کی دی ہوئی ساڑھی ریسپشن پر چھوڑ جاتی ہے۔ منصور حیرت زدہ رہ جاتا ہے۔

بلال کشف سے ملنے آتا ہے کشف اس سے رکھائی سے پیش آتی ہے۔ اس کے یہ پوچھنے پر کہ وہ سونیا کے گھر سے رات میں کیوں آئی کشف ناراض ہو جاتی تھی۔

سونیا ردا کی حالت دیکھ کر پریشان ہے کہ اس کے سسرال والے آچکے ہیں اور کسی وقت بھی ہوٹل سے گھر ملنے آسکتے ہیں۔ ردا کہتی ہے کہ وہ چکر آنے پر گر پڑی تھی۔ موحد کے جانے کے بعد زرین منصور سے معافی مانگتی ہے منصور کے نہ ماننے پر چپ تو ڑ دیتی ہے۔

سونیا آکر کشف سے معافی مانگتی ہے اور کہتی ہے کہ زینب یا کسی کو پتا نہ چلے۔

زینب پاکستان آکر حیدر کے ساتھ آتی ہے وہ یہ جان کر حیرت زدہ ہے کہ کشف سونیا کے گھر نہیں بلکہ اپنے گھر میں ہے۔ حیدر یہ جان کر کہ زینب منصور سے کینیڈا میں مل چکی ہے، چونک جاتا ہے۔

سونیا اور آذر نے شائستہ اور سلیمان کی دعوت اپنے گھر میں رکھی تھی جس میں ان کی شادی کی تاریخ مقرر ہونا تھی۔ رمشا ردا کو تیار کرتی ہے۔ ردا رمشا سے محبت کے حوالے سے بات کر رہی ہوتی ہے کہ دروازے میں سلیمان کو کھڑا دیکھ کر شاکڈ رہ جاتی ہے۔

موحد کو زینب ڈنر پر انوائیٹ کرتی ہے۔ کشف کو بہت غصہ آتا ہے۔ وہ ڈنر پر موحد سے بدتمیزی کرتی ہے۔ میر وجیل میں بیٹھا شدید غم میں ہوتا ہے۔ اسے اپنی بیٹی سے اس حرکت کی توقع نہیں ہوتی۔ ردا کو جبران الزام دیتا ہے۔ اور پھر اسے کہتا ہے کہ وہ کل ہر اس صورت اس سے ملاقات کرلے جبران ردا کو ایک انجان جگہ لے جاتا ہے۔

حیدر، زینب کو میر منصور کا کینیڈا کا ایڈریس دینا بھول جاتا ہے۔ رمشا، کشف کے آنے پر بہت خوش ہوتی ہے۔ طاہرہ بیگم ان سے اجازت لیے بغیر کشف کے وہاں آنے کا بہت زیادہ برا مناتی ہیں۔ کشف کو لگتا ہے کہ وہ مر جائے گی۔ وہ سونیا سے وہاں سے جانے کی ضد کرتی ہے۔

میر منصور کے گھر فون آتا ہے کہ ایمان بلڈنگ سے گر کر انتہائی زخمی حالت میں اسپتال میں ہے۔ زینب کی وہاں بہت پذیرائی ہوئی ہے۔

موحد کو ایمان کے زخمی ہونے کا پتا چلتا ہے۔ وہ پریشان ہوتا ہے۔ منصور اور زرین میں کھٹ پٹ ہو جاتی ہے۔ منصور کو اپنی ماں کی بات یاد آتی ہے کہ انہوں نے زینب کی شادی کر دی ہے۔

طاہرہ بیگم سونیا کو سخت سست سناتی ہیں۔ آزر کو بھی کشف کا وہاں رہنا پسند نہیں آتا۔

کشف گھبرا کر موحد کے پاس جاتی ہے وہ اپنی پریشانی میں الجھا ہوتا ہے۔ کشف کو ناگوار گزرتا ہے۔ زینب فون پر کشف کو ڈانٹتی ہے کہ وہ بغیر بتائے سونیا کے گھر سے کیوں نکل آئی۔ زینب کے ساتھ آئے ایک شاعر کو دل کا دورہ پڑتا ہے اور سب کے ساتھ زینب بھی انہیں دیکھنے اسپتال جاتی ہے۔ جہاں اس کا سامنا میر منصور سے ہوتا ہے۔ وہ دونوں حیران رہ جاتے ہیں۔

موحد کے کینیڈا جانے کا سن کر کشف موحد سے کہتی ہے کہ وہ بتا کر جاتا تو وہ اپنے باپ کا اتا پتا معلوم کروالیتی اس سے۔ موحد کہتا ہے کہ تمہاری آپی کا بھی تو کینیڈا میں رابطہ ہے ان کے کزن ہیں وہاں۔ کشف کی حیرانی پر پوچھتا ہے کہ زینب کی اجازت کے بغیر اسے نہیں بتانا چاہیے تھا۔ وہ کشف سے اس کے والد کا نام پوچھتا ہے اور منصور احمد کا نام سن کر پتھر ہو جاتا ہے۔

سلیمان کو دیکھ کر رمشا جلدی سے آگے بڑھتی ہے۔ وہ ردا کی چوٹ دیکھ کر استفسار کرتا ہے۔ رمشا اور ردا یہ جاننے کے لیے بے چین تھیں کہ کہیں سلیمان نے ان کی باتیں تو نہیں سن لیں۔

کشف زینب سے شکایت کرتی ہے کہ وہ اسے اکیلا چھوڑ کر کیوں گئی۔ زینب پریشان ہوتی ہے کشف کی حالت دیکھ کر۔ وہ اس سلسلے میں صالحہ بانو سے بھی بات کرتی ہے۔

ردا شاپنگ پر جانے سے انکاری ہے، ماں کے سمجھانے پر سلیمان اس کی والدہ رمشا اور سونیا کے ساتھ وہ چلی جاتی ہے، وہاں وہ لوگ کچھ دیر کے لیے سلیمان اور ردا کو بات کرنے کا موقع دیتے ہیں، فرحان اسے سلیمان کے ساتھ دیکھ لیتا ہے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ اسے دس پندرہ دن کے لیے پاکستان جانا ہے، اس کی بھانجی کی شادی ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے کہ سونیا کے ہاں ایسا کیا ہوا جو وہ وہاں سے آ گئی۔ کشف کہتی ہے کہ وہ ایک شرط پر بتائے گی کہ زینب اسے بتائے کہ زینب منصور سے کینیڈا میں ملی ہے اور یہ بات اسے ڈاکٹر موحد نے بتائی ہے۔

سونیا نکاح والے دن زینب کو بتاتی ہے کہ منصور پاکستان نہیں آ رہا۔

حمزہ ردا کے نکاح والے دن کشف سے ملنے جاتا ہے۔ کشف اسے دیکھ کر حیران رہ جاتی ہے وہ اس سے معافی مانگتا ہے۔ اور بتاتا ہے کہ وہ باہر جا رہا ہے۔ کشف اسے معاف کر دے۔

منصور زرین سے کہتا ہے کہ وہ پاکستان اس لیے جا رہا ہے کہ وہ اپنا گھر بیچ کر اس کا قرض اتارے۔ لیکن زرین اس کی بات پر یقین نہیں کرتی کہ تم وہاں جا کر ہمارے رشتے سے مکر سکتے ہو۔ جس پر منصور اسے بتاتا ہے کہ زرین کے والد نے اس کی خوشامد کر کے اسے زرین سے شادی پر مجبور کیا تھا۔

ردا سلیمان کو پا کر محسوس کرتی ہے کہ یہ اس کی ماں باپ کی فرمانبرداری کا انعام ہے۔

کشف، فائقہ کے ساتھ ورکشاپ اٹینڈ کرنے آئی ہے تو اس کی ملاقات وہاں موحد سے ہوتی ہے۔ موحد اسے نظر انداز کر دیتا ہے۔ لیکن اس کی وجہ سے کھانے پینے کا انتظام اچھے سے کروا دیتا ہے۔ کشف کو بہت محسوس ہوتا ہے۔ لیکن بعد میں وہ اس کی وضاحت کر دیتا ہے۔

زینب کشف کی وجہ سے پریشان ہے۔ وہ حیدر کے آفس جاتی ہے۔ وہاں اس سے کشف کے رشتے کی بات کرتی ہے وہ بلال کی بات کرتا ہے۔ وہاں ثمینہ آ جاتی ہے اور ان دونوں کو خوب ذلیل کرتی ہے۔ حیدر ثمینہ کو لے جاتا ہے۔ زینب وہاں سن بیٹھی رہ جاتی ہے چوکیدار آ کے اسے جانے کا کہتا ہے۔

کشف، ڈاکٹر موحد سے ملتی ہے اور کہتی ہے کہ اگر آپ مجھے اچھا سمجھتے ہیں تو میری ماں سے میرا ہاتھ مانگیں اور مجھ سے شادی کر لیں۔

فرحان، سلیمان کے ہوٹل پہنچ جاتا ہے اور اس سے کہتا ہے کہ وہ ردا کا بوائے فرینڈ اور سابقہ محبوب ہے۔

موحد کشف سے محبت کا اظہار کرتا ہے۔ حمزہ باپ سے ناراض ہے۔ آزر غصے میں حمزہ کو گھر سے نکل جانے کو کہتا ہے۔ فرحان سلیمان سے مل کر اسے اپنے اور ردا کے تعلق کے بارے میں بتا دیتا ہے۔ سلیمان، ردا کی کال ریسیو نہیں کرتا۔

ثمینہ حیدر سے لڑتی ہے۔ اور بہت غلط زبان استعمال کرتی ہے بلال اسے روکتا ہے تو وہ اسے بھی لتاڑتی ہے۔ کشف کے حوالے سے کہتی ہے کہ وہ اسے کبھی بہو نہیں بنائے گی کشف یہ سب سن لیتی ہے۔ اور روتی ہوئی گھر چلی جاتی ہے۔ سلیمان، ردا سے فرحان کے متعلق سوال کرتا ہے۔

پچیسویں قسط

زینب یوں کھڑی رہ گئی جیسے اسے سکتہ ہو گیا ہو۔
اور کشف خود بھی جیسے بے یقین کھڑی تھی۔
اسے امید ہی نہیں تھی، موحد اس طرح اچانک سے آ کر بغیر کسی تمہید، بغیر کسی ابتدائیے کے اتنی بڑی بات، یوں عام سے انداز، عام سے لہجے میں اس طرح بول دے گا۔
وہ گنگ سی کھڑی رہ گئی۔
زینب نے پیچھے ہاتھ کر کے جیسے کرسی کی موجودگی کا خود کو یقین دلایا اور دھڑام سے کرسی پر گر سی گئی۔
موحد کا اس طرح اچانک آ کر فوراً ہی ایسی بات کہہ دینا کسی طرح بھی مناسب نہیں تھا۔
مگر اب تیر کمان سے نکل چکا تھا!
''یہ...... یہ جھوٹ بول رہا ہے ناں کشف؟'' زینب کی کپکپاتی آواز کشف کے کانوں سے ٹکرائی۔
شاید یہی موقع ہے اب سچ کہہ دینے کا، اس نے صرف ایک لمحے کو سوچا اور گہرا سانس لے کر رہ گئی۔
''نہیں...... آنی یہ جھوٹ نہیں ہے...... سچ ہے۔'' اب تو جو بھی ہو...... ہو جائے اس نے سوچ لیا تھا۔
اور زینب کو لگا جیسے پل بھر کو اس کا دل بند ہو گیا ہے، وہ بے روح آنکھوں سے کشف کو تکے جا رہی تھی۔
ان میں نہ حیرت تھی نہ غصہ نہ کوئی اور کیفیت!
یوں جیسے اس کی بینائی سلب ہو گئی ہو۔
کشف کو بھی زینب کی کیفیت نے لحہ بھر کو پریشان کیا۔
''آنی! مجھے نہیں پتا، میں نے یہ فیصلہ کیوں کیا؟ کس جذباتی لمحے میں کیا، مجھے لگتا تھا، میرے سر پر کسی مرد کے ہاتھ اور نام کا سایہ نہیں تو ہر کوئی مجھے مالِ غنیمت سمجھ رہا ہے؟ دھتکار رہا ہے۔ ٹھوکریں لگا رہا ہے، مجھے اپنا آپ بہت ہلکا بے قیمت اور بے کار لگنے لگا تھا۔ شاید اس اسٹریس میں میں اپنی جان لے لیتی جس دن آزر انکل اور پھر ثمینہ آنٹی۔ محلے والے جس طرح آپ کے لیے، میرے لیے باتیں کرتے ہیں۔ آنی! اکیلی عورت یا دو اکیلی عورتوں کے لیے یہ معاشرہ، اس کے لوگ اتنے بے رحم اتنے سنگدل کیوں ہیں؟ رشتے اگر نہیں ہیں تو اس میں میرا آپ کا کیا قصور، یہ تو اوپر والے کی تقسیم ہے ناں، رزق کی طرح رشتے بھی تقسیم کرتا ہے، کسی کو کم ملتے ہیں کسی کو زیادہ اور کسی کو بہت ہی کم۔'' وہ جانے کس رو میں بولتی چلی جا رہی تھی۔
''تو رشتوں کی کمی پوری کرنے کے لیے تم نے یہ انتہائی قدم اٹھا لیا؟ تم نے سمجھا، میں مر گئی ہوں۔ تمہارے سر پر اب کوئی بھی نہیں بیٹھا اور تم جو چاہو، جس سے چاہو اس سے رشتہ جوڑ لو۔'' زینب کے بے روح جسم میں زندگی کا شعلہ سا لپکا تھا۔
''سارا قصور کشف کا نہیں ہے آنٹی! میں نے بھی۔'' موحد نے جیسے اپنی موجودگی کا احساس دلایا۔
''تم نے بھی اسے ضرور ورغلایا ہوگا، تم جس شخص کے بیٹے ہو، اس کی نس نس میں یہ سازش پلتی ہے صرف اپنی غرض، اپنا مطلب، میں نے سالوں پہلے اس سے رشتہ، تعلق سب ختم کر دیا، اس نے تمہاری شکل میں میرے لیے ایک اور آزمائش ایک اور امتحان......''
وہ بے بس ہو کر رونا چاہتی تھی مگر آنسو بھی ساتھ نہیں دے رہے تھے۔ گلے میں پھنسے اس کا گلا بند کر رہے تھے۔
''میں شرمندہ ہوں۔ معذرت......'' موحد کو احساس ہو رہا تھا۔ وہ کیا کر چکا ہے اور اب کیا ہونے والا ہے۔

"نہیں چاہیے تمہاری شرمندگی یا معذرت، کچھ بھی نہیں چاہیے مجھے، تمہارا یہاں ہونا بھی نہیں۔" پہلی بار اس نے زینب کے لہجے میں ایسی نفرت اور بیزاری دیکھی تھی۔

"چلے جاؤ یہاں سے جس طرح آئے ہو۔" وہ ہاتھ جھٹک کر اسے دفع ہو جاؤ والے انداز میں بولی۔

"ظاہر ہے، میں اس طرح تو یہاں سے جا نہیں سکتا۔" وہ بھی جیسے سب کچھ سوچ کر آیا تھا۔

زینب نے چونک کر کشف کو دیکھا جس نے فوراً سر جھکا لیا۔

"تم اس کے ساتھ جانا چاہتی ہو، جاؤ چلی جاؤ، جاؤ ابھی چلی۔"

وہ چیخ کر بولتی کنپٹی کو دباتی ایک طرف لڑھک سی گئی۔ کشف کے منہ سے ہلکی سی چیخ نکلی تھی۔

"آپی!" وہ اس پر جھکی۔

موحد تیزی سے آگے آیا۔ کشف نے ہاتھ کے اشارے سے اسے روک دیا۔ وہ ان ہی قدموں پہ ٹھٹک سا گیا۔

"ابھی نہیں۔ ابھی چلے جائیں یہاں سے پلیز۔" وہ جیسے کراہ کر بولی۔ موحد ساکت سا کھڑا رہ گیا۔

"مجھے انہیں چیک تو کر لینے دو پلیز ہٹو آگے سے۔" وہ اب کے ذرا سختی سے بولا۔

"میں نے کہا ناں، آپ جائیں یہاں سے۔ چلے جائیں ابھی۔" وہ بھی اسی ترشی سے چلائی۔

اور پہلی بار موحد نے کشف کو زور سے پرے دھکیلا۔

"ہر معاملے، ہر بات میں ضد اچھی نہیں ہوتی۔" وہ اب زینب پر جھکا اس کی نبض اور دل کی دھڑکن چیک کر رہا تھا۔

"میرا فرسٹ ایڈ باکس بھی گاڑی میں پڑا ہے۔ میں لے کر آتا ہوں۔" وہ کہہ کر تیزی سے جانے لگا۔

"واپس آئیں گے تو دروازہ نہیں کھلے گا۔ ابھی آپ یہاں سے چلے جائیں۔ میں آپ سے فون پر بات کر لوں گی۔" وہ قطعی لہجے میں کہہ رہی تھی۔

"مگر ان کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔" وہ رکا۔

کشف اسے جانے کا اشارہ کر کے دروازہ بند کرنے لگی۔ وہ گہرا سانس لے کر باہر نکل گیا۔

☆☆☆

بہت ساری ٹوٹی ہوئی چوڑیوں کے رنگ برنگے کانچ تھے۔ کچھ ٹاپس اور بندے، ایک عنابی رنگ کی کرن گوٹا لگی چنری، چھ سات کچی پکی لکھائی میں لکھے عید کارڈز تھے۔

بلال جو اپنے لیے موسم کے حساب سے گرم کپڑے الماری کے اوپر والے خانے سے نکالنے لگا تھا، اس کے ہاتھ یہ سالوں پرانا باکس لگا۔ ہر عید پر بابا اسے اندرونِ شہر آنی کی طرف لے کر جایا کرتے تھے۔

انہیں تو یہ پتا ہی نہیں تھا، بلال کی اس دن عید ہوتی ہے، جب وہ کشف سے ملنے جاتا ہے۔

چاند رات کو راستے میں بابا آنی اور کشف کے لیے چوڑیاں مہندی، جیولری، میک اپ کا سامان اور کچھ دوسرے تحفے مٹھائی اور پھلوں کے ساتھ لے کر جاتے۔

اندرون شہر کی گلیوں میں چاند رات یوں ہوتی جیسے شب برات ہو۔ جگہ جگہ مہندی چوڑیوں کے اسٹال مٹھائیاں، پھینیاں گرم گرم نان ختائیاں نکالتے لوگوں کا جوش، گھما گھمی بلال کو سارے راستے مسمرائز کیے رکھتی، اس کا ننھا سا دل خوشیوں سے بھر جاتا۔

اور جب کشف ان کی دستک سن کر بھاگ کر دروازہ کھولتی تو اسے لگتا جیسے سارے جہاں کی خوشیوں کا دروازہ اس پر کھل گیا ہو۔

وہ ہنستی کھلکھلاتی حیدر کے گلے لگتی تو بلال جلدی اسے چپکے سے چٹکی کاٹ لیتا، وہ بھی پلٹ کر جواب دیتی۔ دونوں میں لڑائی شروع ہو جاتی، زینب اور حیدر کی تنبیہ دونوں ان سنی کر دیتے۔

کشف کو چوڑیاں پسند تھیں مگر انہیں توڑنا اس سے بھی زیادہ! جس پر بلال اس سے خوب لڑتا۔

"میرے بابا اتنی مہنگی، اتنے دل سے خرید کر لاتے ہیں یہ چوڑیاں اور تم مزے سے توڑ دیتی ہو۔ تمہیں ذرا احساس نہیں ہوتا۔"

وہ اس پر غصہ کرتا۔

"نہیں۔ مجھے احساس نہیں ہوتا۔" وہ رکھائی سے کہتی۔

"ہاں۔ تمہیں واقعی احساس نہیں ہوتا تھا کشف اور اب بھی نہیں ہوتا۔ ان چوڑیوں کے ٹوٹنے کا تمہیں ذرا غم نہیں ہوتا تھا جنہیں میرے بابا بڑے چاؤ سے خریدتے۔ میں پسند کرتا اور تم خوشی خوشی پہنتیں اور ذرا دیر میں ان ہی چوڑیوں کے ٹوٹے کانچ یہاں وہاں بکھرے ملتے اور بلال چپکے چپکے انہیں سمیٹتا اپنی جیبوں میں چھپاتا جاتا اور گھر لا کر اس خوب صورت باکس میں چھپا دیتا جو اس نے بابا سے بڑی ضد کر کے خریدا تھا۔

اس میں تو بہت سی نشانیاں تھیں اس کے ٹوٹے دل کی طرح!

"میں ان ٹوٹے کانچوں کو کہاں سنبھالوں کشف! تم نے تو میرا دل بھی کانچ کی چوڑی کی طرح توڑ ڈالا اور تمہیں احساس تک نہیں ہوا۔"

اس کی آنکھوں میں نمی تھی۔

"تو بابا ٹھیک کہتے ہیں۔ میں خسارے کا سودا کر رہا ہوں سوچتا تمہیں ہوں اور تعلق جوڑ رہا ہوں کسی اور کے ساتھ۔"

وہ پریشان سا ماضی کی ان نشانیوں کے پاس سوگ منانے والے انداز میں پھسکڑا مارے بیٹھا رہ گیا۔

☆☆☆

زینب کو ہوش آ چکا تھا۔

مگر وہ آنکھیں کھولے صرف چھت کو تکتی تھی یا ذرا دیر بعد آنکھیں بند کر لیتی۔ کشف اس کے پاس آتی۔

"آپی! کیسی طبیعت ہے آپ کی؟" وہ چھت کو تکتے ہوئے آنکھیں بند کر لیتی۔ کشف شرمندہ سی انگلیاں چٹخاتی رہ جاتی۔

"مجھ سے بات تو کریں۔" آخری بار آ کر وہ رہ نہ سکی۔ رونے لگی۔

اور یہ پہلی بار تھا زینب پر کشف کے آنسوؤں کا بھی کچھ اثر نہ ہوا تھا۔

وہ اس طرح بے حس پڑی رہی۔

"آپی! میں نے جان بوجھ کر یہ نہیں کیا تھا۔ قسم لے لیں، مجھے خود بھی نہیں پتا، میں نے کیسے یہ سب کر لیا۔ کئی بار آپ کو بتانے کے لیے میں نے کوشش کی۔ ہمت نہیں پڑتی تھی یا......"

"تو وہ انگوٹھی ڈائمنڈ کی اس نے تمہیں دی تھی؟" زینب نے قسم توڑتے ہوئے پوچھا۔

کشف سر جھکا کر لاجواب سی ہو گئی۔

"مجھے کسی مشکل، کسی مصیبت نے نہیں ہرایا۔ کشف! آج تم نے مجھے ہرا دیا۔ مجھے میری نظروں میں دو کوڑی کا نہیں رہنے دیا۔" اس کے خاموش آنسو تکیے میں جذب ہونے لگے۔

"میں نے بتایا ناں آپی۔" اس نے بولنے کی کوشش کی۔ زینب نے اسے ہاتھ اٹھا کر بولنے سے روک دیا۔

"مجھے اکیلا چھوڑ دو۔" وہ لمحہ بھر بعد جانے کون کرب ناک لمحوں سے گزر کر درد سے کراہ کر بولی۔

''آنی!'' وہ اس سے لپٹنا چاہتی تھی۔
''اتنا تو میرا مان ہے کہ تم میری یہ بات مانو گی، مجھے اکیلا چھوڑ دو۔'' زینب نے ایک دم سے اس کے آگے ہاتھ جوڑ دیے۔
کشف اس کے ہاتھوں کو بے اختیار ہونٹوں سے لگاتی رو پڑی۔
''میں آپ کی بیٹی کہلانے کی حق دار ہی نہیں تھی آنی! میں آپ کی زندگی میں صرف مشکلیں اور مصیبتیں ہی لے کر آئی ہوں، مجھے آپ کی زندگی میں ہونا ہی نہیں چاہیے تھا۔''
وہ رک رک کر آنسو پیتی، بہاتی کہتی گئی۔
زینب نے جواب میں کچھ نہیں کہا۔
وہ ہونٹ کچلتی اسے دیکھتی رہ گئی۔
''آپ میری طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتیں۔'' وہ کراہی۔ زینب نے اپنی خاموشی نہیں توڑی۔
کشف نے کچھ دیر انتظار کیا پھر کچھ کہے بغیر اٹھ کر چلی گئی۔
اس کے جاتے ہی زینب کے آنسو سارے بند توڑ کر نکل آئے۔

☆☆☆

حمزہ نے بے اختیار روتی رمشا کو اپنے گلے سے لگالیا۔ وہ رو رہی تھی اور وہ طیش میں جیسے ضبط کھو رہا تھا۔
''اگر پاپا نے اس بار اپنی بات منوانے کی کوشش کی تو خدا کی قسم، میں کسی کی بھی جان لے لوں گا۔ ان کی یا اپنی۔'' وہ جذبات میں بولتا چلا گیا۔
رمشا تڑپ کر اس سے الگ ہوئی۔ اس کے منہ پر اس نے بے اختیار ہاتھ رکھا تھا۔
''نہیں پلیز حمزہ! یہ نہیں سوچو، ہر مسئلے کا حل غصے اور طیش سے نہیں ہوتا۔ پلیز، تم صرف بابا کو سمجھانے کی کوشش کرو۔'' وہ اس کے ہاتھ پکڑ کر آنسو بہاتی اسے ٹھنڈا کرنے لگی۔
''تو تمہیں لگتا ہے، میں سمجھاؤں گا اور وہ سمجھ جائیں گے۔'' وہ طنز سے بولا۔
''حمزہ! میں کیسے اس شخص کے ساتھ پوری زندگی گزاروں گی جو کل تک میری بہن کا ہمسفر بننے جا رہا تھا اور اب کیا یہ تعلق، یہ رشتے اتنے کمزور، اتنے کچے ہوتے ہیں جب چاہو توڑ ڈالو یا نئے رشتے میں ڈھال لو پلیز بابا کو منع کرو۔'' وہ بری طرح ٹوٹی ہوئی تھی۔
سونیا نے اس کا رونا سن لیا تھا۔ چند لمحے وہ دروازے میں کھڑی رہی پھر اس کے پیچھے آ کر اسے کندھوں سے پکڑ کر سنبھالنے لگی۔
''میرے ہوتے ہوئے ایسا کچھ نہیں ہوگا رمشا! میں ہونے نہیں دوں گی۔'' اس کے لہجے میں کچھ تھا۔ رمشا کو ڈھارس سی ملی۔
''ہر بار تمہارے پاپا اور دادی کے فیصلے نہیں چلیں گے، میں ردا کو کھونے کے بعد اپنی کسی اولاد کو کھونے کا حوصلہ نہیں رکھتی۔''
سونیا کا لہجہ قطعی تھا۔
''آپ میں اتنی جرات ہوتی ماما! تو آج یہ سب کچھ یہاں تک پہنچا نہیں ہوتا۔'' حمزہ اسی تلخی سے بولا جواب اس کے مزاج کا ایک لازمی حصہ بن گئی تھی۔
''کیا میں نے کوشش نہیں کی تم سب کے اچھے فیوچر کے لیے۔ تمہاری ہر خوشی، خواہش کے لیے۔'' وہ شکایتی لہجے میں بولی۔

''ردا کتنی ذہین تھی۔ ہر کلاس میں ٹاپ کرتی، اس نے دو کلاسز میں ڈبل پرموشن لی اور ہم عمروں سے دو سال پہلے اس کی تعلیم مکمل ہو گئی اور میں اس سے کہتی تھی اسے کس بات کی جلدی ہے۔ وہ کس طرح جلدی جلدی سب کچھ کرتی جا رہی تھی، جاب بھی اسے پہلی کوشش میں مل گئی۔ جاب بھی اس کی ضد تھی اور میں نے جیسے بھی ہوا اس کی ضد تمہاری دادی اور پاپا سے پوری کروائی۔ مجھے کیا معلوم تھا۔ یہ معمولی سی ضد ایک دن مجھے رونے پر مجبور کر دے گی۔ وہ اسے جلدی جانا تھا تو سب کچھ اس کی زندگی میں جلدی جلدی ہوتا چلا گیا اور وہ جلدی سے منوں مٹی تلے بھی جا سوئی۔''

کہتے کہتے سونیا زور زور سے رونے لگی۔ حمزہ اور رمشا کو اسے سنبھالنا مشکل ہو گیا تھا۔ یہ اس کا معمول بن چکا تھا۔

وہ یونہی بات کرتے کرتے ردا کی کہانی پھر اس کی موت میں الجھ جاتی۔ اردگرد کیا ہو رہا ہے وہ یکسر بھول جاتی۔

آج بھی یہی ہوا تھا۔ وہ ذہنی طور پر اتنی مضبوط نہیں رہی تھی کہ اسے یوں چھوڑ کر رمشا چلی جاتی۔

وہ ماں کو سنبھالتی خود بکھرنے لگتی تو ایسے میں اس طرح کی خوشی کا سوچنا آنکھوں میں نئے خواب سجانا ناممکن ہی نہیں ناقابل برداشت بھی تھا اور رمشا اس کے لیے تیار نہیں تھی۔

☆☆☆

موحد تمام مریضوں کو چیک کر کے فارغ ہو چکا تھا۔

اسے اس سارے وقت میں بھی اپنی جلد بازی پر غصہ آ تا رہا تھا۔ پر کیا کیا جا سکتا تھا اب سوائے غصہ کرنے کے!

اس نے تیسری بار کافی منگوائی اور گرم جلتی کافی نے اس کے ہونٹ جلا ڈالے مگر اسے احساس نہیں ہوا۔ شاید وہ خود کو سزا دینا چاہتا تھا۔

''پتا نہیں آنی کی طبیعت اب کیسی ہے۔'' اس نے فکرمندی سے سوچا۔ زینب جو اسے بہت پسند کرتی تھی کس طرح اس کی پسندیدگی ناگواری میں بدلی۔ موحد سوچنے لگا۔

شاید جب زینب نے موحد کو منصور کے ساتھ دیکھا تھا۔ اس کے بعد سے دونوں کے تعلق میں گرم جوشی نہیں رہی تھی۔'' اس نے سوچتے ہوئے کڑی ملائی۔

مگر اب کچھ بھی ہوا سے اس خلیج کو پاٹنا تھا جو زینب اور کشف کے درمیان آ رہی تھی۔

بہت سوچنے کے بعد اس نے کشف کا نمبر ملایا۔ اس نے دوسری بیل پر ہی کال ریسیو کر لی۔

''کیا ضرورت تھی یہاں آ کر یہ ساری بکواس کرنے کی۔'' وہ فون اٹھاتے ہی پھٹ پڑی۔

''اس طرح ہوتا یا اس طرح جس طرح سے بھی آنی کو پتا چلتا کشف! ان کو دھچکا لگنا ضرور تھا۔'' اس نے لہجہ نرم ہی رکھا۔

''آپ کو مل گئی خوشی انہیں دھچکا پہنچا کر، آپ جانتے ہیں ناں ان کے سوا میرا اس دنیا میں اور کوئی نہیں ہے۔'' وہ ٹوٹی ہوئی تھی۔

''مجھے کیوں ہر بار بھول جاتی ہو۔'' وہ جتا کر بولا۔

کشف خاموش ہو گئی۔

کیسا اقرار تھا جو اس سے ہو ہی نہیں پاتا تھا۔

''ایک بات کہوں۔'' کشف لہجہ بھر رک کر بولی۔

"میں اس وقت صرف کہیں ہی سننا چاہتا ہوں۔" وہ متوجہ تھا۔
"میں چاہتے ہوئے بھی آپ کو اپنے ساتھ نہیں سوچ پاتی۔" وہ رک کر بولی۔
"اس کو میں کیا کہوں؟" وہ الٹا پوچھنے لگا۔
"مجھے نہیں معلوم۔" وہ لاعلمی سے بولی۔
"خیر..... " چند لمحے دونوں کی خاموشی کے بعد موحد نے موضوع بدلنا چاہا۔ "میں جس کام کے لیے آیا تھا۔"
"وہ نہیں ہو سکتا۔" وہ اس کی بات کاٹ کر تیزی سے بولی۔ وہ کچھ دیر خاموش رہا۔
"ہونے کو کیا نہیں ہو سکتا۔" وہ اسے چڑانے کو بولا۔
"آپ عجیب ضدی سے انسان ہیں، سچ کہوں کبھی کبھی مجھے آپ سے خوف آنے لگتا ہے۔" وہ صاف گوئی سے بولی۔
"اور کبھی کبھی جب خوف نہیں آ رہا ہوتا۔" وہ جیسے اس کی بات کو انجوائے کر رہا تھا۔
"پتا نہیں۔" وہ ناسمجھی سے بولی۔
"اس کا مطلب ہے، آپ کے دل میں کچھ ایسا ہے جو آپ زبان پر نہیں لانا چاہتیں۔" وہ جرح کر رہا تھا۔
"میرے دل میں ایسا کچھ نہیں ہے۔" وہ اسی چڑے ہوئے تیز لہجے میں بولی۔
"میں تو ہوں ناں آپ کے دل میں؟" وہ بے اختیار بولا۔
"سچ کہوں؟" وہ پھر اسی لہجے میں بولی۔
"میں سچ ہی سننا چاہتا ہوں۔" وہ مشتاق سا ہوا۔
"سن نہیں سکیں گے کیونکہ مجھ سے کہا نہیں جائے گا۔"
اس کے جواب پر موحد کو مایوسی سی ہوئی۔
"آنی کی طبیعت اب کیسی ہے؟" وہ کچھ دیر بعد بولا۔
"پتا نہیں۔" وہ اتنی لاعلم تھی یا کچھ بھی بات نہیں کرنا چاہتی تھی جو ہر بات میں پتا نہیں کی گردان کیے جا رہی تھی۔
"کشف!" موحد کو غصہ سا آ گیا۔
"تو کیا کہوں۔ انہوں نے مجھے کمرے سے نکال دیا۔ وہ میری طرف دیکھنا بھی نہیں چاہتیں۔" کہتے کہتے جیسے اس کے آنسو چھلک پڑے، موحد خاموش سا رہ گیا۔
"میں سمجھ سکتا ہوں۔ وہ غصے میں ہوں گی۔" وہ گہرا سانس لے کر بولا۔
"غصے میں ہوتیں، مجھے ڈانٹ لیتیں، مارتیں، بول لیتیں مگر اس طرح لاتعلق تو نہ ہو جاتیں۔" وہ سخت رنجیدہ تھی۔
"یہ بھی ایک ری ایکشن ہوتا ہے اعتماد کے ٹوٹنے کا۔" موحد کی بات پر کشف کے اندر جیسے کچھ ٹوٹا۔
ٹھیک ہی تو کہا اس نے، کیا بھرم رکھا تھا اس نے زینب کی امیدوں کا، اس کی توقعات کا کیا پاس رکھا تھا جو وہ اس کی طرف دیکھتی بھی۔
"وہ کب تک مجھ سے ناراض رہیں گی؟" وہ دل گرفتہ پوچھ رہی تھی۔
"زیادہ وقت نہیں۔" موحد کے لہجے میں تسلی دینے والا انداز تھا۔
"آپ کو یہ بات اچانک آ کر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔" اسے پھر سے یاد آ گیا اپنا گلہ!

کیونکہ کشف! میں واقعی تمہیں اپنے ساتھ لے جانا چاہتا ہوں، جہاں مجھے جانا ہے۔" وہ سنجیدہ تھا۔ کشف تو گم صم سی ہو کر رہ گئی۔

"مجھے...... میں آپ کے ساتھ کیوں جاؤں گی کہیں بھی۔" وہ بگڑتے بگڑتے بھی بوکھلاسی گئی۔

"کیا مجھے پھر سے یاد دلانا پڑے گا کہ کیوں لے جانا چاہتا ہوں میں تمہیں ساتھ اپنے۔"

کشف کے اندر تک کڑواہٹ پھیل گئی۔

"یہ ممکن نہیں۔" وہ یہی کہہ سکی۔ صاف مدعا اس سے بڑھ کر اور کیا ہوتا۔

"میں نہ سننے کا عادی نہیں ہوں۔" وہ اچانک سے سخت ہو گیا۔

"اور مجھے لوگوں کی توقعات کی پروا نہیں کرنی آتی، اس لیے مجھ سے یہ امید نہ رکھیے گا کہ محض آپ کے ساتھ ہونے یا نہ ہونے سے مجھے کچھ فرق پڑے گا، میں وہی کروں گی جو میرا دل کہے گا۔"

"وہی دل جس کے کہنے پر آپ نے نکاح نامے پر دستخط کیے اب وہی آپ کو میرے ساتھ چلنے پر بھی اکسائے گا دیکھ لیجیے گا۔" وہ بڑے دعوے سے بولا۔

"ایسا ہو ہی نہیں سکتا۔" وہ بھی مضبوطی سے بولی۔

"ایسا ہی ہوگا اگلے ہفتے ہمیں جانا ہے میں فارمیلیٹز والا بندہ نہیں ہوں کہ رخصتی بیاہ کے چکر میں پڑوں۔ نکاح ہمارا ہو چکا ہے، اب آپ کو اپنی پیکنگ کرنی ہے، اس کے لیے چاہیں تو کچھ ضروری چیزوں کی شاپنگ کر لیتے ہیں۔ کل تین بجے میں آپ کو لینے کے لیے آؤں گا۔ شاپنگ کے لیے تیار رہیے گا۔"

اس نے کہہ کر کشف کا جواب سنے بغیر کال کاٹ دی تھی۔

عجیب سی سرد مہری تھی موحد کے لہجے میں!

اور ایسا کشف کو پہلی بار محسوس ہوا تھا۔ وہ برف جیسا شخص ہے جس میں شاید احساسات بہت کم ہیں یا شاید ہیں ہی نہیں وہ کس طرح اس پر حکم چلا رہا تھا۔

تو کیا اب وہ باقی کی زندگی اس کے حکام پر بے چوں چرا عمل کرتے گزارے گی۔ اور کس طرح وہ اسے ساتھ چلنے کا کہہ رہا ہے۔ کیا آنی اسے جانے دیں گی اور کیا وہ خود انہیں چھوڑ کر جا سکتی ہے۔

کشف کو کھلی کھڑکیوں کے باوجود کمرے میں عجیب سی گھٹن اور تنگی کا شدت سے احساس ہوا۔ وہ اٹھ کر باہر کی طرف بھاگی۔

☆☆☆

منصور آج گھر سے کہیں نہیں نکلا تھا۔ دل بہت عجیب سا ہو رہا تھا۔

جو کچھ سوچ کر وہ یہاں آیا تھا۔ ایسا تو کچھ بھی نہیں ہو سکا تھا۔ اس نے سوچا تھا، وہ گھر بیچنے کی بات کرے گا زینب گھبرا جائے گی۔ اس کی منتیں کرے گی، پرانی محبت کے واسطے دے گی اور وہ اس پر احسان کرتے ہوئے اسے شیشے میں اتار لے گا۔

وہ گھر بیچ کر زریں کی رقم اس کے منہ پر مارے گا۔

اور خود زینب سے شادی کر کے باقی کی زندگی سکون سے گزارے گا اور یہ بھی اچھی بات ہو گئی تھی کہ ایمان کا رشتہ بھی طے ہو گیا تھا جو ایک فکر اس کے کندھوں پر تھی۔ کسی بوجھ کی طرح، وہ بھی جاتی رہی مگر اس کی جلد بازی نے جیسے سارے تاش کے پتے بکھیر دیے تھے، ان پتوں سے کھڑا اس کے خوابوں کا محل دھڑام سے آ گرا تھا۔ وہ اب چاہتا بھی تو زینب کو شیشے میں نہیں اتار سکتا تھا۔

دوسری عجیب بات جو وہ خود بھی بھولے ہوئے تھا کہ وہ جو سمجھتا تھا، وہ واپس جائے گا تو وہی ڈری سہمی سمٹی

سمٹائی گھبرائی زینب ہوگی جو اسے دیکھتے ہی خوشی سے پاگل ہو جائے گی، وہ جہاں قدم رکھے گا۔ وہ سجدہ کرے گی کہ وہ منصور کی محبت میں ایسی ہی باؤلی تھی۔
وہ جاتے ہوئے اس سے کتنے وعدے لے کر گیا تھا اور اس نے منصور سے کتنے وعدے لیے تھے اور دونوں مطمئن تھے شاید انہوں نے ایک دوسرے کو ان وعدوں کی زنجیر میں باندھ لیا ہے۔
اسی لیے تو زریں کے ساتھ محبت کا کھیل کھیلتے ہوئے وہ بے خوف تھا۔ وہ آگے ہی آگے بڑھتا چلا گیا۔
زریں نے بھی اس کی حوصلہ افزائی کی۔
منصور نے اس سے پہلے زریں جیسی بے خوف و نڈر عورت نہیں دیکھی تھی جو شوہر اور بچے کے ہوتے ہوئے ایسی دیدہ دلیری سے غیر مردکی کمپنی کو اتنے کھلے ڈلے انداز میں انجوائے کرتی ہو۔
وہ خود بھی انجوائے کر رہا تھا۔
زینب کا تو اس کو پتا تھا، وہ جب بھی واپس جائے گا۔ وہ اسی گھر کی دہلیز پر اس کی منتظر کھڑی ہوگی۔
اور ایسا کچھ غلط بھی نہیں تھا اس کا اندازہ۔ اسے زینب کی طرف سے ملنے والے ہر خط اور فون کال سے ہو جاتا تھا۔
مگر پھر وہ واقعہ ہو گیا جس نے اس کی دنیا ہی بدل دی۔
وہ شام کی شفٹ میں کسی پٹرول پمپ پر کام کرتا تھا۔ وہ پٹرول پمپ شہر سے باہر جنگل کے پاس تھا۔
رات بھر کی ڈیوٹی میں گرم ترین کپڑوں میں بھی اس کی قلفی جم جاتی تھی مگر اسے جنون تھا، بہت پیسہ اکٹھا کرنے کا اسے کیا پتا تھا، اس ہفتہ رات اس کے لیے کتنی بھیانک ہوگی۔
ویک اینڈ پر پمپ پر رش کچھ غیر معمولی تھا۔
وہ پمپ میں مصروف تھا جب کہیں قریب ہائی وے سے گولیاں چلنے کی آواز آئی۔
اس دن پمپ پر اس کے ساتھ تین لڑکے اور بھی تھے اور ایک پمپ کا مالک جو اپنے کیبن میں تھا۔
دونوں لڑکوں نے گولیوں کی آواز سن کر بھی کان نہیں دھرا مگر منصور سے رہا نہیں گیا۔
وہ بھاگتا ہوا جائے واردات پر پہنچا تھا۔ خون میں لت پت محمود الحسن سڑک پر پڑا تھا۔
مائیکل اپنے ساتھیوں کے ساتھ زریں کو کھینچتے ہوئے لے جانے کی کوشش کر رہا تھا۔ اس کا بیٹا موحد اپنے باپ کی لاش سے لپٹا ہوا تھا۔
منصور کو دیکھتے ہی زریں نے مدد کے لیے چلانا شروع کر دیا۔
اسی وقت پولیس کے سائرن سے سارا علاقہ گونج اٹھا۔
مائیکل اور اس کے ساتھی گاڑی لے کر جنگل کے اندھیرے میں کہیں گم ہو گئے۔
وہ اپنا پستول منصور کے ہاتھ میں دے گئے تھے وہ بھی جوش و جذبات میں اندھا ہو کر اس پستول سے ان کے پیچھے فائر کر رہا تھا جب پولیس وہاں پہنچی اور موحد نے شور مچا دیا کہ اس کے باپ کو منصور نے قتل کیا ہے زریں کو حاصل کرنے کے لیے!
زریں صدمے سے خاموش تھی یا وہ بھی دل سے یہی چاہتی تھی۔ پولیس جب اسے گاڑی میں ڈال کر لے جا رہی تھی وہ چیختا چلاتا رہا کہ اس نے کسی کو قتل نہیں کیا۔
جبکہ آلۂ قتل اس کے ہاتھ میں تھا۔
موحد کی گواہی اور مقتول کی بیوی کی خاموشی کھلی گواہی تھی! ایک پولیس مین کو وہاں چھوڑ کر ایمبولینس کے انتظار میں پولیس انہیں اپنے ساتھ پولیس اسٹیشن لے کر آ گئی۔ تو اس سے بھی عجیب واقعہ ہو گیا۔

پولیس جس شخص کو لاش کی نگرانی کے لیے چھوڑ کر گئی۔ وہ واش روم جانے کے لیے پٹرول پمپ چلا گیا۔
جب وہ واپس آیا تو حیرت زدہ رہ گیا۔
محمود الحسن کی لاش وہاں نہیں تھی۔
خون کا ایک ننھا سا تالاب تھا مگر لاش کہیں نہیں تھی۔ لاش کو نہ تو گھسیٹا گیا تھا نہ کسی طرح لے جانے کے کسی کے قدموں کے نشان تھے نہ کسی گاڑی کے پہیوں کے!
ایمبولینس کے ساتھ مزید پولیس فورس آئی۔ رات بھر اس ہائے وے پر اور جنگل میں کہاں کہاں اس لاش کو تلاش نہیں کیا گیا مگر اس کا کوئی سراغ نہ ملا۔
تین چار دن کی تلاش کے بعد پولیس نے ہمت ہار دی۔
موحد کئی بار نانا کے ساتھ اس جگہ آیا، جنگل میں مارا مارا پھرا مگر محمود الحسن بدنصیب کی لاش کو خدا جانے قبر نصیب ہوئی یا نہیں مگر اس کی میت نہیں مل سکی۔
موحد کی گواہی کمزور تھی۔ بعد زریں نے بھی منصور کے حق میں گواہی دے دی۔ آلہ قتل پر اس کی اور کسی دوسرے کی انگلیوں کے نشان نے بھی منصور کو شک کا فائدہ دیا۔
مگر اس کیس کو چلنے اور فیصلہ آنے میں بھی دو تین سال لگ گئے۔ منصور کو جیل کی وہ کال کوٹھڑی کبھی نہیں بھولتی تھی۔ جہاں وہ اپنی ماں، بہن اور زینب کو ہر لحہ یاد کرتا تھا۔ اپنے مسرت بھرے دن جن میں روٹی کم تھی مگر سکون اور خوشی بہت تھی۔
کاش وہ اتنے اونچے خواب سجا کر اس بے درد ملک میں نہ آیا ہوتا۔ جس کی سردی ہی نہیں، رویوں کی سرد مہری بھی جیتے جی انسان کو لاش بنا دیتی ہے۔
وہ زریں کو دیکھتا تو بچوں کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگتا اور وہ اسے تسلیاں دیتی۔
اس کی تسلیوں نے یہ تین سال گزار دیے۔
گھر میں پہلے وہ جھوٹ بولتا رہا کہ مصروف ہے، فون نہیں کر سکتا، خط نہیں لکھ سکتا۔
کئی کئی مہینے کسی سے بات نہیں ہو پاتی تھی۔ وہ جیسے ہر چیز سے کٹ گیا تھا۔ باہر کی دنیا سے، باہر کے رشتوں سے، ہر معاملے سے کٹا ہوا ایک بدحال شخص۔
جب وہ سوا تین سال بعد زریں کے ساتھ جیل سے نکل کر باہر آیا تھا، اتنی تیز روشنی میں اس کی آنکھیں نہیں کھل رہی تھیں۔ شاید اللہ کو اس پر رحم آ گیا تھا، جو زریں نے اس کا ساتھ نہیں چھوڑا اور نہ تو شاید وہ مرتے دم تک اس کال کوٹھڑی میں گل سڑ جاتا۔
زریں نے باپ کی مخالفت کے باوجود منصور کو شادی کی آفر کی تو اسے جیسے شادیٔ مرگ ہو گیا۔
اپنی خوش بختی کو تو وہ بھول ہی چکا تھا۔
وہ تو اپنی پچھلی محبت کو بھی بھول چکا تھا، جب اس نے زریں کو ہاں کی اور پھر سب کچھ ہوتا چلا گیا۔
جانے کیوں زریں کو یہ یقین تھا کہ منصور اسے چھوڑ کر چلا جائے گا۔ اس نے بہت سے حفاظتی اقدامات کیے۔
اس نے منصور کو گھر کے کاغذ چھڑانے کے عوض خطیر رقم دی جو اس نے بہت مہینوں بعد پاکستان بھیجی تھی۔
زریں نے وہ رقم ڈیل کی صورت میں لکھوالی کہ جب بھی منصور اسے طلاق دے گا، اسے یہ ساری رقم ڈیل کر کے پہلے زریں کو ادا کرنی ہوگی۔
اس وقت تو اس کے لیے یہ سب ہنسی کھیل تھا، اسے یقین تھا زریں کو طلاق دینے کی نوبت کبھی نہیں آئے

گی۔ وہ کچھ ماہ بعد پاکستان جائے گا اور زینب سے شادی کرے گا، واپس آجائے گا۔ زرین کے بزنس پر اب صرف اس کا حق ہے سو وہی اسے چلائے گا۔

وہ پہلے کی طرح بے خوف اور نڈر ہو چکا تھا۔ قسمت ایک بار پھر اس پر مہربان تھی۔ اس کے گھر سال بھر بعد ہی ایمان ہو گئی تھی۔

ہاں موحد...... وہ دس بارہ سال کا لڑکا جتنی نفرت منصور کے لیے اس کی آنکھوں میں ہوتی، اس سے کہیں زیادہ منصور کے دل میں اس کے لیے تھی۔

وہ اس کی جھوٹی گواہی کو مرتے دم تک بھولنے والا نہیں تھا۔ زریں نے موحد کے غصے اور نفرت کی وجہ سے اسے بورڈنگ میں داخل کروادیا تھا اور ہر طرف چین سکون، خوشی تھی جب اسے پتا چلا زینب نے شادی کر لی ہے۔

☆☆☆

زینب کو سونیا سے ایسے پیار تھا جیسے سگی بہنوں کو بھی ایک دوسرے سے نہیں ہوتا۔ اس کی وجہ اگرچہ منصور کی محبت تھی تو بھی سونیا اور زینب میں بہت محبت تھی۔ سونیا زینب کی طرح ذمہ دار اور احساس کرنے والی لڑکی تھی۔ اس نے میٹرک کے بعد کسی ٹیکنیکل ارادے سے دو تین شارٹ کورسز اور ایک ڈپلوما کیا تھا۔

ابا کی وفات کے بعد گھر کے حالات بہت خراب ہو چلے تھے۔ ان کی پینشن سے گھر چلانا ناممکن تھا۔ زینب تو بہت چھوٹی تھی جب اس کے ماں باپ کا ایک ایکسیڈنٹ میں انتقال ہو گیا تو ابا میر حیات اسے اپنے ساتھ لے آئے تھے۔

ان کی اماں اتنی سخت دل نہ تھیں کہ ایک چھوٹی سی یتیم بچی کو گھر میں جگہ نہ دیتیں یا اس سے بیر باندھتیں اور یہ بھی سچ تھا کہ اس بڑے گھر میں زینب کے ابا کا بھی وراثتی حصہ تھا۔

اس سے بھی بڑی بات زینب کو بچپن ہی سے میر منصور کے لیے مانگ لیا گیا تھا اور یہ بات وہ دونوں جانتے تھے اور دل سے چاہتے تھے پھر اس چاہت میں جانے کیسے دوریاں آ گئیں۔

وہ تینوں شاپنگ کے لیے آئے تھے۔

☆☆☆

ثمینہ، ایمان اور بلال کو زبردستی اکٹھے شاپنگ کے لیے لے کر آئی تھی۔ ان کی اگلے ہفتے منگنی تھی۔ ایک مہینے بعد شادی......

ثمینہ، کچھ جلدی جلدی جھٹ پٹ کرنا چاہتی تھی جیسے اس کو بھی کسی چیز کا اعتبار نہیں رہا تھا۔

وہ ایما کو یہاں کی رسم کے مطابق منگنی کا سوٹ پسند کروا رہی تھی اور وہ حیران ہوئے جا رہی تھی۔

''اتنے ہیوی کام کے کپڑے۔ آنٹی میں انہیں کیری کیسے کر سکتی ہوں۔ لک ایٹ دیز بلال۔''

وہ بلال کا بازو سارا راستہ تھامے ہوئے تھی اور وہ کسی معمول کی طرح اس کے ساتھ چلتا جا رہا تھا۔

''بلال! تم بتاؤ، یہ ایما پر کتنا سوٹ کریں گے۔ ہے نا، کلر کتنا خوب صورت اور یونیک سا ہے۔''

ثمینہ اس ستاروں بھری خوب صورت پرپل اور پیچ کلر فراک پر فریفتہ ہو چکی تھی۔

وہ یوں ہی سر ہلا کر رہ گیا۔

''اچھی ہے ماما بہت۔'' وہ رُکھی سا بولا تھا۔ ثمینہ اسے گھور کر رہ گئی۔

''آپ ایما سے پوچھیں ناں، پہننا تو اس نے ہے۔'' وہ جلدی سے ماں کی گھوری سے متاثر ہو کر بولا۔

''ہیلو ثمن! کیسی ہو ڈیر۔'' اجنبی آواز پر بلال ایما کے ساتھ گھوما تھا۔

ثمینہ کا رنگ ایک پل کے لیے فق ہوا، پھر نارمل ہو گیا۔
''ہائے شیرازی۔ یہاں کہاں بھٹک رہے ہو۔'' وہ بے تکلفی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر نزاکت سے بولی تھی۔
بلال کے ماتھے پر بل پڑ گئے۔
''تمہاری بے وفائی کا غم کم کرنے کے لیے اور کیا کروں۔ تم تو نہ کال پر آتی ہو نہ......'' وہ مزید کچھ اور بے تکلفی سے بولنا چاہتا تھا۔ ثمینہ اس کا ہاتھ پکڑ کر جانے لگی۔
''ایما، بلال! میری جان۔ تم لوگ چوز کرو اپنی پسند کے ڈریسز، میں ذرا شیرازی صاحب کی بات سن لوں۔'' وہ کہتی ہوئی اپنی ٹائٹ شرٹ پر ٹخنوں سے اوپر جاتی کیپری کے ساتھ دوپٹے سے بے نیاز شیرازی صاحب کی بانہہ پکڑے دوسری طرف چلی گئی۔
بلال ہونٹ بھینچے ہکا بکا انہیں جاتا دیکھتا رہ گیا۔
ایسا اسے پہلے کئی بار محسوس ہوا کہ اس کی ماں وہ نہیں ہے جو دکھتی ہے تو اس نے اپنے دماغ کے اس خیال کو بری طرح سے جھٹکا تھا۔
اور آج سب کچھ اپنی آنکھوں سے دیکھ کر بھی دل بے یقین ہو رہا تھا۔ وہ ایما کی موجودگی کو بھول چکا تھا۔
''یہ تو سیم میری ماما والا کیس ہے۔'' وہ بڑبڑائی تو چونکتے ہوئے پورا اس کی طرف گھوم گیا۔
''کیا مطلب؟'' اس کے ماتھے پر تیوریاں تھیں۔
''ان کے بھی ایسے ہی بے تکلف دوست تھے۔ میں تو سمجھتی تھی کہ یہاں آئی مین اس سوسائٹی میں اتنی لبرٹی نہیں ہے سو اس کے لیے ویری نائس۔''
اور بلال کا دل چاہا، اس سات منزلہ مال کے آخری فلور سے نیچے چھلانگ لگا دے۔
اس کا دل جیسے سینے سے نکلا جا رہا تھا۔ اس کی نظروں کے سامنے بار بار حیدر کا بے بسی بھرا چہرا آتا تھا۔
''ویسے یہ اچھی ٹریڈیشن ہے، رشتوں میں اتنا مارجن ہونا چاہیے کہ جب آپ اپنے رشتے سے اکتا جائیں تو کہیں اور جا کر کھل کر سانس لے سکیں۔ کیوں بلال! ہے ناں۔''
وہ اس سے بے تکلفی سے پوچھ رہی تھی۔
وہ جھٹکے سے اس سے ہاتھ چھڑا کر تیز تیز وہاں سے چلا گیا۔
ایمان حیران سی اسے دیکھتی اس کے پیچھے جانے لگی۔

☆☆☆

''شیرازی! کس بات کی جلدی ہے تمہیں؟'' ثمینہ ایک ادا سے اپنے رنگے ہوئے سرخ بالوں کو ایک طرف ڈال کر بولی۔
''جلدی لگ رہا ہے تمہیں۔ دو ماہ بعد میں کینیڈا جا رہا ہوں۔ ہمارا معاملہ ابھی تک وہیں ہے۔'' وہ خفگی سے بولا۔
''کم آن۔ دو ماہ تو زیادہ ہیں۔ سمجھو، میں تمہارے ساتھ ہی کینیڈا جا رہی ہوں۔ پاسپورٹ بنوا چکی ہوں، بس ویزا لگوانا ہوگا۔''
''اس کے لیے کتنے پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، کچھ اندازہ ہے تمہیں۔'' وہ اسی لہجے میں بولا۔
''ڈونٹ وری۔ میں نے سارا بندوبست کر لیا ہے۔'' وہ بے فکری سے سلش کا گھونٹ بھرتے ہوئے بولی۔
''کیا مطلب، میں بالکل نہیں سمجھا۔'' وہ کچھ حیران تھا۔
جواب میں وہ کھلکھلا کر ہنس پڑی۔

''ثمینہ ڈارلنگ۔ کم آن۔ یو نو میں بی پی پیشنٹ ہوں۔ اتنا سسپنس برداشت نہیں کر سکتا۔'' وہ کچھ خفگی محسوس کر گیا تھا۔
''اونہوں۔ میرے سامنے یہ بیماریوں کے نام مت لیا کرو۔''
''سنو، میں نے اپنے بیٹے کی ایک کینیڈین نیشنلٹی ہولڈر لڑکی کے ساتھ شادی طے کر دی ہے۔ میں ان کے ساتھ ہی کینیڈا جاؤں گی، بس باقی کا کام آسان ہے۔'' وہ اسے سمجھاتے ہوئے بولی۔
''اور تمہارا شوہر؟'' وہ ماتھے پر بل ڈال کر بولا۔
''میں نے پہلے کبھی اس کی پروا کی ہے، جواب کروں گی۔''
وہ کندھے اچکا کر لاپروائی سے بولی۔
وہ اسے پراعتماد دیکھ کر مطمئن سا ہو گیا۔

☆☆☆

''تمہیں اس سے خلع لینا ہوگا۔''
وہ مختصر الفاظ میں زینب کو جو ہوا تھا، کچھ بتا چکی تھی۔ سب سننے کے بعد زینب نے ایک لمبی خاموشی کے بعد یہ کہا تھا۔ کشف نے کچھ بے چینی سے پہلو بدلا۔
''کیوں انوالو ہو گئی ہو۔ محبت کرنے لگی ہو اس سے۔'' زینب کے لہجے میں کچھ طنز تھا۔
''پتا نہیں۔'' وہ واقعی بہت کنفیوز تھی، موحد والے معاملے میں اس کے منہ سے یہی نکلتا۔
زینب اسے دیکھتی رہ گئی۔
''اگر پتا نہیں تو پتا کرو، جس طرح خاموشی سے یہ سب ہوا ہے۔ اسی خاموشی سے ختم ہو جانا چاہیے۔'' اس کے لہجے میں کچھ دھمکی سی تھی۔
کشف کچھ نہیں بولی۔
''تم سن رہی ہو ناں میری بات۔'' وہ تیزی سے بولی، کشف کی چپ اسے کھل رہی تھی۔
''میں آپ کے کہنے سے پہلے اس سے یہ بات کر چکی ہوں۔'' وہ گہرا سانس لے کر بولی۔
''تو......؟'' زینب بے چینی سے بولی۔
''وہ کہتا ہے، یہ ممکن نہیں، وہ اب تب ہی مجھ سے دور جا سکتا ہے۔ جب اس کی موت آئے گی۔'' وہ اطمینان سے بولی۔
زینب اسے دیکھ کر رہ گئی۔
''باپ کی طرح کا بلیک میلر دو نمبریا...... '' وہ دانت پیس کر بولی۔ ''اس منصور کو پتا چلے گا تو......''
''ان کا نام مت لیا کریں میرے سامنے۔'' وہ غصے میں بولی۔ زینب ایک دم سے چپ کر گئی۔
دونوں خاموشی سے کچھ سوچنے لگیں۔
''پھر کیا سوچا ہے تم نے۔'' زینب اس کی لمبی چپ پر کچھ بے چینی سے بولی۔
''جو آپ کہیں گی۔'' جانے ایسی سعادت مندی کہاں سے آ گئی تھی جو وہ کہہ گئی۔
''بڑی جلدی خیال آ گیا، میرے کہنے کا۔'' وہ طنز سے بولی۔
''کل ہی وکیل سے مل کر خلع کا نوٹس بھجواتی ہوں میں اسے اور یہ معاملہ ختم کراتی ہوں۔ تم نے مجھے مارنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑی کشف۔'' وہ اب غصے میں تھی۔
باہر کا دروازہ زور زور سے بج رہا تھا۔

یہ بیل پھر خراب ہوگئی ہے، ٹھیک کروائیں کسی کو بلا کر۔"
وہ بولتی ہوئی، دروازے تک گئی اور دروازہ کھول کر لمحہ بھر کر ساکت کھڑی رہ گئی۔
وہ جتنا اس کو بھلانے کے جتن کرتی تھی، پھر وہ کیوں۔ بار بار اس کے سامنے آجاتا تھا۔
اس نے ہونٹ سکوڑے۔
"کیا مسئلہ ہے؟" وہ یہ کمر پر ہاتھ رکھے تیکھے پن سے بولی۔
"مسئلہ تو تم ہو۔" وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ کر بولا۔
"میرے ساتھ تمہارا جو بھی مسئلہ تھا، سب ختم ہو چکا تو پلیز بار بار آکر ایک ہی موضوع کو چھیڑ کر میرا میٹر نہیں گھماؤ، میں پہلے ہی بہت فیڈ اپ ہو چکی ہوں ہر چیز سے۔"
وہ نظریں چرائے اونچا اونچا بولتی اسے وہیں کھڑا چھوڑ کر اندر کمرے کی طرف چلی گئی۔
بلال خاموشی سے وہیں کھڑا رہا۔
"آؤ، بلال! کہو، کیسے ہو؟ تمہارے گھر میں سب۔ خیریت ہے۔" زینب کو آداب میزبانی تو نبھانے تھے۔
"دادو کہاں ہیں، ان سے ملنے آیا ہوں۔" وہ کچھ اجنبی سے لہجے میں پوچھ رہا تھا۔ کتنے فاصلے آگئے ہیں بیچ میں۔
زینب کو دکھ سا ہوا۔
"تمہارے بابا انہیں شاہ پور والی خالہ خدیجہ کے گھر لے گئے تھے دو دن پہلے، ان کی بیٹی کی شادی ہے۔ شاید انہوں نے بلوایا تھا۔ حیدر بھائی نے تمہیں نہیں بتایا۔" زینب نے تفصیل سے بتایا۔
"نہیں۔ مجھے معلوم نہیں تھا، اس لیے آگیا۔ سوری۔ چلتا ہوں۔"
"مبارک ہو، تمہاری منگنی طے ہوگئی۔" زینب نے اونچی آواز میں کہا۔
اور اندر کمرے میں یوں ہی چیزیں ادھر ادھر پھینکتی کشف نے سنا تو اس کے مصروف ہاتھ ٹھٹک کر رہ گئے۔
بلال نے جواب میں کچھ بھی نہیں کہا۔
"بلال!" زینب نے پھر پکارا۔
"میں چلتا ہوں آنی! مجھے ایک ضروری کام سے جانا تھا پھر کبھی آؤں گا۔" وہ کہہ کر مڑ کر جانے لگا۔
"پھر کبھی بھی نہیں آنا یہاں، کوئی نہیں بیٹھا جو تمہارا انتظار کر رہا ہے یا تمہارے آنے پر دیے جلانے والا ہے۔ ہزار بار تمہیں کہہ چکی ہوں، یہاں مت آیا کرو۔ پتا نہیں تم کس ڈھیٹ مٹی کے بنے ہو، پھر بھی چلے آتے ہو۔ مزا آتا ہے تمہیں دوسروں کو پریشان کرنے میں۔" وہ پاگلوں کی طرح اس پر پل پڑی تھی۔
وہ سکون سے کھڑا تھا۔
"میں نے تو کسی کو کچھ نہیں کہا مگر لگتا ہے، لوگوں کو خود ہی مزا آتا ہے خود کو پریشان کرنے میں۔" وہ اسی سکون کے ساتھ بولا۔
"تم مذاق اڑا رہے ہو میرا، اس ایمان کے ساتھ منگنی کر کے تم نے اور تمہاری ماں نے جو شارٹ کٹ ڈھونڈا ہے، سمجھتے ہو کیا جیسے کسی کو کچھ سمجھ میں نہیں آتا۔ تم نے میرے انکار کو جواز بنا کر جس طرح مجھ سے پیچھا چھڑایا، تمہیں لگتا ہے مجھے پتا نہیں۔" وہ عجیب ہسٹریائی سی ہو رہی تھی۔
"کشف! کیا ہو گیا ہے تمہیں۔ چھوڑو اسے۔" زینب نے کشف کو غصے میں پیچھے دھکیلا۔
بلال اب اپنا کالر ٹھیک کر رہا تھا، اس کے چہرے پر عجیب سکون سا تھا۔

"بولنے دیں آنی! اسے۔ اس کے اس طرح بولنے سے مجھے بہت خوشی ہو رہی ہے۔ اس کے دل کا غصہ نکل رہا ہے، یہ زبان سے بھلے اقرار نہ کرے مگر اسے فرق پڑتا ہے، میرے کسی بھی عمل سے۔ کشف منصور! تمہیں فرق پڑتا ہے۔"

وہ اس کی آنکھوں میں دیکھ رہا تھا۔

اور وہ جیسے گنگ کھڑی تھی۔

وہ اسے دیکھتا استہزائیہ انداز میں مسکراتا چلا گیا۔

رات بھر زنبہ بے چینی سے سو نہیں سکی تھی۔

آج دوسری رات تھی جو اس کی ایسی بے خوابی میں گزری تھی۔ نہ جانے کیا تھا جو اسے سونے نہیں دے رہا تھا۔

موحد اور کشف کے نکاح سے اسے یقیناً بہت دھچکا لگا تھا۔

مگر کشف کی بے دلی دیکھ کر اسے کچھ تسلی ہوئی تھی کہ اس نے یہ سب کچھ بے وقوفی اور جلد بازی میں کیا ہے، وہ ایسی ہی تھی بچپن سے، جلد بازی اور غصے میں ایسا کچھ کر گزرتی جو اس کے لیے بھی نقصان دہ ہوتا تھا۔

مگر اب اس کا بچپنا تو نہیں تھا جو اس نے اتنا بڑا قدم اٹھالیا، اس کا دل سوچتا تو پریشانی چین نہ لینے دیتی۔

وہ تہجد کے لیے بہت پہلے اٹھ گئی۔

کشف کے کمرے کی لائٹ جل رہی تھی۔

فجر پڑھ کر وہ ذرا سی دیر کو لیٹی تو دن چڑھے اس کی آنکھ کھلی۔

"کمال ہے، میں اسکول سے لیٹ ہو گئی۔ کشف نے مجھے جگایا بھی نہیں۔" وہ بڑبڑا کر اٹھی۔

"کشف...... کشف کہاں ہو؟" وہ بال باندھتی اسے سارے گھر میں پکارتی پھر رہی تھی۔

اور سارے گھر میں گونجتی خاموشی کہہ رہی تھی، وہ نہیں ہے، نہیں ہے۔ اس نے دھڑکتے دل سے اس کے کمرے میں قدم رکھا جو بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔

☆☆

(باقی آئندہ ماہ ان شاء اللہ)

ابھی اک شور سا اُٹھا ہے کہیں
کوئی خاموش ہو گیا ہے کہیں

ہے کچھ ایسا کہ جیسے یہ سب کچھ
اس سے پہلے بھی ہو چکا ہے کہیں

تجھ کو کیا ہو گیا کہ چیزوں کو
کہیں رکھتا ہے ڈھونڈتا ہے کہیں

تُو مجھے ڈھونڈ میں تجھے ڈھونڈوں
کوئی ہم میں سے رہ گیا ہے کہیں

کتنی وحشت ہے درمیانِ ہجوم
جس کو دیکھو گیا ہوا ہے کہیں

میں تو اب شہر میں کہیں بھی نہیں
کیا مرا نام بھی لکھا ہے کہیں

مل کے ہر شخص سے ہوا محسوس
مجھ سے یہ شخص مل چکا ہے کہیں

جون ایلیا

ٹھہری ٹھہری سی طبیعت میں روانی آئی
آج پھر یاد محبّت کی کہانی آئی

آج پھر نیند کو آنکھوں سے بچھڑتے دیکھا
آج پھر یاد کوئی چوٹ پرانی آئی

مدّتوں بعد چلا ان پہ ہمارا جادو
مدّتوں بعد ہمیں بات بنانی آئی

مدّتوں بعد پشیماں ہوا دریا ہم سے
مدّتوں بعد ہمیں پیاس چھپانی آئی

مدّتوں بعد کھلی وسعتِ صحرا ہم پر
مدّتوں بعد ہمیں خاک اڑانی آئی

مدّتوں بعد میسّر ہوا ماں کا آنچل
مدّتوں بعد ہمیں نیند سہانی آئی

اتنی آسانی سے ملتی نہیں فن کی دولت
ڈھل گئی عمر تو غزلوں پہ جوانی آئی

اقبال اشہر

اپنی تصویر کو آنکھوں سے لگاتا کیا ہے
اک نظر میری طرف دیکھ، تیرا جاتا کیا ہے

میری رُسوائی میں تُو بھی ہے برابر کا شریک
میرے قصّے میرے یاروں کو سناتا کیا ہے

پاس رہ کر بھی نہ پہچان سکا تُو مجھ کو
دُور سے دیکھ کے اب ہاتھ ہلاتا کیا ہے

سفرِ شوق میں کیوں کانپتے ہیں پاؤں تیرے
دُور سے دیکھ کے اب ہاتھ اُٹھاتا کیا ہے

عمر بھر اپنے گریباں سے اُلجھنے والے
تُو مجھے میرے سائے سے ڈراتا کیا ہے

مر گئے پیاس کے مارے تو اُٹھا ابرِ کرم
بجھ گئی بزم تو اب شمع جلاتا کیا ہے

میں تیرا کچھ بھی نہیں ہوں مگر اتنا تو بتا
دیکھ کر مجھ کو تیرے ذہن میں آتا کیا ہے

شہزاد احمد

سالِ نو کی دُعا

کاش کہ یہ سال
رنجشیں بھُلا دے ساری
چاہتیں بے حساب کر دے
کب سے اُتری ہے میرے آنگن میں خزاں
اس خزاں کو گلاب کر دے
اور میری ضعیف ہوتی ہمتوں کو
پھر سے شباب کر دے
کاش کہ یہ سال!
سچے دلوں کو امر کر دے
جھوٹے چہروں کو بے نقاب کر دے
کاش کہ یہ سال
عداوتوں کا سدِباب کر دے
محبتوں کا انتخاب کر دے
کاش کہ یہ سال
زیست کی تاریک راہوں کو آفتاب کر دے
میرے اُجڑے چمن کو شاداب کر دے
کاش کہ یہ سال
کاش کہ یہ سال

حمیرا شفیع

شگفتہ جاہ

حسین و خوبصورت باتیں

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا،

حضرت ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے انہوں نے فرمایا۔

"رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی مجلس میں بخار کا ذکر ہوا تو ایک آدمی نے اسے برا بھلا کہا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"اس بخار کو برا نہ کہو اس سے گناہ اس طرح دور ہو جاتے ہیں جس طرح آگ سے لوہے کی میل کچیل دور ہو جاتی ہے۔" (مسلم)

فوائد و مسائل،

1۔ بیماری پر صبر کرنا چاہیے۔ برا بھلا کہنے کے بجائے دعا اور دوا کی طرف توجہ کی جائے۔

2۔ بیماری اور مصیبت پر صبر کرنے سے گناہ معاف ہو جاتے ہیں۔

والدین کا احترام،

حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں "حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی خدمت میں ایک آدمی آیا۔ اس کے ساتھ ایک بڑے میاں بھی تھے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اس سے فرمایا۔

"اے فلانے! یہ تمہارے ساتھ کون ہے؟"

اس نے کہا۔ "یہ میرے والد ہیں۔"

حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا۔

"ان سے آگے نہ چلو اور ان سے پہلے نہ بیٹھو اور ان کا نام لے کر نہ پکارو اور ان کو گالی دیے جانے کا ذریعہ نہ بنو (کہ کسی کے باپ کو گالی دے دو۔ وہ جواب میں تمہارے باپ کو گالی دے۔")

حسد

حضرت انسؓ نے کہا ہے کہ ایک روز ہم حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس بیٹھے تھے۔ آپ ؐ نے فرمایا۔

"اب ایک شخص اہل بہشت سے یہاں آئے گا۔" تب انصاری جماعت کے ایک صاحب تشریف لائے۔ اپنے بائیں ہاتھ میں لوٹا لٹکائے تھے، وضو کا پانی ان کی داڑھی سے ٹپک رہا تھا۔"

دوسرے اور تیسرے دن بھی حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے اسی طرح فرمایا اور وہی صاحب تشریف لائے۔

حضرت عبداللہ ابن عمر بن العاص رضی اللہ تعالیٰ عنہ نے چاہا کہ ان کا رنگ ڈھنگ معلوم کریں چنانچہ ان صاحب کے پاس گئے اور کہا۔

"میں اپنے باپ سے لڑا ہوں۔ چاہتا ہوں کہ تین رات آپ کے پاس ٹھہروں۔" اس شخص نے منظور کر لیا۔

حضرت عبداللہ رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ ان تین راتوں میں، میں ان کے عمل پر نظر رکھے رہا۔ میں نے دیکھا کہ وہ جب سو کر اٹھتے تو اللہ کا ذکر کرتے۔ اس کے بعد میں نے ان سے کہا۔

"میری اپنے باپ سے لڑائی نہیں ہوئی تھی۔ البتہ حضور اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے تمہارے سلسلے میں ایسا فرمایا تھا۔ میں نے چاہا کہ تمہارا عمل معلوم کروں۔"

انہوں نے کہا۔ "بس میرا عمل یہی ہے کہ جو تم نے دیکھا۔" جب میں ان کے گھر سے نکلا تو انہوں نے مجھے پکارا اور کہا کہ "ایک بات اور ہے وہ یہ کہ میں نے ہرگز کسی کی خوبی پر حسد نہیں کیا۔"

میں نے ان کو جواب دیا۔ "تم کو یہ درجہ اسی سبب سے ملا ہوگا۔"

مہمان نوازی،

امیر المومنین حضرت علی رضی اللہ تعالیٰ عنہ فرماتے

ہیں۔

"ایک صاع کھانا بھائیوں کے سامنے رکھنا مجھے اس سے زیادہ عزیز ہے کہ ایک غلام آزاد کروں۔"

کھانا کھلانا،

حضرت حسن بصری فرماتے ہیں۔

"بندہ جو کچھ کھاتا ہے، پیتا ہے اور اپنے ماں باپ کو کھلاتا ہے۔ اس کا حساب ہوگا۔ جو کھانا دوستوں کے ساتھ کھاتا ہے اس کا حساب نہ ہوگا۔"

تکلف نہ کرنا،

حضرت سلمان کہتے ہیں۔

جناب سرورِ کائنات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہمیں فرمایا ہے۔

"تکلف نہ کرنا جو کچھ حاضر ہو اس سے بھی دریغ نہ کرنا۔ صحابہ روٹی کا ٹکڑا اور خشک چھوہارے ایک دوسرے کے سامنے لاتے اور فرماتے۔ "ہم نہیں جانتے کہ وہ شخص بڑا گناہ گار ہے جو ماحضر کو ناچیز جان کر سامنے نہ لائے یا وہ شخص جس کے سامنے حاضر کریں اور وہ حقیر جانے۔

سادگی،

حضرت یونس علیہ السلام روٹی کا ٹکڑا اور جو ترکاری ہوتے وہی دوستوں کے سامنے رکھتے اور فرماتے۔

"اگر سبحانہ، و تعالیٰ تکلف کرنے والوں پر لعنت نہ کرتا تو میں تکلف کرتا۔"

خود کما کر کھانا،

حدیث شریف میں آیا ہے کہ حضرت داؤد علیہ السلام بھیس بدل کر باہر نکلتے تھے۔ جو کوئی نظر آتا اس سے دریافت کرتے کہ "داؤد کی سیرت، طرزِ زندگی اور معاش کیسی ہے؟"

ایک دن جبرائیل علیہ السلام ایک شخص کی صورت میں سامنے آئے۔ حسبِ معمول ان سے داؤد علیہ السلام نے دریافت کیا تو انہوں نے کہا۔

"داؤد نیک مرد ہوتا اگر وہ بیت المال سے اپنی روزی نہ لیتا ہوتا۔"

حضرت داؤد علیہ السلام اپنی محراب میں گئے اور روتے ہوئے بارگاہِ الٰہی میں عرض کیا۔

"الٰہی! مجھے کوئی حرفہ سکھا دے تاکہ میں اپنے ہاتھ سے کمائی کر کے کھا سکوں۔"

اللہ تعالیٰ نے انہیں زرہ بنانا سکھا دیا۔

اعتماد،

حضرت عمرؓ فرماتے ہیں۔

"خلق میں تم اس شخص پر اعتماد نہ کرو، جب تک تم غصے کی حالت میں اس کو نہ دیکھ لو (کہ وہ غصے کو ضبط کرنے والا ہے) اور جب تک تم کسی شخص کو حرص و طمع میں نہ آزما لو۔ اس کے دین پر اعتماد مت کرو۔"

بچے کو سکھائیں،

بچے میں سب سے پہلے کھانے کا شوق پیدا ہوتا ہے لہٰذا لازم ہے کہ اس کو کھانے کے آداب سکھائیں۔

1۔ وہ سیدھے ہاتھ سے کھائے۔

2۔ بسم اللہ الرحمٰن الرحیم پڑھ کر کھانا شروع کرے۔

3۔ جلدی جلدی نہ کھائے۔ اچھی طرح لقمے چبائے۔

4۔ دوسروں کے نوالوں پر نظر نہ رکھے۔ اپنے سامنے سے لقمہ اٹھائے اور جب تک ایک نوالہ نہ نگل لے، دوسرا نوالہ نہ لے۔

5۔ کھانے سے نہ ہاتھوں کو خراب کرے اور نہ کپڑے خراب کرے۔

کبھی کبھی اس کو روکھی روٹی بھی کھلائیں تاکہ وہ ہمیشہ سالن کا طالب نہ ہو۔

بچے کے سامنے بسیار خوری کی مذمت کریں اور اسے یہ بتائیں کہ یہ کام جانوروں اور احمقوں کا ہے اور اس کے سامنے پیٹو بچے کی مذمت کریں اور باادب بچے کی تعریف کریں تاکہ اس کی تعریف سن کر اس میں حمیت پیدا ہو اور وہ خود بھی اس پر عمل کرنے لگے۔

دھوکا

ایک صاحب، ماہر نفسیات کے پاس گئے اور بولے۔ میں نے اپنے بزنس پارٹنر کو دھوکا دیا ہے۔ جس کی وجہ سے میرا ضمیر مجھے مسلسل ملامت کررہا ہے۔

''اچھا اچھا۔'' ماہر نفسیات نے کہا۔

''تو آپ کی قوت ارادی مضبوط کردوں تا کہ آپ اپنے بزنس پارٹنر سے معذرت کرسکیں اور غلطی کی تلافی......''

نہیں،نہیں۔'' وہ صاحب فوراً بولے۔

''میں چاہتا ہوں کہ آپ میرے ضمیر کو کمزور کردیں۔''

سائنس

رات کمرے کا لاک خراب ہوگیا تو بیوی نے ٹارچ لی اور مجھے ساتھ لے جاکر ٹھیک کرنے لگی۔ بیوی نے ٹارچ مجھے تھمادی اور خود لاک کھولنے میں مصروف ہوگئی۔

خاصی دیر گزر گئی لیکن لاک کھلنے کا نام نہیں لے رہا تھا۔ بیوی کا پارہ آسمان کو چھونے لگا۔ پھر اس نے ٹارچ خود پکڑی اور مجھ سے کہنے لگی۔

''تم ٹرائی کرو۔'' میں نے کوشش کی تو لاک فوراً کھل گیا۔ بیوی مجھ پر برس پڑی اور کہنے لگی۔

''اب پتا چلا ٹارچ کیسے پکڑتے ہیں۔''

نالائق

شوہر بیگم سے۔ ''بیگم پتی کہاں رکھی ہے پورا کچن چھان مارا ہے۔''

''بیگم، تم مردوں کو کبھی کوئی چیز نظر نہیں آتی۔ سب کچھ ہمیں بتانا پڑتا ہے۔

ایک چھوٹا سا کام ذمہ لگادو وہ بھی پہاڑ بن جاتا ہے۔ سامنے برتنوں کی الماری کھولو، اس میں مرچ مسالوں والا خانہ ہے۔ اس میں بسکٹوں کا ڈبہ رکھا ہے جس پر نمک لکھا ہوا ہے۔ بس اسی میں پتی رکھی ہے۔''

سودا

ایک صاحب نے پشاور میں کلاشنکوف کا سودا کیا تو پٹھان نے کہا۔ ''یہیں پر لینی ہے تو چالیس ہزار روپے اور اگر گھر پہنچانی ہے تو ایک لاکھ روپے۔''

''ان صاحب نے کہا ٹھیک ہے لاہور پہنچادو اور یہ لو ایک لاکھ روپے۔''

پٹھان نے کہا۔ ''گھر پہنچ جاؤ تو فون کرنا۔''

لاہور پہنچ کر ان صاحب نے فون کر کے کہا۔

''ہاں خان صاحب! میں گھر پہنچ گیا ہوں۔''

پٹھان نے کہا۔ ''ٹھیک ہے کلاشنکوف تمہارا گاڑی کے نیچے باندھا ہوا ہے۔''

آگاہی

چرچ میں ایک پادری صاحب یہ بتا رہے تھے کہ ''انسان کا صرف ذہین ہونا ہی کافی نہیں بلکہ آدمی زندگی میں جو کچھ بھی پاتا ہے وہ اپنی محنت کے بل بوتے پر حاصل کرتا ہے۔'' پادری نے مثال دیتے ہوئے کہا۔

''جارج ذہین تو ہے لیکن محنت سے جی چراتا ہے اس لیے زندگی میں زیادہ ترقی نہیں کرسکا، اس کے برخلاف جان نے محنتی ہونے کی وجہ سے زندگی میں اپنے لیے ایک اعلا مقام پیدا کیا اور جب مرا تو اپنی جوان بیوہ کے لیے لاکھوں کی جائیداد چھوڑ گیا۔''

یہ سن کر پیچھے سے ایک صاحب نے کھڑے ہو کر کہا۔

''شاید آپ کو تازہ ترین اطلاع نہیں ملی ہے۔ جارج اب جان کی بیوہ سے شادی کررہا ہے۔''

☆

کھلتا کسی پہ کیوں مرے دل کا معاملہ

خالدہ جیلانی

نورین ناز — گجرات

تہہ بار سنگ گراں ہے دل کہ ہے خاک خاک اٹا ہوا
کہیں فرد فرد سے رابطے کہیں شہر بھر کٹا ہوا

ثوبیہ قطب — کراچی

فریب آرزو کی سہل انگاری نہیں جاتی
ہم اپنے دل کی دھڑکن کو تیری آواز سمجھے

فاکہہ سہیل — کراچی

کون دل کی ویرانی دیکھ کے یہ سمجھے گا
اس جگہ بھی ٹھہرے تھے قافلے محبت کے

نادیہ فیصل — علی پور چٹھہ

یہ جو زندگی ہے پہاڑ سی، یہ جو روز و شب ہیں چٹان سے
انہیں صبر سے انہیں ضبط سے انہیں چشم تر سے تراشیے

فضہ بلال — ڈیفنس

جاتی ہے دھوپ اجلے پروں کو سمیٹ کے
زخموں کو اب گنوں گا میں بستر پہ لیٹ کے

عائشہ — گوجرہ

میں ہاتھ کی لکیریں مٹانے پہ ہوں بضد
گو جانتا ہوں نقش نہیں یہ سلیٹ کے

صدف عمران — کراچی

پھر بے خودی میں بھول گیا راہ کوئے یار
جاتا وگرنہ ایک دن اپنی خبر کو میں

ثمرہ عاقب — گرین سٹی

یہ حقیقت ہے کہ احباب کو ہم
یاد ہی کب تھے جو اب یاد نہیں

نادیہ یاسر — گوجر خان

ہر کوئی پارسائی کی عمدہ مثال تھا
دل خوش ہوا ہے ایک گنہگار دیکھ کر
بے حسی بھی وقت مدد دیکھ لی عدیم
کترا گیا ہے یار کو بھی یار دیکھ کر

زینب — حیدر آباد

سیاہ رات میں جلتے ہیں جگنوؤں کی طرح
دل کے زخم بھی کمال ہوتے ہیں

خدیجہ سلیم — کے ڈی اے

ہاتھ سے کھو نہ بیٹھنا اس کو
اتنی خودداریاں نہیں اچھی

افشین شاہد — گوجرہ

زندگی کس طرح بسر ہو گی
دل نہیں لگ رہا محبت میں
ایسے پڑتی ہے وہ نظر دل پر
جیسے پتھر میں جان پڑتی ہے

ایمان — لاہور

کبھی یک بہ یک توجہ، کبھی دفعتاً تغافل
مجھے آزما رہا ہے کوئی رخ بدل بدل کر

ام رجا — کراچی

کبھی گزریں تو شاید دیکھ لوں میں اک جھلک ان کی
اسی امید پر مدفن قریب راہ کر رکھا
بھری محفل میں ناحق راز الفت کر دیا افشا
محبت کا بھرم تو نے نہ کچھ اے چشم تر رکھا

رابعہ گل — کراچی

ٹھیک ہے ساتھ رہو میرے، مگر ایک سوال
تم کو وحشت سے حفاظت کی دعا آتی ہے

اقرا امین — کورنگی

وحشتیں بڑھتی گئیں ہجر کے آزار کے ساتھ
اب تو ہم بات بھی کرتے نہیں غم خوار کے ساتھ
اس قدر خوف ہے اب شہر کی گلیوں میں کہ لوگ
چاپ سنتے ہیں تو لگ جاتے ہیں دیوار کے ساتھ

کرتی ہے تو برابر کا کام کرنا پڑتا ہے۔ پوتوں کو اسکول کا اور عربی کا بھی پڑھانا ہوتا ہے۔ تین سالہ علی بھی نورانی قاعدہ پڑھتا ہے قاری سے، ہمیں تو تمام عمر سیکھنے جانے کا وقت نہ ملا۔ تو سکھا کیسے سکتے ہیں۔ البتہ ترجمہ تفسیر خود ہی چار بار پڑھا ہے۔ اور منظوم خلاصہ بھی لکھ رکھا ہے جو اشاعت کے لیے غیب کی مدد تک رہا ہے۔ نیند ہمیں اتنی آتی ہے کہ ہانڈی چولہے پر رکھ کے سو جاتے ہیں۔ قرآن ہاتھوں میں اور خود بے ہوش۔ اس بار تو حد ہو گئی۔ بھری محفل میں سورہ بقرہ کے ڈھائی سپارے پڑھتے کئی بار آنکھ لگی۔ ایسے میں ہم باقاعدہ درس کے قابل کہاں۔

البتہ درس والیاں کبھی ملیں تو مجھ سے دعا ضرور کرواتی ہیں۔ میری عزت بہت کرتی ہیں۔ مگر دنیادار تو ہم سے عاجز ہیں۔ ان کا ہم سے دل ہی نہیں ملتا، ہم تو اس دن کی راہ تک رہے ہیں جب میرے دونوں بیٹے پکے نمازی بنیں گے۔ باقی کچھ دیے ضرور روشن ہوئے ہیں۔ ہماری بات مانتی ہیں سہیلیاں۔ ایک عبادت گزار عورت جو ایک دن میں ایک قرآن پڑھ لیتی ہیں اور اکثر روزے سے رہتی ہیں وہ مجھے اپنا پیر کہتی ہیں اور مجھ سے نعت سن کر، دعا کروا کر کے ان کو آرام ملتا ہے۔

جبکہ گھر والے میرے ہر شوق سے بیزار ہیں۔ سوائے بیٹی کے۔ بے شمار نعتوں کی کاپیاں میں نے جلا ڈالیں۔ دفنا دیں۔ مگر باز نہیں آسکی۔ بیٹے نے قرآن اور منظوم ترجمے سے روکا مگر ہم نہیں رکے، عشق کوئی بھی ہو کہاں رکتا ہے۔ ابھی تو قرآن حفظ کا شوق بھی اپنے وقت کا منتظر ہے۔ جانے کب جانے کب۔

"شام شہر ملال میں" جو سین دکھائے گئے، بے شک دنیا میں سب ہو رہا ہے سب تک پہنچ رہا ہے مگر یہ خبر تک ہی پھیلنا کافی ہے۔ یہ ہماری تربیت پر طمانچہ ہے کہ ہم مسلمان مائیں ایسے بیٹے پیدا کرتی ہیں۔ شعور تو سب کو ہے کہ کیا غلط ہے پھر بھی نفس پر کنٹرول نہیں۔ خود کو نہ بدل سکے تو توقع دوسروں سے کیا، افسانے تقریباً ہی اچھے رہے۔

آمنہ زریں جناب ان کی آمد کی جتنی خوشی مجھے ہوئی ہے شاید ہی کسی کو ہو۔ ویسے اگر میں آپ جیسے لوگوں کے

خط بھجوانے کے لیے پتا۔
ماہنامہ شعاع۔ 37۔ اردو بازار، کراچی۔
Email:shuaa@khawateendigest.com

پہلا خط جڑانوالہ سے کوثر خالد کا ہے، لکھتی ہیں

پہلے بات قرآن سیکھنے کی یا سکھانے کی۔ جناب ہم نے اپنے ابا سے قرآن پڑھا تھا۔ اور ٹی وی اور ایک کتاب سے درست پڑھنا سیکھا تھا۔ اب خود ہی تلاوت سیکھنے کی کوشش میں لگے رہتے ہیں۔ ناظرہ قرآن تو خاندان کے اکثر بچوں کو میں نے پڑھایا ہے۔ عرض ہے کہ قرآن میں الگ کاغذ پر نہیں لکھ رہی بلکہ مٹے لفظوں والا قرآن ہے۔ جس کے اوپر لکھ کر لکھنا سیکھ رہے ہیں۔ اگر روزانہ ایک صفحہ لکھوں تو ڈھائی سال میں لکھا جانا تھا۔ مگر ہم سے دو چار لائنیں ہی لکھی جاتی ہیں۔ کیونکہ قرآن پڑھنا اور معوذتین کی تسبیح بھی پڑھنا ہوتی ہے۔ دعا تو آدھ پون گھنٹہ ہے جو کبھی کبھار ہی پڑھ پاتی ہوں۔ نماز کبھی وقت پر کبھی قضا مگر رات تک پانچ پڑھ لیتی ہوں۔ کبھی بیٹھ کر، کبھی لیٹ کر، خط بھی اکثر لیٹ کر لکھتی ہوں۔ بہو سلائی

درمیان رہتی تو شاید اتنی عجیب و غریب نہ ہوتی۔ یا کہ پھر بھی ایسی ہی ہوتی۔ قیصر نقوی کے لیے بہت سی دعائیں اور جو نقوی فوت ہوئے ان کو میرے پڑھے قرآن سے حصہ ان کے درجات کی بلندی کے لیے۔

☆ پیاری کوثر! قرآن پڑھنے اور پڑھانے والے لوگ بہترین ہیں۔ آپ نے خاندان کے بچوں کو قرآن پڑھایا۔ یہ بہت نیکی کا کام ہے۔ اللہ آپ کو اس کا اجر دے۔ آپ نے لکھا ہے کہ آپ لوگوں کے درمیان رہتیں تو اتنی عجیب و غریب نہ ہوتیں۔ آپ عجیب و غریب نہیں۔ بہت ذہین اور سمجھ دار ہیں، ہم آپ سے کبھی ملے نہیں لیکن آپ کے خطوط سے آپ کی شخصیت کا جو خاکہ ہمارے ذہن میں بنتا ہے۔ وہ ایک سادہ اور مخلص خاتون کا ہے جو سب کا خیال رکھتی ہیں اللہ آپ کو ہمیشہ خوش رکھے۔

قرآن پاک تین دن میں ختم کرنا چاہیے۔ اس سے کم نہیں۔

بشریٰ رضوان نے چوک شاہدرہ بہاولپور سے لکھا ہے

کچھ گھریلو پریشانیوں کی وجہ سے خط نہ لکھ سکی۔ مگر ہر ماہ شعاع اور باقی رسالے پڑھتی رہی ہوں۔ وہ نازنین کا آخر بہت زبردست تھا۔ اس ماہ کے ڈائجسٹ کی ٹائٹل گرل بہت اچھی لگی، اس کے بعد حمد و نعت سے دل کو منور کیا، نبی کی باتیں ہر بار کی طرح معلومات میں اضافے کا سبب بنیں سب کے انٹرویو پڑھ کر اچھا لگا۔ نیا ناول "نور القلوب" ابھی کچھ کچھ سمجھ میں آیا۔ "شام کی حویلی" زبردست تھا۔ مکمل ناول ویسے تو سارے ہی زبردست تھے مگر حسنہ حسین کا "عسر یسرا" بہت اچھا تھا۔ حنا بشریٰ جی "قصہ ایک جل پری کا" بہت خوب لکھا ہے۔ "بھرم" مونا شاہ جی پڑھ کر اچھا لگا۔ افسانے سب ہی زبردست تھے مگر "پچھتاوا" بہت زیادہ پسند آیا۔ پورا ڈائجسٹ بیسٹ تھا۔ امید ہے "یار دل دار" اس ماہ شائع ہو جائے گا۔ میرا بھائی بھی اسے شوق سے پڑھتا ہے۔

☆ پیاری بشریٰ! یار دل دار اس ماہ شامل ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کی تمام پریشانیوں کو رفع کرے۔ آپ کے لیے دعا گو ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے ممنون ہیں۔

صائمہ گل مردان سے لکھتی ہیں

یہ تو ہم ہیں کہ آپ کی محبت میں دوڑے چلے آئے ہیں۔ خیر جی آپ بھی کیا کریں ایک "ہم" تھوڑی ہیں آپ کو پڑھنے والے بے شمار اور خط لکھنے والے لاتعداد اب ایسے میں کون ہمیں یاد رکھے گا۔ شمارہ اس دفعہ یکم تاریخ کو ہی مل گیا۔

"نور القلوب" امید ہے یہ ناول اچھا ہوگا۔ صدف ریحان کا "عناد" اچھی تھیم پر تھی۔ مگر بے جا طوالت کا شکار نظر آئی۔

☆ پیاری صائمہ! ہمیں پڑھنے والے، خط لکھنے والے چاہے ہزاروں کی تعداد میں ہوں یا لاکھوں میں، ہمیں اپنا ہر قاری بے حد عزیز ہے۔ ویسے بھی محبت کرنے والے کس کو برے لگتے ہیں بس کچھ مسائل ہوتے ہیں جن کی بنا پر خط شامل نہیں کر پاتے۔ آپ نے خط لکھا، بہت خوشی ہوئی۔

فوزیہ مرتضیٰ نے ہارون آباد ضلع بھاول نگر سے شرکت کی ہے

اس دشت کی سیاحی میں باقاعدہ پندرہ سال اور بے قاعدہ مزید چار سال اور شامل کرلیں گزار چکی ہوں۔ ایک دفعہ خط لکھا، خواتین اور شعاع میں تقریباً تین چار سال پہلے، خواتین میں چھپ گیا تھا دوبارہ پھر مصروفیات زندگی نے دبوچ رکھا۔ کالج اور یونیورسٹی لائف میں بے قاعدہ خواتین و شعاع کا مطالعہ اور پھر شادی کے دو سال بعد جب جاب شروع کی تو باقاعدہ پڑھنا شروع کیا اور آج تک پڑھ رہی ہوں۔ لاک ڈاؤن کے دوران ان سے جدائی کا جو جھٹکا سہا تھا۔ اللہ معاف کرے ہماری تلاش کا یہ عالم تھا۔

دشت تو دشت ہیں دریا بھی نہ چھوڑے ہم نے بحر ظلمات میں دوڑا دیے گھوڑے۔ ہم نے لاہور، کراچی، فیس بک کہاں کہاں نہ تلاش کیا۔ جب ملا تو ایسے سنبھالا جیسے دو بچھڑی ماں بیٹی ملی ہوں۔ زندگی اور خصوصی طور پر ازدواجی زندگی میں آپ کے رسائل سے بہت مدد ملی۔ عمیرہ احمد کے ناول "امر بیل" سے جو سفر شروع کیا تھا

اسے نمرہ احمد، سائرہ رضا، راحت وفاخرہ، فرحت اشتیاق، سمیرا حمید نے جاری رکھا ہوا ہے۔

تبصرہ کرنا چاہا ہر ماہ لیکن دل میں چلتے پھرتے کر لیتی ہوں۔ یا پھر کسی قاری بہن نے کیا ہوا۔ ہاں ایسا ہی ہے چلو میں نہ سہی کسی اور ذریعے سے رائے پہنچ گئی۔ عمر کے اڑتیس سال گزر گئے۔ سترہ سال شادی شدہ زندگی کے گزار لیے۔ درس و تدریس کے شعبے سے وابستہ ہوں۔ جتنی بار کہانیاں ذہن کے پردے پر ابھریں کوئی واقعہ یا حادثہ دیکھا۔ تصورات میں دور تک انجام کو پہنچا آئے۔ ہوش آنے پر مسکراہٹ لبوں پر آ گئی۔ پر لکھنے کی ہمت نہ ہوئی۔ جب عمیرہ، نمرہ، سمیرہ اور راحت یا آسیہ رزاقی کو پڑھتی ہوں تو ہمت جواب دے جاتی ہے۔ ایسا لکھ پاؤں گی تو بھیجوں گی۔ خود بڑی نقاد ہوں۔ پڑھتی پورا رسالہ ہوں۔ پسند کوئی کوئی آتی ہے۔ لیکن مجھ سے ست (لکھنے میں) کو اللہ نے بہترین اولاد سے نوازا ہے۔ ہانیہ ہارون کو خاصا علمی و ادبی ماحول ملا۔ اور میں تھک کر جب بھی فریش ہونا چاہوں تو کتابیں میری ساتھی ہوتی ہیں۔ میری بیٹی نے بھی یہی جنون اپنایا ہے۔

خیر ہانیہ نے ماشاء اللہ 1072 نمبر لیے۔ 19 ستمبر 2020 کو اس کا میٹرک کا رزلٹ آیا۔

☆ فوزیہ جی...... ہمیں آپ سے بہت شکوہ ہے آپ نے خط لکھنے میں اتنی تاخیر کیوں کی؟ آپ کا خط بھی بہت اچھا ہے اور تبصرہ بھی، صفحات کی مجبوری کی وجہ سے آپ کا پورا خط شامل نہ کر سکے اس کے لیے معذرت، ہانیہ کا خط بھی اس ماہ شامل ہے۔

ہانیہ ہارون نے ہارون آباد ضلع بھاولنگر سے لکھا ہے

میں زندگی کے جس دور سے گزر رہی ہوں، وہ میرے خیال میں عملی زندگی کا ابتدائی دور ہے۔ اس سے پہلے جو تھا، وہ سب بچپن کا ہی حصہ تھا۔ اب زندگی کے میدان میں کچھ کر دکھانے کا وقت ہے۔ یہ وقت بہت قیمتی ہوتا ہے کسی بھی انسان کے لیے کہ اسی کے ساتھ یہ دور بہت نازک بھی ہوتا ہے۔ اور اسے صحیح رہنمائی کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ یہ رسالے مجھے زندگی کے رہنما اصولوں سے آشنا کر رہے ہیں۔ اس کے لیے میں تہہ دل سے آپ کی ممنون ہوں۔

"شام کی حویلی میں" میں لگتا ہے کشف سونیا کی بیٹی ہے۔ "شام شہر ملال میں" بس ٹھیک لگی۔ "عصر یسرا" بہت شان دار، اگلی قسط کا بڑی بے تابی سے انتظار ہے۔

مجھے ناڈا اکٹر فریال بہت اچھی لگتی ہیں بچی۔

☆ پیاری ہانیہ! اللہ تعالیٰ آپ کو اپنے مقصد میں کامیاب کرے اور آپ ایک کامیاب ڈاکٹر بن سکیں۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔ آپ کا خط پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے، آپ بہت اچھی اور سمجھ دار بچی ہیں۔ ان شاء اللہ اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہوں گی۔

پری وش مری بلوچ...... ضلع کوہلو بلوچستان

میں نے اس سال تین چار خطوط بھیجے تھے لیکن ڈائجسٹ میں کہیں دکھائی نہیں دیے۔ اور ویسے بھی ڈائجسٹ ہم تک پہنچنے میں دس پندرہ دن لگا دیتے ہیں اور ہمارے خط کراچی پہنچنے میں ایک ماہ، تو اس لیے تازہ شمارے پر تبصرہ نہیں کر سکتے۔

پچھلے ماہ میرے سیکنڈ کزن کی شادی تھی۔ گیٹ سے باہر ایک ٹھیلے والا ٹھیلے پر سلنڈر رکھ کر بچوں کو فرنچ فرائز بنا کر بیچ رہا تھا کہ سلنڈر گر کر پھٹ گیا اور معصوم بچے زد میں آ گئے۔ پندرہ بچے جان کی بازی ہار گئے۔ پچیس تیس ابھی تک جھلسے ہوئے ہیں۔ ثمینہ اکرم آپا یا پھر باقی قارئین بھی یہ سمجھتی ہیں کہ "وہ نازنین" بلوچ کلچر پر مبنی ایک تحریر ہے دراصل "وہ نازنین" بلوچستان کے پٹھانوں کی کہانی ہے اور اس کا کوئی ایک کردار بھی بلوچی نہیں۔ پٹھان اور بلوچ یکسر مختلف قومیں ہیں۔ ہاں بلوچستان میں رہائشی پختونخوں کے کچھ رسم و رواج بلوچوں سے ملتے ہیں۔ جولائی کے شمارے میں افشین نعیم کی "محبت کے رنگ" میرے لیے تو کم از کم شاندار تحریر تھی۔ پچھلے شماروں میں "چھاؤں جیسے لوگ" اور "خاک زادہ" وہ کہانیاں ہیں جن کے مجھے نام بھی یاد رہ گئے۔ عناد میں سائرہ جبین کو ود فیملی کوئی اچھی سی سزا تو ملنی چاہیے تھی مگر ناں جی ایسے ہی گزر گئے۔ اور پلیز یہ جو تحاریر میں (زیادہ تر ڈراموں میں) ہیرو یا ہیروئن کو مار دینے کا رجحان پیدا ہوا ہے یہ ہمارے

رسالوں تک پہنچنے نہ دیں ورنہ ہماری دل وہش کا نام تو دل وہش ہے مگر اس کا دل بہت کمزور اگر اسے پتا چل جائے کہ ہیرو یا ہیروئن نے مرجانا ہے تو وہ والی اسٹوری وہ شروع ہی نہیں کرے گی۔

☆ پیاری پری! بلوچستان کی پریاں ہمیں خط لکھیں اور ہم شائع نہ کریں، یہ تو ممکن ہی نہیں۔ آپ کے نام اتنے منفرد ہیں کہ ذہن میں محفوظ ہیں۔ آپ کے خط راستہ بھول کر کہیں اور نکل گئے۔ سلنڈر پھٹ جانے کا سانحہ انتہائی المناک ہے۔ جو بچے جاں سے گئے وہ اپنی جگہ بہت بڑا سانحہ ہے لیکن جو بچے جلنے کی اذیت سہ رہے ہیں وہ بھی کم نہیں ہے۔ ان کے والدین کے دلوں پر کیا گزر رہی ہوگی۔ سوچ کر ہی رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اللہ پاک ان کو صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔

ماہا بشیر اور تبسم بشیر نے ہمیں خط نہیں لکھا۔ اس لیے ان کی والدہ کی صحت کے بارے میں ہمیں علم نہیں ہے۔

حافظہ حفصہ صدیقی نے رسول نگر ضلع گوجرانوالہ سے لکھا ہے

میں نے ایک ناول جنت کے پتے پڑھا تھا، اس کے بعد میری دوست اسماء کی ماما نے مجھے شعاع پڑھنے کے لیے دیا۔ اس کو پڑھ کر میں نے اپنی زندگی کو بہت بدلا یہ کہہ لیں کہ زمین آسمان کا فرق آ گیا مجھ میں۔ گھر والے ان رسالوں کے بہت خلاف ہیں۔ پانچ سال سے پڑھ رہی ہوں لیکن زندگی کی مشکلات کی وجہ سے میں نے یہ پڑھنا چھوڑ دیا۔ میرے خیال کے مطابق اس رسالے میں اپنی ماؤں بہنوں اور دوستوں کے لیے ایک دعا کا صفحہ ہونا چاہیے۔

☆ پیاری حفصہ! اللہ تعالیٰ آپ کی تمام مشکلات کا خاتمہ کرے اور آپ پرسکون اور خوش گوار زندگی گزاریں۔ آمین۔ آپ کی تجویز نوٹ کر لی گئی ہے۔

حیمی نور بلوچ نے ضلع کوہلو بلوچستان سے لکھا ہے

اکتوبر کی دس کو میری کزن کا نکاح اور گیارہ کو ولیمہ تھا۔ میں اس میں مصروف رہی کزن کو شعاع لانے کے لیے بھیجا تو پتا چلا کہ رسالے ختم ہو گئے (عموماً دس کو شعاع ملتا ہے) مجھے نومبر کے شمارے کا دیدار بھی نصیب نہیں ہوا۔ ظلم...... ہائے ظلم میں نے پچھلے نو دس مہینوں میں چار کہانیاں بھیجی ہیں لیکن ایک بھی شائع نہیں ہوئی۔

پیاری حیمی! آپ کو ہمارے پرچے نہ مل سکے۔ یہ جان کر بہت افسوس ہوا۔ آپ ہمارا واٹس ایپ نمبر نوٹ کر لیں اگر آئندہ پرچے نہ ملیں تو اس نمبر پر واٹس ایپ کر دیں۔ 0317-2266944۔

ہمیں علم نہیں ہے کہ آپ کے علاقے میں نیٹ سروس کی سہولت مہیا ہے یا نہیں۔ اگر نیٹ نہیں ہے تو آپ اس سہولت سے فائدہ نہیں اٹھا سکتیں پھر اس کا ایک ہی حل ہے کہ سالانہ خریدار بن جائیں۔

علیشاء، ثناء کھرل، مومنہ سہوا اور ثمرین نے جودھ پور سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

ہم تین سال سے ڈائجسٹ کے خاموش قاری ہیں۔ ہم بہت اچھی رائٹر ہیں لیکن قسمت کی ستم ظریفی یہ ہے کہ ہماری لکھی ہوئی کہانیاں ہماری دوستوں تک ہی محدود رہتی ہیں۔ ہم نہم کلاس کی طالبات ہیں اور ڈائجسٹ کی دیوانیاں (ہاہاہا) ہم آپ کو پچھلے سال کا ایک واقعہ سناتے ہیں جب ہم انگلش کا ٹیسٹ دے کر فارغ ہوئے تھے۔ ٹیچر ٹیسٹ چیک کر رہی تھیں۔ دل اتنا بے چین تھا کہ فوراً بیگ سے شعاع نکال کر پڑھنا شروع کر دیا۔ اور برا ہوا جو ٹیچر نے ہمیں یوں رسالے میں غرق دیکھ لیا اور ڈائجسٹ چھین لیا اور کافی منت سماجت کے بعد بھی واپس نہ دیا۔ ساتھ ایک لمبا لیکچر بھی دیا۔

تین دن کی منت سماجت کے بعد ڈائجسٹ واپس ملا۔

علیشاء، ثناء، مومنہ اور ثمرین! شعاع سے آپ کی محبت ہمارے لیے بہت قیمتی احساس ہے۔ آپ شعاع کا مطالعہ ضرور کریں لیکن پڑھائی کے اوقات میں اور اسکول میں نہیں۔ گھر پر صرف فارغ اوقات میں مطالعہ کریں۔

م، الف پسرور سیالکوٹ سے لکھتی ہیں

سرورق پر مسکراتی ہوئی ماڈل اچھی لگی پہلی شعاع پڑھی اور پھر دوڑ لگائی نور القلوب کی طرف۔ اسٹوری اچھی ہے۔ شام کی حویلی بھی اچھا جارہا ہے شام شہر ملال میں شاہ میر پہلے تو بہت اچھا لگا، بعد میں اتنا کمینہ، خیر اسٹوری اچھی تھی۔ عسر یسرا میں ایسے گم ہوئے کہ وقت کا پتا ہی نہ چلا چونکے تو تب جب باقی آئندہ منہ چڑا رہا تھا خیر صبر کر گئے، ''جل پری'' دانیال اتنا سخت اف اف اور آیت کو اتنی جلدی مان نہیں جانا چاہیے تھا۔ ''بھرم'' کچھ خاص متاثر نہیں کر پایا۔ افسانے سب ہی اچھے تھے۔ خط آپ کے موسٹ فیورٹ، بہت مزہ آتا ہے پڑھ کر ایک دم فریش ہو جاتی ہوں۔ تاریخ کے جھروکے بہت اچھا لگتا ہے۔ انبیاء کرام کے بارے میں پڑھ کر۔ شعاع کے ساتھ ساتھ پڑھ کر بے اختیار مسکراتی رہی پیاری دوست کی باتیں سن کر۔ ڈاکٹر نسیم سے ملاقات اچھی رہی۔ سیر دو جہاں واہ کیا خوب! نانا بھی پڑھا یہ اچھا سلسلہ ہے۔ اس کو ختم مت کیجیے گا۔

میں 2012 سے شعاع پڑھ رہی ہوں خط شائع نہ ہوا تو کوئی بات نہیں۔ اگر بار بار دستک دیں تو دروازہ کھل ہی جاتا ہے۔

میری امی جان بھی کبھی کبھی غصہ کرتی ہیں کہ ہر وقت رسالوں میں لگی رہتی ہو۔ کوئی کام بھی کر لیا کرو، ان کو اور میں دل تھام لیتی ہوں کہ امی جان ان کو کچھ نہ بولیں میری جان ہیں لکھنے والیاں، پڑھنے والیاں، چھاپنے والیاں۔

☆م، الف! پیاری بہن، آئندہ خط لکھیں تو اپنا نام ضرور لکھیں۔ نام لکھنے میں کیا راز داری برتنا۔ شعاع سے آپ کی محبت ہماری محنتوں کا حاصل ہے۔ آپ اپنی امی کو کچھ کہنے کا موقع نہ دیا کریں۔ گھر کے کام نبٹا کر فارغ اوقات میں شعاع پڑھا کریں۔ انہیں آپ سے شکایت نہیں ہوگی اور آپ بھی سکون سے شعاع کا مطالعہ کر سکیں گی۔

صفیہ مہر نے کوٹلی مراد ضلع رحیم یار خان سے لکھا ہے
پہلی شعاع، پڑھا، واقعی آپ نے سچ کہا جو حال میں ہے اس کی قدر کریں اور مطمئن رہیں۔ وقت بدل جاتا ہے۔ حمد، نعت سے آنکھوں کی ٹھنڈک اور دل کو منور کیا۔ پیارے نبیؐ کی پیاری باتوں سے ہر ماہ کی طرح ایمان دین سے متعلق آگہی پائی۔ ''بیٹھ کر سیر دو جہاں'' خیمہ، آمنہ زریں نے اس بار مصر کی تاریخ و تمدن اور پیاری فاطمہ کی کہانی سنائی۔ ڈاکٹر نسیم اختر سے ملاقات دلچسپ رہی۔ دستک قیصر نقوی سے مل کر افسوس کیا۔ خط آپ کے میرا پسندیدہ سلسلہ ہے۔ زینب نور دوستی کی طرف ہاتھ بڑھا رہی ہوں۔ ڈاکٹر صاحبہ کا خط لاجواب ہوتا ہے۔ ثریا راجپوت آپ کو لفظ گڑیا منحوس کیوں لگتا ہے میں تو بھانجیوں کو پیار سے گڑیا کہتی ہوں اکثر۔ ریحانہ جی آپ کا ہر خط مجھے اچھا لگتا ہے۔ تنزیلہ ریاض، نور القلوب نام کی طرح پراثر ہے۔ آثار بتاتے ہیں کہ تنزیلہ ہمیں شاہکار دینے والی ہیں۔ مونا شاہ کا بھرم شاندار اسٹوری تھی۔ افسانہ دعا تھی کوئی فرحت جبیں نے واقعی صحیح لکھا بہنوں کی دعائیں، بھائیوں کے رزق میں برکت ڈال دیتی ہیں (لیکن ظرف وسیع نہیں ہو پاتا عورتوں کا کہ نندوں کی دعا ہی لے پائیں) نوشین فیاض کا ناول ''شہر ملال میں'' پہلے تو کہانی سمجھ میں نہیں آئی جب کچھ آئی تو نہیا پر بڑا غصہ آیا عثمان نے طلاق نہیں دی کوئی شرعی رشتہ بھی نہ توڑا۔ منگنی کا کیا ہے دنیا میں ہزاروں ٹوٹتی ہیں مگر ایسا انتقام لینے کا تو کوئی نہیں سوچتا۔ نہیا کا شوہر نفسیاتی مریض نکلا اس میں بھی قسمت کا قصور ہی تھا سراسر، عثمان کا تو کوئی قصور نہ تھا ماہ پارہ کے ہیرو کا نام مجھے بڑا اچھا لگتا ہے۔ وہی نام کی وجہ سے اسٹور پڑھی۔ پڑھتی گئی۔ حسن آرا، ماریہ کامران نے سچ کہا کہ حسن کی عمر فقط کچھ سالوں پر محیط ہے لیکن دل کا حسن تاعمر قائم رہتا ہے۔ حسنہ حسین کا مکمل ناول ''عسر یسرا'' دلچسپ سے پڑھتے گئے کہ باقی آئندہ دیکھ کر کوفت ہوئی مگر ناول شان دار ہے۔ جنت یار ایسے ڈٹی رہنا۔ رخسانہ نگار عدنان کا ''شام کی حویلی میں'' آزر پھول سی ردا کو قبر میں اتار کر بھی عقل نہ آئی۔ دسمبر کا آخری شمارہ بہترین لگا۔

☆ پیاری مہر! تفصیلی تبصرے کے لیے شکریہ۔ صفحات کی مجبوری کی وجہ سے ہم آپ کا پورا خط شائع نہ

کر سکے۔ معذرت۔

کراچی سے ماہ انجم نے لکھا ہے

یہ سال مجموعی طور پر نہ صرف معاشی، سیاسی بلکہ گھریلو طور پر بھی بہت تلخ یادیں ہم سب کو دے کر گیا۔ اللہ تعالیٰ سے دعا ہے کہ آنے والے دن ہم سب کے لیے خیر و عافیت امن خوش حالی اور کامیابی کی نوید لائیں۔ آن لائن پڑھائی کے بعد فزیکل امتحانات دیے جس میں مابدولت کچھ خاص کارکردگی نہ دکھا سکے۔ اور نتیجتاً گزشتہ سال کے برعکس بی بی اے کا گراف کافی نیچے آ گیا۔ خیر یہ سب تو زندگی کا حصہ ہے۔ ڈائجسٹ پڑھنا ہمارا سب سے دل پسند مشغلہ ہے جو پچھلے پانچ سال سے جاری ہے۔ پچھلے ماہ گوشی جمال نے اپنے خط میں ہمارا تذکرہ کیا تو انہیں بتاتے چلیں کہ پردہ کسی سے نہیں ہے لیکن نجانے کیوں اکثر ہمارا نام چھپنے سے رہ جاتا ہے حالانکہ لفافے کے باہر اور خط کے اختتام پر ہمیشہ نام لکھتے ہیں۔

پیاری ماہ انجم! آپ کی مما بھی ہمارے پرچے پڑھتی ہیں۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ انہیں ہمارا سلام کہہ دیں۔ اللہ تعالیٰ ان کو کامل صحت سے نوازے۔ آمین۔ اس ماہ آپ کا خط بھی شامل ہے اور آپ کا نام بھی لکھا ہے۔ اب تو کوئی شکایت نہیں؟

اقراء گل ناز نے گوجرہ سے شرکت کی ہے لکھتی ہیں

ہم تمام بہنیں اور کزنز پچھلے کئی سالوں سے کرن، خواتین اور شعاع ریگولر پڑھ رہے ہیں۔

میری فرینڈز، کزنز اور ٹیچرز بھی پڑھتی ہیں۔ مگر خط لکھنے کی کبھی ضرورت محسوس نہیں ہوئی، خاموش قاری رہنا چاہتے تھے۔ پھر ہمارے اندر نئے جذبات پیدا ہوئے لکھاری بننے کے پھر کئی افسانے اور ناولز سوچے اور کچھ لکھ بھی دیے۔

پلیز ناول جو "زندگی تیری راہ گزر میں" لکھا ہے اس میں کمی رہ گئی ہو یا لکھتے وقت کوئی غلطی ہوئی تو نوک پلک سنوار کر ہمیں شکریہ ادا کرنے کا موقع دیں۔

ایک بات میری بہنیں کہتی ہیں کہ تمہاری لکھائی اچھی نہیں ہے یوں لگتا ہے جیسے عربی زبان میں لکھا ہو تو پھر میں بھی جواب دے دیتی ہوں لکھائی جیسی بھی ہو اتنی کلاسیں پڑھ لیں۔ جاب کرنے لگی ہوں۔ لکھ کر آئی تھی تو وہ اچھے مارکس دیتے تھے۔

پیاری اقراء! آپ کی لکھائی بہت اچھی ہے اور آپ نے خط بھی بہت اچھا لکھا ہے۔ زبان و بیان بھی ٹھیک ہے۔ ہمیں آپ کے افسانوں میں کہانی کی کمی محسوس ہوئی۔ اس لیے شائع کرنے سے قاصر ہیں ناول بہت طویل ہے۔ اس لیے اب تک پڑھ نہیں پائے۔

انجی فیصل آباد سے لکھتی ہیں

تنزیلہ ریاض کا "نور القلوب" ایک چونکاتا ہوا نام، داؤد کا کردار کافی اہم ہوگا میرے لیے۔ خان بابا کا یہ جملہ بہت جاندار لگا۔

میری زندگی میں جب کبھی اثاثے ڈکلیئر کرنے کا وقت آئے گا تو میں سب سے اوپر تمہارا نام لکھوں گا۔"

تنزیلہ ریاض آپ نے مرگ اور عہد الست لکھ کر جو ریکارڈ بنایا ہے وہ آپ ہی توڑ سکتی ہیں۔

دوسرا سلسلہ وار ناول شام کی حویلی رخسانہ نگار کے قلم میں اتنی روانی ہے جیسے خود ہی سب طے ہو رہا ہے۔ ردا کی موت والا سین انتہائی حساس تھا۔ سانس رک گیا۔ مکمل ناول میں عریسرا شروع میں تو روایتی سا لگا لیکن آگے جا کر نیا موڑ آیا۔ عرصہ پہلے میرے خیال میں ایک ناول جو عربی تھیم والا تھا وہ ان ہی کا تھا۔ گھوڑے پر آنے والا ہیرو، کیا بھلا سا نام تھا نور سین شاید۔

خط آپ کے سب سے دلچسپ سلسلہ جیسے پرائم ٹائم پہ نیوز چینلز کے شوز ریٹنگ پر جا رہے ہوتے ہیں ویسے ہی یہ سلسلہ ہے۔ سب قارئین ہی بہت اچھا تبصرہ لکھتی ہیں۔ ثمینہ جی آپ کو نانی بننے پر مبارک باد اور ثوبیہ نور کو شادی کی مبارک۔ کافی عرصے سے ان کا کوئی خط نہیں آیا۔ ریحانہ آپ کو پڑھ کر گجرات یاد آ جاتا ہے۔ میاں جی (دادا ابو) کے ننھیال کا تعلق گجرات سے ہے، کیا قریبی تعلق نکالا ہے میں نے (واہ)۔

خط لمبا ہوتا جا رہا ہے نئے سال میں سائرہ رضا اور فرزانہ کھرل کا ناول ضرور ہونا چاہیے۔

راشدہ رفعت بہت اپنی سی لگتی ہیں۔ نعیمہ ناز اتنا اچھا لکھا آپ نے شہر تمنا۔ میں رائٹرز پر بہت لمبا مضمون لکھ سکتی ہوں کیوں کہ سکینہ عبدالقیوم (محبت غیر مشروط لامحدود) از نازیہ رزاق، کی طرح اپنی زندگی کا پہلا عشق آپ سے کر بیٹھی ہوں۔

پیاری انجی! خط لکھنے کا سلسلہ تو اب متروک ہی ہوگیا ہے خطوں کی جگہ ای میلز میسج نے لی ہے لیکن یہ بھی حقیقت ہے کہ خط کا اپنا ہی لطف ہوتا ہے۔ پہلے دوستوں، عزیزوں کے خط آتے تھے تو انہیں سنبھال کر رکھا جاتا تھا۔ بار بار پڑھا جاتا تھا۔ اب تو نہ وہ فرصتیں ہیں نہ وہ سلسلے۔ ایک میسج لکھ کر چھٹی۔

آپ کو شعاع کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں بہت اچھا تبصرہ کیا ہے آپ نے، اب ہماری محفل میں باقاعدگی سے شرکت کرتی رہیے گا۔

سیدہ ماہم شاہ کراچی سے شریک محفل ہیں لکھا ہے

شعاع ہاتھ میں آتے ہی سب سے پہلے تو ماڈل نے اپنے سحر میں جکڑ لیا۔ اف! اس کی آنکھیں، بالکل میری جیسی لگ رہی تھیں...... ہاہاہا۔

ارے مذاق تھا بھئی، میری آنکھیں ذرا اس سے بڑی ہیں اور میک اپ کے بعد تو اور بھی بڑی بڑی لگتی ہیں۔ ہی ہی ہی

خیر شعاع ہاتھ آتے ہی سب سے پہلے ''شام کی حویلی'' کا رخ کیا۔

رائٹر جی! میری ایک ریکویسٹ ہے پلیز اس موحد کے بچے کو ذرا میرے گھر بھیجیں۔ عجیب پاگل پن مچایا ہوا ہے اس آدمی نے۔ ویسے کشف چھپ کر نکاح کرنا نہیں چاہیے تھا۔

اتنی پیاری، اتنی سوئیٹ، اتنی نیک دل ہے زینب۔ بس اب اس کو بھی سکون کے پل نصیب ہوں ''شام کی حویلی'' کے بعد پہنچے خطوں کی طرف، ڈاکٹر فریال خان کا خط زبردست تھا۔ باقی تمام خطوط بھی زبردست تھے۔

سب بہنوں کے خطوط کی محفل سے فارغ ہو کر اڑان بھری نور القلوب تک۔ ہائے تنزیلہ جی کیا بتاؤں کیا ناول ہے۔ قسم سے بہت ہٹ جانے والا ہے، لکھ کر رکھ لیں میری بات۔ خوش الحان خان اور گلے بیسٹ کریکٹرز ہیں۔ آپ نے بہت اچھے کردار تخلیق کیے۔

جی تو اگر بات کی جائے افسانوں کی تو تمام اچھے تھے۔ ''پچھتاوا'' ٹاپ پر رہا، گڈ جاب شازیہ جی۔ حمیرا شفیع کی غزل پڑھی اچھی تھی مزہ آیا کچھ اس سے ملتی جلتی نظم ایک دفعہ میں نے بھی نونہال کے لیے لکھی تھی۔ باقی تینوں غزلیں بھی شان دار تھیں۔ ''باتوں سے خوشبو آئے'' شاندار رہا۔

''اس ماہ کی مسکراہٹیں'' اگلے ماہ تک برقرار رہنے والی ہیں۔

''قصہ ایک جل پری کا'' مکمل اور زبردست! ''شام شہر ملال میں'' رائٹر کی بے انتہا محنت صاف ظاہر ہوتی ہے۔ ''عسر یسرا'' پہلی قسط اوسم! ویسے آپ کو کیا لگتا ہے میرے نام کا کیا مطلب ہوگا۔

ج: پیاری ماہم! شعاع کی محفل میں خوش آمدید۔ آپ کی ہاہاہا سے ڈاکٹر فریال یاد آ گئیں۔ وہ بھی اتنی ہی خوش مزاج ہیں۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی۔ اطمینان رکھیں، قابل اشاعت ہوئی تو ضرور شائع ہوگی۔

ماہم کے معنی تو ہمیں نہیں پتا لیکن اتنا ضرور جانتے ہیں کہ یہ مغل بادشاہ ظہیر الدین بابر کی اہلیہ، کا نام تھا اس لیے اس کے معنی بھی اچھے ہی ہوں گے۔

صدف ناز انصاری، مقدس ناز انصاری اور طوبیٰ شوال انصاری، ملتان سے شریک محفل ہیں، لکھا ہے

آپی! آپ نے کہا کہ پورے پاکستان میں شعاع یکم تاریخ کو دستیاب ہوتا ہے تو کیا کراچی میں جلدی نہیں آجاتا ہوگا؟ من موہنی سی عشا نور کافی پیاری لگی۔ پہلی بار ہوا کہ دسمبر کے سرورق پر اداسی کی نشانی کے طور پر پیلا رنگ استعمال نہیں کیا گیا۔ تنزیلہ ریاض کا نیا نیا ناول ''نور القلوب'' ہمارے قلوب میں نور بن کر سیدھا اترتا جا رہا ہے۔ حسنہ حسین کے مکمل ناول ''عسر یسرا'' کی دوسری قسط کا شدت سے انتظار ہے۔ آپ نے اچھا کیا کہ شعاع کے ساتھ ساتھ اور بیٹھ کر سیر دو جہان کرنا کے سلسلے دوبارہ شروع کر دیئے، انہیں کبھی بند نہ کیجیے گا۔ چھ کے چھ

افسانے زبردست تھے۔ اس کے بعد پہنچے خط آپ کے کی محفل میں۔ گڑیا راجپوت کے خط کے جواب میں آپ نے بتایا کہ نومبر کی ماڈل ثناء امجد شعاع پہ پہلی بار لگی ہے جبکہ اکتوبر 2016ء کے شعاع پہ بھی یہی ماڈل تھی۔ دیکھ لیں ہماری عقابی نگاہوں کا کمال۔ آپ نے ہمارا لکھا خط ایڈٹ کر کے کیا سے کیا کر دیا۔ شاید اسی کانٹ چھانٹ کے باعث ہمیں دوسری قارئین کے خطوط بھی ادھورے سے اور بعض اوقات جھول زدہ محسوس ہوتے ہیں۔ آپی! آپ نے لکھا کہ ماڈلز تصویر کے علاوہ اپنے بارے میں کچھ چھپوانا نہیں چاہتیں جبکہ فیشن میگزینز میں ہماری مذکورہ یہی ماڈل گرلز پورے تفصیلی انٹرویو کے ساتھ شہرت پانے کی حسرتیں بیان کرتی ہیں۔ بہرحال ہمارا مقصد یہ تھا کہ ان تین چار مخصوص چہروں کے بجائے کجل، ماورا، عائزہ، مایا، ایمن وغیرہ کے ٹائٹل سجائے جائیں۔ آپ نے تو ان کے بھی ٹائٹلز نہیں دیئے جو اپنے شعبے میں اصلی اور صف اول کی ماڈل ہیں یعنی نادیہ حسین، سنیتا مارشل، مہرین سید، زی کیو اور صدف کنول وغیرہ۔

ج: صدف، مقدس اور طوبیٰ! آپ کے گراں قدر مشوروں کے لیے ممنون ہیں۔ ہم نے آپ کے مشورے نوٹ کر لیے ہیں۔

آپ کا خط ایڈٹ ہوا، اس کا ہمیں افسوس ہے لیکن ہم پہلے بھی لکھ چکے ہیں، خط ایڈٹ کرنا ہماری مجبوری ہے آپ کو اندازہ نہیں کہ ہر ماہ ہمیں کتنے طویل اور کتنے خط موصول ہوتے ہیں اگر ہم خط ایڈٹ نہ کریں تو صرف چند خط شامل ہو سکیں گے پھر باقی بہنوں کو شکایت ہوگی۔

آپ کے سوالوں کے جواب بالترتیب درج ذیل ہیں۔

(1) شائع ہونے کے بعد ہم تینوں شمارے پڑھتے نہیں لیکن دیکھتے ضرور ہیں۔

(2) بیرون ملک سے دستی خط موصول ہو ہی نہیں سکتے۔ اتنی دور بیٹھی قارئین دستی خط کس کے ہاتھ بھجوا سکتی ہیں۔ بیرون ممالک سے زیادہ تر ڈاک سے خط موصول ہوتے ہیں یا ای میلز آتی ہیں۔

(3) شازیہ چودھری کا ناول دریچۂ دل ان کی وفات کے بعد ادھورا گیا۔ کسی رائٹر نے اسے مکمل نہیں کیا۔

(4) شعاع عمیر کا نام شعاع میں نہیں کرن میں ہی شائع ہونا تھا، اب بھی کرن میں ہی شائع ہو رہا ہے۔

دعا مصطفیٰ لکھتی ہیں

''نورالقلوب'' بہت ہی خوب صورت موضوع پر لکھی گئی ایک اچھی کہانی ہے ''وہ نازنین'' کا بہترین اینڈ ہوا۔ باقی کہانیوں پر تبصرے بعد میں، دعا کیجیے گا۔

ج: دعا! بہت شکریہ آپ نے ہمیں یاد کیا آئندہ اپنے شہر کا نام ضرور لکھیے گا۔ ہماری دعائیں آپ کے ساتھ ہیں۔

انیلہ رزاق نے اٹک سٹی سے لکھا ہے

عرصہ دراز سے خواتین وشعاع کی مستقل خاموش قاری...... کبھی وقت تھا تو ٹائٹل سے لے کر ہر کہانی کے اسکیچ پر بھی تبصرہ کیا جاتا تھا۔ اب زندگی کی روانی میں تعلق قائم رکھنا بھی بہت لگتا ہے۔ احادیث سے بہت سے دینی پہلوؤں پر رہنمائی ملتی ہے۔ انٹرویو کا سلسلہ بھی اچھا ہے۔ جب تجھ سے ناتا جوڑا'' بہو کے بعد ساسوں سے بھی لکھوائیں...... بلکہ ہر ماہ ایک ساس اور ایک بہو کا شامل کریں...... باقی تمام سلسلے اچھے ہیں۔

''تاریخ کے جھروکوں سے'' میرا پسندیدہ ہے۔

اشعار دو تین ہی دل کو بھاتے ہیں، بڑے شعراء کے کلام کو شامل کیا جائے۔ شام کی حویلی میں ''زینب اور منصور کی لکا چھپی ختم کر دیں اب۔'' تنزیلہ ریاض ہمیشہ کی طرح آئیں اور چھا گئیں۔ نئی رائٹرز بھی بہت اچھا لکھ رہی ہیں۔ خطوط کا سلسلہ رسالے کی جان ہے۔

پیاری انیلا! دو صفحات پر مشتمل سلسلہ ختم کر بھی دیں تو سلسلہ وار ناول اس کی جگہ نہیں لے سکتا۔ ویسے بھی دو سلسلہ وار ناول رخسانہ نگار عدنان اور تنزیلہ ریاض کے چل رہے ہیں۔ ایک سلسلہ وار مکمل ناول حسنہ حسین کا ہے۔ اب اگر مزید کوئی سلسلہ وار ناول شروع کیا گیا تو ہماری قارئین احتجاج کریں گی۔ شعاع آپ کو پسند آیا۔ یہ جان کر خوشی ہوئی۔

عاصمہ شبیر نے راولپنڈی سے شرکت کی ہے، لکھتی ہیں

سرورق دیکھ کر دل باغ باغ ہو گیا۔ حمد و نعت سے دل کو منور کیا۔ اور چھلانگ لگائی۔ "خط آپ کے" پر حسب معمول بہنوں کے خطوط بہت پسند آئے۔ ڈاکٹر فریال کا خط حسب معمول سب سے الگ تھا۔ شعور کی سیڑھی پر قدم رکھنے سے بھی پہلے میں شعاع، کرن اور خواتین کو اپنے گھر دیکھ رہی ہوں۔ میری مما اور خالہ بہت شوق سے پڑھتی ہیں۔ قریباً تیس سال سے دونوں خاموش قاری ہیں۔ میں بھی کافی عرصے تک صرف کہانیاں پڑھتی رہی پھر خطوط پڑھے تو بہت اچھا لگا۔ سچ تو یہ ہے کہ زندگی میں جب بھی کسی مہربان دوست کی ضرورت محسوس ہوئی۔ شعاع نے بڑھ کر تھام لیا۔ افسانے پانچوں زبردست تھے۔ مونا شاہ قریشی کا "بھرم" اچھا لگا۔ بھروسے کے بغیر رشتہ بے معنی ہے۔ نوشین فیاض کا مکمل ناول بہت زبردست تھا۔ لیکن نوشین صاحبہ کو شاہ میر کا انجام بھی دکھانا چاہیے تھا۔ جس نے پتا نہیں کتنی لڑکیوں کی زندگیاں تباہ کیں۔

پیاری عاصمہ! شعاع کی بزم میں خوش آمدید آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی اور بہت اچھا اور تفصیلی تبصرہ کیا۔ معذرت کہ آپ کا تبصرہ شائع نہ کر سکے۔ بہت خوشی ہوئی۔ اپنی خالہ اور امی کو ہماری طرف سے سلام کہہ دیں کہ وہ ہماری دیرینہ قاری ہیں اور ان ہی کی وجہ سے شعاع آپ تک پہنچا ہے۔

رضوانہ وقاص نے ہزی پور کرلاں سے لکھا ہے

میرا بھائی بشارت کراچی کام پر واپس جا رہا تھا میرے شوہر اسے چھوڑنے گئے واپسی پر شعاع لے کر آئے۔ حمد و نعت دونوں اچھی، پیارے نبی کی پیاری باتیں۔ یہ سلسلہ بہت اچھا ہے۔ بہت ہی اچھی باتیں۔ دستک، قیصر نقوی کا انٹرویو پڑھا۔ اللہ ان کو صحت دیں۔ میں خود بیمار ہوں۔ بہت مشکل ہے اس طرح زندگی گزارنا۔ اس دفعہ شعاع میں صفحے آگے پیچھے ہیں۔ مکمل ناول قصہ ایک جل پری کا پڑھا۔ اچھی کہانی ہے۔ شہناز بیگم تو پھر بھی دادی نہ بن سکیں۔ شام شہر کا ملال میں کہانی اچھی لگی۔ حسن آرا کیا بات ہے جی۔ دادی پوتی کا ساتھ دیتی رہی۔ ہماری دادی تو کبھی نہ دیں ساتھ۔ "عسر یسرا" کہانی اچھی لگی لیکن فارس پر غصہ آتا رہا۔ جنت پر ترس۔ زینب کشف کو بتا کیوں نہیں دیتی وہ کس کی بیٹی ہے۔ پچھتاوا پڑھا اچھی کہانی تھی۔ خط آپ کے سب کے ہی خط بہترین ہوتے ہیں۔ کیا آپ کو میرا خط پسند نہیں آتا۔ آپ نے مجھے تو فون نہیں کیا۔ ثمینہ اکرم، ماہا بشیر حسین آپ کی کمی محسوس ہوئی۔ اگر میں اپنے بچوں کی تصویریں بھیجوں پہلے صفحے پر لگائیں گی۔ خوب صورت بنیے۔ آسان ٹوٹکے ٹرائی کریں گے لیکن آپ کو پتا ہے ہم گاؤں میں رہنے والے ایک چیز پاس ہے تو دوسری منگوانے میں ٹائم لگتا ہے اور سردیوں میں منہ ہی دھو لیں تو شکر کرتے ہیں۔ اتنی سردی ہے۔

پیاری رضوانہ! آپ نے ہماری محفل میں شرکت کی بہت خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ آپ کی تکلیفیں دور کر کے صحت کاملہ عطا فرمائے۔ آمین۔

آپ نے دیکھا ہے کہ ٹائٹل پر ماڈلز کی تصاویر شائع ہوتی ہیں۔ معذرت کہ آپ کے بچوں کی تصاویر شائع نہیں کر سکتے۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے شکریہ۔

ڈاکٹر ہانیہ خان راولپنڈی سے شریک محفل میں لکھا ہے

میں شعاع، خواتین، کرن چھ سال سے پڑھ رہی ہوں۔ میری کزن پڑھتی تھی تو میں نے بھی پڑھنا شروع کیا۔ خط لکھنے کا خیال اس لیے آیا کہ میں دادو کے ساتھ گئی، وہیں پر ایک پوسٹ آفس دیکھا، سوچا اگلی بار آؤں گی تو خط بھی لے آؤں گی۔

لیکن جیسے ہی خط لکھنے بیٹھتی سارے الفاظ اڑ جاتے۔ شعاع سے میں نے بہت کچھ سیکھا ہے شعاع نے میری زندگی سنوار دی ہے۔"

میں ایک پٹھان خاندان سے تعلق رکھتی ہوں اس امید پر خط لکھا ہے۔ کہ شاید ایک پٹھانی کا خط غلطی سے شائع ہو جائے۔

ڈاکٹر ہانیہ! آپ کو شعاع کی محفل میں خوش آمدید کہتے ہیں پٹھانی کا خط غلطی سے نہیں خوشی کے ساتھ شائع

کیا ہے۔ ہمیں کے پی کے سے بہت زیادہ خط موصول ہوتے ہیں اور شائع بھی کرتے ہیں۔ اردو مادری زبان نہ ہونے کے باوجود آپ نے بہت اچھا خط لکھا ہے۔

تابی کھرل جڑانوالہ سے شریک محفل ہیں

شعاع میرا موسٹ فیورسٹ ہے اس لیے پہلی طبع آزمائی اسی میں کر رہی ہوں۔ میں نے سیکنڈ ایئر میں کافی کچھ لکھا تھا لیکن بھیجنے کی ہمت نہیں ہوئی۔ اب ایم سی ایس میں ایڈمیشن لیا ہے، کلاسز ابھی اسٹارٹ نہیں ہوئیں اس لیے سوچا ابھی ایک تو بھیجوں باقی پھر دیکھتی ہوں۔ شعاع کی ایک قاری انیقہ انا پہلے لکھتی تھی اب کیوں نہیں لکھتی وہ؟

پیاری تابی! آپ نے شاہ زندگی کے نام سے خط لکھا اور وہ شائع ہو گیا اور آپ کے نام سے لکھا خط شائع نہ ہو سکا اس میں ہمارے ارادے کو دخل نہیں، یہ محض اتفاق ہے تمام خطوط پڑھتے ہیں اور کوشش کرتے ہیں سب کو جگہ دی جائے۔ کچھ خط صفحات کی وجہ سے شامل نہیں ہو پاتے کچھ تاخیر سے موصول ہونے کے باعث رہ جاتے ہیں۔

انیقہ انا کافی عرصہ سے غائب ہیں، وہ خط لکھیں گی تو ہم ضرور شائع کریں گے۔ آپ کی کہانی ابھی پڑھی نہیں گئی۔

عالیہ رحمان پشاور سے درسنگ سے لکھتی ہیں

میں سکس کلاس سے شعاع پڑھ رہی ہوں اور اب تھرڈ ایئر کی اسٹوڈنٹ ہوں۔ ہم پٹھان ہیں اور پشتو بولتے ہیں۔ میرے رسالہ پڑھنے کے سب خلاف ہیں سب ڈانٹتے ہیں۔ کہ یہ فضول ہے۔ اچھی کتابیں پڑھا کرو لیکن میری تو اس میں جان ہے۔ لیکن میری دوست عائشہ حنیف بہت اچھی ہے۔ وہ ہر ماہ کا رسالہ منگاتی ہے ار مجھے بھی پڑھنے کے لیے دیتی (تھینک یو عائشہ)۔

پیاری عالیہ! آپ کے گھر میں سب پشتو بولتے ہیں اس کے باوجود آپ اردو کے پرچے نہ صرف پڑھتی ہیں بلکہ اردو میں کہانی بھی لکھی ہے۔ یہ جان کر بہت خوشی ہوئی۔ آپ فی الحال صرف مطالعہ کریں۔ پھر کہانی لکھیں۔ اور ایک ضروری بات، اپنی دوست عائشہ کا ہماری طرف سے بھی شکریہ ادا کر دیں۔

شہرین اسلم...... چوک شاہدرہ بہاول پور سے شریک محفل ہیں لکھا ہے۔

سب سے پہلے میری طرف سے سب کو نیا سال بہت بہت مبارک ہو اللہ پاک سے دعا ہے آنے والا سال خوشیوں کی نوید لے کر آئے تمام ملکی مسائل حل ہوں سب کی پریشانیاں دور ہوں۔

ٹائٹل گرل زبردست لگی۔ پیارے نبی کی پیاری باتیں ہمیشہ کی طرح معلومات سے بھرپور تھیں انٹرویوز میں ڈاکٹر نسیم اختر سے ملاقات اچھی رہی۔ قیصر نقوی صاحبہ کے بارے میں جان کر اچھا لگا۔ سلسلے وار ناولز میں سب سے پہلے بات کرنا چاہوں گی وہ نازنین کی واہ فرح جی کمال کر دیا آپ نے بیسٹ اختتام کیا۔ شہر تمنا نعیمہ ناز جی نے بھی اچھا اختتام کیا مگر ماریہ اور ہمارے شاہ میر کی منگنی ہی کروا دیتیں۔ نور القلوب کے بارے میں رائے محفوظ ہے۔ مکمل ناولز میں شام شہر ملال ویری انٹرسٹنگ اور ''عسر یسرا'' اتنے تجسس کے ساتھ ناول پڑھا باقی آئندہ ماہ پڑھ کر دل اداس ہو گیا۔ قصہ ایک جل پری کا الفاظ نہیں ہیں تعریف کے لیے۔ دانیان یونیک نیم پلیز اگر مطلب معلوم ہو تو لازمی بتایئے گا باقی افسانے تو ہوتے ہی ہمیشہ کی طرح سبق آموز اور بہترین۔

پیاری شہرین! شعاع کی پسندیدگی کا جان کر بہت خوشی ہوئی۔

دانیان کے معنی تو ہمیں نہیں پتا۔ یہ تو مصنفہ ہی بتا سکتی ہیں۔

خانیہ بلال نے عالی والا سے شرکت کی، لکھتی ہیں

آپی! ہم آٹھ بہن بھائی ہیں۔ میں (ثانیہ) سب سے چھوٹی ہوں۔ مجھ سے چھوٹا ایک بھائی ہے جو مجھے رسالے لا کے دیتا ہے۔ میرے ایک بھائی اور دو بہنوں کی شادی ہو چکی ہے۔ میں کالج کی طالبہ ہوں اور میری بڑی بہن یونی ورسٹی کی طالبہ ہے لیکن وہ صرف نام کی بڑی ہے، گھر کے سارے کام میں خود کرتی ہوں۔ وہ صرف مجھے باتیں سناتی ہے۔ پہلے میں گھر میں بہت بور ہوتی تھی لیکن اب میری بھتیجیاں دنیا میں آئی ہیں، میری زندگی میں بہار آ گئی ہے میرے گھر میں میرے علاوہ کوئی رسالہ نہیں پڑھتا۔ صرف میں دس دس روپے اکٹھے کر کے رسالہ لیتی

ہوں۔ میرے پاس 2017ء سے لے کر اب تک کے تمام رسالے محفوظ ہیں۔ میں یہ خط زینب نور، فائزہ، بھٹی ریحانہ چوہدری، فوزیہ ثمر بٹ اور اقراء سرور سے دوستی کرنے کے لیے لکھ رہی ہوں۔ زینب نور آپ مجھے اپنی طرح لگی ہیں، میں بھی بالکل تمہاری جیسی ہوں۔

☆ پیاری خانیہ! آپ کی لکھائی بہت اچھی ہے۔ آپ کا خط پڑھنے میں ہمیں کوئی دشواری نہیں ہوئی آپ ہمارا رسالہ اتنے شوق سے پڑھتی ہیں یہ جان کر ہماری ساری محنت وصول ہوگئی۔

یہ تو آپ کی آپی کی زیادتی ہے۔ بڑا ہونے کے ناتے انہیں آپ کا خیال رکھنا چاہیے۔ ہوسکتا ہے کہ وہ پڑھائی کی مصروفیت کی وجہ سے وقت نہیں نکال پاتی ہوں۔ بہر حال وجہ جو بھی ہو لیکن ایک بات یاد رکھیں کام کرنے والوں کی ہر جگہ عزت ہوتی ہے۔ مثل مشہور ہے، انسان پیارا نہیں ہوتا کام پیارا ہوتا ہے۔

کراچی سے زاہدہ راجپوت لکھتی ہیں

میرا شعاع، خواتین اور کرن کا بہت پرانا ساتھ ہے لڑکپن جوانی گزارا کر ادھیڑ عمر میں داخل ہوئے بھی عرصہ گزرا زندگی کے سفر میں ان ماہناموں نے میری بہت رہنمائی کی۔ خط آپ کو گنے چنے مخصوص قارئین ہی لکھتے ہیں۔ دسمبر کا شعاع ہاتھوں میں تبصرہ حاضر (ناقص تبصرہ) سرورق کی گڑیا (جیتی جاگتی) اچھی لگی۔ دو عدد سلسلے وار ناول دو مکمل ایک (نامکمل) ناول ایک ناولٹ اور چھ افسانے اور مختلف سلسلوں کو پڑھا۔ آیت الکرسی کے ترجمے پر مشتمل حمد پڑھی۔ نعت کو چار بار پڑھ کر قلب کو منور کیا۔ پیارے کی نبی کی پیاری باتیں کھانا، کھانے کے آداب، ملازموں کو کھانے میں شامل کرنا اے کاش ہم مسلمان سنت رسول ﷺ کی پیروی کر کے دنیاوی زندگی کو توشہ آخرت بنالیں۔ بیٹھ کر سیر دو جہاں کرنا بے شک یہ کتابوں اور تراجم کا کمال ہے، ڈاکٹر نسیم اختر سے ملاقات خوب رہی۔ اسلامی نقطہ نظر سے اولاد کو ان کے اصلی باپوں کے نام سے پکارا جائے۔ بٹی چونکہ دیور کی ہے تو بٹی کے نام کے ساتھ دیور کا نام لکھیں۔ خط آپ کے قارئین کے خطوط اوران کے جوابات سے محظوظ ہوئی۔ ''تاریخ کے جھروکوں میں'' حضرت یونس کی بابت بتایا گیا۔ آئینہ خانے میں تذکرہ تورگت الپ کی ہیروئن کا تھا اور تصویر دو آن کی ہیروئن کی (خوب) موسم کے پکوان خالدہ جیلانی پاؤ بھاجی کی ترکیب میں گوار کی پھلی ڈالنا بھول گئیں۔

تنزیلہ ریاض کا ناول ''نور القلوب'' خوش الحان کی خوش مزاجی (لب ولہجہ کی) نکاح کے بعد کیا روپ دھارتی ہے گلے کا کردار بھی مزے کا ہے۔

حسنہ حسین نے ''عسر یسرا'' لکھا۔ جنت کے کردار کا آئندہ قسط میں ہی کھل کر پتا چلے گا۔

☆ پیاری زاہدہ! شعاع کی محفل میں خوش آمدید اتنے طویل عرصے سے شعاع پڑھ رہی ہیں تو خط لکھنے میں اتنی تاخیر کیوں جبکہ آپ اتنا اچھا تبصرہ کرتی ہیں۔ شعاع کی پسندیدگی کے لیے تہہ دل سے ممنون ہیں آپ جب چاہیں آفس تشریف لاسکتی ہیں۔

مہوش خولہ راؤ ضلع ٹنڈو الہ یار سے شریک محفل ہیں

شعاع خواتین کی پچھلے بیس سال سے قاری ہوں اس کے پہلے شمارے سے لے کر اب تک تمام شمارے بھی پڑھ رکھے ہیں شعاع و خواتین سے محبوبانہ رشتہ ہے۔ آپ کو خط لکھتے ہوئے اتنی خوشی ہے، جتنی محبوب سے ملاقات کی ہوتی ہے۔ شعاع کے پرانے مصنفین شدت سے یاد آتے ہیں معزز مصنفہ رخسانہ عدنان نگار کا شکر یہ کہ انہوں نے شعاع سے تعلق نہیں توڑا۔ ''شام کی حویلی'' اچھا جا رہا ہے۔ وہ نازنین مزیدار ناول خوش گوار اینڈ مگر فرح کا بن پاکھی کا اثر دل ودماغ سے نہیں جاتا ویسا کچھ لکھیں، ''نور القلوب'' یادگار ہوگا ان شاء اللہ کیونکہ تنزیلہ ریاض کا نام ہی کافی ہے۔ نعیمہ ناز بلاشبہ منجھی ہوئی مصنفہ ہیں۔ ''تجھ سے ناتا'' کے سلسلے میں شمولیت کا ارادہ ہے۔

☆ پیاری مہوش! آپ کا خط پا کر ہمیں بھی ایسی ہی خوشی ہوتی ہے جیسی آپ کو ہمیں خط لکھ کر محسوس ہوتی ہے۔ خصوصاً جن سے دیرینہ تعلق ہے۔ ان کے خط پا کر لگتا ہے جیسے کوئی پرانا دوست اچانک ملنے آجائے۔ تجھ سے ناتا جوڑا ہے کے سلسلہ میں ضرور شرکت کریں بہت شکریہ۔

☆

بقیہ سروے

میاں صاحب (ہوں سوچنے دیں) اگست میں ہمارا عقد ہوا تھا تو انہوں نے میسج کیا کہ تم تصویروں میں ویری پریٹی اور گڈ لکنگ لگ رہی تھیں۔ مجھے تو بڑی شرم آئی۔ یہ خوب صورت پیغام ہے یا نہیں لیکن مجھے تو دنیا میں سب سے زیادہ خوب صورت یہی الفاظ لگے۔

3۔ اشعار تو بہت سے ہیں جو میری ڈائری کی زینت بنے ہوئے ہیں۔ میرے دل پسند اشعار۔ آپ کا یہ آخری سوال مجھے سب سے زیادہ پسند آیا۔

ہر ایک کی طبیعت کے مطابق نہیں ہوں میں
کڑی ضرور ہوں، منافق نہیں ہوں میں
☆ یہ حدیں نہ توڑنا، میرے دائرے میں رہنا
مجھے اپنے دل میں رکھنا، میرے حافظے میں رہنا
میرے ہاتھ کی لکیریں تیرا نام بن کے چمکیں
میری خواہشوں کی خوشبو، میرے زائچے میں رہنا

گڑیا راجپوت جاتری شریف

1۔ دسمبر کی اداسی اور بے رونقی عجیب سی ہوتی ہے۔ ہر طرف خاموشی کا راج، جو عجیب قسم کی جھنجلاہٹ کا باعث ہوتا ہے۔ کہتے ہیں کہ دل کا موسم اچھا ہو تو سارے موسم اچھے لگتے ہیں لیکن کچھ بات تو ہے دسمبر میں کہ اس کی طویل راتیں عجیب سی وحشت کا تاثر دیتی ہیں۔ اس لیے میں نے اپنا معمول بنایا ہوا ہے۔ آٹھ بجے تک ہر کام سے فری ہو کر نو بجے نماز و قرآن پڑھنا اور پھر بستر میں۔ پھر اگر رسالہ پڑھا ہو تو پڑھ لیا۔ نہیں تو "خود کو اللہ کے سپرد کیا اور سو گئے۔ ماضی اتنا شاندار نہیں تھا کہ یادیں خوش گوار ہوتیں۔

2۔ بھائی نے اچانک کہا امی ابو اور گڑیا کا پاسپورٹ بنوا دو۔ جلدی ہی عمرے کے لیے بلواؤں گا۔ روزگار کے سلسلے میں سعودی عرب مقیم ہیں۔

اقتباس: (آج کل اردو ادب پڑھ رہی ہوں تو

یہ بہت سے اقتباسات پسند آ رہے ہیں۔ اب پتا نہیں رسالے کہ سوال کے مطابق ہیں یا نہیں......) "مرد موت کا مقابلہ موت سے مگر عورت موت کا مقابلہ زندگی سے کرتی ہے۔" قرۃ العین حیدر...... آخر شب کے ہمسفر۔

حفصہ صفدر...... کراچی

1۔ دسمبر میرے نزدیک یادوں کا مہینہ ہے۔ یادوں کو یاد کرنے کا مہینہ۔ اس کی طویل راتوں میں بہت سی حسین یادیں دل پر دستک دیتی ہیں۔ اکثر باتیں ایسی ہیں کہ سوچوں تو اب ہنسی آتی ہے۔

اپنی اسکول لائف بہت یاد آتی ہے۔ مجھے اب بھی یاد ہے کہ نویں، دسویں میں جب پیپرز کی تلوار سر پر لٹکنے کے باوجود ہم موج مستی کرتے تھے۔ ایک مرتبہ گول گول چکر کاٹتے میں پلر سے اس زور سے ٹکرائی کہ کندھا ہی سن ہو گیا۔ پھر بھی ہم ہنستے رہے۔ اب تو ذرا سی بات پر آنکھ بھر آتی ہے۔

2۔ اکیسویں صدی ڈیجیٹل صدی ہے۔ مشینی دور، ہمارے دور میں تو سال نو کے پیغام سوشل میڈیا کے ذریعے ہی موصول ہوتے ہیں۔ اور سچ تو یہ ہے کہ مجھے دلچسپی ہی نہیں ہے کہ ایک ہی میسج دس بارہ بندوں کو فارورڈ کر دوں۔ البتہ میری امی کہتی ہیں کہ

ان کے وقت میں وہ کزنز ایک دوسرے کو کارڈ پر اشعار لکھ کروش کیا کرتے تھے۔

3۔ میرا پسندیدہ اقتباس مختصر الفاظ میں مکمل مفہوم لکھنے والی قلم سے:

"عبدالرحمٰن کہتا ہے کہ عائشے گل کے سیپ سے ہمیشہ موتی اس لیے نکلتے ہیں کیونکہ وہ سچ بولتی ہے۔"

جنت کے پتے از نمرہ احمد۔

رضوانہ وقاص...... ہری پور کرلاں

1۔ دسمبر کے کیا کہنے ابھی اداسی تو کوئی نہیں ملی دسمبر میں۔ آگے بھی نہ ملے اپنے تو بہت سارے چلے گئے اللہ میاں کے پاس ایک ہی ہماری پھپھو تھیں وہ اللہ کو پیاری ہوگئیں بہت یاد آتی ہیں اللہ انہیں جنت میں جگہ دیں (آمین)

دادا ابو تو دیکھے ہی نہیں تھے۔ نانا ابو دیکھے تھے۔ ان کی بہت یاد آتی ہے۔ اور حال ہی میں سب سے پیاری دوست کزن نگین مٹی کے نیچے دب گرگئی۔ اس کی بہت یاد آتی ہے۔ بہت ہی اچھی ملنسار اللہ اسے جنت میں جگہ دے (آمین)

ماضی میں جائیں کیا بات یاد کروادی آپ نے جی 2016 کی بات ہے۔ گھومنے تو ہم اپنے شوہر کے ساتھ ہر جگہ ہی جاتے رہے۔ لیکن ناران، کاغان میں ایک دن کا قیام کیا تھا۔ ہوٹل میں رکے تھے۔ سیف الملوک جھیل دیکھی جیپ میں گئے تھے جھیل دیکھنے ہلکی ہلکی بارش شروع ہوگئی ماشاء اللہ میرے تینوں بیٹے۔ احمد وقاص، عباس وقاص، عالیان وقاص، بچوں نے بھی خوب انجوائیں کیا۔ تصویریں بنائیں۔ یہ لمحہ یہ دن میرے لیے بہت ہی یادگار ہے کیونکہ اب بہت بیمار ہوں کہیں نہیں آجاسکتی۔ گزرا ہر دن ہر لمحہ میرے لیے یادگار ہے۔ اللہ مجھے ٹھیک کردے میں پھر اسی طرح اپنے شوہر اور بچوں کے ساتھ گھوموں پھروں آمین۔

2۔ میرے طفیل ماموں فون کرتے ہیں اللہ نیا سال اچھا گزارے۔ میاں صاحب سے پیاری سی مسکراہٹ بس میری ان کے لیے دعا ہے کہ ہمیشہ ہنستے مسکراتے رہیں۔ (آمین)

تیسرے سوال کا جواب: کہانی کا اقتباس تو نہیں یاد لیکن شعر یاد ہے جو بہت پسند آئے۔

اشعار

چلو محسن محبت کی نئی بنیاد رکھتے ہیں
خود پابند رہتے ہیں، انہیں آزاد رکھتے ہیں
ہمارے خون میں رب نے یہی تاثیر رکھی ہے
برائی بھول جاتے ہیں اچھائی یاد رکھتے ہیں
محبت میں کہیں ہم سے گستاخی نہ ہوجائے
ہم اپنا ہر قدم اس کے قدم کے بعد رکھتے ہیں

کوثر خالد

1۔ ہم تو سدا یادوں میں ہی کھوئے رہتے ہیں۔ صرف ایمرجنسی مصروفیت میں بھول جاتے ہیں ورنہ ہر کام کرتے وقت پوری دنیا ہمارے خیالوں، یادوں اور دعاؤں میں رہتی ہے۔ اللہ کی رضا میں راضی، اپنے گناہوں پر نادم اور احتساب کرتے۔ نیکی کی ہر بات ہمیں اپنی طرف کھینچتی ہے۔

2۔ واحد ایک سہیلی شاہدہ ہے جو ہمیں عید کارڈ پر بہترین دعائیں اور شعر لکھا کرتی۔ اور ہم خود سے بنا کر لکھتے ہیں۔ اس کی خوب صورت لکھائی پر اس کے لیے ہم نے یہ شعر بنایا تھا۔

یہ تری تحریر کی سجاوٹ بنے تیرا مقدر
سج جائے تیری زندگی تری تحریر کی مانند

وہ مجھے کہتی ہے کہ آپ کی دعاؤں سے میرا مقدر بنا ہے۔ میری کتاب پر پیسے اس نے لگائے دو بار...... ایک بار بیٹے نے لگائے اکیس ہزار لگائے تھے تو 21 کا لیپ ٹاپ کمپنی سے ملا تھا۔

جنوری 2021ء کے شمارے کی ایک جھلک

- ''بیادِ ابنِ انشاء''
- نئے سال کے حوالے سے شاہین رشید کا سروے،
- اداکارہ ''زینب احمد'' کہتی ہیں ''میری بھی سنیئے''،
- اس ماہ ''عائشہ کیانی'' کے ''مقابل ہے آئینہ''،
- ''دامنِ سحاب'' مہوش افتخار کا سلسلہ وار ناول،
- ''میرے ہم نفس میرے ہم نوا'' آسیہ مرزا کا سلسلہ وار ناول،
- ''کنارِ خواب جو'' فرح بخاری کا مکمل ناول،
- ''سیماب'' اُمِ ہانی کا مکمل ناول،
- ''کانچ سے سائبان'' مصباح علی سید کا ناولٹ،
- ''آدم اور حوا'' میمونہ صدف کا ناولٹ،
- ''مجھے تیری ضرورت ہے'' انعم خان کا ناولٹ،
- زارا ہنجرا، عمارہ امداد، کنیز زہرہ اور اُمِ اقصیٰ کے افسانے اور مستقل سلسلے،

''کرن کتاب''

- معلوماتی مضامین اور مزے دار ریسیپیز کے ساتھ۔

جنوری 2021ء کا شمارہ شائع ہوگیا

امۃ الصبور

لکھنؤ کا عروج و زوال

نواب غازی الدین حیدر کے زمانے سے اودھ کے حکمرانوں کو بادشاہ کا درجہ مل گیا، جو وہاں کے آخری تاجدار نواب واجد علی شاہ تک برقرار رہا۔ نواب واجد علی شاہ بھی بادشاہ کہلاتے تھے، تاہم یہ سب بادشاہ حقیقت میں صرف نام کے ہی بادشاہ تھے۔ انہیں ریاست کے وسائل سے عیش کرنے اور موج مستی میں دولت اڑانے کی آزادی ضرور حاصل تھی لیکن اصل طاقت اور اختیارات انگریزوں کے پاس تھے۔ وہ جب چاہتے، کسی کو حکمراں بنا سکتے تھے اور جب چاہتے اس منصب سے ہٹا سکتے تھے۔

غازی الدین حیدر کے زمانے میں ان کی بیگم کی کم علمی اور بعض مذہبی معاملات میں حد سے بڑھی ہوئی عقیدت مندی کی وجہ سے بدعتوں کو بہت فروغ ملا جو نہ صرف آنے والے زمانوں تک میں رائج ہوتی چلی گئیں بلکہ بعد میں بھی لوگ ان میں حسب توفیق اضافہ کرتے چلے گئے۔

1827ء میں غازی الدین حیدر کا انتقال ہوا اور ان کے صاحبزادے نصیر الدین حیدر تخت نشین ہوئے۔ انہوں نے بھی اپنے مسلک میں بدعتوں کے سلسلے کو نہایت جوش و خروش سے آگے بڑھایا اور اس میں نئی نئی اختراعات کیں۔ تاہم ان کے مزاج میں کچھ جدت پسندی بھی تھی یا پھر شاید اپنی توہم پرستی کی وجہ سے وہ علم نجوم میں گہری دلچسپی رکھتے تھے۔ وجہ کچھ بھی رہی ہو، لیکن انہیں بہرحال یہ کریڈٹ جاتا ہے کہ انہوں نے لکھنؤ میں ہندوستان کی پہلی رصدگاہ تعمیر کرائی جو اپنے وقت اور زمانے کے اعتبار سے جدید ترین آلات اور سازوسامان سے لیس تھی۔ انہوں نے ایک انگریز ماہر فلکیات کرنل ولکاکس کو اس کا نگراں اور منتظم مقرر کیا۔

1847ء میں کرنل ولکاکس کا انتقال ہوا تو ان کی جگہ اس رصدگاہ کا کوئی متبادل نگراں اور منتظم مقرر نہیں کیا گیا۔ اس وقت تک واجد علی شاہ کی حکمرانی کا دور شروع ہو چکا تھا۔ اس دوران ایک تو ویسے ہی لاوارث ہونے کی وجہ سے رصدگاہ اجڑنے اور برباد ہونے لگی تھی۔ دوسری طرف واجد علی شاہ کا اس قسم کی چیزوں میں دلچسپی اور معلومات کا یہ عالم تھا کہ سنا ہے، انہوں نے اس رصدگاہ کی سب سے بڑی دوربین کو کوئی کھلونا سمجھ کر ایک طوائف کی خدمت میں پیش کر دیا تھا۔

یہ رصدگاہ "تاروں والی کوٹھی" کہلاتی تھی۔ کرنل ولکاکس کے انتقال کے بعد سے اس کی بربادی تو شروع ہو گئی تھی لیکن بعد میں رہی سہی کسر جنگ آزادی، جسے عرف عام میں غدر بھی کہا جاتا ہے کے دوران پوری ہو گئی۔ جذبہ حریت سے سرشار، آزادی کے متوالوں نے اپنے ہی اس ورثے کو برباد کر ڈالا۔ انگریزوں سے جنگ کرنے والے ایک لشکر کے کمانڈر احمد اللہ شاہ، جو ڈنکا شاہ بھی کہلاتے تھے۔ وہ اسی کوٹھی میں مقیم ہو گئے تھے۔ یہیں وہ اپنا دربار لگاتے تھے اور اپنے ساتھیوں سے صلاح مشورے کرتے تھے، جو انگریزوں کے خلاف بغاوت کر رہے تھے۔

نصیر الدین کا دور حکمرانی بدنظمی، ابتری اور خرابیوں کا دور تھا۔ بادشاہ کو اپنی عیش و عشرت کی سرگرمیوں اور اپنی مذہبی اختراعات یا بدعتوں سے فرصت نہیں تھی۔ ریاست کا نظام وزیروں پر چھوڑا ہوا تھا۔ جن میں سے ایک بھی دیانت دار یا ڈھنگ کا آدمی نہیں تھا۔ مزید ستم یہ ہوا کہ بادشاہ اور ان کی والدہ میں بھی جھگڑے اور اختلافات تھے۔ والدہ کا کہنا تھا کہ منا جان نامی ایک نوجوان جس نے محل میں پرورش پائی تھی۔ نصیر الدین کا حقیقی بیٹا ہے، جبکہ خود نصیر الدین اسے اپنا بیٹا تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔ ان کے والد غازی الدین حیدر بھی منا جان کو شاہی نسل میں شمار نہیں کرتے تھے۔

ان حالات کو دیکھتے ہوئے انگریز سرکار نصیر الدین کے انتقال سے پہلے ہی فیصلہ کیے بیٹھی تھی کہ ان کے بعد نواب سعادت علی خان مرحوم کے بیٹے نصیر الدین الدولہ محمد علی خان کو تخت پر بٹھایا جائے گا مگر بیگم صاحبہ یعنی نصیر الدین کی والدہ اس فیصلے کو تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ نصیر الدین کے انتقال کے بعد جب تخت نشینی کا مرحلہ آیا تو بیگم صاحبہ اپنے چہیتے منا جان کو ساتھ لے کر اس

بارہ دری میں آ گئیں، جہاں باقاعدہ تخت نشینی کی رسم انجام دی جاتی تھی۔

انگریز ریذیڈنٹ نے انہیں احترام کے ساتھ روکا اور سمجھانے کی بہت کوشش کی کہ منا جان کو بادشاہ بنانا قطعی مناسب نہیں اور انگریز سرکار اس ضمن میں دوسرا فیصلہ کیے بیٹھی ہے لیکن عمر رسیدہ بیگم صاحبہ کسی کی کوئی بات سننے کے لیے تیار نہیں تھیں۔ انہوں نے زبردستی منا جان کو تخت پر بٹھا دیا اور انہوں نے رسم کے مطابق امراء اور دربار کے خاص خاص لوگوں سے نذرانے لینے بھی شروع کر دیے۔

صرف یہ ہی نہیں بلکہ انہوں نے اپنے مخالفین سے انتقام لینا بھی شروع کر دیا۔ انہیں معلوم تھا کہ بہت سے لوگ ان کے حکمران بننے کے حق میں نہیں تھے۔ منا جان نے چن چن کر انہیں گرفتار کرانا اور سزائیں دینا شروع کر دیں۔ ایسے کئی افراد کو انہوں نے قتل کرا دیا۔ کچھ کو زنداں میں ڈلوا دیا اور بعض کے گھر لوٹ لیے گئے۔ یوں پوری ریاست میں ایک افراتفری اور ہل چل مچ گئی۔ خاص طور پر لکھنؤ میں تو گویا بھونچال آ گیا۔

انگریز ریذیڈنٹ بہادر ایک بار پھر بڑی بیگم صاحبہ کی خدمت میں پہنچے اور انہیں سمجھانے کی کوشش کی کہ وہ منا جان کو بادشاہ بنانے کی ضد چھوڑ دیں۔ انہوں نے بیگم صاحبہ کو وائسرائے کا حکم نامہ بھی دکھایا جس میں واضح طور پر لکھا تھا کہ منا جان کو اودھ کا حکمراں بنانے کی کوشش نہ کی جائے۔ ریذیڈنٹ نے بہت کہا کہ منا جان تخت خالی کر دیں اور نصیر الدولہ کو تخت پر بٹھایا جائے مگر دربار چونکہ اب منا جان کے چیلوں، خوشامدیوں اور اس طرح کے موقع سے فائدہ اٹھانے والے طالع آزماؤں سے بھر چکا تھا، اس لیے کسی نے ریذیڈنٹ کی بات پر کان نہ دھرا۔

الٹا کسی نے اسسٹنٹ ریذیڈنٹ پر حملہ کر دیا، جس سے اس کا چہرہ لہولہان ہو گیا۔ ریذیڈنٹ کو پہلے ہی حالات خراب ہونے کا اندیشہ تھا اور اسے اندازہ ہو رہا تھا کہ لاتوں کے بھوت باتوں سے نہیں مانیں گے۔ اس نے انگریز فوج کے دستے بلوائے ہوئے تھے اور بارہ دری کے سامنے توپیں لگوا دی تھیں۔ اس نے ایک طرح سے آخری وارننگ دی کہ اگر دس منٹ کے اندر اندر منا جان تخت سے نہ اترے تو حتمی کارروائی کی جائے گی۔

اس کی اس وارننگ کو بھی کوئی خاطر میں نہ لایا۔ ریذیڈنٹ گھڑی دیکھ کر اعلان کرتا رہا کہ اب اتنے منٹ باقی رہ گئے ہیں، اب اتنی مہلت رہ گئی ہے۔ جب آخری منٹ بھی گزر گیا تو یکا یک توپیں گرج اٹھیں۔ بارہ دری کے ستون گر گئے اور اس کے ساتھ ہی تیس چالیس آدمی بھی لاشوں کی صورت میں ادھر ادھر گر گئے۔ دربار میں بھگدڑ مچ گئی۔ جس کا جدھر منہ اٹھا، بھاگنے لگا۔

دلچسپ بات یہ تھی کہ یہ نازک مرحلہ شروع ہونے سے پہلے دربار میں رقص ہو رہا تھا۔ طوائفوں کا ایک طائفہ دربار میں مجرا پیش کرنے کے لیے آیا ہوا تھا۔ انگریز ریذیڈنٹ جب آخری وارننگ دے کر گھڑی دیکھتے ہوئے ایک ایک منٹ گزرنے کا اعلان کر رہا تھا، طائفے کا مجرا اس دوران بھی جاری تھا جب توپوں کی گھن گرج سے در و دیوار لرزے اور لاشیں گریں تو دیگر بدحواس درباریوں اور تماش بینوں کے ساتھ طوائفیں بھی گرتی پڑتی ادھر اُدھر دوڑیں۔ ان کے سازندے اپنے ساز چھوڑ کر بھاگے۔

خوشامدیوں اور موقع پرستوں کی بھیڑ میں منا جان اور ان کی دادی کے تھوڑے، بہت جاں نثار بھی موجود تھے۔ انہوں نے صورت حال کا مقابلہ کرنے کی کوشش کی، لیکن انگریز فوج اور ان کی توپوں کے سامنے وہ بھلا کیا کر سکتے تھے؟ ایک ہی ہلے میں جب ان کا بھی صفایا ہو گیا تو منا جان نے تخت کو چھوڑ کر جان بچانے کی کوشش کی اور تخت سے اتر کر بھاگے، مگر انہیں گرفتار کر لیا گیا۔

انگریزوں نے ان کی دادی کو بھی حراست میں لے لیا اور نصیر الدولہ کی تخت نشینی کی رسم انجام دی گئی اور وہ محمد علی شاہ کے لقب سے اودھ کے بادشاہ قرار پائے۔

منا جان اور ان کی دادی، جو خاص محل (محل سے مراد بادشاہ کی بیگم ہوتی تھیں) کہلاتی تھیں۔ دونوں کو سخت نگرانی میں پہلے لکھنؤ سے کان پور بھیجا گیا، پھر کان پور سے قلعہ چنار گڑھ بھیج دیا گیا، جہاں ان کی حیثیت نظر بند قیدی کی تھی۔ البتہ گزر اوقات کے لیے لکھنؤ کے سرکاری خزانے سے ان کی تنخواہ دو ہزار چار سو روپے ماہوار مقرر کر دی گئی تھی۔

☆

احساس

ڈراما سیریل ارطغرل غازی کے مرکزی کردار اداکار اینگن آلتان دس دسمبر کو پاکستان کے دورے پر لاہور پہنچے۔ یہ خبر ترک ایمبسی نے ان کے لاہور پہنچتے ہی سوشل میڈیا پر دی۔

اینگن آلتان المعروف ارطغرل ایک پرائیویٹ بزنس کمپنی کی دعوت پر پاکستان آئے تھے۔ پھولوں کی پتیاں نچھاور کر کے ان کا استقبال کیا گیا۔ اینگن نے لاہور میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا۔ ”مجھے معلوم ہے کہ پاکستانی عوام بہت پیار کرنے والے ہیں اور اس کا احساس مجھے یہاں آ کر ہو گیا۔

صحافیوں کے سوالات کا جواب دیتے ہوئے اینگن کا کہنا تھا کہ میرے لیے خوشی کی بات ہے کہ وزیراعظم پاکستان عمران خان نے میرے ڈرامے کی تعریف کی اور اسے پاکستان میں نشر کیا۔ یہ ایک بڑی ڈراما سیریل تھی۔ یہ ایک اسلامی اسٹوری تھی، پاکستان کے عوام نے اسے بہت پسند کیا ہے جس پر میں ان کا شکر گزار ہوں اگر کوئی اچھی کہانی ہے تو پاکستانی ڈراما سیریل میں ضرور کام کروں گا...... (ہاہاہاہا)

اینگن التان نے پاکستان کے قدرتی حسن کی بھی تعریف کی اور کہا کہ پہاڑوں پر سیر کی خواہش تھی لیکن مختصر دورے کی وجہ سے زیادہ سیر نہیں کر سکا پاکستانی کھانے بہت زبردست تھے لیکن مرچیں زیادہ تھیں۔

سچائی

برطانوی حکومت نے نیٹ فلکس ویب سیریز کے ”دی کراؤن“ سیریز کے چوتھے سیزن پر اعتراض کیا ہے کہ اس کے آغاز میں یہ انتباہ دیا جائے کہ یہ سیریز فکشن پر مبنی ہے۔ اس کے پہلے ہی تین سیزنز جاری کیے جا چکے ہیں۔

چوتھے سیزن میں برطانوی شاہی خاندان کے متعدد نئے کردار دکھائے گئے ہیں جن میں لیڈی ڈیانا، شہزادہ چارلس اور برطانیہ کی پہلی خاتون

وزیراعظم مارگریٹ تھیچر بھی شامل ہیں۔ اس سیزن کے ریلیز ہوتے ہی شائقین نے اسے سیریز کے تمام سیزنز سے بہترین قرار دیا اور دنیا بھر میں اس کی تعریفیں کی جارہی ہیں۔

تعریف کے بعد بھی برطانیہ کے وزیر ثقافت اولیور ڈاؤڈن نے نیٹ فلکس سے مطالبہ کیا کہ وہ وہ ویب سیریز کے آغاز میں انتباہ جاری کرے کہ مذکورہ سیریز کی کہانی حقیقی نہیں بلکہ فکشن پر مبنی ہے۔ بقول الیور ڈاؤڈن کے جن لوگوں نے چوتھے سیزن کے واقعات کو اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا ہوگا وہ سیریز کے واقعات کو حقیقت سمجھ بیٹھیں گے۔ نیٹ فلکس نے برطانوی حکومت کا مطالبہ مسترد کرتے ہوئے کہا کہ وہ سیریز کے آغاز میں یہ انتباہ جاری نہیں کریں گے۔

دی کراؤن سیریز کی مذکورہ کہانی ملکہ ایلزبتھ دوم کی زندگی پر مبنی ہے۔ سیریز کا آغاز ان کی جوانی، شادی اور تخت سنبھالنے سے ہوتا ہے۔ سیریز میں نہ صرف شاہی محل میں ہونے والی سازشوں اور معاشقوں کو دکھایا گیا ہے بلکہ شاہی خاندان کے دنیا بھر کے سیاست پر پڑنے والے اثرات کے اہم واقعات کو بھی دکھایا گیا ہے۔

حقیقت

صوبہ پنجاب کے شہر ملتان میں 2016ء میں بھائی کے ہاتھوں غیرت کے نام پر قتل ہونے والی قندیل بلوچ (جو ایک سوشل میڈیا اسٹار تھی) کی زندگی پر بنی دستاویزی فلم کو امریکی فلم فیسٹول میں پیش کر دیا گیا۔ (اصل حقائق کے ساتھ یا......؟)

قندیل بلوچ کی زندگی پر بنائی گئی اس فلم کی ہدایات بی بی سی پشتو کے صحافی سعد زبیری اور پاکستانی نوجوان فلم میکر صفیہ عثمانی نے دی ہیں۔ اس

دستاویزی فلم کا نام "اے لائف ٹو شارٹ" تھا۔ نیویارک فلم فیسٹول سے قبل اسے کہیں بھی نہیں دکھایا گیا۔ (کیوں بھئی کس کا ڈر تھا؟) اسے شرمین عبید چنائے نے پروڈیوس کیا۔ (تمام برے واقعات دنیا کو دکھانے کا ٹھیکہ بی بی شرمین نے ہی تو اٹھا رکھا ہے۔) اس فلم میں حقیقی واقعات کو بھی دکھایا گیا ہے (بھی سے مراد؟) اور اس ڈاکیومینٹری میں قندیل بلوچ کی شہرت اور قتل کے اسباب کو بھی دکھایا گیا ہے۔ (میں نہیں مانتا، میں نہیں مانتا۔)

امریکا کے سب سے بڑے دستاویزی فلمی میلے کا آغاز نومبر کے آخر میں ہوا تھا اور فیسٹول کے آخری دنوں میں اس پاکستانی دستاویزی فلم کو پیش کیا گیا۔ فیسٹول میں مجموعی طور پر دنیا بھر سے سو سے زائد دستاویزی فلموں اور فیچر فلموں کو دکھایا گیا۔

خیال کیا جارہا ہے کہ اب اسے پاکستان میں بھی ریلیز کر دیا جائے گا۔

کچھ اِدھر اُدھر سے

☆ مشرف دور میں ایک دن میں نے بیگم سرفراز اقبال سے سفارش کرائی کہ عمران خان پر غیر اعلانیہ پابندی ختم کرائی جائے تو جمالی صاحب نے کہا۔

میرے تو اپنے معاملات ٹھیک نہیں، میں تمہارے معاملات کیسے ٹھیک کراؤں۔

پتا چلا کہ مشرف پانچ سو کے کرنسی نوٹ پر قائداعظم کی تصویر ہٹا کر اپنی تصویر لگوانا چاہتے تھے لیکن وزیراعظم نے اس خواہش کی منظوری دینے سے انکار کر دیا۔

حامد میر......تیر کمان

☆ 2004ء میں مشرف نے امریکہ کے دباؤ پر ڈاکٹر عبدالقدیر خان کو قربانی کا بکرا بنایا اور انہیں امریکہ کے حوالے کرنے کا فیصلہ کیا۔ جمالی صاحب نے اس فیصلے کی منظوری دینے سے بھی انکار کر دیا لہٰذا اسی سال ان کی چھٹی ہوگئی۔

حامد میر......تیر کمان

☆ ٹی وی میزبان، رکن قومی اسمبلی اور متنازعہ شخصیت کے مالک عامر لیاقت حسین کی اہلیہ طوبیٰ عامر اداکاری کے ذریعے نیا سفر شروع کر دیا ہے۔

(اخبار جہاں)

موسم کے پکوان

خالدہ جیلانی

میکرونی اور چاول آلو بالز

اشیاء:۔

آلو	دو عدد
چاول	آدھا کپ
تیل	حسب ضرورت
ہرا دھنیا	چوتھائی کپ
ہری مرچیں	تین عدد
لہسن کا جوا	ایک عدد
چاول کا آٹا	دو کھانے کے چمچے
انڈا	ایک عدد
میکرونی	آدھا پیکٹ
ڈبل روٹی کا چورا	حسب ضرورت
نمک	حسب ضرورت
سیاہ مرچیں	ایک چائے کا چمچہ

ترکیب:۔

آلو اور چاول کو ابال لیں۔ آلو کو مسل کر چاول، ہرا دھنیا، ہری مرچیں، نمک، چاول کا آٹا، کٹی ہوئی سیاہ مرچیں اور انڈا مکس کر دیں۔ تھوڑی دیر فریج میں رکھیں۔ کسی بھی شیپ میں بالز بنا کر ڈبل روٹی کے چورے میں لگا کر درمیانی آنچ پر گرم تیل میں فرائی کریں اور نکال کر پلیٹ میں رکھیں۔ میکرونی کو تھوڑا نمک ڈال کر ابال لیں اور چھان لیں اور ایک کھانے کا چمچہ تیل مکس کر دیں، ایک ساس پین میں ایک کھانے کا چمچہ تیل میں لہسن ڈالیں۔ میکرونی مکس کر دیں، ایک منٹ پکا کر سرونگ ڈش میں نکال لیں اور رائس پوٹیٹو بالز کے ساتھ سرو کریں۔

چکن کوفتہ رائس

اشیاء:۔

مرغی کا قیمہ	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
سیاہ مرچیں	آدھا چائے کا چمچہ
پسا لہسن اورک	دو کھانے کے چمچے
تلی پیاز	دو کھانے کے چمچے
بادام، پستے، کاجو	حسب ضرورت
چاول	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
ہری مرچیں	چھ عدد
ٹماٹر	دو عدد
زیرہ	آدھا چائے کا چمچہ
تیل	حسب ضرورت
پیاز	ایک عدد
دہی	آدھا کپ
ہرا دھنیا، پودینہ	گارنشنگ کے لیے

ترکیب:۔

قیمے میں نمک، کٹی ہوئی سیاہ مرچیں، ایک کھانے کا چمچہ لہسن ادرک اور تلی پیاز مکس کر کے چوپر میں پیس لیں۔ کوفتے بنا کر ان میں میوہ بھر کے دوبارہ کوفتے بنا لیں اور گرم تیل میں ڈیپ فرائی کر لیں۔ ایک برتن میں آدھا کپ تیل گرم کر کے اس میں زیرہ، پیاز اور باقی لہسن ادرک فرائی کریں۔ ہلکا سا کلر آجائے تو کوفتے ڈالیں، فرائی کریں۔ دہی، ہری مرچیں اور ٹماٹر ڈالیں۔ ڈھکن لگا دیں۔ کوفتے کا پانی خشک ہو جائے تو ہرا دھنیا، پودینہ ڈالیں۔ چاول مکس کر کے دم پر رکھیں (چاہیں تو زرد رنگ چھڑک دیں) رائتے کے ساتھ سرو کریں۔

عربین چکن

اشیاء:۔

چکن	آدھا کلو
دہی	آدھا کپ
پسی سفید مرچ	آدھا چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
پسا لہسن اورک	ایک چائے کا چمچہ
پسی لال مرچ	آدھا چائے کا چمچہ

پسی پیاز ایک عدد
کریم آدھا کپ
تیل آدھا کپ

ترکیب:۔

پیالے میں چکن، نمک، پسی لال مرچ، لہسن ادرک، سفید مرچ، پیاز، دہی اور کریم ڈال کر اچھی طرح مکس کر کے ایک گھنٹے کے لیے رکھ دیں۔ پتیلے میں تیل گرم کر کے چکن ڈال دیں اور ڈھک کر درمیانی آنچ پر پکائیں۔ گوشت گل جائے تو مسالا بھون کر چولہے سے اتار لیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر چاول یا چپاتی کے ساتھ سرو کریں۔

چکن شاشلک اسٹکس

اشیاء:۔

مرغی کا گوشت	آدھا کلو
پسا لہسن	ڈیڑھ چائے کا چمچہ
نمک	حسب ذائقہ
پسی سیاہ مرچ	حسب ذائقہ
سویا ساس	چار کھانے کے چمچے
چلی گارلک ساس	دو کھانے کے چمچے
مکھن	ایک کھانے کا چمچہ
ووسٹر شائر ساس	ایک کھانے کا چمچہ
دہی	دو کھانے کے چمچے
شملہ مرچ	ایک عدد
ٹماٹر	ایک عدد
پیاز	ایک عدد
تیل	حسب ضرورت

ترکیب:۔

مرغی کا گوشت (بغیر ہڈی کا) کو دھو کر خشک کر کے اس کے چوکور ٹکڑے کاٹ لیں۔ ایک پیالے میں گوشت ڈال کر اس میں لہسن، سیاہ مرچ، سویا ساس، چلی ساس، گارلک ساس، مکھن، ووسٹر شائر ساس، دہی اور نمک شامل کر کے خوب اچھی طرح مکس کر کے چھ سے آٹھ گھنٹوں تک فریزر میں میرینیٹ ہونے کے لیے رکھ دیں۔ لکڑی کی سیخوں میں میرینیٹ کیے ٹکڑوں کو ترتیب سے پرولیں۔ فرائنگ پین میں تیل گرم کر کے اس میں تیار کی ہوئی سیخوں کو ڈالیں اور سنہرا ہونے تک فرائی کریں۔ مزیدار چکن شاشلک اسٹکس تیار ہیں۔ سرونگ ڈش میں نکال کر ہری چٹنی یا چلی گارلک ساس کے ساتھ سرو کریں۔

چکن ڈونٹس

اشیاء:۔

ڈونٹ کے لیے:۔

میدہ	آدھا کلو
نمک	حسب ذائقہ
خمیر	آدھا چمچہ
انڈا	ایک عدد
دودھ	حسب ضرورت

فلنگ کے لیے:۔

مرغی کا گوشت	دو کپ
شملہ مرچ	ایک عدد
گوبھی	ایک کپ
پیاز	ایک عدد
پیزا چیز	ایک کپ
تیل	حسب ضرورت

گارنشنگ کے لیے:۔

کیچپ	آدھا کپ
پیزا ساس	ایک کپ
کھیرا	آدھا کپ
پیاز	آدھا کپ
گوبھی	آدھا کپ
چیز	ایک کپ

ترکیب:۔

میدے میں نمک، چینی، انڈا اور خمیر ڈال کر دودھ سے گوندھ کر گرم جگہ پر رکھیں۔ اس کے پیڑے بنا کر ان میں مرغی کا گوشت، شملہ مرچ، گوبھی، پیاز، چیز بھر کے ڈونٹ بنالیں اور گرم تیل میں فرائی کر لیں۔ کیچپ میں کھیرا، پیاز، گوبھی مکس کر لیں۔ ڈونٹ پر پیزا ساس لگائیں۔ کھیرے، پیاز اور گوبھی کا آمیزہ ڈالیں اور پیزا چیز چھڑک کر پانچ منٹ بیک کریں کہ چیز پگھل جائے، گرم گرم سرو کریں۔ (اوون نہ ہو تو ڈونٹس کو ایک اسٹیل کی پلیٹ میں رکھ کر کسی بڑے پتیلے میں رکھ کر ڈھک دیں ایک منٹ میں چیز پگھل جائے گی تو اتار لیں) ☆

ادارہ

خوب صورت بنئے

تھوڑی توجہ سے دمکتا روپ پائیں

خوب صورت بننا یا خوب صورت کہلوانا ہر انسان کا فطری حق ہے۔ اگر آپ خوب صورت بننا چاہتی ہیں یا اپنے آپ کو نمایاں کرنا چاہتی ہیں تو ان مندرجہ ذیل اصولوں پر عمل کیجیے۔ ہم آپ کو اس بات کی ضمانت دیتے ہیں کہ اگر آپ نے ان اصولوں پر عمل کیا تو آپ کا شمار بھی خوب صورت لوگوں میں کیا جانے لگے گا۔

☆ رات کو ساڑھے نو یا دس بجے تک سو جائیں اور صبح پانچ بجے بیدار ہو جائیں۔

☆ صبح کے وقت تقریباً پچیس منٹ قریبی پارک یا گھر کے لان میں ننگے پاؤں گھاس پر چہل قدمی کریں۔

☆ چہل قدمی سے فراغت کے بعد ایک گلاس فریش جوس پئیں۔

☆ صحت مند رہنے کے لیے ورزش بے حد ضروری ہے۔ اپنی صحت اور طاقت کو مدنظر رکھ کر ورزش کے ان طریقوں کو اپنائیں جو آپ کے لیے مناسب ہوں۔

☆ ورزش سے فراغت کے بعد غسل کرنا ضروری ہے تاکہ آپ کو دن بھر تازگی اور راحت کا احساس رہے۔

☆ صبح کا ناشتا ہلکا ہونا چاہیے۔ ایک کپ کم شکر کی چائے، ایک ہاف بوائل انڈا، چند بادام، چند کھجوریں اور دودھ کا ایک گلاس صبح کے ناشتے کے لیے ضروری ہے۔

☆ ناشتے اور دوپہر کے کھانے کے درمیانی عرصے میں ایک گلاس لیموں کا شربت یا پانی میں شہد ملا کر پئیں۔

دوپہر کے کھانے میں پھلوں کو زیادہ فوقیت دیں۔ اگر ہو سکے تو ایک ٹکڑا تربوز، ایک سیب، پپیتے کی چند قاشیں اور ایک دہی کا پیالہ ضرور لیں۔

☆ رات کے کھانے میں سبزیوں کا استعمال کیجیے۔ پالک، بند گوبھی، کھیرے کا سوپ پئیں۔ سبزیوں کو ابال کر بھی استعمال کیا جا سکتا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ دو سلائس براؤن بریڈ یا ایک چپاتی لیجیے۔

☆ رات کو سونے سے قبل ایک دودھ کا گلاس لیں۔

☆ دن بھر میں کم از کم دس گلاس پانی پئیں تاکہ آپ کی رنگت نکھرے۔

☆ چٹ پٹی اور تیل یا گھی میں تلی ہوئی چیزیں نقصان کا باعث ہوتی ہیں۔ اس لیے ضروری ہے کہ آپ چٹ پٹی اور تلی ہوئی چیزوں کے مقابلے میں چائنیز کھانوں کی طرز پر مختلف سبزیاں پکا کر کھائیں۔

☆ ایک بات کا ہمیشہ خیال رکھیے کہ آپ کا چہرہ آپ کا محتاج ہے۔ اس لیے اس کی جانب خاص توجہ دیجیے۔ چہرے کو نکھارنے کے لیے روزانہ چہرے پر بیسن، ہلدی اور ذرا سی بالائی ملا کر لگائیں اور پندرہ منٹ بعد منہ دھو لیں۔

سر کے بال بھی توجہ کے طالب ہوتے ہیں، اس لیے ان کی صفائی ستھرائی کا خیال رکھیں۔ ہفتے میں دو دفعہ ضرور نہائیں اور نہانے سے قبل سرسوں کے تیل کا مساج بالوں میں ضرور کریں۔ اگر آپ کے بالوں میں خشکی ہے اور اس کی وجہ سے بال گر رہے ہیں تو ناریل کے تیل میں لیموں کا عرق ملا کر بالوں میں لگائیں، تاکہ آپ کے بال مزید نہ گریں۔

☆